

حیات و عمر نبوی ﷺ



تصنیف
جنرل گلپ پاشا
ترجمہ
حبیب حیدر آبادی

صَلَّى اللّٰهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حیات و عہدِ نبوی

تصنیف : جنرل سر جان گلپ پاشا

ترجمہ : حبیب حیدر آبادی

بیکن بکس

• قذافی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور فون: 042 - 7351662

• گلگت، ملتان فون: 061 - 520790, 520791



BEACON
BOOKS

E-mail: beaconbookspakistan@hotmail.com

10/10/14

اس کتاب پر کوئی بھی حصہ بیکن بکس / مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت
لئے بغیر کہیں بھی شائع نہ کیا جائے۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورت حال
پیدا ہوتی ہے تو پبلشر / مصنف کو قانونی کارروائی کا حق حاصل ہوگا۔

۲۹۷/۱۱۱۱۱۱

69837

اشاعت : 2003ء

عبدالجبار نے

شرکت پرنٹنگ پریس سے

چھپوا کر بیکن بکس ملتان - لاہور

سے شائع کی۔

قیمت : 375/- روپے

ISBN 969 - 534 - 020 - 2



فہرست

| | |
|-----|--|
| ۱۳ | ۱- تعارف |
| ۱۹ | ۲- عرضِ معنف |
| ۳۱ | ۳- عرب اور اس کے لوگ |
| ۴۸ | ۴- شاہانِ عرب |
| ۶۷ | ۵- مکہ اور قریش |
| ۸۳ | ۶- پیغمبرِ ازلہ دعوت |
| ۹۸ | ۷- آرائشِ کاناہ |
| ۱۲۱ | ۸- حبشہ کو ہجرت |
| ۱۵۱ | ۹- بیعتِ عقبہ |
| ۱۷۷ | ۱۰- انصار اور مہاجرین |
| ۲۰۳ | ۱۱- غزوہ بدر |
| ۲۳۷ | ۱۲- جنگِ احد |
| ۲۶۹ | ۱۳- حملے اور مسلمانوں کے لیے قواعد و ضوابط |

تہذیب میں

375/1

| | |
|-----|-------------------------------|
| ۲۹۷ | ۱۴- خندق |
| ۳۳۳ | ۱۵- مدینہ |
| ۳۶۵ | ۱۶- خیبر اور موتہ |
| ۳۹۸ | ۱۷- مکہ پر قبضہ |
| ۴۲۵ | ۱۸- یوٹ حنین |
| ۴۴۳ | ۱۹- ہجرت مدینہ |
| ۴۶۶ | ۲۰- بت پرستوں کو انتہاء |
| ۴۹۳ | ۲۱- فتوحات |
| ۵۱۸ | ۲۲- اسلام کا پیروی ہمیشہ مذہب |
| ۵۵۲ | ۲۳- اختتام |

تمہید و تعارف

پہلی جنگ عظیم کے بعد مشرق وسطیٰ اور عرب کی سیاست میں جن انگریز سفارت کاروں اور مصنفین کا نام چمکا، ان میں لارنس آف عربیہ اور سر جان گلبن پاشا سرفہرست ہیں۔ گلبن پاشا نے مشرق وسطیٰ اور خصوصاً اردن و عراق کی سیاست و بادشاہت کو تہہ و بالا کرنے میں جو کردار ادا کیا، وہ الگ بات ہے۔ یہاں ان کی مشہور تصنیف ”حیات و عہد نبویؐ“ کا ذکر مقصود ہے۔

یہ کتاب ظاہر ہے، انہوں نے انگریزی زبان میں تصنیف کی تھی اور پہلی بار 1970ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں سیرت طیبہ کے موضوع پر ایک معیاری کتاب ہونے کی وجہ سے بار بار چھپتی رہی۔ یہاں تک کہ برطانیہ میں مقیم مسلمانوں میں بھی مقبول ہونے لگی۔ حبیب حیدر آبادی صاحب کی دختر سلمیٰ نے ایک پبلک لائبریری سے جاری کروائی۔ مطالعہ کیا اور پسند آئی تو اپنے بزرگ والد کو بھی پڑھنے کو دی۔ حبیب صاحب کو گلبن پاشا کا اسلوب بیان اور طرز استدلال پسند آیا، خاص طور پر انہیں مصنف کی یہ ادا اچھی لگی کہ وہ اپنے عیسائی ہونے پر بھی نازاں ہیں اور اسلام اور پیغمبر اسلام کے بھی مدح سرا ہیں۔ سلمیٰ بیٹی نے اپنے والد سے فرمائش کی کہ اس کا ترجمہ اردو میں ہونا چاہیے۔

حبیب صاحب نے اپنے حیدر آباد (دکن) کے دوست ڈاکٹر محمد حمید اللہ کو خط لکھا جو پیرس میں قیام پذیر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مشورہ دیا کہ ہاں اچھی کتاب ہے، اس کا اردو ترجمہ ہونا چاہیے، لیکن ترجمے میں کوئی تحریف اور تصرف نہ کرو۔ ایسا کرنا بددیانتی ہے۔ جو کچھ بھی اصل کتاب میں بیان کیا گیا ہے، من و عن پیش کر دیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کی روشنی میں حبیب صاحب نے پوری کتاب کا اردو میں ترجمہ کر دیا۔

اب انہوں نے پورا مسو لہ کراچی میں اپنے ایک اور حیدر آبادی دوست شاہ منسباح الدین خلیل کو بھیجا کہ ”سپر دم ہوتا یہ خویش را“ پاکستان میں اس کی اشاعت کا بندوبست ہو جائے تو محنت نہ کرنے لگے۔ شاہ صاحب ان دنوں پی ایس او کی جانب سے شائع ہونے والی ”سیرت پاک“ کی تصنیف و تالیف میں مشغول تھے جو تین جلدوں میں شائع ہو کر اس قدر مقبول ہوئی کہ آج تک اس کی طباعت و اشاعت کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ شاہ صاحب نے اپنے دوست سید قاسم محمود سے فرمائش کی کہ وہ کتاب اپنے ادارے ”شاہکار بک فاؤنڈیشن“ کے زیر اہتمام شائع کریں۔ سید صاحب نے فی الفور آمادگی ظاہر کی اور کہا کہ قرآن اور سیرت و حدیث کے موضوع پر کتابیں چھاپنا کاروبار سے زیادہ ثواب کا کام ہے۔ چنانچہ انہوں نے اردو میں اس کا پہلا ایڈیشن ”محمد رسول اللہ“ کے نام سے شائع کیا۔

دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی سعادت ”بیکن بکس“ کو حاصل ہو رہی ہے۔ ہم اس کا نام تبدیل کرنے کی جسارت اس لیے کر رہے ہیں کہ ”محمد رسول اللہ“ کے عنوان سے کئی آسانیف پہلے سے موجود ہیں۔ نیز یہ نام اصل انگریزی کتاب کے مرکزی موضوع کے مطابق بھی نہیں ہے۔ جنرل گلب پاشا نے اپنی کتاب میں آنحضرت کے عہد اور اس عہد کے معاشرتی حالات و کوائف پر خاص زور دیا ہے۔ اس لیے ہم نے اصل انگریزی نام ”The Life and Times of Muhammad“ کی پیروی کرتے ہوئے اردو میں نئے ایڈیشن کا نام ”حیات و عہد نبوی“ رکھا ہے۔

ہم سید قاسم محمود صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کا حق ”بیکن بکس“ کو دیا ہے۔ انہی کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کے مترجم جناب حبیب حیدر آبادی دریں اثناء حالت فرما گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی دختر سلمیٰ کی فرمائش پر اردو ایڈیشن وجود میں آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جزاء دے گا۔

عبدالجبار

بیکن بکس

پیش لفظ

۱۹۱۹ء کی جنگ عظیم کے بعد مشرق وسطیٰ اور عربوں کی سیاست میں لارنس آف عربیہ LAWRENCE OF ARABIA کی طرح گلب پاشا کا نام بھی ایک افسانوی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔

گلب پاشا پیدائشی انگریز ہیں۔ ۱۶ اپریل ۱۸۹۷ء میں انگلستان کے ایک شہر پرستن میں پیدا ہوئے اور ۱ مارچ ۱۹۸۶ء میں اپنے ہی پیدائشی ملک میں انتقال کر گئے۔ اُن کا اصلی نام جان بیگٹ (JOHN BAGOT) تھا۔ عربوں کا دیا ہوا خطاب گلب پاشا ان کے نام پر حاوی ہو گیا اور زندگی بھر گلب پاشا کے نام ہی سے جانے پہچانے گئے۔ ان کے والد برطانوی فوجی افسر تھے جنہوں نے اپنے بیٹے جان بیگٹ کو بھی رائیل ملٹری اکیڈمی میں فوجی تعلیم دلوائی۔ تعلیم اور فوجی تربیت کے اختتام پر ان کو برطانوی فوج میں فریک کروادیا گیا۔ جنگ عظیم کے دوران برطانوی حکومت نے ان کو پہلے یورپ روانہ کیا اور پھر عراق میں ان کو متعین کیا۔

۱۹۲۶ء میں انہوں نے برطانوی فوج سے علیحدگی اختیار کی اور عراقی حکومت نے ان کو اپنی انتظامیہ میں جگہ دی۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے اس خدمت سے بھی سبکدوشی اختیار کی اور ٹرانس جورڈن عرب لیبن میں بہ حیثیت کمانڈر کام کرنے لگے۔ دوسری جنگ عظیم سے کچھ عرصہ قبل انہوں نے قبائلی علاقوں پر مشتمل غیر تربیت یافتہ افراد کی فوج کو ایسی جنگی اور فوجی تربیت دی کہ فوج کے اس دستے نے جنگ کے دوران انگریزوں اور اتحادیوں کی دل کھول کر مدد کی۔ اسرائیل کے وجود میں آنے کے بعد گلب پاشا کی ساری وفاداریاں اور ہمدردیاں عربوں کے ساتھ رہیں۔

۱۹۵۱ء میں انہوں نے اردن کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے ایک قومی رضا کارانہ فوج کی تشکیل دی۔ اردن کو ایک خود مختار ریاست کی حیثیت ۱۹۴۶ء میں حاصل ہوئی اور انگریزوں نے ریاست میں بادشاہت کے قیام اور شاہی کی برقراری کی ضمانت دی۔ اردن کو بہ حیثیت ایک آزاد سلطنت دنیا کے نقشے لانے اور اس سلطنت کو مستحکم بنانے میں عرب حکمرانوں نے گلب پاشا سے خوب کام لیا۔ شاہ حسین ابن طلال ۱۹۵۳ء میں تخت نشین ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں شاہ عبداللہ کے قتل کے بعد گلب پاشا کی مقبولیت میں بتدریج کمی ہوتی گئی۔

عربوں کو لہنی سیاست میں انگریزوں کی ریٹ ڈوانیوں کی وجہ سے کالی رخنہ پڑ چکا تھا۔ دنیا کے نئے پراسرائیل کا وجود برطانوی سیاست ہی کا شاخسانہ تھا۔ عرب سرزمین کے حصے بننے کے گئے۔ عربوں کی زمین پر ہابر سے لے جا کر یہودیوں کو بسایا گیا۔ اس قومی نفرت کا نشانہ گلب پاشا بھی بنے۔

۱۹۵۶ء میں شاہ حسین نے دو گھنٹے کا نوٹس دے کر گلب پاشا کو نہ صرف اُن کی خدمت سے برطرف کیا بلکہ اپنے ملک سے ہابر نکلوا دیا۔ جب وہ انگلستان واپس آئے تو نہ اُن کے پاس پیسہ تھا اور نہ ہی ہانڈار۔ کتابیں لکھ لکھ کر اور امریکہ میں اسلام اور عربوں پر لیکچر دے کر گزارہ کیا۔ ۱۹۵۶ء ہی میں برطانوی حکومت نے اُنہیں سر کا خطاب دیا۔ گلب پاشا کی زندگی کا بڑا حصہ عرب سرزمین پر گزرا۔ اُردن یوں بھی جغرافیائی طور پر شام اور سعودی عرب کے درمیان واقع ہے۔ عربوں کے تھارتی کالے اُردن ہی سے ہو کر گزرتے تھے۔

عرب سرزمین کا یہ خطہ ہمیشہ سے خانہ بدوشوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ آج بھی وہاں ہزاروں کی تعداد میں خانہ بدوش موجود ہیں۔ اُردن چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں پر مشتمل ہے جن کی تعداد اشارہ سو کے قریب ہے۔ سوئنگڑوں قبیلے وہاں آباد ہیں۔ ان ہی خانہ بدوشوں اور بدوی قبیلوں کے درمیان گلب پاشا نے لہنی زندگی گزار لی۔ اُن کو عرب بادشاہوں، قبیلے کے سرداروں، مذہبی رہنماؤں، مالوں کے ساتھ ساتھ عرب عوام کے ساتھ بھی گھل مل کر رہنے کا موقع ملا۔ ۱۹۵۶ء میں جب ان کو عملاتی سازشوں نے ملک بدر کروایا تو عربوں کی اُس فوج نے (جس کی یہ رہنمائی کرتے تھے) شاہ حسین کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔ گلب پاشا نے فوجوں سے درخواست کی کہ وہ اپنے ملک اور شاہ کے ولاداروں میں اور بغاوت سے باز رہیں۔

لیلیٰ خالد نے جب لہنی آپ بیٹی لکھی تو کتاب کے پیش لفظ کے لیے گلب پاشا سے درخواست کی۔ برطانیہ میں رہتے ہوئے یہودی پریس کی مخالفت کے باوجود گلب پاشا نے اس پیش لفظ میں عربوں کی تائید کی۔

جس سرزمین نے اُن کو عزت بخشی، اُن کے نام کو لہنی تاریخ میں محفوظ کیا، اُن کے نام کو مشاہیر عالم کی فہرست میں رکھوایا، اُس سرزمین سے وہ لہنی زندگی کے آخری لمحے تک ولادار رہے۔ اپنے ذاتی تجربات، مشاہدات، اور علم کو لہنی تصانیف میں قلمبند کیا۔ اُن کی حسب ذیل کتابیں عربوں کی زندگی، ثقافت، تہذیب اور فکر کو سمجھنے میں مدد کرتی ہیں۔

۱- عرب دستے کی کہانی- ۱۹۴۸ء

۲- برطانیہ اور عرب صحرائی جنگ میں- ۱۹۵۹ء

۳- عرب سلطنتیں- ۱۹۶۳ء

۴- شام، لبنان اور اردن- ۱۹۶۷ء

۵- رسول اللہ کا زمانہ اور زندگی- ۱۹۷۰ء

۶- امن اور مقامات مقدسہ- ۱۹۷۱ء

۷- قسمت کے دہنی فوجی- ۱۹۷۳ء

۱۹۷۲ء کی بات ہے میری بیٹی سلٹی مقامی کتب خانے سے ایک کتاب لے آئی جس کا عنوان تھا- THE LIFE AND TIMES OF MUHAMMAD - پڑھنے کے بعد مجھ سے کہا کہ میں بھی اس کتاب کو پڑھوں۔ مجھے اُن کا طرز اظہار پسند آیا۔ عیسائی ہونے پر نازاں بھی ہیں اور اسلام کے بھی مدح سرا۔ سلٹی بیٹی جو انگلستان ہی میں پیدا ہوئی اب اس بات پر مصر تھی کہ میں اس کتاب کو اردو میں پیش کروں۔

غیر مسلم جب بھی اسلام یا پیغمبر اسلام پر کچھ لکھتے ہیں تو علاوہ اور باتوں کے ایک بات واضح نظر آتی ہے کہ ان کی تحرروں میں اسلام یا پیغمبر اسلام سے محبت یا عقیدت کی آہن کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ وہ تاریخ کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ دوسروں کے نقطہ نظر سے واقفیت یوں بھی ہمارے لیے سود مند ہے کہ ہم نہ صرف عقیدتوں اور محبتوں ہی کے سہارے اپنے مذہب اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور سیرت سے واقف ہوں بلکہ اُن لوگوں کی تحریروں کو بھی پڑھیں جو اسلام اور پیغمبر اسلام کی عظمت کے قائل نہیں مگر محبتوں اور عقیدتوں کو اپنی تحریروں میں نہیں آنے دیتے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے پیرس سے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں اپنے ترجمہ میں کوئی تعریف و تعریف نہ کروں۔ ایسا کرنا بد دیناںتی ہے۔ جو کچھ بھی اصل کتاب میں بیان کیا گیا ہے من و عن پیش کر دوں۔ اُن کے اس مشورے کی روشنی میں کتاب کا ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ واضح رہے کہ کتاب ایک عیسائی کی لکھی ہوئی ہے۔

گھب پاشائے لہنی زندگی ہی میں بے اس کتاب کو اردو میں ترجمہ کرنے کی بہ خوشی اہازت دے دی تھی۔ اُس کتاب کے پبلشرز HODDER AND STOUGHTON کا میں شکر گزار ہوں جنہوں نے اس ترجمے کی اشاعت کے لیے ہاتھ دے اہازت دی۔ احسان فراموشی ہوگی اگر میں اپنے ہمپن کے دوست اور کرم فرماشاہ مصباح الدین شکیل کا شکر یہ ادا نہ کروں اس ترجمے کی اشاعت مدنی صدان ہی کی زمین منت ہے۔ اللہ پاک ان کو جزائے خیر دے۔ میں پاکستان کے ممتاز دانشور اور ادب سید قاسم محمود صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں غیر معمولی عکوس اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

حبیب حیدر آبادی - لندن

تعارف

اپنی کتاب "عربوں کی فتوحات عظیمہ" کے مقدمہ میں میں نے یہ شکایت کی تھی کہ انگریزی پڑھنے والوں کو عربوں کی تاریخ پر بہت ہی کم کتابیں دستیاب ہوتی ہیں۔ حالانکہ عرب سلطنت اپنے وقت کی سلطنت روما کے مقابلہ میں گنی تھی اور عربوں کا زمانہ ہمارے اپنے زمانہ سے چھ سو سال قریب تر بھی رہا ہے۔

میری اس شکایت کا اطلاق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح پر نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ کی زندگی پر بہت سی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ فرانسیسی، جرمن، اطالوی، انگریزی اور یورپ کی کئی اور زبانوں میں حضورؐ کی سوانح لکھی گئی ہیں۔

موجودہ سوانح عمریوں میں ایک اور کا اضافہ کرنا میرا منشاء نہیں ہے۔ بلکہ اُس موضوع پر قلم اٹھانا ہے جس پر اب تک بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ میرا یہ مقصد اور بھی اچھے طریقے سے حل ہو سکتا ہے اگر میں اس بات کو پیش نظر رکھوں کہ موجودہ سوانح عمریاں ان لوگوں کے قلم سے نکلی ہوئی ہیں جو علم و فضل میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات ان کے علم و فضل کی بھی ترجمانی کرتی رہی ہیں۔ میں قطعاً ان علماء کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یہ کہنے کی ضرورت جرات کروں گا کہ ایسے لوگ یقیناً اپنے علم و فضل میں باکمال تھے اور ان کا یہ کمال عام لوگوں سے ان کی اپنی علمیت، ایقانیت اور فضیلت کا اعتراف بھی کروانا ہوتا ہے۔ عام طور پر ایک عالم اس ارادہ سے اپنا قلم اٹھاتا ہے کہ دوسرا عالم اس کے علم اور اس کی معلومات سے استفادہ کرے اور ساتھ ہی وہ ان تصنیفات کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے جو محض شہرت اور عوام کو خوش کرنے کے لیے منظر عام پر لائی جاتی ہیں۔

آج کے زمانے میں عوام کی خواہش ہوتی ہے کہ عوامی معاملات سے اپنے آپ کو اس طرح وابستہ رکھیں کہ عوامی مسائل کو حل کرنے میں ایک حد تک ان کی مرضی و منشاء کو دخل حاصل رہے اسی لیے میرا بھی مقصد تصنیف اس کتاب کو لکھنے کا یہ ہے کہ یہ کتاب پڑھی جاتے۔ کتاب ایسی ہو جس سے ایک عالم سمجھ بوجھ رکھنے والے پڑھے لکھے مرد اور عورت کو نفسِ مطمئنوں سے ضروری واقفیت ہو جائے۔ میں نے کتاب میں مالانہ قسم کے بحث و مباحث سے گریز کیا ہے۔ فاضلانہ قسم کی حاشیہ آرائی سے بھی احتراز کیا۔ کتاب کے صفحات میں کافی بچت کی ہے۔

تعمیلِ علم کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا اور ساتھ ہی ریگستان کے ان پڑھ بدوی قبیلوں کے ساتھ ان کی روزمرہ زندگی میں گھل مل کر رہنا ناممکنات میں سے ہے۔ اپنی زندگی کی انٹھوں منزل میں قدم رکھنے تک میری زندگی عربِ ہلک میں ایسی گزری جس میں عربوں کے ساتھ ساتھ عملی کام کرنے کا مجھے موقع ملا۔ بہت سارے کام وہ تھے جو بیرونِ خانہ کی تعریف میں آتے ہیں۔ یہ بات میری استعداد اور طاقت سے باہر ہے کہ ساٹھ سال کی عمر میں کتاب لکھنا شروع کروں اور ان علماء و فضلاء سے آگے بڑھنے کی کوشش کروں جنہوں نے تعیلِ علم کے لیے اپنی پوری زندگی کو وقف کر دیا تھا۔

اگرچہ کہ ماضی کی تاریخ کتابوں ہی کے ذریعہ ہم تک پہنچتی رہی لیکن تاریخ لکھنا اس کا نام نہیں ہے کہ ہم پرانی کتابوں کی جلدوں ہی کی ورق گردانی کریں اور ان ہی باتوں کو پھر سے اپنی کتابوں میں دہرائیں جو ضبطِ تحریر میں آچکی ہیں۔

میری ناچیز رائے میں مورخ کا سب سے اہم کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس مقام پر لے جائے جہاں پر وہ خود کو اسی ملک کے ذہنی اور روحانی ماحول میں پائے جس ملک اور جس دور کی وہ تاریخ لکھ رہا ہے اس لحاظ سے وہ مورخین جنہوں نے حضور کے عہد کی تاریخ لکھی ہے خاص طور پر خوش قسمت ہیں۔

جب کبھی ہم قدیم یونان یا قدیم روم حتیٰ کہ چھٹی صدی سے پندرہویں صدی تک کے یورپ کے تعلق سے کچھ لکھنا چاہتے ہیں تو ہماری معلومات کے لیے صرف ان دستاویزات کا سہارا رہ جاتا ہے

جو زمانہ کے خرد برد سے محفوظ رہیں۔ اس طرح ہماری معلومات کی حد بندی ہو جاتی ہے اور معلوماتی رسائل کا فقدان نظر آتا ہے۔

زمانے نے نہ تو یونان کے اُن قدیم شہروں کو باقی رکھا نہ ہی رومیوں کی مشہور عالم مجلس مشاورت کو۔ نہ ہی یورپ کے ماضی قریب کے پر شوکت فوجی افسر یا حکمران رہے جن سے ہم بالمشافہ بل کر دریافت کریں کہ بتاؤ تمہارے اپنے عہد کے تعلق سے تمہارے کیا تاثرات ہیں۔ لیکن عرب کے ریگستان میں آج کی بیسویں صدی میں بھی اسی قسم کے بدوی اور خانہ بدوش پائے جاتے ہیں جیسے آج سے دو ہزار سال پہلے موجود تھے۔

زندگی کے اتنے سال ان لوگوں میں گزارتے ہوتے جب کبھی میں عربی کتابوں میں ابتدائی عربوں کے حالات پڑھتا ہوں تو موجودہ عرب اور ان کے آباؤ اجداد کی زندگی میں ایک تطابقی نظر آتا ہے اس سرزمین پر اب جو لوگ پائے جاتے ہیں ان میں اور ان کے آباؤ اجداد میں ذہنی طور پر مجھے تو کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

خوش قسمتی سے مجھے ان لوگوں کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا جن کی تاریخ آج میں لکھ رہا ہوں ان لوگوں کے ساتھ میرا رہنا بسا ہوا جن کی زندگیوں میں گزشتہ تیرہ سو برسوں میں وقت کے دھارے بہت ہی کم تبدیلیاں لاسکے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بات میری علمی بے بصانمتی کا پردہ دکھ لے گی۔ موجودہ نئے نئے ذرائع آمد و رفت اور عرب میں تیل کی دریافت نے گزشتہ بیس برسوں میں بدویوں اور خانہ بدوش عربوں کی دنیا کو درہم برہم کر دیا۔ مستقبل کا طالب علم لندن، نیویارک اور واسکو سے پرواز کر کے چند گھنٹوں میں جزیرہ نما تے عرب کے بچوں پہنچ جاتے تو اب اُس کو اونٹوں پر سوار وہ قافلے نظر نہیں آئیں گے جن کی تاریخ اسلام سے پہلے سے چلی آرہی ہے۔ بدویوں کی اپنی دنیا بڑی پرانی دنیا ہی ہے۔

جس ذہنی اور روحانی ماحول کو انہوں نے گزشتہ تیرہ سو برس سے برقرار رکھا تھا وہ اس طرح نئے ختم ہوا کہ اب اُس کا تصور بھی مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم موقوفہ کو شروع کریں ایک بات وضاحت طلب ہے حضرت محمد مصلیٰ ثانی علیہ وسلم مذہب اسلام کے بانی ہیں۔ گزشتہ تیرہ سو سال سے آپ کو مسیحیت کا دشمن سمجھا جاتا رہا ہے اس مداوت اور نفرت کی بنیاد سیاسی نوعیت کی رہی ہے نہ کہ مذہبی۔ سیاسی رقابتوں نے مداوت اور نفرت کا روپ اختیار کیا۔ مذہبی عقائد اور ان کے درمیان اختلافات کبھی بھی نفیس و عناد کا باعث اس لیے نہیں بنے کہ اسلام اور مسیحیت پر حیثیت مذہب ایک دوسرے سے بہت ہی قریب ہیں۔ مذہبی تعصبات نے حضور کی سوانح کو توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ حضور کی زندگی پر لکھی ہوئی تقریباً تمام کتابوں میں تعصبات نے جگہ لی۔ مغربی مصنفین بذات خود مذہبی نہیں تھے۔ لیکن لاشعوری طور پر تعصب کا اس لیے شکار ہوئے کہ انہیں مسلمانوں سے نفیس و عناد وراثت میں ملا تھا۔ اس کی تہ میں یورپ کی اُبھرتی تہذیب اپنا کام کر رہی تھی۔

دوسری طرف مسلمان مورخین کے لیے مغربی مصنفین کے پر شاہکار تازیانہ کا کام کر رہے تھے حضور کی ذات گرامی پر مغرب کی طرف سے من مانے اعتراضات کی جو بوچھاڑ شروع ہو گئی تھی اُس کا جواب مسلم مورخین نے بھی ترکی بر ترکی دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فریقین نے نہ صرف تاریخی حقائق کو مکمل طریقے سے توڑ مروڑ کر پیش کیا بلکہ ایک دوسرے کے خلاف وہ نفرت پیدا کی جو مختلف قوموں، نسلوں اور ثقافتوں کے درمیان تقسیم پھوٹ اور علیحدگی کا باعث بنتی ہے۔

میں ایک عیسائی ہوں۔ اپنی زندگی کا آدھے سے زیادہ حصہ مسلمانوں کے درمیان گزار چکا ہوں۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا کہ میرے ارد گرد مسلمان ہی مسلمان رہے اور کسی عیسائی کا کوسوں پتہ نہ رہتا تھا۔

میں یہ جانتا ہوں کہ اسلام بہترین آدمیوں کو جو د میں لاسکتا ہے۔ آدمی کو خوب سے خوب تر بنا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اوتار اور ولی کے درجہ تک پہنچا سکتا ہے۔ اس کے باوجود مغرب کے لوگوں کا مسلمانوں کے تعلق سے غلط خیال اور ان کا اپنے ذہنوں میں غلط خاکہ حقیقت سے انحراف کا باعث بنتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام مجھے اپنی طرف مائل نہ کر سکا اور میں مسلمان نہ بن سکا۔
 موجودہ سائنس نے کتنی عجائبات اور حیرت انگیز باتوں پر اپنا تصرف قائم کر لیا ہے اور باتوں
 کے علاوہ اس نے فضا کی وسعت کا کھوج بھی لگایا۔ ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہماری یہ دنیا۔ یہ سارا عالم
 جو ہماری نظروں کے سامنے ہے فضا کی وسعت کے مقابلہ میں اس ذرے سے بڑا نہیں جو گرد کی صورت
 میں لندن کے دائرہ کوسٹیشن پر ہوا میں اڑتا رہتا ہے۔ عالم کی وسعت کا اندازہ بھی اسی حد تک ہو سکتا
 ہے جہاں تک دوزخ کے ذریعہ ہماری حد نظر ہے۔ اس سے آگے کیا ہے قطعیت کے ساتھ ہم میں
 سے کسی کو بھی معلوم نہیں۔

زمانہ وسطیٰ میں رہنے والے یہ خیال کرتے تھے کہ سارے عالم کا مرکز یہ زمین ہے اور انسان
 اس زمین پر خدائی کرتا ہے۔ اسی خدائی کے تصور نے ان کو اپنی ذات پر نازاں کر رکھا تھا۔ اب ہم سے
 یہ کہا جاتا ہے کہ ہماری زمین گرد کے ایک ذرہ جیسی ہے اور فضا میں اڑتی رہتی ہے۔ ہم کو اپنی ذات
 پر ناز کرنے کے لیے اب باقی کیا رہ گیا ہے۔

ساری تاریخ میں بہت کم قومیں ایسی گزری ہیں جو ہماری طرح مغرور اور خود پسند ہوں۔ ہم
 حقیر اور فرومایہ جیسے ایک جرثومہ جسے دیکھنے کے لیے بھی خوردبین کی ضرورت ہو اور جو ہوا کی گرد
 میں اپنے آپ کو ٹوٹ کیے ہوئے ہو۔ اپنی حقارت اور بے بضاعتی کا یہ عالم اور اس پر یہ دماغ کہ اپنی
 غفلت بے تعلقی اور بے پرواہی پر زعم اور اس کی تحقیر کرنے کی جرأت جو ساری کائنات کا پالنہ ہے۔
 جو ہر چیز کو عدم سے وجود میں لے آیا ہے۔ واہ ری عجیب و غریب مخلوق!

انسان اپنے ذہنی دیوالیہ پن کی جن جن صورتوں کو اختیار کر سکتا ہے ان میں سب سے زیادہ مضحکہ
 خیز اور جگر سوز صورت وہ ہے جسے اختیار کر کے وہ اپنے آپ کو خالق کائنات کے ساتھ بالکل ہی بے تکلف
 ظاہر کرے۔ بحث کتنی آسانی سے یہ کہہ کر آگے بڑھائی جا سکتی ہے کہ میرا اس بارے میں یہ خیال ہے
 خدا عاقل و دانہ ہے۔ اس کے ہر حکم میں منطقیات اور واجبیت ہوتی ہے۔ چونکہ میرا انداز فکر واجبی اور
 منطقی ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ مجھے ایبہ الیٰ علیٰ ہر۔ لہذا یقیناً وہ میری امید کرتا ہے۔ چونکہ

ندا میری تائید کرتا ہے اس لیے ہر وہ شخص جو مجھ سے اختلاف کرے خدا کا دشمن ہے۔

جو سکتا ہے کہ پڑھنے والے میسران جملوں کو کلمہ کفر سے تشبیہ دیں۔ یہاں ان جملوں کے کھنکے کا
 دامن مقصد خدا کی عظمت اور اس کی بندگی اور انسان کی اپنی بے ہودگی اور بیچ مندی کو ظاہر کرنا ہے۔
 میرا اپنا موقف یہ ہے کہ میں اپنے یسائی ہونے پر خوش ہوں اور مسلمانوں کے ساتھ مجھے ہمیشہ سے
 اُسر رہا ہے۔ ہمیشہ سے میں نے مسلمانوں سے محبت کی ہے۔ خدائی منصب کو اپنے آپ پر مسلط کر کے
 دوسروں کے تعلق سے فیصلے صادر کرنا میرا کام نہیں ہے۔ میری کوشش یہی رہی ہے کہ عربوں کے تعلق
 سے جو کچھ میں میں جانتا ہوں اُسے بیان کر دوں، فیصلے صادر کرنے سے میں نے احتراز کیا ہے اس لیے کہ
 میں اپنے آپ کو اس کام کے لیے ناموزوں سمجھتا ہوں۔

حاکم اعلیٰ اور مختار کل کا حکم ہے۔

”انگشت نمائی مت کرو تا کہ تم پر انگشت نمائی نہ ہو۔“

عرب مصنف

انگریزی پڑھنے والوں کو عرب ناموں کے تعلق سے دشواری پیش آتی ہے اس لیے کہ ان میں سے بعض نام بہت ہی بڑے اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اسلامی مورخین نے ناموں کی بڑی ہی لمبی چوڑی فہرست دی ہے میں نے ان ناموں کو گھٹا کر صرف ضروری ناموں پر ہی اکتفا کیا ہے تاکہ پڑھنے والوں کو اہم ناموں کے یاد رکھنے میں آسانی ہو۔ عربوں میں مختلف قسم کے نام ہوتے ہیں جن کی وضاحت یہاں کر دینی ضروری ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم اپنے ہیر و حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے نام سے اس وضاحت کو شروع کریں۔ اس نام کا مصدر یا لگائی ال حمد ہے، جس کے معنی ہوتے ہیں اس نے تعریف کی۔ یہی مصدر قرآن کے مشہور اور مقبول سورہ فاتحہ میں بھی الحمد للہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ محمد کے معنی ہوتے ہیں وہ جس کی تعریف کی گئی ہو۔

ساتویں صدی عیسوی میں ایک عرب اپنے نام کے علاوہ اپنے باپ کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ عربی لفظ ابن کے معنی بیٹے کے ہوتے ہیں۔ زید ابن عمر سے مراد عمر کا بیٹا زید ہوگا۔ معروف اور اہم خاندان اپنے مورث اعلیٰ کے نام کو اپنا خاندانی نام بنا لیتے ہیں۔ اس کی مثال سعودی عرب کے حکمران ابن سعود کی ہے۔ سعود موجودہ حکمران کے والد کا نام نہیں تھا بلکہ دو سو سال قبل ان کے جو مورث اعلیٰ تھے یہ ان کا نام تھا۔ ان کے زمانے سے اس حکمران خاندان کے افراد اپنے نام کے ساتھ ابن سعود کی نسبت کا اضافہ کرتے ہیں اور سعودی کہلاتے ہیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی عرب کے ہاں پہلا لڑکا پیدا ہوتا ہے تو لڑکے کا باپ لڑکے کے نام کو اپنی کنیت یا نام کا جزو بنا لیتا ہے جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

صاحبزادہ قاسم کے پیدا ہونے کے بعد حضور نے اپنی کنیت ابو القاسم یعنی قاسم کو باپ قرار دی تھی۔
 بعض اوقات کنیت نام پر یہی مادی ہو جاتی ہے کہ ذاتی نام کو لوگ بالکل بھول جاتے ہیں، اور
 کنیت نام پر غالب ہو جاتی ہے اس کی مثال حضرت ابو بکرؓ ہیں۔ جن کا اصلی نام غالباً عتیق تھا۔ عتیق کے
 نام سے حضرت ابو بکرؓ کو کوئی بھی نہیں جانتا۔

حوت اپنے نام کے ساتھ بنت استعمال کرتی ہے۔ بنت کے معنی لڑکی یا بیٹی کے ہیں۔ رقیہ بنت
 محمدؐ کے لفظی معنی ہوتے محمدؐ کی صاحبزادی رقیہؓ۔

میں نے جان بوجھ کر اس کتاب میں آیات قرآنی اور عربی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا ہے۔
 صرف ان آیات یا عربی الفاظ کا ترجمہ دے دیا ہے جن کی ضرورت محسوس کی گئی۔

مختلف اسباب کی بنا پر واقعات کے سنہ اور تاریخوں کی صحت پر صدی صدی اعتماد نہیں کیا جاسکتا
 اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ساتویں صدی مسوی میں عرب چاند کے مہینوں یا قمری سال کو استعمال کرتے تھے
 ان کے ہاں شمسی مہینوں یا شمسی سال کا رواج نہیں تھا۔

دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ ابتدائی عرب مورخین کے درمیان تاریخوں اور سنہ میں ابتدا ہی سے
 بحث چلی آرہی ہے۔ ایک ہی مورخ اپنے اندازہ کے مطابق ایک ہی واقعہ کے لیے دو دو تین تین تاریخیں
 یا سنہ لکھتا چلا گیا ہے۔ بعضوں نے برطانیہ کے ساتھ کہا ہے کہ ان تاریخوں اور سنہوں میں جن کو انہوں نے خوبیان
 کیا ہے کوئی تاریخ اور کون سنہ صدی صحیح ہے پورے یقین سے نہیں کہہ سکتے۔

اس کی تیسری وجہ یہ ہے کہ بعض مواقع پر دو تین نے صرف قمری مہینہ ہی کا ذکر کیا ہے اور دن اور
 تاریخ کے لیے خاموشی اختیار کی ہے مثلاً کسی نے لکھا ہے کہ جب کے مہینہ میں کوئی مخصوص واقعہ ہوا۔ نہ
 یہاں تاریخ لکھی اور نہ ہی دن۔

جہاں تک اہم واقعات کا تعلق ہے تاریخوں میں اختلاف نسبتاً ذرا کم ہی واقع ہوا ہے۔ چھوٹے
 اور جزوی واقعات جہاں تک تعلق ہے مورخین کے بیانات میں ایک ایک دو دو سال کا فرق پڑ
 جاتا ہے۔

عرب مورخین نے تاریخوں کی صحت پر اتنی اہمیت نہیں دی جتنی اہمیت واقعات کی صحت پر۔ ایک ہی واقعہ کو اگر کسی مورخ نے مختلف راویوں سے سنا ہے تو وہ بے تکلف تمام راویوں کا بیان جن کو وہ ثقہ سمجھتا ہے اپنی تاریخ میں لکھ دیتا ہے اور پڑھنے والوں کو آزادی دے دی جاتی ہے کہ وہ جس راوی کی روایت کو صحیح سمجھے اُسے مان لے۔

مسلم مورخین اس بات کے بڑے ہی والد و شیدا تھے کہ اپنے بزرگوں سے جو بات بھی سن لیں اسے تحریر میں لے آئیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر دم دید واقعات اور سنی سنائی باتیں تحریر میں آنے لگیں چونکہ اس زمانہ میں لکھنے لکھانے کی وہ سہولتیں میسر نہیں تھیں جیسی آج ہیں اس لیے سنی ہوئی بات بھی فوراً قلمبند نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے باوجود ان لوگوں کے حافظے کی داد دینی چاہیے جو واقعات کو نسل بعد نسل ایک دوسرے کو منتقل کرتے رہے۔

تیرہ سو سال پرانی باتیں آج بھی بدوی اور بغیر پڑھے لکھے لوگوں کی زبانی اسی صورت میں سنی جا سکتی ہیں جیسی کئی سو سال قبل کتابوں میں لکھی جا چکی تھیں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات ہم تک تین ذرائع سے پہنچے ہیں۔

پہلا ذریعہ قرآن ہے، دوسرا ذریعہ سوانح ہے اور تیسرا ذریعہ احادیث اور روایات ہیں۔

حضور نے اپنے آپ پر نزولِ قرآن کا دعویٰ کیا تھا۔ قرآن کے نازل ہونے کی مختلف صورتیں تھیں، جن میں سے ایک صورت یہ بھی تھی کہ حضرت جبریل اللہ کا کلام لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے جیسے ہی حضور پر قرآن نازل ہوتا آپ اپنے صحابہ سے بیان کرتے اور صحابہ ان آیات کو حفظ کر لیتے اور بعض موقعوں پر اسے مختلف لکھی جنسے والی چیزوں پر لکھ لیتے۔

ساری قرآنی سورتیں اور آیات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بیس سال بعد ایک کتابی صورت میں یکجا کی گئیں جسے قرآن کہا جاتا ہے اس میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں کہ قرآن میں جو کچھ محفوظ ہو چکا ہے وہ کم و بیش وہی الفاظ ہیں جن کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے سامنے بیان فرمایا تھا۔ قرآن واقعات کو مختصر انداز میں یکجا کرنے یا بیان کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ اخلاقیات و دینیات

مذہب اور خدائے عزوجل کی تعریف و توصیف کا مجموعہ ہے۔

قرآن کریم نے حضور کی زندگی کو جہاں ہمارے آگے پیش کیا ہے وہیں اس سلسلے میں دوسرا ذریعہ حضور کی ذات اقدس پر لکھی گئی وہ کتابیں ہیں جو ابتدائی عرب سوانح نگاروں اور مورخین نے لکھیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی کتاب جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک پر لکھی گئی وہ ابن اسحاق کی ہے یہ حضور کی وفات کے ایک سو بیس برس بعد لکھی گئی۔

موجودہ زمانے میں ابن اسحاق کی مرتب کی ہوئی تاریخ وہی ہے جسے ابن ہشام نے ترتیب دیا تھا ابن ہشام کا انتقال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے تقریباً دو سو سال بعد ہوا۔

اس سلسلے میں دوسری قابل ذکر کتاب واقعی کی منازی ہے مورخ واقعی کا انتقال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے ایک سو ستیاز سے سال بعد ہوا۔ ان کے علاوہ چند اور کتب بھی حضور کی زندگی پر لکھی گئیں لیکن ان میں سے کوئی کتاب بھی ایسی نہیں ہے جو حضور کی وفات کے ایک سو سال کے اندر لکھی گئی ہو۔

حضور کی زندگی سے واقف ہونے کا تیسرا ذریعہ احادیث ہیں، حدیث کے لفظی معنی مباحثہ، آپس کی گفتگو یا زبانی یادداشت ہے۔ حضور کی وفات کے بعد صحابہ کرام اس بات میں بڑی خوشی اور فخر محسوس کرتے تھے کہ حضور کی زندگی کے ہر بڑے اور چھوٹے جزو کو لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے۔ یہ بیان ان کے اپنے چشم دید واقعات، کیفیات، حالات، مشاہدات اور تجربات پر مشتمل ہوتا تھا جو لوگ نئے نئے مسلمان ہوتے تھے ان بزرگوں کی باتوں کو بڑے ہی شوق اور دلچسپی سے سنتے تھے۔ اپنی سنی ہوئی باتیں دوسروں تک پہنچاتے تھے اسی طرح ایک کی کہی ہوئی بات دوسرے سنی اور دوسرے نے تیسرے کو سنائی اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔

زندگی کے مختلف موضوعات پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات ارشاد فرمائی یا عمل فرمایا وہی بات لوگوں نے دوسروں کو بتائی اور یہی کہی سنی اتنی اہمیت اختیار کر گئی کہ زندگی کے بہت سے گوشوں میں حضور کے ارشادات و افعال اسلامی قانون کی بنیاد قرار دیے گئے۔

69837

آج بھی اسلامی ممالک میں کسی بھی بیج کے سامنے حضورؐ کا ارشادِ اعلیٰ بطور سند پیش کیا جا سکتا ہے اور یہ سند اسلامی تازن کی نظر میں قابلِ قبول ہوتی ہے۔ اس اچھی بات کا بد قسمتی سے یہ نتیجہ نکلا کہ بے ایمان اور غیر فردش لوگ ہر اس بات کو جس میں ان کا اپنا مفاد وابستہ تھا حضورؐ کی ذات گرامی سے منسوب کرتے گئے۔ تاکہ ایک طرف قانون کی گرفت سے آزاد ہوں اور دوسری طرف عوام کی نظروں میں باعزت رہیں۔ سونے پر سہاگہ یہ ہر اک سیاسی جماعتوں نے اپنی وضع کردہ پالیسیوں کو دوہرے عمل لانے کے لیے بہت سی باتیں جو ان کی اپنی من مانی تھیں حضورؐ کی ذات گرامی سے منسوب کر دیں تاکہ حضورؐ کا نام لے لے کر وہ اپنی ہوسِ اقتدار کی آگ کو تیز سے تیز تر کریں۔ اس کا لازمی نتیجہ جو نکلا وہ یہ کہ حضورؐ کے ارشادات کو لوگ جانچنے لگے۔ اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ واقعی جو بات حضورؐ سے منسوب کی جا رہی ہے، حضورؐ نے ارشاد فرمائی بھی تھی یا نہیں اس بات کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے ایک خاص فن کی ابتداء ہوئی جس کو فنِ حدیث کہا جاتا ہے۔ فنِ حدیث کے علماء اور اماموں نے اس بات کی سخت کوشش کی کہ وضع کردہ اور جھوٹی باتیں جو حضورؐ سے منسوب کر دی گئی ہیں ان کو حضورؐ کے ارشادات سے الگ کر دیا جائے۔

اس کوشش میں سخت محنت کر کے ایک حد تک کامیاب ہونے والوں میں بخاری اور مسلم ہیں جو بید قابلِ اعتبار اور انتہائی مشہور اور مقبول ہوئے ہیں۔

بخاری نے اس سلسلے میں قابلِ قدر کام کیا ہے۔ بڑی اسی کاوشوں سے انہوں نے کتاب لکھی یہ کام 40 ابواب پر مشتمل تھا۔ امام بخاری کا زمانہ حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے دو سو بیس برس بعد کا ہے۔

امام بخاری کے کام کی تکمیل کے پانچ یا چھ سال بعد مسلم اپنے کام کو منظر عام پر لائے۔ ان کے علاوہ بھی حدیث کے فن میں کئی بزرگوں نے کام کیا اور ان کا کام بھی قابلِ قدر ہے۔ میسرے نزدیک صرف بخاری اور مسلم ہی قابلِ قبول ہیں۔ میں نے اپنی کتب میں ان ہی کی روایات پر اکتفا کیا ہے۔

حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک پر نظر ڈالنے کے لیے ابتداء ہی سے یہی

تین ذرائع رہے ہیں۔ ان ہی ذرائع کو آج سے سینکڑوں برس پہلے لکھنے والے مورخین، مصنفین، سیرت نگاروں اور تذکرہ نگاروں نے استعمال کیا تھا۔ وہی ذرائع آج بھی موجود ہیں۔ ان ہی کو میں بھی استعمال کر رہا ہوں اور بروٹھمنس جو اس موضوع پر قلم اٹھانا چاہے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ ان ہی ذرائع کی طرف رجوع ہو۔

(سیرت کے قدیم ماخذ کے عنوان کے تحت پروفیسر سید نواب علی نے اپنی کتاب سیرت رسول اللہ میں لکھا ہے۔)

”گزشتہ صدی میں یورپ نے علوم و فنون میں خیریت اُمین ترقی کے ساتھ مذاہب عالم کے متعلق معلومات کا ذخیرہ قدیم اور نیا باب کتب کو تلاش کر کے اور ان کے متن اور تراجم شائع کر کے جمع کر دیا، جس سے تحقیق کا راستہ کھل گیا۔ ہم یورپ کے اس احسان کو کبھی بھول نہیں سکتے کہ اس کے مایہ ناز فرزندوں نے ہمارے اسلاف کے علمی کارنامے، جو دست برد زمانہ سے فراموش ہو چکے تھے ہمارے سامنے پیش کر دیئے۔ کتب مغازی و سیر کے اصل ماخذ جو ہمارے علمی کتب خانوں کی بربادی اور ہمارے ذوقِ علمی کے فقدان سے قریب قریب مفقود ہو چکے تھے، مستشرقین یورپ کی مساعی جلیلہ کی بدولت پھر ہم کو ملے۔“

سب سے قدیم ماخذ محمد ابن اسحاق کی کتاب ’المغازی‘ ہے، اصل کتاب تو ایک مدت سے مفقود ہو چکی ہے لیکن اس کو جس شکل میں ابن ہشام (وفات ۲۱۳ھ / ۸۲۹ء) نے ابن اسحاق کے ایک شاگرد زیاد ابن عبد اللہ الیکالی (وفات سنہ ۱۸۳ھ) کی روایت سے حذف و اضافہ کے ساتھ مرتب کیا اور جس کا نام سیرت رسول اللہ رکھا اس کو دستنفلد نے سنہ ۱۸۶۰ء میں گوتنگن سے شائع کیا جس کا جرمن ترجمہ گتساویل نے سنہ ۱۸۶۴ء میں طبع کرایا۔

دوسرے قدیم ماخذ طبقات ابن سعد ہے۔ رسول کریم صحابہ اور تابعین کے عیال میں محمد ابن سعد (وفات ۲۳۰ھ / ۸۴۵ء) کا تہ و اقدسی نے ایک کتاب بارہ جلدوں میں لکھی تھی جو تقریباً

نیاب ہو چکی تھی مگر قیسر ولیم نے ایک کثیر رقم عطا کر کے قسطنطنیہ اور مصر وغیرہ سے اس کتاب کے اجزا فراہم کر کے ایک کامل نسخہ تیار کرایا، پھر پروفیسر ساخراور سات مستشرقین کے زیر اہتمام سنہ ۱۸۵۵ء میں اس کو طبع کرانا شروع کیا۔ اس سلسلے میں واقدی کی کتاب "المغازی" کو بھی یاد رکھنا چاہیے جس کو سنہ ۱۸۵۵ء میں کریم نے کلکتہ سے شائع کیا مگر یہ نسخہ ناقص تھا۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں ولہاسن نے ایک دوسرے نسخے کا ترجمہ برلن سے شائع کیا۔

تیسرا قدیم ماخذ محمد بن جریر الطبری (وفات ۲۴۰ھ / ۸۵۳ء) کی "تاریخ الامم والملوک" ہے جس میں واقعات عالم کے ساتھ آنحضرت صلعم اور خلفاء کے حالات بھی مذکور ہیں۔ آنحضرت کے حالات زیادہ تر ابن اسحاق سے منقول ہیں۔ اس طور سے ابن اسحاق کی کتاب کا معتدبہ حصہ طبری میں محفوظ ہے اس مبسوط اور مشہور تاریخ کو نولائی اور جے بارتھ نے چودہ برس کی محنت میں سنہ ۱۸۸۵ء میں جرمنی کے شہر لیپٹن سے شائع کیا۔ اس سلسلے میں تاریخ یعقوبی ابن دافع (وفات ۲۹۲ھ / ۹۰۵ء) بھی قابل ذکر ہے جس کو ہولسمان نے اسی شہر لیپٹن سے دو برس پیشتر شائع کیا تھا۔ اس میں آنحضرت کے حالات جزو دوم میں مذکور ہیں۔ مغازی و سیر کے علاوہ علم رجال میں ابن حجر کی مشہور کتاب "اصابہ" کو اسپرنگر نے کلکتہ سے سنہ ۱۸۵۶ء میں شائع کیا۔

ان ماخذات کی اشاعت سے مستشرقین یورپ کی معلومات وسیع ہو گئیں اور اب انہوں نے عالمانہ رنگ میں سیرت نبوی اور اسلام پر قلم اٹھایا۔ لیکن صدیوں کی قومی منافست اور سیاسی تفوق کا غرور سنگ راہ ہو گیا۔ سوء اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اسلام کی سیاسی قوت پامال ہو رہی تھی۔ ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہو گیا تھا۔ ایران میں قاجاریہ آفتاب لب بام تھا۔ یورپ کا مرد بیمار (ترکی) سنہ ۱۸۴۰ء کی جنگ میں خرابی روس سے بڑی طرح زخمی ہو گیا تھا، مصر شیر برطانیہ کے پنجے میں تھا۔ مراکش کی پگڑی زلف فرانس نے اچھال دی تھی۔ سنہ ۱۸۶۱ء میں سرولیم میور نے سیرت نبوی پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر شائع کی اور اسی سال اسپرنگر نے برلن میں اپنی تصنیف شائع کی۔

سنہ ۱۸۶۰ء میں مشہور جرمن مستشرق نولائی نے قرآن مجید اور تیسرے سال سیرت پاک پر اپنی

سارہات شائع کیں۔

۱۸۸۳ء میں ڈاکٹر کراہل نے پنزک سے سیرت نبویؐ پر ایک علمی تصنیف شائع کی۔
۱۸۹۶ء میں علی گڑھ کالج کے پروفیسر ڈاکٹر ازلہ نے اپنی مشہور کتاب ”پریچنگ آن اسلام“
ویسٹ منسٹر سے شائع کی۔

۱۹۰۶ء میں پروفیسر مارگریٹ نے اپنی کتاب ”محمد“ شائع کر دئی۔

جس طرح تورات و اناجیل میں انبیائے بنی اسرائیل کے متعلق بہت سی لغو اور شرمناک روایات
منقول ہیں اسی طرح آنحضرتؐ کی سیرت کے متعلق ہمارے قدیم ماخذ کتب منغازی و سیر میں ویسی ہی روایات
مندرجہ تھیں۔ ان کا ذیبا باطلہ کو جنہیں مورخین ما بعد نے تقلید نقل کر دیا۔ سترتین یورپ نے
تقسیم رسول اور تنمیک اسلام کے لیے ایک سہل الوصول ذریعہ سمجھ کر خوشی سے تسلیم کر لیا اور پھر اپنے
نقدیہ نام سے رائی کا پہاڑ بنا دیا اس لیے ہم پہلے ان قدیم ماخذوں اور ان کے مفسرین پر نظر ڈالتے ہیں۔
قرآن مجید سیرت رسول اللہؐ کا سب سے پہلا ماخذ ہے۔ اس کی ۱۱۴ سورتوں میں آنحضرتؐ کے
ابتدائی حالات، بعثت، عہد رسالت کی تعلیمات، خانگی زندگی اور غزوات جتہ جتہ مذکور ہیں
منغازی اور سیر کا یہ سب سے پہلا ماخذ رسول اللہؐ کی حیات ہی میں ۲۳ سال کے اندر حفظ
اور تحریر دونوں ذریعے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ آپؐ کی وفات کے ایک سال بعد حضرت ابو بکرؓ نے پورا
قرآن مجید ایک کامل نسخے میں قلم بند کروا لیا، جس کی چھ نقلیں حضرت عثمانؓ نے ۲۵ء میں بلاد اسلامیہ
میں بھیج دیں۔ پچاس سال تک یہی قرآن تھا جس میں سیرت رسول اللہؐ کا مطالعہ ان آنکھوں سے ہوتا
رہا جنہوں نے پیکرِ قدسی کو اس عالم رنگ و بو میں چلتے پھرتے دیکھا تھا۔

اس کے بعد سیرت پاک پر طب و یابس روایات کا پردہ پڑنے لگا۔ اس خرابی کی ابتدا عبدالملک
ابن مروان کے عہد سے شروع ہوئی جو ۷۵۰ء میں حضرت عبداللہ ابن زبیر کو کعبے میں شہید کر کے
ذیلے اسلام کے سیاہ و سفید کا منتقل حاکم بن بیٹھا۔ عبدالملک بحیثیت ایک حکمران بڑا بیدار مغز اور تدبیر
تھا۔ اس نے اسلام کی دنیاوی سلطنت کا پایہ مضبوط کیا۔ دفتر سلطنت کو سب سے پہلے عربی زبان میں منتقل

کیا اور اپنا مکہ (درہم و دینار) قلمروئے اسلام میں جاری کیا۔ چونکہ سلاطین میں شاہی خاندان کی تاریخ لکھنے کا

کاد تو تھا۔ مغازی کی طرف توجیہ کی اور حضرت عروہ بن زبیر کو جو حضرت عائشہؓ کے تربیت یافتہ اور بیت نبوی کے عالم تھے خطوط لکھ کر واقعات جمع کرنے شروع کیے۔ بعضوں کا قول ہے کہ عروہ نے فن مغازی میں سب سے پہلی کتاب لکھی۔ اسی زمانے میں مشہور محدث زہری پیدا ہوئے جنہوں نے فن مغازی میں تصنیف کا سلسلہ قائم کیا۔

زہری کا نام محمد بن مسلم تھا۔ قریش کے قبیلہ بنی زہرہ سے تھے۔ زہری ۵۵ھ میں پیدا ہوئے ہشام ابن عبدالملک نے جو ۷۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ زہری کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کیا تھا وہ دربار داری کی برائیوں سے بچ کر شہر حدیث اور خدمت دین میں مصروف رہے زہری کا انتقال ۱۲۳ھ میں ہوا۔

محمد بن اسحاق کے دادا ایسا کہ حضرت ابو بکرؓ کے عہدِ خلافت میں خالد بن ولید نے شہر انبار کے ایک مقام عین التمر سے گرفتار کیا تھا۔ جب سے ان کا خاندان مدینہ میں قیس مطلبی کے موالیوں میں داخل ہو کر رہنے لگا۔ ان کی ولادت کی تاریخ معلوم نہیں۔ ابتدائی زندگی مدینہ میں طلب علم میں گزاری مگر امام مالک سے جو ان کے ہم عصر تھے، مخالفت ہو جانے سے سیاحت اختیار کی۔ ان کو آثار و سیر کا شوق تھا اور اس شوق میں وہ مسلم اور غیر مسلم سب کی روایات لے لیتے تھے۔ امام مالک نے ان کے تعلق سے کہا تھا۔

”دجالوں میں سے ایک دجال کو دیکھو“

مدینہ سے نکل کر ۱۱۹ھ میں ابن اسحاق اسکندریہ پہنچے پھر کوفہ، جزیرہ اور رے میں پھرتے پھرتے آخر بغداد میں سکونت اختیار کی۔ سفاح کے بعد اس کا بھائی منصور ۱۳۶ھ میں تخت نشین ہوا، اس نے عباسیوں کی حکومت کی عمارت ایسی مستحکم کر دی کہ چھ سو برس تک قائم رہی۔ وہ مدبر، مقنن اور علم دوست تھا۔ اس کی سرپرستی میں ابن اسحاق نے اپنی وسیع معلومات اور مجموعہ روایات کو قلم بند کرنا

شروع کیا۔ اس وقت تک سیرت نبوی پر کوئی مستقل اور مفصل کتاب نہیں تھی۔

قرآن مجید اگرچہ حضور کے خالقِ عظیم اور اسوہ حسنہ کا آئینہ تھا لیکن اب تفسیر اور شانِ نزول کی تشریح کا محتاج تھا۔ اسلام کی فتوحات میں سے اندلس تک اور نومسلموں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی، جن میں یہود و نصاریٰ، مجوس سب ہی تھے۔ حضرت موسیٰ کے منادی و سیر کتب ہمدانی میں اور حضرت موسیٰ کے حالات انابیل میں موجود تھے۔ زرتشت اور بزرگانِ عجم کی داستانیں، اساطیر اور پہلوی کتابوں میں متداول تھیں جن میں سے بعض کا عربی ترجمہ بھی ہو چکا تھا۔

ہشام ابن عبد الملک کے میسنجی جیل بن سالم نے ۱۱۳ھ میں عجم کی ایک مفصل اور مبسوط تاریخ کا ترجمہ کیا تھا جس میں سلاطین کی تصاویر بھی ان کی خاص وضع قطع، زیور و لباس کے ساتھ شامل تھیں، اسی طرح عبد اللہ بن المقفع نے جو پہلوی کا عالم اور عربی کا مستند استاد تھا، منصور کے عہد میں ایران کی ایک دوسری مفصل اور مقبول کتاب السیر خدائی کا ترجمہ کیا تھا جس کا نام تاریخ ملوک الفرس رکھا غرض کہ گرد و پیش کے یہ حالات تھے جب کہ ابن اسحاق نے منصور کو قدر داں اور مہربان پاکر سیرت نبوی دو حصوں میں لکھی۔

۱۔ کتاب البداء و قمع الانبیاء ۲۔ کتاب المغازی

مگر یہ قابلِ قدر کتاب مدت ہوئی منقود ہو گئی ہے۔ ہاں ابن ہشام نے جس طور سے اس کو مرتب کیا اور طبری نے جو اقتباسات اپنی تاریخ میں نقل کیے وہ موجود ہیں۔

ابن اسحاق اگرچہ جدت تحریر، طرزِ ادا اور جامعیت کے لحاظ سے سیرت نبوی کے پہلے مصنف اور امام المغازی کہلاتے، چونکہ اکثر منقطع روایات اور اہل کتاب کے باطل اقوال اور سیکڑوں اشعار جن میں بہت سے جعلی ہیں کتاب کو دلچسپ بنانے کے لیے درج کر دیتے اس لیے فنِ حدیث کے ثقہ علماء کی نظروں سے گر گئے۔ اگرچہ بعضوں نے تعریف بھی کی ہے۔ محدث دارقطنی (وفات ۳۸۵ھ / ۹۹۵ء) نے خوب فیصلہ کیا ہے۔

”وحدیث میں صالح ہے میسرے نزدیک اس میں کوئی برائی نہیں سواتے اس کے کہ

وہ سیرت میں منسکر اور منقطع بائیں اور جھوٹے اشعار ملا دیا کرتا تھا۔

واقعی ابن اسحاق نے ایک ایسا نسخہ گلاب تیار کیا تھا جہاں پھول چننے کے لیے کانٹے ہٹانے کی ضرورت ہے۔ انہیں کانٹوں کو مخالفین اسلام زہرا لود کر کے چبوتے ہیں۔ ابن اسحاق نے یہودی خبیث اور اس کی اولاد کے اقوال نقل کیے۔ ابو جہل اور عقبہ وغیرہ کفار قریش کے جو مرثیے مکہ میں لکھے گئے تھے، ان کو بھی نقل کیا۔ مرثیوں میں کس قدر اور کس طرح جذبات برانگیختہ کیے جاتے ہیں یہ سب پر ظاہر ہے۔ لیکن ابن اسحاق کی یہ ریانت تھی کہ سیرت پاک لکھتے وقت مخالفین کے اقوال کے سیاہ بادل بھی دکھادیتے تاکہ آفتاب حقیقت اور زیادہ تاباں ہو جائے۔

محمد ابن عمر الواقدی بھی بنی ہشام کے مولیوں میں ہے۔ ۱۳۰ھ، ۱۳۱ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوا اور وہیں علم دین حاصل کیا۔ ان کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ پچاس سال کی عمر میں بغداد آیا جو اس وقت ہارون الرشید کی علم دوستی اور قدر شناسی کے باعث علم و فضل کا مرکز تھا۔ واقدی نے وہیں سکونت اختیار کی اور جب مامون الرشید کا زمانہ آیا اور خراسان سے وہ بغداد میں داخل ہوا تو واقدی کی بڑی قدر کی اور جانب شرفی کا قاضی مقرر کیا۔ جہاں انہوں نے تادم مرگ اس عہدہ پر فائز رہ کر ۲۰۷ھ میں انتقال کیا۔

انہوں نے سیرت میں کتاب المغازی لکھی ایک اور کتاب الردۃ جس میں آنحضرت کی ذنات کے بعد مرتدین عسکر کے حالات قلم بند کیے۔ فتوحات اسلامی کی بھی تاریخ لکھی۔ غرض کہ واقدی نقل روایات کا ایک دریائے ذخائر تھا لیکن ساتھ ہی سیرت پاک میں جس بے اعتیادگی سے انہوں نے رطب دیابس کو مخلوط کر کے واقعات تحریر کیے وہ ان کے دامن علم پر ایک بد نما دافع ہے، یہی وجہ تھی کہ ائمہ دین نے ان کو سخت الفاظ میں یاد کیا۔ امام احمد حنبل نے ان کو کذاب کہا اور امام بخاری نے متروک الحدیث۔ نسائی نے کہا کہ رسول اللہ پر جھوٹ بولنے والوں میں مدینہ میں واقدی تھا اور خراسان میں متعاف بن سلیمان۔ حالانکہ متعاف کو امام المفسرین کا بھی لقب دیا گیا ہے جن کا انتقال ۶۵ھ میں ہوا واقدی کے اکاذیب باطلہ کے جھوٹے موتیوں کو ششترتین نے ایک بیش بہا تاج بنا کر اپنی تحقیق

کے سہ پر رکھ لیا ہے۔

محمد بن جریر الطبری طبرستان کے کوہستانی مقام اہل میں ۲۲۴ھ / ۸۳۸ء میں پیدا ہوئے
تعمیل علم کے شوق میں بغداد گئے۔ پھر شہم و منہر کا سفر کیا اور حدیث، تفسیر، فقہ اور تاریخ میں خاص طور
سے کمال حاصل کیا۔ ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔ تاریخ الامم اور تفسیر ابن جریر دونوں ضخیم اور بیسوط تصانیف
ان کے بے مثل عملی کارنامے ہیں جو قیامت تک یادگار رہیں گے۔

طبری کا شمار ائمہ مجتہدین میں ہے۔ ابن خلکان نے ان کی تاریخ کو اصح تاریخ کا لقب دیا
ہے۔ نقل روایات میں نہایت ثقت تھی۔

طبری کی یہ حرکتہ آثار تاریخ اس قدر مقبول ہوئی کہ مشہور مؤرخین مابعد ابن اثیر، ابن خلدون، ابوالندا
کی تاریخیں سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ طبری نے عمر کے ۸۶ مرتلے طے کر کے ۳۱۰ھ میں بغداد میں انتقال
کیا۔ (

عرب اور اس کے لوگ

سنہ ۶۳۲ء میں مسیحیوں اور یہودیوں کا تھا۔ عرفات کا میدان تھا۔ ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے کوئی اونٹ پر سوار تھا تو کوئی زمین پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ مصلح صاف تھا۔ سورج اپنی منور شعاعوں سے لوگوں کے لیے فیض کا سامان فراہم کر رہا تھا۔ عرفات کے اطراف پہاڑیاں ہی پہاڑیاں تھیں، ان پہاڑیوں کے درمیان ساری دنیا سے الگ تھلگ ایک اجتماع اپنے مخصوص مشاغل میں منہمک تھا۔ اللہ کا ایک بندہ اونٹ پر لگے بڑھتا ہے۔ تھوڑی سی بلندی پر اپنا اونٹ لے جاتا ہے، میانہ قدر، ریش مبارک میں چند سفید بال، زلف سیاہ میں بھی کچھ سپیدی کے آثار، آنکھیں شاید عرب کی گرمی کی وجہ سے سرخ، چہرہ کشادہ، مسکراتے تو ایسے جیسے فضا مسکرا رہی ہو اور جاذبِ نظر اتنا کہ ہر ایک کا دل موہ لے۔

اونٹ پر بیٹھنے والا اب اس اجتماع سے مخاطب ہے جو اس کے ارد گرد ہے۔ مخاطب یوں ہوتا ہے کہ آپس میں شہ و سکر کی طرح مل جل کر رہو۔ اپنے ہمسایوں کے حقوق کی حفاظت اور نگرانی کرو، ان کی جائداد اور ان کی عزت و آبرو کا ہمیشہ خیال رکھو۔ آپس کی دشمنی اور آپس کے اختلافات کو بھول جاؤ۔ عربی اور عجمی میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ استحصال چاہے کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو بہر حال ختم ہو جانا چاہیے۔ عورتوں کا پورا پورا خیال رکھو۔ ان عورتوں پر مہربان رہو جن کی ذمہ داری خدائے تعالیٰ نے تمہارے سپرد کر رکھی ہے۔ ان کے لیے جن کے تم ذمہ دار ہو ضروریاتِ زندگی کی

کفالت کرتے رہو۔ میں تمہارے درمیان خدا کی کتاب قرآن پھوڑ رہا ہوں۔ اگر تم اس کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامے رکھو تو خدا تم کو کبھی گمراہ نہیں کرے گا۔ اس کے بعد مجمع سے پوچھا جاتا ہے کہ کہو کیا میں نے اپنے مشن کی تکمیل کر دی ہے؟ کیا میں نے اپنے مشن کو پورا کر دیا ہے؟ مجمع سے جواب ملتا ہے کہ ہاں آپ نے اپنے مشن کی تکمیل کر دی ہے۔

لوگوں سے یہ جواب ملنے پر مجمع کو مخاطب کرنے والے نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور فرمایا "خدا یا تو بھی گواہ رہو" تین بار اپنے اسی جملے کو دہرایا۔ ایک لمحے کے لیے عرفات کے میدان پر سناٹا چھا گیا اور اس کے بعد ایک تہہ اور حبشی نے نماز کے لیے اذان رینی شروع کر دی۔

وہاں کے اس پیغمبر نے اپنے آخری پیام کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے حج کے دن کا انتخاب کیا تھا۔ آپ نے اپنے مشن کی تکمیل کر دی۔ اس واقعہ کے تین مہینے بعد رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ جس نئے نظام اور نئے عقیدہ کی شمع آپ نے لوگوں کے سینوں میں روشن کر دی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کے ماننے والے ریگستان سے نکل کر اب دنیا پر خدائی حکومت قائم کرنے کے خواہاں نظر آنے لگے۔

جزیرہ نمائے عرب تین طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے۔ مغرب میں بحر احمر ہے مشرق میں خلیج فارس اور جنوب میں بحیرہ عرب پہاڑوں کی ایک لمبی قطار ہے جو مشرقی جانب بڑھتی چلی گئی ہے اس کا دو تہائی حصہ عدن سے ہوتے ہوئے مسقط کی جانب چل نکلا ہے۔ دوسری طرف حجازی پہاڑوں کا سلسلہ شمال کی طرف بڑھتا چلا گیا اور موجودہ اردن، شام اور لبنان سے ہوتے ہوئے بحیرہ روم کے مشرقی کونے تک پہنچ گیا۔

بارش کے لیے آسمان پر بادل عموماً دوسرخ سے آتے ہیں۔ ایک تو اٹلانٹک اور بحیرہ روم کی طرف سے جس کا سلسلہ نومبر سے مارچ تک چلتا رہتا ہے۔ دوسرا دسرخ بحیرہ ہند کی طرف سے جس کی وجہ سے جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی ساحلوں پر بارش ہوا کرتی ہے۔

بدقسمتی سے اردن، شام، لبنان اور فلسطین کے پہاڑی سلسلے ان بادلوں کو جو بحیرہ روم کی طرف سے آتے ہیں عرب کے اندر جانے سے روک لیتے ہیں۔ بحیرہ ہند سے آنے والے بادلوں کی مزاحمت

جنوبی عرب کے پہاڑ کرتے ہیں۔

چونکہ مغرب اور جنوب دونوں طرف سے بادل عرب کے اندر داخل نہیں ہونے پاتے اس لیے سارے عرب میں بہت ہی کم بارش ہوتی ہے۔ میلوں ریگستان ہی ریگستان نظر آتا ہے۔ بارش کی کمی زراعت پر اثر انداز ہوتی ہے بہت ہی کم حصے زراعت کے قابل ہیں۔ لوگوں کی معیشت کا دار و مدار جزوی طور پر زراعت پر ہے اور جزوی طور پر کھجوروں کے درختوں پر۔ جانوروں کی رکھوالی اور عام چیزوں کی خرید و فروخت بھی ان کی معیشت کا جزو ہیں۔

سارے عرب میں مختلف مقامات کی تقسیم کی بنیاد یا تو وہ ریگستان ہیں جو ان مقامات کے درمیان مائل ہیں یا وہ پہاڑ ہیں جو دو مقامات کو ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ جہاں بارش ہوتی ہے وہاں وقتی طور پر بڑھ اگ جاتا ہے۔

اس لقی و دق ریگستانی محسوسہ کے مختلف حصوں میں اب بھی وہ خانہ بدوش قبائل مل جاتے ہیں، جن کا رہن سہن آج سے تیرہ سو سال قبل جیسا ہے اس قسم کے قبیلے اب بھی ان ہی خیموں میں قیام کرتے ہیں جن کو ان قبائل کی عورتوں نے اپنے جانوروں کے بالوں سے بنا ہے۔ وہ اب بھی اپنی بکریوں کے دودھ پر گزارا کرتے ہیں۔ اپنے ملائے کے کھجور کے درختوں سے کھجور توڑ کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ اپنے جانوروں کے بالوں یا نمڈوں کے عومن اگر کبھی آٹا اور چادل مل جائے تو خوشی سے لے لیتے ہیں اپنی بکریوں کے بالوں یا نمڈوں سے جو چیزیں وہ بنا سکتے ہیں بنایا کرتے ہیں اور ان کے عومن کوئی اور کام کی چیز بنا دے لے لیتے ہیں۔ اب بھی ان کا گزارہ اونٹوں، بھیڑوں اور بکریوں کی نگہداشت پر ہوتا ہے تیل بھی وہ نکال لیتے ہیں۔

عرب میں بارش کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کبھی ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی۔ کہیں ہوتی ہے کہیں نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ سے وہ قبائل جن کی معیشت کا دار و مدار بھیڑوں، بکریوں اور اونٹوں کی نگہداشت پر رہتا ہے ان کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے جانوروں کے ساتھ آج کہیں رہیں اور کل کہیں۔ جہاں جانوروں کے لیے چارہ ملنے کے امکانات نظر آتے ہیں وہاں وہ منتقل ہو جاتے ہیں۔ جب تک

ان کے جانوروں کو وہاں چار اہتار ہے گا وہیں رہیں گے۔ جب چار ختم ہو جائے گا دوسری منزل کا مسخ کریں گے۔ مناسب جگہ کی تلاش کے لیے خانہ بدوش قبائل کے رضا کار ہمیشہ گھومتے پھرتے رہتے ہیں جب بھی ان رضا کاروں میں سے کسی ایک کو بھی ایسی جگہ نظر آجائے جہاں ان کے جانوروں کے دانہ پانی کا انتظام ہو سکے وہ اپنے قبیلہ کو فوری اطلاع کر دے گا۔ سارا قبیلہ مو اپنا ساز و سامان اور جانوروں کے سخی تلاش کر دے جگہ پر اپنا ڈیرہ ڈال دے گا۔

برخانہ بدوش قبیلے کی یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ اپنے لیے ایک وسیع علاقہ مخصوص کر لے جہاں پر وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تیار کر سکے۔ بارش کی کمی بیشی ان کے لیے کسی بھی قسم کی پابندی کو عملاً باقی نہیں رکھتی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قبیلہ جو علاقہ اپنے لیے مختص کر لیتا ہے وہاں سال بھر بدوش کو ایک تھوڑی سی نہیں پڑتا جس کی وجہ سے ان کے جانوروں کی زندگی جو خود ان کی زندگی کا باعث ہوتی ہے خطرے میں پڑ جاتی ہے اور یہ نقل مقام شروع کر دیتے ہیں۔ کئی سو میل دور جا کر اتفاق سے اس علاقہ میں پہنچ جاتے ہیں جو کسی اور قبیلے نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ دونوں قبیلوں میں رقابت اختلاف اور شائبگی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

(خانہ بدوش قبائل کے آپس کے امتحانات اور ان کی رقابتیں اور ان کے آپس میں جھگڑے خانہ بدوش زندگی کا ایک اعلیٰ حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ ان باتوں کو ان کی عملی زندگی سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اس قسم کی رقابتیں اور ایک دوسرے سے دشمنی کا اظہار ایک دوسرے کے جانوروں کو چھڑانے سے شروع ہوتا ہے۔ کبھی ایک قبیلہ کے لوگ دوسرے قبیلے کے جانوروں کو غائب کر دیں گے تو کبھی دوسرے قبیلے کے لوگ پہلے قبیلے کے جانوروں کو کاٹ کھائیں گے۔ یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ پھر سے کہیں نہ کہیں بارش نہ ہو جائے اور ان کے جانوروں کے لیے چارہ تیسر نہ ہو جائے۔

اس کے باوجود اس قسم کی رقابتیں ان خانہ بدوشوں میں نفرت کا جذبہ اتنا زیادہ نہیں پیدا کرتیں جتنا آج کل کی تمدن یافتہ اور نہ زہیب سے آراستہ قومیں ایک دوسرے کے خلاف پیدا کرنے میں کامیاب

نظرائی ہیں۔

خانہ بدوش زندگی گزارنے کے باوجود بھی ان خانہ بدوشوں کو اپنی عزت کا پورا پورا احساس ہوا کرتا ہے۔ وہ اپنی خودی کے محافظ اور انسانیت کی عظمت کے عکاس نظر آتے ہیں۔ قناعت ان کی زندگی کا شمار ہے۔ اپنی قناعت پسندی میں وہ مست ہیں۔

مصر، شام اور عراق کی زرین زمینیں ہمیشہ حملہ آوروں کی لالچی نگاہوں کا مرکز بنی رہیں بہت سی اقوام اور بہت سے مذاہب کے لوگ ان ممالک پر قبضہ کرتے رہے۔ ان علاقوں میں اپنی زندگی کی بنیادوں کو استوار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مقامی لوگوں سے باہر آنے والوں نے شادی بیاہ کیا۔ ان علاقوں کی اولاد مخلوط النسل ہونے لگی۔ باہر سے آنے والوں میں آریہ بھی تھے، سامی بھی، افریقی، ترک اور ایرانی بھی۔

مصر کے عرب میں کوئی بات ایسی نہیں تھی جو حملہ آوروں کے لیے کشش کا باعث بنے اس لیے یہ حصہ باہر والوں کے حملوں سے بچا رہا۔ نتیجے کے طور پر اس علاقہ کے لوگ خالصتاً عرب ہی رہے ان کی نسل میں کسی قسم کا کوئی اختلاط نہ ہو سکا۔

تمام دنیا سے الگ تھلگ رہنے والی یہ عرب قوم اپنی تہذیب و ثقافت میں بھی تمام دنیا سے الگ تھی۔ اس کی اپنی تہذیب تھی۔ اس کے اپنے رسم و رواج تھے۔ دوسری تہذیبیں نہ وہاں پہنچ سکیں اور نہ ہی ان عربوں نے دوسروں کی تہذیب کو اپنانے کی کبھی کوشش کی۔

لبنان و صحرائیں کھڑے ہوئے تمام دن جانوروں کی مگرانی کرنا ان کے لیے یقیناً ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ کا باعث بنتا تھا۔ اسی تھکاوٹ کو دور کرنے شاید وہ قبیلہ داری جنگوں میں حصہ لیتے تھے۔ یہ جنگیں ان کی زندگی کی عظمت کے اظہار کا ذریعہ ہوا کرتی تھیں۔ ان کی آپس کی قبیلہ داری جنگوں کا مقصد ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا آتسا نہیں ہوتا تھا جتنا ان جنگوں سے اپنی بہادری اور شجاعت کی داد حاصل کرنا، ہمت، ہوانمردی اور شجاعت کی داد جب ہی مل سکتی ہے جب کہ چند ایسے اصول بھی وضع کیے جائیں جن پر عمل کرتے ہوئے وہ اپنے بہادریہ صفات کا مظاہرہ کر سکیں۔ اسی شخصی اور خاندانی عظمت

کے اظہار کے لیے یہ لوگ رضا پرانہ طور پر چند قوانین کی پابندی بھی سختی سے کرتے تھے۔ مثلاً دھوکہ دینا یا کسی کو دھوکہ سے مارنا ان کے ہاں شرم انگیز بات تھی۔

(اگر دو قبائل کو آپس میں جگ جگ کرنی ہوتی تھی تو وہ ایک دوسرے کو بہت پہلے دن، تاریخ، بیٹے اور تمام اور جتنی کر دقت تک سے مطلع کر دیتے تھے تاکہ حربیت مقابل بھی مقابلہ کے لیے تیار رہے۔ کبھی بھی قبیلے کے لیے یہ بات انتہائی شرمناک تھی کہ وہ بغیر اطلاع دیتے اپنے دشمن کو کسی بھی قسم کا کوئی نقصان پہنچانے ان کی آپس کی جنگوں کا مقصد فتح نہیں ہوتا تھا بلکہ عزت کا حصول تھا۔ ان کے ہاں فاسمانہ امن ایک نہیں تو بات تھی۔ عزت کا حصول ان کی زندگی کا مہم جوئی نظر تھا۔ جدوجہد اور اضطراب کو وہ جمود کی زندگی پر ہزار بار ترجیح دیتے تھے۔)

خانہ بدوش بدویوں کے لیے شاعری ان کی زندگی کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ وقت ان کے لیے اللہ کی دین تھا۔ کام کرنے کو کم تھا۔ زندہ رہنے کے لیے وقت زیادہ تھا۔ قدرت نے ان کو سحرانگیز زبان دی تھی۔ اسی شیریں زبان میں وہ اپنے پیش روں اور بزرگوں کے کارناموں کو شاعر کی صورت میں ڈھالتے تھے۔

جنگوں سے ہٹ کر ان لوگوں کو جو چیز سب سے زیادہ عزیز تھی وہ اعترافِ حقائق تھا۔ اپنے بزرگوں کی خصوصیات جیسے فیاضی، سخاوت، مہمان نوازی، میزبانی، بہادری اور کمزوروں کی حمایت پر نازاں ہوا کرتے اور بر ملا اس کا اعلان، اعتراف اور ان خصوصیات کو اپنانے کی کوشش کرتے۔ بلاشبہ مہمان نوازی اور صحرائی زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ دنیا کا کوئی سیاح شاید ہی ایسا گزرا ہو جو ان ملائوں سے گزرا ہو جہاں قبائلی باشندوں کے ڈیرے پڑا کرتے ہیں اور وہ ان کی خاطر مدارات سے نوازا گیا ہو۔

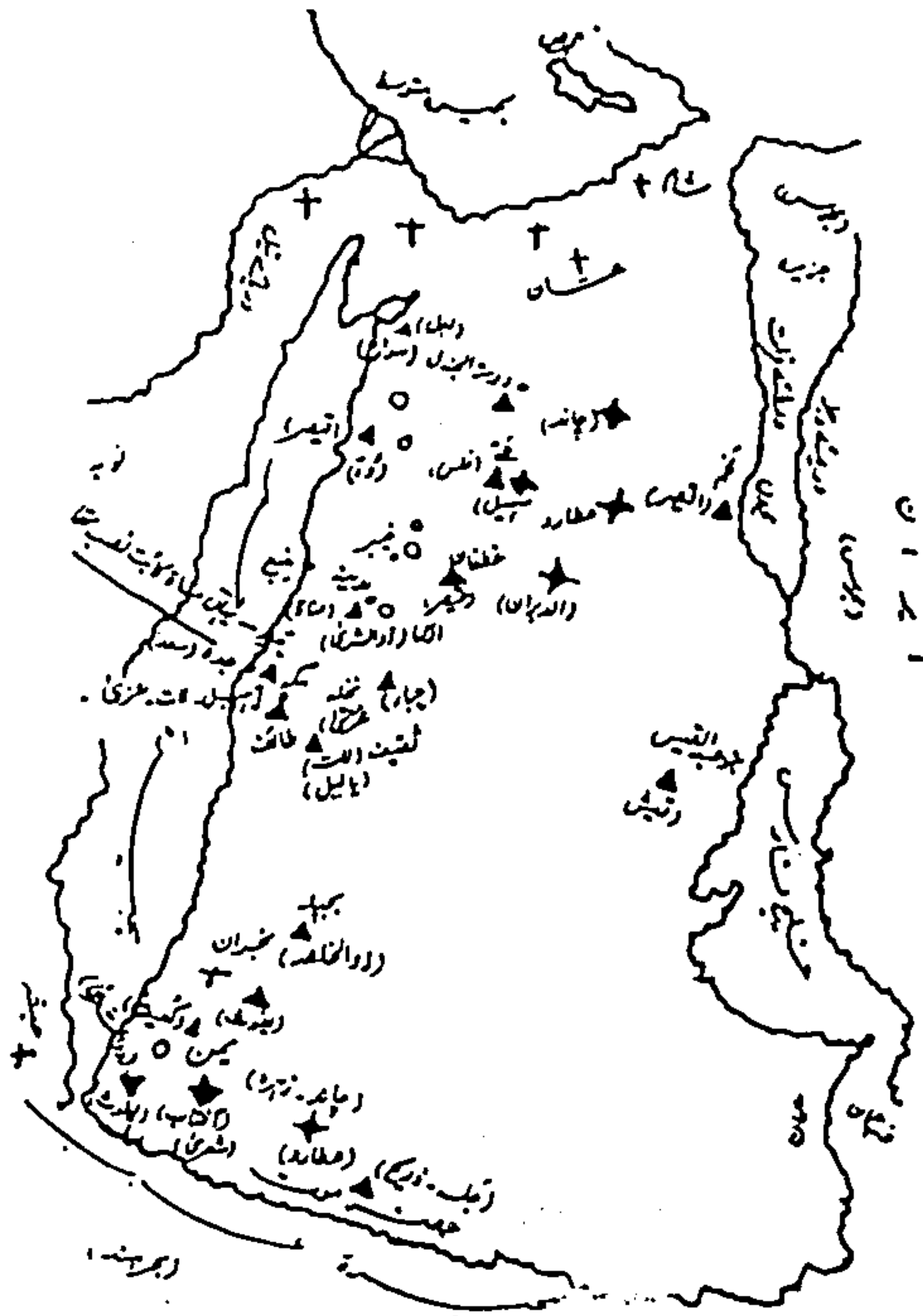
امن کی حالت ہو یا جنگ کی، خوش مالی ہو یا تنگ دستی، ان قبائلیوں کا دستور رہا ہے کہ اپنے مہمان کی تواضع نہ صرف کھلانے پلانے سے کریں بلکہ شاعری سے بھی اپنے مہمان کو لطف اندوز کریں خوشی کے موقع پر قبیلہ سے پڑھے بتائیں گے۔ جنگ کے موقع پر رزمیہ ہو گا۔ غم کے موقع پر مرثیہ۔ خوشی کا

جزیرۃ العرب

بعثت کے وقت مذہبی حالت

▲ بت پرستی + ستارہ پرستی ○ یہودیت
+ عیسائیت

جمہوروں اور ستاروں کی پوجا بہت ہی ان کے مذہبوں میں
میں تھی



موقع ہو یا فم کا، جنگ کی حالت ہو یا امن کی ہر موقع پر شاعر اپنے فن کا اظہار کرتا رہتا رہے گا اور فن کار کے فن کی قدر کی ہاتھ رہے گی!

مصراتے عرب کی غربت نے اس بات کا کبھی موقع ہی نہیں دیا تھا کہ وہاں کوئی مستحق حکومت قائم ہو۔ نہ تو پولیس تھی اور نہ ہی قانون کی نگرانی۔ طاقتور کمزور پر حکمرانی کرتا تھا۔ طاقت در قبیلوں نے آپس میں اشتراک کر کے ایک ایسی مشترکہ طاقت کی بنیاد ڈالی جس نے کمزوروں کا تحفظ اپنا ذمہ لیا۔

جب تک فرد کا تعلق قبیلے سے رہا اس کی عزت و ناموس محفوظ رہی۔ جیسے ہی اس کا تعلق قبیلے سے قطع ہو اور وہ بیچارہ لوہیں کا نہ رہا۔

بہتر کمزوروں کی حمایت قبیلوں کا قومی شعار رہا ہے اس لیے اگر کوئی فرد اپنے قبیلے سے کٹ جاتا ہوتا تو وہ کسی اور قبیلے کا دامن تمام لیتا۔ اگر دوسرے قبیلے والے اس کی درخواست کو قبول کر کے پناہ دے دیتے تو پھر اس کی زندگی محفوظ ہو جاتی تھی۔ جس کو پناہ دی جاتی تھی اس کی عزت و آبرو کی حفاظت ہر قیمت پر کی جاتی تھی۔ چاہے اس کے لیے پورے قبیلے پر بھی آفت کیوں نہ آجائے۔

خونی رشتے کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ خاندان اور قبیلے کے ہر فرد کی عزت و عظمت اور مصمت کو سارا خاندان اپنی عزت سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خاندان کے سارے افراد خونی رشتے کی وجہ سے محفوظ سمجھے جاتے تھے۔ خاندان کے ایک فرد کو بھی نقصان پہنچانا پورے خاندان کو مخالفت کی دعوت دینا ہوتا تھا۔ خونی رشتے افراد کے جان و مال کی مکمل حفاظت کا باعث بنتے تھے۔ اگر کسی خاندان کے ایک بھی فرد کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچتا تھا تو پورے خاندان والوں پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ جس خاندان کے فرد نے ظلم و زیادتی کی ہے اس خاندان کے کسی بھی فرد کے ساتھ بدلہ لیں۔ اسی لیے ظالم چاہے کتنا ہی امیر کیوں نہ ہو، جسمانی طور پر کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو، بہترین ہتھیاروں کا مالک کیوں نہ ہو، اس کی یہ مجال نہیں ہوتی تھی کہ دوسرے قبیلے کے غریب سے غریب آدمی کو بھی کسی قسم کا نقصان پہنچائے، وہ جانتا تھا کہ اس کے ظلم کا بدلہ بہر حال یا تو اس کی ذات سے لیا جائے گا یا اس کے خاندان کے کسی اور فرد سے۔

ظلم کا موازنہ بھاری جرموں کی صورت میں لیا جاتا تھا بشرطیکہ مظلوم یا اس کے قریبی رشتہ دار

اس بات کے لیے راضی ہوں۔ اگر مقتول کے رشتہ دار معاوضے کے لیے تیار ہوں... تو انہیں اس بات کا اختیار تھا کہ ظالم سے اس کے ظلم کا پورا پورا انتقام لیں جس میں ظالم نے موت بھی شامل ہو سکتی تھی۔ بہادری، شجاعت، سخاوت، مہمان نوازی اور غریب کی حمایت۔ یہ وہ خصوصیات تھیں جو عربوں کے غیر میں تھیں جہاں جہاں عرب گئے اپنی ان قومی خصوصیات کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اسپین، فرانس، ہسپانی اور دنیا کے دیگر خطوں میں جہاں بھی عربوں کے قدم پڑے اپنی قومی خصوصیات کے ساتھ پڑے۔

ایک عرب کے لیے یہ بات قابل فخر رہتی ہے کہ وہ اپنی عزت نفس کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے۔ اس سلسلے میں اُس کی کوتاہی خود اس کی اپنی نظر میں تحقیر اور ذلت کا باعث بنتی ہے۔ خطاؤں سے درگزر کرنا بنیادی طور پر بیعت کی تعلیم ہے۔ قدیم یونانیوں کی طرح عربوں کا بھی اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ دوستوں کے ساتھ دوستی اور دشمنوں کے ساتھ دشمنی۔ دوستوں کے ساتھ مہربانی اور مہارت اور دشمنوں کے لیے دوڑھاری تلوار۔

ان کے نقطہ نظر سے آدمیوں میں آدمی وہ ہے جو پہلے یہ سوچتا ہے کہ دشمن کو نقصان اور اس کے بعد دوست کو فائدہ کس طرح پہنچایا جا سکتا ہے۔ بددیوں کی بہادری کو وحشیانہ پن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بددیوں کا اپنا نظم و نسق ہے۔ انصاف اور حقوق کی ادائیگی یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

بدوی اپنی عظمت کو شاعری میں پوشیدہ کرتے آتے ہیں۔ ہمیشہ وہ نعمت ان کی زبانوں پر جاری رہتے ہیں جن میں ان کی اپنی عظمت کی داستانیں بھری پڑی ہیں۔ شاعری کا مرکز ان کی اپنی جنگیں رہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی شاعری میں مہمان نوازی، محبت اور دلنوازی کا بھی ذکر کرتے ہیں بدوی عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ وہ ان پابندیوں سے آزاد ہیں جو عام طور سے مسلم عورتوں کے تعلق سے منسوب ہیں۔ عشق و محبت کے دام میں یہ بھی گرفتار ہوتی ہیں۔ خصوصاً چھٹی صدی عیسوی میں بدوی عورتیں اپنی آزادی اور خودداری میں اپنا ایک مقام رکھتی تھیں۔ بیوہ عورتیں آزادی کے ساتھ اپنے علیحدہ خیموں میں قیام کرتی تھیں۔ جن کا وہ اپنے پاس آنا جانا پسند کرتی تھیں ان کو اس بات کی اجازت

بھی تھی۔

ریگستان کے شاداب علاقوں میں رہنے والے رجعتوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ ایک ترقی یافتہ پیشہ اور دوسرے تجارت پیشہ۔ چونکہ عربوں کی عام غذا کھجور تھی اس لیے اکثر زراعت پیشہ کھجوروں کے درخت پر گزر رہے کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کھجور سے۔ کچھ ترکاریاں بھی ان کے باغوں یا کھیتوں میں لایا کرتی تھیں۔ اپنے مویشیوں کے لیے چارہ بھی ان کو اگا نہ پڑتا تھا۔ فلہذا کاشت بھی تھوڑی بہت ہو جاتی تھیں۔ طائف انگوروں کی کاشت کے لیے مشہور تھا۔ زراعت آب پاشی کی کمی تھی پانی صرف کنوؤں سے دستیاب ہوتا تھا۔ زراعت کے علاقے بھی بہت ہی مخصوص ہوا کرتے تھے۔

زراعت پیشہ عام طور سے قبیلہ واری جنگوں میں یا آپس کی لڑائی میں حصہ نہیں لیتے تھے لیکن جنگوں میں حصہ لینے والوں کے قیام و طعام کا بندوبست ضرور کر دیتے تھے۔ زراعت پیشہ بہت ہی منفی قسم کے لوگ تھے۔ لین دین میں بہت ہی محتاط رہا کرتے تھے۔ ان کی اپنی مہمان نوازی میں بے حد شان و شوکت کے اقدار پسندی کا عنصر زیادہ نمایاں ہوا کرتا تھا۔ اکثر زراعت پیشہ اپنے قبیلہ اور خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے پاس خونی رشتے کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔

ریگستان کے شادابی علاقوں کا دوسرا گروہ تجارت پیشہ لوگوں پر مشتمل تھا۔ جزوی طور پر یہ لوگ زراعت میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ ان کے اپنے چھوٹے چھوٹے باغات ہوا کرتے تھے۔ تھوڑی بہت زراعت ان باغات میں ہوتی تھی لیکن معاش کا بڑا ذریعہ تجارت تھا۔ بعض قبیلے ایسے تھے جن میں کچھ لوگ زراعت میں مشغول رہتے تھے اور کچھ تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنا لے سوتے تھے۔

چھوٹے پیمانے پر تجارت کرنے والے عام طور سے خانہ بدوش قبیلوں کے ہاں تجارت کا سامان فروخت کرنے کے لیے لایا کرتے تھے۔ خانہ بدوش ان لوگوں سے گھی، ادن، بکریوں کے بالانہنے اور اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی چیزیں خرید کر لیتے تھے۔ متول قسم کے تاجر اپنی تجارت کے لیے دور دراز کا سفر کرتے تھے۔ جزیرہ نمائے سب سے متصل جو ممالک تھے ان میں ان کی آمد و رفت تھی ان لوگوں کو تجارت کے سلسلے میں ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں جانا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی مصر

جاتے تو کبھی شام تو کبھی ایران۔ ان بڑے تاجروں کے لیے جو سیکڑوں ہزاروں میل کا سفر اپنے تجارتی سامان کے ساتھ کرتے تھے۔ امن و امان کی فضا ضروری تھی جہاں سے وہ بے روک ٹوک اور بے خطر گزر سکیں۔ اس کے لیے انہوں نے حفظ و امان اور سلامتی کے چند قانون وضع کر لیے تھے جس کی پابندی سب پر لازمی تھی۔

مرکزی حکومت کے فقدان نے ہر قبیلہ کو اپنی آزادی کا تصور دے دیا تھا۔ تجارت پیشہ اور زراعت پیشہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ ایک دوسرے کی معاشی اور معاشرتی اہمیت کو پوری طرح سے سمجھتے تھے۔ جہاں تجارت پیشہ اڈنٹوں کا چارہ اور اپنے کھانے پینے کا سامان زراعت پیشہ لوگوں سے خرید کرتے تھے۔ وہیں ان لوگوں کو اسلحہ، کپڑے اور ضروریات زندگی کا دوسرا سامان فراہم کرتے تھے۔

جب ایک بڑا تاجر اپنے کاروان کو ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک لے جانا چاہتا تھا اس کے لیے یہ ضروری ہو جاتا تھا کہ ان تمام قبائل کے سرداروں سے رابطہ قائم کرے جن کے علاقوں سے اس کے کاروان کا گزرنا گزیر ہوتا تھا۔ ہر قبیلہ کے سردار کو تحفے و تحائف دینے پڑتے تھے یا رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ ان تحائف اور رقم کے عوض ہر قبیلہ کا سردار یہ ذمہ داری لیتا تھا کہ اس کے اپنے علاقے سے تاجر کا کاروان بے حفاظت تمام گزر جائے گا۔ اس قبیلے کے ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی تھی کہ وہ اس کاروان کے جان و مال کی پوری پوری نگرانی کرے۔ کوئی چھوٹی سی ناگوار بات بھی پیش نہ آنے پاتے جب تک کہ کاروان ان کے اپنے علاقے میں موجود رہے۔

عام طور سے جب کسی تاجر اور اس کے کاروان کو سلامتی کی ضمانت دے دی جاتی تو جس قبیلے کی طرف سے یہ پیش کش ہوتی تھی اس قبیلے کا ایک آدمی کاروان کے ساتھ شامل ہو جاتا تھا تاکہ جب تک کاروان اس قبیلے کے علاقے سے گزر نہ جاتے اس پر کوئی آفت نہ آئے۔ اس کے باوجود اگر کوئی فرد یا جماعت کاروان پر حملہ کر بیٹھے تو جس قبیلے کے سردار نے سلامتی کی ضمانت دی تھی اس کے لیے یہ بات باعث شرم ہوتی تھی۔ اسے وہ اپنے قبیلے کے لیے زلت کا باعث سمجھتا تھا۔ اس کا انتقام پورے

طریقے سے لیتا تھا۔

ہر قبیلے کا سردار سرت اپنے ہی علاقے اور اپنے ہی قبیلے کے لوگوں کی طرف سے سلامتی کی ذمہ داری لیا کرتا تھا۔ اگر کسی تاجر کو کسی بڑے سفر پر جانا ہوتا تھا تو بعض اوقات اُسے چھ یا آٹھ مختلف قبیلوں کے سرداروں سے حفاظت اور سلامتی کے عہد کی درخواست کرنی پڑتی تھی۔ مگر یہ بات اس وقت بڑی عجیب معلوم ہوتی تھی لیکن اُس وقت کے تاجران باتوں کے عادی تھے۔ ان تاجروں کی رسم و راہ ان سرداران قبیلہ سے رہا کرتی تھی جن کے علاقوں سے ان کے کاروان گزرا کرتے تھے۔ کاروانوں کی مختلف علاقوں سے روانگی ان کے لیے ذرا پریشانی کا باعث ہوا کرتی تھی اور نہ ہی کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ ان کے آپس میں ممانہ سے ہوتے تھے۔ مہتمم اور مسافر دونوں ایک دوسرے کی عزت اور سلامتی کا بے حد خیال رکھتے تھے۔

اسلام سے قبل سال کے تین مہینے انتہائی حرمت والے سمجھے جاتے تھے۔ ان مہینوں کا احترام اتنا کیا جاتا تھا کہ ان دنوں جنگ، لوٹ مار، فارت گری اور آپس میں مار پیٹ سب کچھ منع تھے۔ ان مہینوں میں سب مقدس مہینہ رجب کا سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے دو مہینے ذیقعد اور ذی الحجہ کے تھے بعض لوگ ایک اور مہینے کا بھی اس میں اضافہ ذکر دیتے ہیں جو محرم کا ہے۔ ان مقدس اور قابل احترام مہینوں میں کاروانوں اور تجارت پیشہ لوگوں کی حفاظت کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی تھی۔

مگر مذہبی مہینوں کی اہمیت ان کے پاس ضرور تھی لیکن ان لوگوں کا آپس کا مفاد اس بات میں پریشہ تھا کہ وہ اس بہانے ایک دوسرے کے جان و مال کی حفاظت کریں۔

تیرہ سو برس سے آج تک بدویوں کی مہمان نوازی ضرب المثل رہی ہے۔ قبل اسلام ایک بدوی بنی لہے سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس کا نام حاتم ابن عبد اللہ تھا۔ یتیم ہونے کے باعث اپنے دادا کے زیر پرورش تھا۔ جب بنی بلوغت کو پہنچا تو اپنے باپ کا ورثہ پایا۔ اس ورثہ میں بہت سے جانور شامل تھے، اپنے مہمانوں کو خوش کرنے کی خاطر جتنے جانور اُس کو اپنے ورثے میں ملے تھے ایک ایک کر کے ذبح کرتا گیا۔ اس کی زندگی کا سارا اثاثہ جو جانوروں کی شکل میں تھا۔ جلد ہی ختم ہو گیا اور وہ غریبوں میں شمار ہونے لگا

ایک دن تین آدمی اس کے پاس آئے اور ان کی مینانٹ کے لیے اس نے اپنے دادا کے تین اونٹ ذبح کر دیے۔ اتفاق کی بات کہ وہ تینوں نورا و شاعر تھے۔ حاتم کی اس دریا دلی پران میں سے ایک مشہور شاعر نے میزبان اور اس کے قبیلے کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ ڈالا۔ اپنی مدح کو سن کر حاتم نے کہا کہ میرا مقصد آپ تینوں کے ساتھ لطف و کرم کے ساتھ پیش آنا تھا لیکن آپ کی مدح ڈنڈنے مجھے آپ کا مقروض کر دیا ہے۔ یہ کہہ کر حاتم نے وہ سارے اونٹ جو اس کے دادا کی ملکیت تھے اور اس کی نگرانی میں تھے تینوں شاعروں کی نذر کر دیے، اس واقعہ کے فوری بعد حاتم کے دادا اثر شریف لائے۔ جب اونٹوں کو اپنے مقام پر نہ پایا تو حیرت و استعجاب سے اپنے پوتے سے دریافت کیا کہ سارے اونٹ کہاں ہیں۔ حاتم نے سیدھا سا جواب دیا کہ ان اونٹوں کو تو اس نے شاعروں کے حوالے کر دیا ہے۔ حاتم نے کہا کہ اگر وہ اونٹوں کو اپنے پاس رکھتا بھی ہوتا تو وہ زیادہ سے زیادہ بیس سال تک جیتے ہوتے اور ہمارے استعمال میں آتے لیکن میں نے ان اونٹوں کے بدلے وہ لازوال شہرت حاصل کی ہے جو اب تک ہمارے خاندان کے نام کو زندہ رکھے گی۔ حاتم کی اس فیاضی کا ذکر عمر خیام نے بھی اپنی رباعیات میں کیا ہے۔

آج بھی بدویوں کی بہان نوازی اور دریا دلی کے نظارے پورے عرب میں دیکھے جاسکتے ہیں صاحب خانہ آج بھی اپنے خیمے کے سامنے کھڑے ہو کر براؤز بلند اعلان کرتا ہے کہ کھانا تیار ہے۔ جس کو کھانا ہو وہ آئے اور اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو۔

حاتم کی خوبی یہ بھی رہی ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کا قتل نہیں کیا۔ وہ لوٹ مار میں حصہ لیا کرتا تھا لیکن جانوں کو نقصان کبھی نہیں پہنچاتا تھا۔ اگر کسی کو گرفتار کرتا تو بغیر معاوضہ لیے اپنے قیدی کو آزاد کر دیتا۔ اگر حاتم کو یہ معلوم ہوتا کہ اس کا مخالف بھی کسی کے قبضے میں ہے تو وہ اُسے بھی آزاد کروانے کی پوری کوشش کرتا حتیٰ کہ اگر اُسے اپنے مخالف کو آزاد کروانے کے لیے مالی معاوضہ دینا پڑتا تو وہ رقم دے کر اُسے دشمنوں سے نجات دلاتا اور اس کو حفاظت و سلامتی کے ساتھ اپنے قافلے میں روانہ کر دیتا۔

یہ وہ خصوصیات تھیں جو ان لوگوں میں پائی جاتی تھیں جن کے درمیان اسلام نے جنم لیا۔ ان

بدویوں کی ان اعلیٰ صفات اور بہترین خصوصیات کا رخ اسلام نے جہاد کی طرف پھرا اس طرح ان کی جفاکشی، عننت اور بہادری نے اسلام کا پرچم اسپین سے ہندوستان تک لہرا دیا۔

جہاں ان کی جنگیں بہادری میں اپنی مثال آپ ہوتی تھیں وہیں ان کی مصیبت اور قبیاداریت ہر جگہ اُبھرتی رہتی تھی۔ اس معاملے میں وہ خونخواری کے درجے تک پہنچ چکے تھے۔ انتقام کے معاملے میں وہ ہر جگہ اپنے قدم مضبوط رکھتے تھے۔

ان بدویوں کی مدد سے زیادہ قیامی اور سخاوت کا نتیجہ نکلتا تھا کہ ان میں سے بہترین لوگ بن کر بیروں کہا جاسکتا ہے غربت کی زندگی گزارتے تھے۔

ان کی زندگی کی زینت اور ان کی عظمت کا دازدہ اپنی شاعری میں پوشیدہ سمجھتے تھے، اکثر وہ بیشتر اپنی شاعری میں فخر و مباہات اور اپنی بڑائی کا اظہار کرتے تھے۔ بعض اوقات محنت، سلوک اور لعنت و کرم کی داستانیں بھی شاعری میں جگہ پاجاتی تھیں۔ قبیلہ انصار کا مدی بن شداد ایک مشہور شاعر گزار ہے۔ مکہ کے قریب عکاظ کے میلے میں اس نے اپنے فن میں ایک بہترین انعام بھی حاصل کیا تھا۔ اسی وقت تک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کی ابتداء نہیں فرمائی تھی۔

شاعری کو کسی بھی اور زبان میں ترجمہ کرنا صرف الفاظ سے کیلنا اور اشعار کی روح کو فارت کرنا ہوتا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم مدی بن شداد کی نظموں کے ترجمے سے احتراز کریں۔ اس کی نظموں پر ترجمے کے بعد وہی تاثر قائم ہوتا ہے جس کا ہم اور پر ذکر کر چکے ہیں۔

عام طور سے کہا جاتا ہے کہ قبل اسلام عرب کے قبائل بت پرست تھے۔ عجیب اتفاق کہ بات ہے کہ ان قبائل کے لیے جب بھی کوئی مذہب آیا اس نے توحید ہی کی تعلیم دی۔ یہ سائیت ہو کر یہودیت یا پھر اسلام ان سب مذاہب نے توحید کی تعلیم دی۔ بت پرستی سے اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ بت پرستی اپنے لیے کوئی جگہ مذکورہ بالا مذاہب میں کسی بھی صورت سے نکال سکی۔ خصوصاً وہ انبت کے پرتاروں کے نزدیک بت پرستی نہ صرف ناقابل برداشت تھی بلکہ معاشرہ کے لیے بحیثیت مجموعی ایک بہت بڑا خطرہ سمجھی جاتی تھی۔

جب ہم قبل اسلام کے عربوں کی زندگیوں کے مطالعہ کرتے ہیں تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں بھی سمجھدار، دماغدار اور حقیقت شناس لوگوں کی موجودگی اسی طرح تھی جیسی آج ہے۔ جب اس قسم کے لوگ اسی زمانے میں موجود تھے تو تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر سادہ لوح اور بے وقوف کس طرح ان بتوں کی پوجا کرتے تھے جو خود ان کے اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے تھے ان درختوں کو خدا مانتے تھے جو پہاڑیوں کی وادیوں میں سرسبز و شاداب نظر آتے تھے۔ سمجھدار اور صاحب الرائے لوگوں کی موجودگی اور سادہ لوحوں کی بت پرستی ان دونوں کے تضاد سے ایک بات جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ ان لوگوں کے ذہن میں ایک مافوق الفطرت اور عظیم ترین ہستی کا تصور تھا جو ضرور لیکن اپنے نفس کو مطمئن کرنے کے لیے وہ خدائی صفات کو بتوں، درختوں اور کنوؤں سے منسوب کر دیتے تھے تاکہ اپنی آنکھوں سے وہ خدا کی جلوہ گری کے مظاہر مادی صورتوں میں دیکھ سکیں اور اپنی عقیدت کا اندازہ بھی مادی صورت میں غائب کی بجائے موجود کی خدمت میں پیش کریں۔

ان کے درختوں یا کنوؤں یا بتوں کے پوجا کرنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ بذاتِ خود ان چیزوں کو اہم یا خدا سمجھ کر اس کی پرستش کریں بلکہ منشا یہ تھا کہ ان چیزوں میں وہ خدائی صفات کے جلوے دیکھیں بتوں کے ابتدا کا منشا بھی بظاہر ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان دیکھی قوت کے مظاہر کو بتوں کی شکل میں اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرنے چاہتے تھے۔ عرب کے متمول گھرانے بتوں کو عزت و احترام کے ساتھ ایک خاص مقام پر رکھا کرتے تھے جو بت فلنے کی شکل میں ان کے لیے عبادت کا مقام بن جاتے تھے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ عرب کے بت یونانیوں اور رومیوں کے بتوں کی طرح انسانی صورتوں میں نہیں ہوا کرتے تھے۔ یہ بات عین ممکن ہے کہ سنگ تراشی سے ناواقفیت یا اس فن میں مدہم کمال غیر مثالی بتوں کا باعث ہوا ہو۔ ان کے بت عام طور سے پتھروں اور پتھر کے مختلف قسم کے ٹکڑوں کی شکل میں ہوتے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ ان ہی وقتوں میں دیگر اقوام مختلف فنون میں کمال پر تھیں۔ خصوصاً سنگ تراشی، عمارت سازی اور فنون لطیفہ میں اپنی آپ نظیر تھیں۔ عرب دوسری قوموں کے ان فنون سے ناواقف نہیں تھے۔ پھر کیا بات ہے کہ انہوں نے

اپنے بتوں کو بے شکل رہنے دیا اور کسی بھی قسم کے جاندار کا تشبہ اپنے بتوں میں نہ آنے دیا۔ ہرزمانے میں بت پرستوں نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ وہ بتوں کی پر جان معنی بتوں کی خاطر کرتے ہیں جو ان کے یا ان ہی کے بیسے اور لوگوں کے ہاتھوں کی ضاعی ہوتے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ بت پرستی معنی بہانہ ہوتا ہے اپنے خدا کو یاد کرنے کا۔

عربی زبان نے اس بات میں خوب تمیز کی ہے کہ بت پرستی جو جانداروں کے اشکال میں بتوں کو وجود میں لا کر کی جاتی ہے اس کی تمیز کیا جاتے اس و مدانی جذبے سے جو کسی کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ کسی بھی شکل میں کسی بھی چیز کو سامنے رکھ کر اپنے جذبہ جبارت کی تسکین کرے۔

ابن ہشام نے کہا ہے کہ جانداروں کی شکل میں پہلی مرتبہ مکہ میں بت شام سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بعثت سے قبل لائے گئے۔ مسلم مؤرخین نے اکثر و بیشتر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس زمانے کے عرب بت پرست نہیں تھے۔ وہ مختلف چیزوں کا نانا اپنے خدا سے جوڑ دیا کرتے تھے۔

ہرزمانے میں ہر مذہب کے لوگ اپنے اپنے طور پر مذہب کا ایک مخصوص تصور رکھتے ہیں۔ لوگ جتنے سادہ بول گئے ان کا تصور بھی مذہب کے تعلق سے اتنا ہی سادہ ہوگا۔ وہ بے چارے عرب اتنے سادہ لوح تھے کہ انہوں نے بے شکل پتھروں کو مقدس سمجھنا شروع کر دیا اور یہ سمجھتے رہے کہ ان بے جان پتھروں میں کوئی عیبی قوت ہے۔ ان سے زیادہ مجھدار لوگوں نے ان دیکھی قوتوں کی پرستش شروع کر دی۔ عام طور سے اپنی اپنی مقدس چیزوں کو بوسہ دینا، اسے چھونا یا اس کے قریب جانا اپنے لیے وہ برکت کا باعث سمجھتے تھے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے تین سو سال قبل رومی شہنشاہیت کے لیے مسیحیت سرکاری طور پر قابل قبول ہو گئی تھی۔ ۳۰۵ء میں مسیحیت رومی شہنشاہیت کا سرکاری مذہب قرار پائی اس زمانے میں شام کے اکثر لوگ عیسائیت کے حلقے میں داخل ہوتے، لیکن یہ اثر صرف خارجی تھا۔ عیسائیت کی روح کو وہ اپنا نہ سکے۔ وہ لوگ جو انتقام کی خاطر سب کچھ کر گزرنے کو تیار رہتے تھے

ان کے لیے مسیح کی تعظیم کو کوئی اگر ایک گال پر طمانچہ مارے تو اپنا دوسرا گال بھی پیش کر دوئے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

۲۲ء میں NESTORIOUS نامی ایک مذہبی رہنما نے بیسائیت میں تنازع کا ایک نیا مسئلہ داخل کیا اس وقت کی مرکزی مذہبی میسائی کونسل نے اسے شدید سے رد کر دیا۔ نتیجے کے طور پر اس مذہبی رہنما کے ملنے والوں نے ایران کا رُخ کیا۔ یہ لوگ وادی فرات EUPHRATES VALLEY میں جا کر سکونت پذیر ہوئے اس کے کچھ سال بعد ایک اور مذہبی رہنما EUTYCHES نے متنازع کو ایک نئے رنگ میں پیش کیا۔ اس کی بھی مذمت مرکزی میسائی کونسل نے کی۔ اس کے پیرو جو مسیح کو بشریت اور الوہیت کا جامع قرار دیتے تھے مصر اور شام کی طرف کوچ کر گئے یہی مذہب چھٹی سے پندرہویں صدی عیسوی تک بازنطینی سلطنت کا سرکاری مذہب رہا۔

یہودی بھی اس زمانے میں ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ ولادت مسیح سے چھ سو سال پہلے ہی سے یہودی اچھی خاصی تعداد میں عراق میں سکونت پذیر تھے۔ عرب کے زرخیز علاقوں میں بھی ان کی بستیاں پائی جاتی تھیں۔ ان میں سے بیشتر نے اپنے آپ کو عربوں کے سانچوں میں ڈھال لیا تھا۔ یہ ان میں مخلوط ہوتے چلے گئے۔ اپنی قومی یا مذہبی انفرادیت کو اتنی اہمیت نہیں دی۔

مختصر یہ کہ چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے زیادہ تر لوگ کسی خاص مذہب کے پیرو نہیں تھے مگر عیسوی بھی آہستہ آہستہ ان میں توجید کا شور پیدا ہو رہا تھا۔ یہ زمانہ یقیناً ایک نئے عقیدے کے پرچار کے لیے وزوں ترین زمانہ تھا جس میں ایک خدا کا تصور جو زمینی اور روحانی تسکین کا باعث ہو پیش کیا جاتے تاکہ لوگ توہمات کی دنیوں سے باہر نکل آئیں۔

شاہانِ عرب

مسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے تین ہزار سال قبل جب کہ دنیا کی تاریخ ابھی لکھنی شروع نہیں ہوئی تھی دنیا میں سب سے زیادہ تہذیب و تمدن کے مراکز جزیرہ نمائے عرب سے متصل علاقوں میں واقع ہوتے تھے۔ جنوب میں مصر کے فرعون 'ASSYRIANS' 'BABYLONIANS' نامی مروج پر تھے اور احرار ایران کی شہنشاہیت اپنے شباب پر تھی۔ عرب کے قبائل اپنے ہمسایوں کے مروج اور ان کی عظمت و شوکت سے یقیناً واقف ہوں گے

۳۳۰ قبل مسیح میں سکندر اعظم نے ایرانی شہنشاہیت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد دو سو ستر سال تک یونانی تہذیب کا سکھانہ علاقوں میں رواں دواں رہا۔ ۶۴ قبل مسیح میں رومیوں نے شام اور فلسطین میں اپنے قدم جمائے اور اس کے بعد سات سو سال تک مصر، فلسطین اور شام پر رومیوں کا قبضہ رہا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ۶۱۰ء کی ہے۔ یہ زمانہ وہ ہے جس میں مقامی باشندوں کا رہن سہن اس طریقہ کا تھا جس کا ذکر ہم پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں اور دوسری طرف ان کا سابقہ ان اقوام سے بھی تھا جن کی عظمت اس زمانے میں مسلم تھی۔

خانہ بدوش زندگی ایک متقل تہذیب کی بنیاد اور اس کے ارتقا کی راہ میں ایک تدریجی رکاوٹ تھی۔ دستاویزات، مخطوطات اور کتابوں کا فقدان اور کتابیں لکھی جاتی تھیں تو ان کی خیموں میں حفاظت

یہ وہ مشکلات تھیں جن کے باعث تقریباً تمام بدوی پڑھنے اور لکھنے کے فن سے آشنا نہ ہر سکے حالانکہ خطابت اور شاعری کے فن میں حافظہ کی بدولت وہ بہت آگے تھے۔

جزیرہ نمائے عرب کے ان علاقوں میں جو شہری نوعیت کے تھے بہت سے خاندان ایسے تھے جو صاحبِ عزت، صاحبِ دولت اور صاحبِ ثروت تھے اور ان کا رابطہ یونان، روم اور ایران سے رہا کرتا تھا۔ وہ ان کی تہذیب و تمدن سے پوری طرح آشنا تھے۔ اسلام سے سینکڑوں برس پہلے ان میں سے چند نے مسیحیت یا یہودیت کو اپنا مذہب بھی بنا لیا تھا۔

ساتویں صدی کی ابتدا میں جب کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ شروع فرمائی جزیرہ نمائے عرب میں مختلف طبایع اور مختلف مذاہب کے لوگ پائے جاتے تھے۔ گوان سب کی زبان عربی تھی لیکن ہر ایک کا اندازِ فکر جداگانہ تھا۔

جزیرہ نمائے عرب میں سب سے پہلا علاقہ جہاں نظم و نسق کے ساتھ حکومت کی ابتدا ہوئی وہ یمن تھا۔ یمن میں ایک باقاعدہ حکومت جو ایک ہی خاندان پر مشتمل تھی۔ پندرہ سو قبل مسیح سے ۷۰۰ قبل مسیح تک چلتی رہی۔ اس شاہی خاندان کا خاتمہ تقریباً سات سو قبل مسیح میں ہوا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت سلیمان کے دربار میں ۹۵۰ قبل مسیح میں جس ملکہ بلقیس یا ملکہ سبائے حاضر دی تھی وہ اسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ یمن نے دولت اور تہذیب و ذرائع سے حاصل کی۔ لوبان اور مصالحات کی کاشت اور ان کی برآمد سے۔

مصر کے فراعمہ، ایران کے شہنشاہ اور دوسرے بڑے ممالک کے سیاسی اور مذہبی ادارے لوبان کو اپنی خانقاہوں اور درباروں میں جلائے کے لیے خاص طور سے یمن سے تعلقات رکھتے تھے۔ حجاز اور شام کو بھی یمنی عود اور لوبان روانہ کرتے تھے۔

ان کی آمدنی کا دوسرا ذریعہ وہ تجارت تھی جو ہندوستان، انڈونیشیا اور مشرقی افریقہ سے ہوتی تھی۔ ان مقامات سے آئے ہوئے مال کے جہازوں کو عدن پر رکن پڑتا تھا جہاں پر جنوبی عرب کے تاجر اس سامان کو خرید لیتے تھے اور پھر اس کو مصر، شام اور ایران فروخت کے لیے روانہ کر دیتے تھے۔

پہلی قسم کی تجارت کا سلسلہ چند سو سال قبل مسیح سے چلا آ رہا تھا اور دوسری قسم کی تجارت چھ سو سال قبل مسیح سے شروع ہوئی تھی۔

۱۰، قبل مسیح تک منائین کا تسلط تھا پھر سائین نے ان کی جگہ لی ۲۱۵ قبل مسیح میں عرب کے جنوب میں نباتین کا ظہور ہوا۔ یہ وہ عرب تھے جو تجارت میں پیش پیش تھے۔ ان کا دار السلطنت ٹبر تھا جو جنوبی اردن میں واقع تھا۔

منائین اور سائین کی جگہ قدرت نے عبریوں کو دی۔ ان کا پہلا بادشاہ الحارث تھا جو تقریباً ۱۰، قبل مسیح میں حکومت کر رہا تھا۔ اس کے بعد الحارث ہی کے جانشین نے اپنی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ یمن سے آگے تہجد پر ان کا تسلط قائم ہو گیا اور پھر ایران پر بھی حملہ کیا۔

۲۲ قبل مسیح میں رومیوں نے ایک لشکر یمن پر چڑھائی کرنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ لشکر بجا حمر کے مشرقی ساحلوں سے ہوتا ہوا یمن تک پہنچا منور مگر گرمی کی شدت پانی کی کمی اور نامناسب آب و ہوا نے پورے لشکر کا تباہی ناس کر دیا۔ بغیر کسی کامیابی کے لشکر کے چند بچے کچھ خوش نصیب روم پس پہنچے یمن کامیاب ہوئے اور پھر کبھی حملے کی جرات نہ کی۔

ایک روایت کے مطابق یمن کی آب پاشی ایک تالاب کے ذریعہ ہوا کرتی تھی۔ یہ تالاب مارب یا ماربہ پر بنایا گیا تھا۔ تقریباً ۱۲۰ عیسوی میں اس تالاب کا بند ٹوٹ گیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر بڑی تباہی مچی بڑے پیمانے پر یمن کے لوگ جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصوں میں ہجرت کر گئے اس غیر معمولی تباہی کے باوجود یمن کی خوش حالی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ کیونکہ ان کی معیشت سداوار و مدار درآمد اور پھر برآمد ہی پر ہوتا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یمن کی تہذیب و ثقافت اس زمانے میں اپنے عروج پر تھی۔ زراعت میں وہ آگے تھے۔ آب پاشی کی طرز وہ خاص توجہ دیتے تھے۔ پہاڑیوں پر کاشت کیا کرتے تھے۔ اپنی زراعت کو انہوں نے بہت فروغ دیا۔

فن تعمیر میں بھی یہ ممتاز تھے۔ بڑی بڑی عمارتیں اس طرح سے بناتے کہ دو پتھروں کے درمیان

کوئی بوڑھ تک نظر نہ آتا۔

۲۰۰ سے ۲۲۹ تک کا زمانہ ایک تلمیذ بادشاہ اسد ابو القارب کے لیے مشہور ہے۔ اس بادشاہ نے سارے عرب کو فتح کر لیا۔ یثرب اس کے قبضہ میں جا چکا تھا۔ حجاز کے شاداب حصوں پر اس کا تسلط تھا۔ حجاز میں اس وقت اکثریت یہودیوں کی تھی۔ یہودی توحید کے لیے بادشاہ بہت متاثر ہوا۔ واپس جلتے ہوئے دو یہودی مالوں کو اپنے ساتھ مین لے گیا۔ ان دونوں یہودی علماء کی تعلیم تدریس کا اس بادشاہ پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے یہودیت اختیار کر لی اور بت پرستی سے توبہ کی۔ اس کی تقلید اس کی رعایا نے بھی کی۔

ابھی ابھی نبائین اور ان کے دارالسلطنت پٹرا کا ذکر ہو چکا ہے۔ مین سے جو کارواں یہاں پہنچتے تھے ان کے لیے آگے بڑھنے کے تین رخ تھے۔ ایک راستہ تو مغرب کی طرف مصر کے لیے جاتا تھا دوسرا راستہ بند گاہ غزہ کو لے جاتا تھا اور تیسرا دمشق کو۔

تاریخ میں نبائین کا ذکر عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے تین سو سال قبل ملتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مین میں بے چینی تھی۔

مشرقی تجارت اور مشرقی سامان کی خرید و فروخت نے ان کو بہت ہی متمول بنا دیا تھا۔ کچھ صدیوں تک تو ان لوگوں نے شام کے مشرقی حصے کو بھی اپنے قبضے میں رکھا جس میں دمشق بھی شامل تھا۔ ۱۰۶ عیسوی میں نبائین کی سلطنت کو زوال ہوا۔ ایک فوجی نے ان کا نام TRAJAN تھا اپنی شہنشاہیت کا اعلان کر دیا۔ اپنے مقروضہ علاقے کو رومی سلطنت کا ایک حصہ قرار دیا۔ بادشاہت کی تبدیلی نے ان کی تجارت پر بھی اثر ڈالا۔ نبائین اونٹوں کے ذریعہ سامان لاتے لیجاتے تھے۔ یہ رومنوں کے بس کی بات نہیں تھی۔

تجارت میں نبائین کے جانشین پالمیرس ہوتے جنہوں نے شام کے ریگستان کو اپنا مرکز قرار دیا۔ یہ لوگ بھی تجارت کے وہی طریقے اختیار کیے ہوتے تھے جن کو ان کے پیش رو اپناتے ہوئے تھے۔ TRAJAN کا جانشین UDHAINA ہوا۔ اس نے تجارت کی طرف خاص توجہ کی۔ تجارتی امور میں

ہیٹل ابن خصوصیات کا حامل تھا اس نے کوشش کی کہ اپنے زیر تسلط مملکت کو ان ہی تجارتی خصوصیات کا حامل کر دے۔ اس کا زمانہ ۱۵۰ عیسوی کا ہوا ہے۔ اس بادشاہ نے بڑی ہی شان و شوکت کے ساتھ مشرقی شام اور الجزائر پر حکومت کی۔

۱۹۳ء سے ۲۱۱ عیسوی تک رومی شہنشاہیت اہلی کے لوگوں پر مشتمل نہ تھی۔ بحیرہ روم کے آس پاس جو مختلف سلطنتیں پھیلی ہوئی تھیں ان کے اشتراک اور باہمی تعاون سے رومی شہنشاہیت نے ایک نیا روپ دھار لیا تھا۔ LDHAINA کا پرتاجب برسر اقتدار ہوا تو اس ملی صحبت نے اس کی سرپرستی کی۔ اس بادشاہ نے کافی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

تقریباً چھ سو سال تک جنوبی شام اور الجزائر کی خوش حالی اور آسودگی روم اور ایران کی باہمی رقابت کا شکار رہی۔ ۲۵۷ء میں SAPORI شہنشاہ ایران نے شام پر حملہ کیا۔ رومیوں کو شکست فاش دی رومیوں کے شہنشاہ کو قیدی بنا کر ایران کے دار الحکومت لے آیا۔ فتح کے نشے سے مست ہو کر ایران کے شہنشاہ نے پورا اس طرف کا رخ کیا۔ انطاکیہ کو فتح کیا۔ اس عرصے میں اُدھینہ اور اس کے لوگ ان تمام حالات سے بے خبر ہو کر خاموشی سے اپنے اپنے کاموں میں لگے رہے۔ ان ایرانی اور رومی جنگوں میں کسی بھی قسم کا کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ رہی کہ جن مقامات سے ایرانی افواج گزرا کرتی تھیں ان مقامات سے ان لوگوں کا رہائشی ریگستانی علاقہ کافی دور تھا۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے جب SAPORI اپنی مہم سے کامیابی کے ساتھ واپس ہو رہا تھا تو جدتہ کی وادیوں میں پالمیرا کے عربوں نے اس کی افواج پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس کی تمام فوج کو جو اس باختمہ کر کے تتر بتر کر دیا تھی کہ اس ایرانی شہنشاہ کی بیویوں کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ کوئی اتفاقی سرحدی تنازعہ نہیں بلکہ ایک سوچی سمجھی سازش تھی۔ اُدھینہ نے ایرانی شہنشاہ کو مقابلے کی دعوت دی اور دوبار اس کے دارالسلطنت کا محاصرہ کیا۔

گھبن لگتا ہے کہ روم کی عظمت جو ایرانیوں کے ہاتھوں پامال ہو رہی تھی۔ اس کو باقی اور سلامت رکھنے میں پالمیرا کے عربوں نے حصہ لیا۔

رومیوں نے پالمیرا کے عربوں کی حمایت کی قدر کی۔ ان کے بادشاہ کو خطاب اور تمغوں سے

نوازا۔ جس بادشاہ کی سرکردگی میں یہ ساری باتیں ہوئی تھیں، اس کے اقبل کا ستارہ بہت جلد ڈوب گیا وہ اپنے نتیجے یا بچانچے کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کی بیوی زینب اس کی جانشین ہوئی۔ زینب کی سرکردگی میں شام ایشیائے کوچک اور مصر فتح ہوئے۔ اس کی حکمرانی کے دوران روم کی شہنشاہیت میں تبدیلیاں ہوئیں شہنشاہ AURELIANO نے اس بات کی کوشش کی کہ تمام رومی سلطنتوں پر مشتمل ایک وفاق بنایا جائے تاکہ منظم طریقے سے رومن ایمپائر اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہناتے۔ زینب کو کسی بھی قسم کی مصالحت ناپسند تھی وہ ایک آزاد اور خود مختار ملکہ کی حیثیت سے حکومت کرنا چاہتی تھی۔ یہ بات روم کے شہنشاہ کو ناگوار گزری، اس نے زینب کے ملک پر حملہ کر دیا۔ زینب کی فوج کو شکست ہوئی۔ زینب کو گرفتار کیا گیا۔ سونے کی زنجیروں میں لٹے بانڈ کر روم لے جایا گیا۔ سونے کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ملکہ کو رومی شہنشاہ کے شکار کے طور پر روم کی شاہراہوں پر گشت کروایا گیا۔

عربوں کے تعلق سے یہ سب تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ قبل اسلام یا حضور کے ابتدائی زمانے میں وحشی اور درندہ صفت تھے بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ روم کے شہنشاہوں میں چھ شہنشاہ ایسے گزرے ہیں جن کا تعلق جزیرہ نمائے عرب سے تھا۔ اگر وہ بحیثیت ایک قوم درندہ صفت ہوتے تو روم جیسی سلطنت جو اپنی تہذیب اپنے تمدن اور نظم و نسق میں قابلِ مثال تھی ان لوگوں کو اپنا شہنشاہ نہیں بناتی۔ چار کا تعلق تو شام سے تھا اور فلپ اور SEPTIMINS عرب کے ریگستانی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔

یمن کے ایک تالاب کے بند کے ٹوٹنے کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔ اس حادثے کے بعد جن یمنی قبیلوں نے ترکِ وطن کیا ان میں سے ایک قبیلہ نمان تھا جو شام کے بنجر علاقوں میں پہنچا۔ یہ زمانہ ۲۵۰ مسوی کا تھا جب کہ پالمیر خاندان کے فرمانروا اسروج پر تھے۔ ODNATHUS کے خاندان کا زوال رومن حکمرانوں کے ہاتھوں ہوا۔ ۲۹۲ء میں رومنوں نے بنی عثمان کے فرد ثعلبہ ابن عمر کو مشرقی شام کا حکمران بنایا۔ ۳۶۶ء تک جب کہ مسلمانوں نے اسے فتح نہ کر لیا اس خاندان میں حکمرانی باقی رہی۔ اسی زمانے میں جب کہ بنی عثمان نے شام کا رخ کیا یمن کے دوسرے قبیلے حبشہ کے مغربی ریگستانی علاقوں میں جا بے۔

۲۶۸ء میں شہنشاہ ایران SAPOR I نے قبیلہ لحم کے ایک نوجوان لمر ابن عدی کو اس علاقے کا

عمران بنیادہس نے ۶۲۶۹ سے ۶۲۸۸ تک حکمرانی کی۔ اپنا پایہ تخت EUPHRATES حبشہ کے ایک شہر حیرا کو بنایا۔ بنی فسان کی طرح ان کا فاترہ بھی اسلامی فوجوں کے ہاتھوں ۶۶۳ء میں ہوا۔

اس تمام عرصے میں روم اور ایران کے درمیان گرم و سرد جنگ جاری رہی ۵۷۵ء میں مغربی رومی شہنشاہیت کو زوال ہوا۔ لیٹرول اور وحشیوں نے ان کی بگلی۔ آدھا مشرقی قبضہ رومیوں کے قتلہ ہی میں رہا جس کی راجدحالی استنبول تھی۔ اس سیاسی تقسیم کے بعد مشرقی حصے پر رومیوں کی حکمرانی بازنطینی شہنشاہیت کے نام سے باقی رہی۔ ملک آرمے حصے پر لیٹرول اور وحشیوں کا قبضہ تھا اور آرمے حصے پر رومی قابض تھے۔ ان کے مقبوضہ علاقوں کے لیے مقامی ریگستان ہی جزئیاتاً سہد کا کام دے رہے تھے۔ ان دونوں علاقوں میں سیاسی گروہ نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے عربوں کو استعمال کیا۔ ایک طرف بنی فسان کی حمایت رومی کیا کرتے تھے تو دوسری طرف ایران نے لخمیوں کو اپنا وسیلہ کار بنا رکھا تھا۔

استنبول، ایران اور دوسرے ممالک کے درباروں میں عرب شاہی خاندانوں کی کافی عزت ہوا کرتی تھی۔ ان ہی عرب شاہی خاندانوں کے ذریعے متحدہ ممالک کی تہذیب اور ثقافت کا پتہ مقامی عرب قبیلوں کو ہوا کرتا تھا۔ بنی فسان اور لخم جس وقت حکمرانی کر رہے تھے اسی دوران حیری مین کے ایک بڑے حصے پر بڑی ہی شان و شوکت کے ساتھ حکمران تھے۔ ان کے قبضے میں جزیرہ نمائے عرب کا ایک بڑا حصہ تھا۔ تیسری صدی عیسوی کے اختتام پر ان ہی تین خاندانوں کی سارے عرب پر حکمرانی تھی۔ ان کے اپنے مقبوضہ علاقے تھے جہاں وہ بادشاہت کر رہے تھے۔ مین میں حیری۔ شام میں بنی فسان اور حیرا میں لخم

لخمی خاندان کا ایک نامور بادشاہ نعمان اول گزرا ہے۔ یہ کاناکھا۔ اس نے ۳۹۰ سے ۴۱۸ء تک حکومت کی۔ اس کے عہد حکومت میں خوش حال کا دور دورہ تھا۔ حیرا اپنی ثقافت اور تہذیب کے باعث کافی مشہور ہوا۔ ایران کے شہنشاہ یزدگیر اول نے اپنے بیٹے بہرام کو نعمان کے دربار میں روانہ کیا تاکہ نعمان اپنی ننگانی اور سرپرستی میں اسے رموز مملکت بگھائے۔ بادشاہت کے طور طریقے بتائے۔ یہ واقعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس وقت عرب اپنی تہذیب اور ثقافت میں کس درجے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ ۴۲۰ء میں جب یزدگیر اول شاہ ایران کا انتقال ہوا تو اس کا ولی عہد بہرام اس وقت حیرا میں نعمان

کے زیر تربیت تھا۔ بہرام کی ایران میں غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یزدگیر اول کے دوسرے شہزادے خسرو نے اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ اس کے فوری بعد نعمان اول کا انتقال ہو گیا اس کا بیٹا منذر اول بہرام کو اپنے ساتھ لے کر ایران پر حملہ آور ہوا۔ ایران کے تخت کو حاصل کر کے بہرام کو اس پر سند نشین کر دیا بہرام شکار کا بہت شوقین تھا۔ خاص طور پر وہ شکار کھیلا کرتا تھا جس کو اس نے اپنے عرب کے قیام کے دوران سیکھا تھا۔ اس کے شکار کے شوق کا ذکر عمر خیام نے بھی اپنی رباعیات میں کیا ہے۔ جبکہ بنی عسسان اور لخمیہ جزیرہ نمائے عرب کے جنوب میں اپنی بادشاہت میں مصروف تھے اسی دوران میں اسد ابوقارب یہودیت کی اشاعت میں مصروف تھا۔ چھٹی صدی عیسوی کی ابتدا میں کن کا فرمانروا ذوالنوا اس یہودیت کو جنون کی حد تک اپنا چکا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے مین کے قریب نجران میں شام کا ایک پادری عیسائیت کو پیش کر چکا تھا نجران میں عیسائیت کافی پھیل چکی تھی۔ اس کا نتیجہ دونوں مذاہب کے تصادم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہودیوں نے نجران پر حملہ کر کے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہودی بادشاہ نے ایک بڑی خندق کھدوائی۔ خندق کو آگ سے بھرا دیا۔ اس آگ سے بھری ہوئی خندق میں عیسائیوں کو پھینکا گیا۔ مذہبی تعصیب نے اس کو اتنا دیوانہ بنا دیا تھا کہ عیسائی زندہ جلنے کے لیے آگ سے بھری ہوئی خندق میں پھینکے جا رہے تھے۔ ان مظلوم عیسائیوں میں سے ایک عیسائی کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا۔ سیدھے استنبول پہنچا۔ بازنطینی شہنشاہ کو یہودی بادشاہ کے ظلم و ستم کی روداد سنائی مدد کا طلب گار ہوا۔ اس وقت بازنطینی شہنشاہ تھا۔ اس کی اپنی سلطنت اس موقف میں نہیں تھی کہ وہ عملی طور پر مظلوموں کی مدد کر سکے یا اپنی افواج مقابلے کے لیے روانہ کر سکتے۔ اس نے یہ کام ضرور کیا کہ حبشہ کے بادشاہ کے نام ایک خط لکھا۔ حبشہ کا بادشاہ عیسائی تھا۔ خط میں درخواست کی گئی تھی کہ مظلوم اور شہید عیسائیوں کا بدلہ لیا جائے۔ گو مذہب کے نام پر حبشہ کے بادشاہ کو مین پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا گیا تھا لیکن اس کے پیچھے عیسائیوں کا اپنا معاشی مفاد وابستہ تھا۔ جنوبی عرب نے تجارت کے لیے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کر رکھی تھی۔ مشرق یعنی ہندوستان، انڈونیشیا، چین وغیرہ سے سامان وہاں جمع ہو کر فروخت کے لیے پھر آگے بڑھتا تھا۔ اس لیے بازنطینی عیسائی حکومت نے حبشہ کی عیسائی حکومت کو اس طرح سے اکسایا

کہ نجران کے میسائیوں کے ساتھ یہودیوں کی حکومت نے جو بے رحمانہ سلوک کیا تھا اس کا اسے پورا پورا بدلہ اس طرح سے دیا جائے کہ ایک طرف میسائیت پر احسان بھی ہو جائے۔ اور دوسری طرف ان کے دل کی مراد بھی برآ جائے جو تجارتی مرکز پر قبضہ کرنے کی صورت میں تھی۔

۵۲۵ء میں حبشہ نے یمن پر قبضہ کیا۔ ذوالنوا اس مارا گیا۔ حیرلوں کے خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ حبشی افواج نے یمن کو اس کے بعد پچاس سال تک اپنے قبضے میں رکھا اور وہاں حکومت کرتے رہے۔ حبشہ کا ایک مشہور وائسرائے یا گورنر جو یمن پر مامور کیا گیا تھا اس کا نام بربرہ تھا۔ بربرہ نے یمن میں ۵۳۷ء سے ۵۷۰ء تک گورنری کی۔ اپنی گورنری کے آخری زمانے میں اس نے مکہ پر حملہ کرنے اور خانہ کعبہ کو اپنے قبضے میں لے لینے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں بھی مذہب اپنا کام کر رہا تھا۔ بات یہ تھی کہ مکہ ایک زمانہ سے مذہبی مرکز بنا ہوا تھا۔ عرب کعبہ کی زیارت کے لیے دور دور سے وہاں جایا کرتے تھے۔ بربرہ نے اپنے صوبہ میں ایک بڑا اور بہت ہی خوب صورت کلیسا بنایا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بنائے ہوئے کلیسا کو وہاں بہت دے جو اس زمانے میں کعبہ کو حاصل تھی۔ عربوں کی مذہبی عقیدت کا مرجع کعبہ تھا۔ بربرہ چاہتا تھا کہ کعبہ کی عظمت اس کے گرجا کو حاصل ہو جائے۔

مسلم مورخین نے لکھا ہے کہ بربرہ قریب تھا کہ مکہ کو اپنے قبضے میں لے لے کہ ہزاروں پرندوں نے جو اپنی چوچوں میں جھوٹے لڑکے دار پتھر دباٹے ہوئے تھے اس طرح بربرہ کی فوجوں پر پتھر برسائے کہ تمام افواج وہیں ڈھیر ہو گئیں۔ بربرہ خود بھی اپنے مستقر یمن پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چیپک کو با اس کی فوجوں میں ایسی پھیلی کہ ساری فوج ہلاکت کی نذر ہو گئی۔

روایات اس بات کی شاہد ہیں کہ ایک با تھی پر سوار ہو کر بربرہ نے مکہ کا رخ کیا تھا۔ یہ سال ۵۶۷ء کا تھا جس کو اہل حجاز ۱ سال قبل کے نام سے ایک زمانے تک موسوم کرتے رہے۔ اسی سال یعنی ۵۶۷ء میں ہما سے ہیر و حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے۔ بربرہ کی اس ذلت آمیز شکست سے حبشہ کا وفار یمنیوں کی نظر سے گر گیا۔ یمن اس واقعہ کے بعد بار بار بغاوت کی طرف مائل ہوتے گئے۔ ۵۶۷ء میں الحیری خاندان کا ایک شہزادہ سیف ذی یزن حیرا گیا۔ اس نے حبشیوں کے ظلم و ستم کی داستان محمد شہزادے

کے آگے بیان کی۔ محمد شہزادہ اُسے اپنے ساتھ لے کر ایران کے دربار میں گیا۔ ایران کے بادشاہ خسرو ابن شیروان نے ان کی فریاد سنی۔ اپنے مشیروں کو طلب کر کے ان سے مشورہ مانگا۔ مشیروں نے کہا کہ میں بہت دور رہے۔ حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ میں پر حملہ کیا جائے۔

سیف ذی یزن کو ایران کی سرکار نے چاندی کے دس ہزار درہم دیئے۔ اپنی افواج سے عملی مدد کرنے سے معذرت چاہی۔ یعنی شہزادہ جب دربار سے باہر آیا تو اُس نے درباری ملازمین میں ان دس ہزار درہم کو تقسیم کر دیا۔ جب یہ بات خسرو کے گوش گزار کی گئی تو اُس نے دوبارہ سیف کو اپنے دربار میں طلب کیا وضاحت چاہی کہ اس نے اپنے اس عمل سے دربار کی جو توبہن کی ہے اس کا سبب اور جواز پیش کرنے سے سیف نے جواب دیا کہ چاندی اور درہم میرے کس کام کے۔ میرے ملک میں جو چیزیں ہیں انہوں میں ہمارے ہاں سونے اور چاندی کے پہاڑ ہیں۔ جس وقت ہم چاہیں سونے اور چاندی کو ان پہاڑوں میں سے نکال کر جتنا چاہیں اوروں کو دے سکتے ہیں۔ اس جواب سے شہشاہ بہت متاثر ہوا۔ فیصلہ صادر ہوا کہ سیف کی مدد فوج کے ذریعہ کی جائے تاکہ سونے اور چاندی کے پہاڑوں والا ملک اُس کے قبضے میں آسکے۔

ایرانی فوجوں نے حبشی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ سیف کو یمن کا بادشاہ بنانے کا اعلان کیا۔ تقریباً ۲۷ سال تک یمن میں افراتفری رہی۔ عرب، ایران اور حبشی ایک دوسرے کے خلاف خوب لڑتے رہے۔ ان کی آپس کی جنگوں کا سلسلہ برسوں تک جاری رکھا۔ بالآخر ۵۹۷ء میں خسرو پرویز نے ایران سے ایک تازہ دم فوج یمن کو روانہ کی۔ اس فوج نے یمن پر پوری طرح سے قبضہ کر لیا۔ وہاں سے حبشیوں اور الجیروں کو مار بھگا یا۔

جس وقت اب ہم باتیں کر رہے ہیں اس وقت جزیرہ نمائے عرب میں تین مذاہب تھے۔ عوام کی اکثریت بت پرست تھی۔ سیف خود یہودی تھا۔ اس کے اپنے علاقے میں رہنے والوں کی اکثریت بھی یہودی مذہب اختیار کئے ہوئے تھی۔ شاہی خاندان کے دیگر افراد بھی یہودی تھے۔ نجران میں تقریباً سب عیسائی تھے۔

پورا جزیرہ نما ایک عجیب بد نظمی کی حالت میں تھا۔ یہ کیفیت سسکے لڑتے ہی جبکہ یہ حصہ اسلامی

مملکت کا ایک جزو بن گیا۔ حبشی حملے سے قبل یمن نے اپنی تہذیب و ثقافت میں جو عروج حاصل کیا تھا وہ تاریخ کا بس ایک حصہ بن کر رہ گیا۔

ہم نے جنوبی عرب کی تاریخ پوری تفصیل سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ اب آئیے آپ کو شمالی حصے کی تاریخ سنائیں۔

ادعربنی عسّان مشرقی شام پر حکومت کر رہے تھے۔ ان کے قبضے میں دمشق کے مغرب سے لے کر بحیرہ احمر کے سرے ایڈمک پورا علاقہ تھا۔ ایڈمک بندر گاہ عقبہ کے نام سے مشہور ہے۔ بازنطینی حکومتوں کی سرپرستی انہیں حاصل تھی۔ اپنے اندرون معاملات میں یہ بالکل آزاد اور خود مختار تھے۔ امور خارجہ کی بھی نگرانی خود ہی کر لیا کرتے تھے۔

کراچہ صانی حیرا تھا۔ حیرا کی جگہ آج کل کو ذاباد ہے۔ یہاں نجد خاندان کی حکومت تھی۔ ان کو ایرانی دربار کی سرپرستی حاصل تھی۔ شہنشاہ ایران کی بالادستی تھی۔ دو میوں یادگار اقوام سے لڑائی اور جنگ ہونے کی صورت میں ایران ان کی عملی مدد کیا کرتا تھا۔

دریائے فرات کی ایک تدرتی سرحد کا کام دیتا تھا۔ اس دریا کے مشرقی جانب عراق کی وادی تھی جہاں ایرانی نسل کے لوگ کاشت کاری میں لگے ہوئے تھے۔ عرب پہلے تو دریا کے مغربی حصے کے ریگستان میں گھومتے پھرتے تھے پھر عسّان کے شمال میں پہنچے اور کسی نہ کسی طرح اس دریا کو پار کر کے جنوبی جزیرہ میں پہنچ گئے۔

بازنطینی حکومت کا سرکاری مذہب دایاتی اور قدیم عیسائیت تھا۔ پانچویں صدی عیسوی میں توحید کا ایک نیا عنصر عیسائیت میں داخل کیا گیا جس کو مصحولوں نے اور مشرقی شام کے عربوں نے اپنایا۔

۵۸۱ء میں بنی عسّان کا ایک شہزادہ حراست میں لیا گیا اور اسے استنبول پہنچایا گیا۔ اس کی حراست کا سبب اسی نئی بدعت کا اختیار کرنا تھا۔ مشرقی شام کے لوگوں نے اس کی حراست پر اپنے علم و حکمت کا اظہار کیا اور بغاوت بھی کی۔ ان کی بغاوت کو کچل دیا گیا۔ ۵۸۳ء میں بنی عسّان کے خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اس کے باوجود بھی اس خاندان کے لوگ عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ مختلف

قبائل کی وفاداری ان کو حاصل ہی لیکن سیاسی حیثیت سے ان کا کوئی مقام نہ رہا۔
 ریگستان کے مشرقی حصوں میں نحمد خاندان کے جو پچھے کچھے لوگ رہ گئے تھے ان میں سے نعمان ہجسم
 ابو قاسم تھا جس نے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ بیس سال تک اُس نے شان و شوکت سے حکومت کی۔
 ۵۸۳ء سے ۶۰۵ء تک اُس نے عرب میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔ اُس کی تعریف میں بہت سے
 عرب شاعروں نے کئی ایک قصیدے لکھے۔

درباری سازش کی وجہ سے ایران کا بادشاہ خسرو پرویز نعمان ابو قاسم سے ناراض ہو گیا اپنے
 عتاب کا اعلان کیا۔ نعمان نے راہ فرار اختیار کی۔ اپنے پیچھے عورتیں اور مال و دولت کا بیش بہا خزانہ چھوڑ
 گیا۔ آخر میں اپنے آپ کو خسرو پرویز کے حوالے کر دیا۔ خسرو نے اُسے قتل کروا ڈالا۔ نحمد خاندان کا یہ آخری
 فرمانروا تھا۔ اس خاندان نے حیرا میں، ۳۳ سال تک حکومت کی۔ ایرانی دربار نے اس کے قتل کے
 بعد اس علاقے کے لیے اپنا ایک صوبہ دار مقرر کیا۔

خسرو پرویز کے دربار میں حاضر ہونے سے قبل نعمان نے اپنی دولت اور خزانے کو ایک مقام
 قبیلے بنی بکر ابن ویل کے حوالے کیا تھا۔ نہ صرف مال و دولت بلکہ اپنے حرم کی عورتوں کو بھی وہیں چھوڑ گیا
 تھا۔ خسرو پرویز نے بنی بکر کو طلب کیا نعمان کے حرم کی عورتوں اور اُس کے چھوڑے ہوئے خزانے کا اُس
 سے مطالبہ کیا۔ اُس وقت تو اس کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ۶۱۱ء کے موسم گرما میں جبکہ
 بنی بکر ذوقار میں اپنا پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا خسرو کو یہ موقع ملا کہ اس کے قبیلے پر فوج کشی کی جائے۔
 ایرانی فوجوں نے دو طرف سے اس کے قبیلے کو اپنے گھیرے میں لیا اور اپنے ایک نمائندہ کو بنی بکر
 کے سردار کی خدمت میں روانہ کیا۔ پیغام بھجوایا کہ نعمان کی عورتوں اور خزانے کو ایرانی فوجوں کے حوالے
 کر دیا جائے۔ چونکہ بنی بکر نے نعمان کی عورتوں کو پناہ دے رکھی تھی اس لیے اس نے اس مطالبہ کو پورا کرنے
 میں اپنی ذلت سمجھی اور مطالبہ کو رد کر دیا۔ بنی بکر کا سردار تھا۔ دوسرے دن اس نے اپنے
 لوگوں کو حکم دیا کہ ایرانی فوجوں پر حملہ کر کے انہیں مار بھگائے۔ اس نے اپنے قبیلے کی عورتوں کو حکم دیا
 کہ وہ اونٹوں پر سوار ہو کر دشمن پر پہلے بولنے والے لوگوں کے پیچھے پیچھے رہیں۔ جیسے ہی یہ لوگ اس مقام

پرہنپے جہاں دشمن نظروں کے سامنے تھا حفظہ نے عورتوں سے کہا کہ وہ اونٹوں پر سے نیچے اتر آئیں اور میدان میں صف بستہ کھڑے ہو جائیں۔ جب ان عورتوں اور بچوں کو کھلے میدان میں دشمن کے آگے کھڑا کر دیا گیا تو بنی بکر کے سردار نے آواز لگائی کہ جس کو اب اپنی عزت و عظمت کی حفاظت کرنی ہے وہ سامنے آئے۔ غیرت دلانے کا یہ ایک ایسا نفسیاتی حربہ تھا کہ عربوں کی رگ حمیت پھٹک اٹھی اور وہ زوردار لڑائی ہوئی کہ ایرانی فوجوں کے دونوں کمانڈر مارے گئے۔ دشمن کی فوج میں انتشار پھیل گیا۔ بنی بکر کو فتح حاصل ہوئی۔ اس فتح نے عربوں میں ایک ایسا اعتماد پیدا کر دیا کہ ان کے دلوں میں ایرانیوں کی عظمت کی جو دھاک بیٹھی ہوئی تھی وہ خاک میں مل گئی۔ عربوں کا یہی حملہ ان میں خود اعتماد کا وہ جوہر پیدا کر گیا جو اس واقعے کے ۲ سال بعد مسلمانوں کی ایران پر چڑھائی کی صورت میں نمودار ہوا۔

محمد خاندان کے خاتمے کے ساتھ ہی ایران اثر و رسوخ جو عربوں پر تھا آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا۔ یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ شروع ہونے سے ذرا پہلے ہی سے بازنطینی اور ایرانی سلطنتوں نے اپنے عرب ملیفوں سے چھیڑ پھاڑ شروع کر دی تھی جس کے نتیجے کے طور پر ان دونوں عظیم الشان سلطنتوں کے جاہ و جلال کے نقوش ان عرب علاقوں سے مٹتے جا رہے تھے۔

جب ذوقار کی جنگ لڑی گئی حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف ۱۱ سال کی تھی۔ اسی واقعے سے ایک سال پہلے یعنی ۶۱۰ء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہو چکی تھی۔ اس جنگ کے دو سال بعد حضور نے اپنی تبلیغ شروع فرمائی۔

مسلمانوں کے لیے ایک اور بات جو نامزدہ مند ہوئی وہ یہ تھی کہ ۶۰۲ء میں ایران کے بادشاہ خسرو پرویز نے بازنطینی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ ۶۱۱ء میں شام کو اُس نے اپنے قبضے میں لے لیا ۶۱۶ء میں مصر اور ایشیا کو چیک اُس کے زیر نگیں آگئے ۲۶ سال تک یہ دونوں بڑی سلطنتیں ایک دوسرے سے اس طرح گتھم گتھار ہیں کہ ان دونوں کی سیاست کا اندرونی اور بیرونی دونوں محاذوں پر دیوالیہ نکل گیا۔ ایک عجیب افراتفری اور بد نظمی کا دور رہا۔ ۶۳۰ء میں جبکہ مسلمانوں نے وہاں اپنی سلطنت قائم

کی امن و امان کا دور پھر لوٹ آیا۔

اسلام سے صدیوں قبل جزیرہ نمائے عرب کی جو سیاسی کیفیت رہی اس کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ وہاں کی سیاست اور حکمت عملی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ عرب قوم کا اونچا طبقہ نامور خاندانوں پر مشتمل تھا۔ ان خاندانوں میں کسی لوگ ایسے نزر سے ہیں جن پر عرب قوم بجا طور پر اپنے وقتوں میں ناز کیا کرتی تھی۔ ان خاندانوں کے سردار، شہزادے اور رہنما اپنی قوم کے سیاسی شعور کو ہمیشہ بیدار کرتے رہے۔ ان ہی خاندانوں میں الحمویوں، سبائین، لخمیہ اور بنی ہاشم شامل ہیں جزیرہ نمائے عرب کا مرکزی علاقہ قابل افراد سے ہمیشہ محروم رہا۔ عزت اپنے عروج پر رہی۔ کوئی بھی خاندان اپنے آپ کو مکمل طور پر حکمران کی حیثیت سے زیادہ دیر تک برقرار نہ رکھ سکا۔ اس کے برخلاف سرحدی مقامات جیسے یمن، مشرقی شام اور یبائے فرات کا پختلا حصہ تجارت میں کافی آگے تھے۔

اپنے وقت کی عظیم ترین سیاسی طاقتیں جزیرہ نمائے عرب کے اطراف پائی جاتی تھیں۔ ایک طرف ایران کی عظیم الشان سلطنت تھی تو دوسری طرف رومیوں کی پر عظمت اور مضبوط حکومت۔ اس پورے جزیرہ نمائے عرب کی عزت اور افلاس اور مفلوک الحالی نے بڑی طاقتوں کو عرب کے مرکزی علاقے پر قبضہ کرنے سے باز رکھا۔ اس کے باوجود جغرافیائی طور پر اس جزیرے کی اہمیت کا احساس ہر ایک کو تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف بحیرہ ہند واقع تھا تو اس جزیرے کی دوسری طرف بحیرہ روم۔ ان دونوں سمندروں کے ذریعہ بڑی ہی لمبی چوڑی تجارت ہو کر رہتی تھی۔ جزیرے نمائے عرب کے ساحل بین الاقوامی تجارت کے لیے استعمال میں لائے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بڑی طاقتوں نے عرب کے مرکزی علاقوں تک جانے کی زحمت گوارا نہ کی بلکہ صرف ساحل علاقوں پر ہی اکتفا کیا۔ یہی وہ ساحل علاقے تھے جن پر قبضہ کرنے سے یا جن پر نگرانی رکھنے سے یا ان علاقوں کے سربراہوں سے اپنے تعلقات بہتر رکھنے سے ان کا اپنا مقصد بہر حال پورا ہو جاتا تھا۔ آج بھی عدن اور یمن، پٹرا اور شرق اردن، پالمیرا اور خلیج فارس کی وہی اہمیت ہے جو آج سے دو ہزار سال پہلے تھی۔ اس وقت کی مہتمم بالشان سلطنتوں میں سے ایک سلطنت روم کی تھی جو بازنطینی سلطنت بھی کہلاتی ہے۔ دوسری ایران کی۔ اس وقت ان کی وہی اہمیت تھی جیسے

آج امریکہ اور روس کی اہمیت ہے۔ بیشتر روم کی سلطنت کا ملیف اور یارو لادار تھا۔

دولوں بڑی طاقتیں یعنی روم اور ایران مختلف عرب قبائل اور ان کے علاقوں کی حفاظت کا ذمہ اپنے سر سستی تھیں۔ ادھر بیان کیا جا چکا ہے کہ بنی فسان کو رومیوں کی حمایت حاصل تھی تو متحد کو ایرانیوں کی جھپٹی صدی عیسوی کے ختم پر عرب قبائل بڑی طاقتوں کے لیے ایک بوجھ بن گئے۔ عربوں کے آپس کے جھگڑوں سے وہ ایسے تلک آئے کہ ان کو اسی میں اپنی خیریت نظر آئی کہ وہ ان قبائل اور ان کے علاقوں سے دستبردار ہو جائیں اور ان کے آپس کے جھگڑوں میں حصہ نہ لیں۔ ان علاقوں اور قبائل کی حمایت بڑی طاقتوں کے لیے بہت ہی ہنگامی بڑ رہی تھی۔ جب اس سر پرستی اور حمایت کو اٹھایا گیا تو یہ بات نہ صرف عرب قبائل کے لیے نقصان دہ ہوئی بلکہ ان کے سر پرستوں یعنی روم اور ایران کے لیے بھی۔ کئی صدیوں سے پہلے آنے والے عرب کی بادشاہتیں ثقافتی اور سیاسی محروم ہر اپنا ایک مخصوص اثر چھوڑتی چلی آ رہی تھیں۔

سیاسی اور الحمری یہ دولوں قبائل کافی دولت مند اور شائستہ تھے۔ ذرائع آبپاشی اور فن تعمیر میں دنیا میں ان کا کول ثانی نہیں تھا۔ ان کی کپڑے کی صنعت اور زرکاری ساری دنیا میں مشہور تھی۔ حبشی اور ایرانی حملوں نے مین کی صنعت اور معیشت کو ایسا تباہ کیا کہ پھر وہ ان میں آج تک لوٹ کر نہ آئی۔

جزیرہ نمائے عرب کے شمال حصے جہاں بتائیں اور پالمیروس کی حکومت تھی رومی سلطنت کے حصے بنے ہوئے تھے۔ بنی فسان کے سربر آوردہ اکثر بیشتر استنبول، شام اور ایشیائے کوچک آیا جایا کرتے کرتے تھے۔ شام تقریباً ایک ہزار سال تک روم کا ایک انتہائی دولت مند صوبہ اور ثقافت کا مرکز بنا رہا۔

اس کے برخلاف جیراجو میں واقع تھا اس وقت کی ایرانی سلطنت

کے دارالخلافے سے صرف ستر میل دور تھا۔ ایران بھی اپنی ثقافت اور تہذیب میں اونچا مقام رکھتا تھا۔ محمد نے جو ایران کے زیر اثر تھے ایرانی تہذیب کو کافی حد تک اپنایا تھا خود ان لوگوں کے اخلاق و عادات اتنے اعلیٰ تھے کہ شہنشاہ ایران نے اپنے ولی عہد کو تعلیم و تربیت اور اخلاق سیکھنے کے لیے جیرا روانہ کیا تھا۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا کہ اسلام سے قبل سارے عرب وحشیانہ صفات کے حامل تھے ایک بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے جہاں تک عربوں کی سیاست، حکمت عملی، جنگ، بادشاہت، اندرونی

اور بیرونی تعلقات کا تعلق ہے اور پر کے صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اب ذرا اور تفصیل سے دیکھنے اور ان کی زندگی کے مختلف رنوں پر جو نقاب پڑا ہوا ہے اُسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

عرب کی سماجی زندگی کی بنیاد خاندان اور قبیلے پر تھی۔ ہر فرد چاہے مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا بڑا، جوان ہو یا بوڑھا اپنے قبیلے کا وفادار ہوا کرتا تھا۔

اسلام سے قبل مرکزی عرب کے لوگوں کی وفاداری اپنے خاندان اور قبیلے کے ساتھ ویسے ہی وابستہ ہوتی تھی جیسے آج انگلستان، امریکہ، فرانس یا جرمنی کے لوگوں کی وفاداریاں اپنے ملک سے یا اپنی پارلیمنٹ سے یا اپنے منتخب کئے ہوئے نمائندوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ ایک امریکی کے لیے یہ بات ذلت اور شرم کا باعث ہوتی ہے کہ وہ روس کے لیے جاسوسی کرے۔ چونکہ سارے امریکی اپنے آپ کو ایک خاندان یا ایک معاشرے کا رکن تسلیم کرتے ہیں اس لئے وہ اپنے معاشرے سے بغاوت کر کے دوسروں کے معاشرے سے ناجائز یا نقصان دہ ربط قائم رکھنا اپنی سوسائٹی کے لیے تباہ کن تصور کرتے ہیں۔

یہی نفسیاتی کیفیت اُس وقت کے عربوں کی بھی تھی لیکن اس کے اطلاق کے پیمانے مختلف تھے۔ ہر خاندان یا قبیلے کا رکن اپنے خاندان اور قبیلے اور اس کے اپنے سردار کا مطیع فرماں بردار اور وفادار ہوتا تھا۔ مختلف قبائل کے سرداروں کے درمیان رقابت کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ ان رقابتوں کی تہہ میں جو باتیں پوشیدہ رہتی تھی وہ یہ کہ اقتدار، دولت اور وفاداری میں کس طرح اضافہ کیا جائے۔ جیسے جیسے اُن کے اقتدار، دولت اور لوگوں کی ان سے وفاداریوں میں اضافہ ہوتا تھا ویسے ویسے اس قبیلے اور اُس کے سردار کی گرفت لوگوں پر مضبوط ہوتی جاتی تھی۔ قبیلے کی عظمت کا دار و مدار ان ہی باتوں پر تھا۔ مختلف قبیلوں کے سردار ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ تبادلہ خیال کرتے تھے۔ آپس میں تحفوں کا لین دین ہوا کرتا تھا۔ ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے مراتب کے پیش نظر آپس میں ضیانت اور خاطر داری کی جاتی تھی۔ مغربی مصنفین کے پاس بادشاہ کی حیثیت سلطنت کے ایک سربراہ کی ہوتی ہے۔ بادشاہ کو عوام کی وفاداری حاصل رہتی ہے عوام کی نظروں میں بادشاہ

قابل احترام رہا کرتا ہے۔ اس کے برعکس بدویوں کے ہاں قبیلے کی فرماں برداری رہا کرتی تھی مائے کے سرداروں میں تبدیلی ہوا کرتی تھی۔ ملک یا علاقے کی ترجمانی قبیلہ کرتا تھا۔ سردار قبیلے کی ترجمانی کرتا تھا۔ اس بات کو جو ابھی بیان کی گئی ہے بہت ہی توجہ کے ساتھ پڑھا جائے۔ اس لیے کہ جب ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر نظر ڈالیں گے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ جب حضور نے پیغمبری کا اعلان فرمایا تو بدویوں کے لیے کسی مذہبی رہنما یا پیغمبر کا وجود میں آجانا اتنی پیچیدہ بات نہیں تھی جتنی یہ بات کہ نہیں نے ذات اقدس کو ایک سیاسی اور فوجی روپ میں دیکھا اور یہ کچھ سمجھے کہ حضور بھی اسی قسم کی بادشاہت کے خواہاں ہیں جیسے مائے میں بنی عساک یا محمد خاندان کے سربراہ جب مختلف قبائل کے سردار حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے تو حضور کی ضیافت کرتے یا حضور ان کی ہمان نوازی کرتے۔ تحفے تحائف دیتے بھی اور لیتے بھی۔ محنت و مباحثے میں بھی حضور حصہ لیا کرتے تھے اور اپنی تحریک کو ان سرداروں کے آگے رکھتے تھے۔

یہاں یہ بات دلچسپی سے غالی نہیں کہ عرب کے سرداروں کے درمیان جو کشمکش جاری رہتی اس میں اور قبائل کے درمیان جو رقابتوں کا سلسلہ پیدار ہوتا دونوں میں کافی فرق ہے۔ جب سردار آپس میں لڑتے تو ان کا منشأ مزید مال و دولت کا حصول ہوا کرتا تھا۔ ان کی سرداری قبول کرنے والوں میں اضافہ کرنا ہوتا تھا۔ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے سردار ہر جائز و ناجائز طریقہ کار اختیار کرتے تھے قبائل کی جنگوں کے مقاصد بالکل جدا گانہ ہوا کرتے تھے۔ ان کا مقصد حصول دولت ہونا تھا اور نہ ہی حصول اقتدار وہ خود بھی زندہ رہنا چاہتے تھے اور دوسرے قبائل کو بھی زندہ دیکھنے کے آرزو مند تھے۔ بعض اوقات قبائل اور ان کے سرداروں کی جنگیں ساتھ ساتھ چلتی رہتی تھیں۔ سردار کی لڑائی کا منشأ کچھ اور ہوتا تھا۔ قبیلے کی لڑائی میں شرکت کا مقصد کچھ اور۔ سردار اپنے مقصد کے حصول کے لیے قبیلے کو استعمال کرتا تھا اور قبیلہ سردار کو۔

قبائل جنگوں میں کسی قسم کی کوئی تنظیم نہیں ہوا کرتی تھی۔ ان جنگوں میں جس کے ہاتھ جو چیز آجاتی تھی وہ اس کی ہو جاتی تھی۔ جو بھی لوٹ مار ہوا کرتی تھی مال غنیمت کو سردار آپس میں تقسیم کر لیا کرتے تھے۔

بادشاہت تاریخیں

- یمن میں منائیں کی حکومت ۱۵۰۰ سے ۱۰۰ قبل مسیح تک
 مشرق وسطیٰ پر ایرانیوں کا قبضہ ۵۳۸ قبل مسیح
 یمن میں سبائین کی حکومت ۱۰۰ قبل مسیح سے ۱۵ قبل مسیح تک
 سکندر اعظم کا مشرق وسطیٰ پر قبضہ ۳۳۰ قبل مسیح
 نبائیں کی بادشاہت کا فاتحہ ۳۱۵ قبل مسیح سے ۱۰۴ عیسوی تک
 یمن میں الحریوں کی حکومت ۷۵ سے ۵۲۵ء تک
 یمن میں ماریہ تالاب کے بند کا ٹوٹنا
 اور اس کی وجہ سے عام تباہی اور لوگوں کی ہجرت ۶۱۲ء
 اسد ابوقارب بادشاہ یمن کا یمن میں یہودیت پھیلانا ۲۰۰ سے ۲۳۶ء
 پالیسرا کا دور زریں ۶۱۵۰ سے ۶۲۷ء
 ایران کی بالادستی میں محمد خاندان کی حکومت ۶۲۷ء سے ۶۵۵ء
 رومنوں کی سرپرستی میں مشرقی شام میں بنی خسان کی حکومت ۲۹۲ء سے ۵۸۳ء
 رومن شہنشاہت کے مغربی آدھے حصے کا زوال ۶۷۵ء
 یمن کے بادشاہ ذوالنواس کے ہاتھوں نجران کے عیسائیوں کا قتل عام ۵۲۲ء
 یمن پر حبشیوں کا قبضہ ۵۲۵ء

- حبشی و السرائے ابرہہ کا یمن پر اقتدار ۵۳۱ء سے ۵۴۰ء
- سیف ذی یزن کا ایرانیوں کو حبشہ کے خلاف مدد کی دعوت دینا ۵۴۲ء
- یمن میں خانہ جنگی ۵۴۳ء سے ۵۹۶ء
- بنی عساک کی حکومت کا خاتمہ ۵۸۳ء
- لمنہ خاندان کے آخری فرماں روا نعمان بن مخنف کا خاتمہ ۶۰۵ء
- حضرت زینب کریمہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی ۶۱۰ء
- ذوقار کا واقعہ ۶۱۱ء
- حضرت زینب کریمہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کی ابتدا ۶۱۳ء
- بازنطینی اور ایرانی حکومتوں کی آپس میں جنگیں ۶۰۳ء سے ۶۲۸ء

مکہ اور قریش

مکہ بکر احر کے قریب عرب کے ساحلوں سے کچھ ہی دور واقع ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں دو اسباب کی بناء پر یہ شہر اہمیت اختیار کر گیا تھا ایک سبب تو یہ تھا کہ بت پرستی کا مرکز تھا۔ عرب کے بدوی قبیلے یہاں زیارت کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس مذہبی تقدس کے علاوہ اس کی اہمیت کا دوسرا سبب اس کا ایک تجارتی مرکز ہونا تھا۔ بحر احر کے مشرقی ساحلوں سے تجارتی سامان اونٹوں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا تھا۔ اس تجارت میں چین، ہندوستان اور دوسرے مشرقی ممالک کے سامان شامل تھے۔ صدیوں سے اس اہم تجارت پر پہلے منائین قابض رہے اس کے بعد سائین اور پھر تباہین اور ان کے بعد ان کی جگہ الحمیریوں نے لی ۵۲۵ء میں حبشیوں نے ان کے علاقوں کو فتح کر لیا اور آخر میں ۵۴۰ء میں ایرانیوں نے یمن پر حملہ کیا جس کے نتیجے کے طور پر یمن میں وہ تباہی مچی کہ یمن کے ہاتھوں میں برس برس سے تجارت کی جو لگام تھی وہ ان کے ہاتھوں سے نکل گئی۔

چھٹی صدی عیسوی میں مکہ کے رہنے والوں نے یمن کی تباہی سے فائدہ اٹھایا۔ تجارت میں پیش پیش ہونے لگے۔ مکہ جغرافیائی طور پر عدن اور شام کے تقریباً بیچ واقع ہے۔ یہاں اکثر و بیشتر تجارتی کاروانوں کا پڑاؤ ہوا کرتا تھا۔ اس جغرافیائی اہمیت کے باوجود مکہ کے رہنے والوں نے چھٹی صدی عیسوی سے قبل خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا اور ان میں سرمایہ داری نے جگہ نہیں لی۔

مکہ کا چھوٹا سا شہر محل وقوع کے لحاظ سے اپنے میں چند خوبیاں بھی رکھتا تھا۔ پانی کی کمیابی کی وجہ سے باغات اور زراعت کو فقدان تھا۔ چاروں طرف پہاڑوں کے ڈھلوانے جاتے تھے۔ زراعت اور باغات کے لیے زمین بالکل موزوں نہیں تھی۔ جن لوگوں کے قبضے میں پانی کے چشمے تھے وہ معاشی اور سماجی اہمیت اس لیے اختیار کر گئے تھے کہ جو لوگ بت پرستی کے لیے مکہ آتے وہ ان چشموں کے مالکوں کے ہاں پانی کے لیے ضرور جاتے۔

قدیم روایات کے مطابق یہ پوری بلکہ عرب کے ایک قدیم قبیلے جرہم کی ملکیت تھی۔ اس کا ذکر تورات میں بھی ہے۔ زمانے کی گردش کے باعث قبیلہ جرہم پر ایک اور قبیلے خزاعہ کی بالادستی ہو گئی۔ قریش نامی قبیلہ جن کا اصل تعلق مکہ کے جنوبی حصے سے تھا ایک بڑے قبیلے بنی کنانہ کی شاخ تھی۔ ۲۲۵ء کے مکہ جنگ فہر خندان کے ایک فرد نے جس کا نام قحط تھا خزاعہ خاندان کی طرف سے شادی کی۔ قحطی اس وقت اپنے خاندان کا سردار تھا۔ قحطی ایک ہونہار نوجوان تھا۔ اپنے خسر کا اس کو اتنا اعتماد حاصل تھا کہ وہ مختلف اوقات میں اور مختلف کاموں میں اپنے خسر کی نمائندگی کیا کرتا تھا۔ اس نمائندگی میں بت پرستی کرنے والوں کی رہنمائی اور ان کی سرپرستی بھی شامل تھی۔ جب خزاعہ کا انتقال ہوا تو اس کے داماد قحطی نے بت خانے کی نگرانی کو اپنے ذمے لینے کی کوشش کی۔ خزاعہ کے خاندان نے اپنے اس مورد وثیقہ کو دوسرے خاندان میں جاتے دیکھ کر قحطی کی مخالفت کی۔ عواریں پیام سے نکل آئیں۔

قحطی جو بہت ہی ہوشیار اور عقلمند نوجوان تھا بڑی ہی عقلمندی اور دانشمندی سے اپنے خاندان والوں کو جمع کیا اور خزاعہ قبیلے سے مقابلہ کر کے ان کو مار بھاگا۔ مکہ کا بت خانہ اب اس کا رہنا ہو گیا۔ اس لڑائی کے نتیجے کے طور پر مکہ کی وادی پر قریش کا قبضہ ہو گیا۔ خزاعہ خاندان قبیلہ قریش کی سرداری تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ لوگ مکہ کے جنوب مغربی حصے میں جا کر رہنے لگے۔

قبیلہ قحطی کے لوگ مکہ کی وادی میں خیموں میں رہا کرتے تھے۔ ان کا مذہبی مرکز چار دیواریوں پر مشتمل تھا۔ ان دیواریوں کے اوپر نہ چھت تھی اور نہ ہی اس کے اوپر کوئی سائبان لکے میں یوں بھی بارش بہت ہی کم ہوتی ہے۔ لیکن جب ہوائیں چلتی تو بیت کے ذریعے اور گرد و خبار کی بت خانے میں وہ بھر مار ہو جاتی تھی

کہ ان کے لیے اس کی صفائی ایک در دسر بن جاتی خیموں میں رہنے کے باوجود انہوں نے اپنے خیموں ہی کے اطراف ایک چھوٹی سی دیوار کا حصار بنالیا تاکہ گرد و غبار اور ریت کے ذروں کی زد سے محفوظ رہیں۔
قصی میں بہت ساری ذاتی خصوصیات بھی تھیں۔ اس نے اپنے قبیلے قریش کو اس بات پر رماند کیا کہ وہ اپنے بت خانے یعنی کعبہ کے ارد گرد گھر بنائیں۔

ان سارے لوگوں نے جو بنی قریش میں اہمیت کے مالک تھے کعبہ کے اطراف اپنے اپنے گھر بنائے ان اہم آدمیوں کی تعداد ۳۶ بتائی جاتی ہے۔ ان ۳۶ افراد کے بنائے ہوئے گھر صدیوں تک انکی آل و اولاد کے قبضے اور تصرف میں رہے۔ جو لوگ قصی کے قریب ترین رشتہ دار تھے انہوں نے کعبہ کے اطراف اپنے اپنے گھر بنائے۔ باقی لوگ حسب عادت خیموں میں رہا کرتے تھے۔ بدوی گھرانے ریگستانوں میں اپنے پراڈڈانے ہوئے رہتے تھے۔

چند اچھے خاندانوں نے مکہ میں رہائش اختیار کر لی تھی اس کی وجہ سے یہ شہر اب دوسرے لوگوں کو بھی اپنی طرف راغب کرنے لگا۔ چھٹی صدی عیسوی میں ان جیسے ہوئے خاندانوں نے تجارت میں دل کھول کر حصہ لینا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ ان میں امارت آتی گئی۔ دولت نے اپنے کھیل کھیلنے شروع کیے۔ غلاموں کی خرید و فروخت ہونے لگی۔ نوکر شاہی کا دور دورہ شروع ہوا۔ کاروانوں کی حفاظت کے لیے چوکیدار مقرر کیے جانے لگے۔ تیر و کمان اور ہتھیار بنانے والوں کو ملازم رکھا جانے لگا۔ آہستہ آہستہ ان خاندانوں کی امارت اور ثروت نے مقامی لوگوں کو اور ریگستان علاقوں کے قبیلوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کیا۔ مختلف قبائل کے لوگ مکہ میں آکر رہنے لگے مقامی لوگوں سے شادی بیاہ کا آغاز ہوا۔ باہر سے آنے والوں نے اب مکہ کی زندگی کو اپنانا شروع کیا۔ اب مکہ صرف ایک ہی خاندان کی ملکیت نہ رہا بلکہ اس کے معاشی معاشرتی اور تمدنی ڈھانچے میں دوسرے لوگوں نے بھی اپنے آپ کو سمونا شروع کیا۔

قصی نے کعبہ کی زیارت کے فن کو نکھارا۔ اس کی تنظیم نے سرے سے کی۔ کعبہ کی مختلف مذہبی رسومات کی ادائیگی کی ذمہ داری اپنے خاندان کے افراد کے سپرد کی۔ کعبہ کی تولیت اس نے اپنے سب سے بڑے لڑکے اور اس کی آل و اولاد کے حوالے کی۔ جس شخص کو کعبہ کی تولیت عطا کی گئی تھی اس کا نام عبدالدار

تھا۔

قدیم زمانے سے کعبہ بت نماز بنا ہوا تھا۔ ہر سال تین دن کے لیے یہ بت پرستوں کا مرکز بنا رہتا تھا۔ مرزین عرب کے ہر حصے سے لوگ مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لیے مکہ آنا عبادت سمجھتے تھے۔ کعبہ کی زیارت کے لیے امیر و غریب سب ہی آیا کرتے تھے۔ ان کی خاطر مدارات اور ان کی بھوک پیاس رفع کرنے کے لیے قص نے لوگوں سے ایک ٹیکس وصول کرنا شروع کیا جس کا نام رقادہ تھا۔

اگرچہ کعبہ کی زیارت اور عبادت تین دن پر مشتمل ہو کر تھی لیکن عربوں کا دستور تھا کہ اس سے ایک ہفتہ قبل مکہ کے اطراف تجارتی میلے لگائیں اور اس میں خرید و فروخت کریں۔ رفتہ رفتہ قریش کے لوگ جانوروں کی دیکھ بھال، نگہداشت اور خرید و فروخت سے جوان کی آمدل کا واحد ذریعہ تھا تجارت کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرنے لگے۔ مکہ کے قرب و حصار کے میلے ان کے لیے یہ مواقع فراہم کرنے لگے کہ وہ تجارت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

اس ہوشیار آدمی یعنی قص نے یہ ہدایت بھی کی کہ قمری سال کو اپنا لیں۔ قمری سال عرب کے بدوی قبیلوں کے لیے آسان ترین ان معنوں میں تھا کہ پاند کے دکھائی دینے پر ان کے بیٹے شروع ہوتے تھے اور عرب ایک ایسا مقام ہے جہاں کی ٹٹا میں اکثر و بیشتر ایسی ہوتی ہیں جہاں پاند ہر ایک کو آسانی سے دکھائی دیتا ہے چونکہ عرب لوگوں کی اکثریت بڑھی لکھی نہیں ہوتی ہے اس لیے پاند پر مشتمل سال، بیٹے اور دن ان کو آسان معلوم ہونے لگے قمری سال شمسی سال سے 11 دن چھوٹا ہوتا ہے۔

قمری سال کے بارہویں بیٹے میں صبح ہوا کرتا ہے اور اس لحاظ سے شمسی سالوں کے پیش نظر ہر 2 سال کے بعد صبح پورا ایک سال پیچھے ہو جاتا ہے۔ اس شمسی اور قمری سالوں کے تفاوت کو اور اس کے اثرات کو پیش نظر رکھ کر قص نے اس بات کی کوشش کی کہ صبح کا زمانہ موسم بہار میں رکھا جائے تاکہ ہر تیسرے سال شمسی اور قمری مہینوں کا اتصال ہو جائے۔ گویہ طریقہ اطمینان بخش نہیں تھا لیکن اس دور میں جبکہ لوگ بدوی زندگی کے مادی تھے اس کی عبرت کی داد دینی پڑتی ہے۔

قص نے دوسری ہدایت جو امتیاز کی وہ یہ تھی کہ جب کوئی قبیلہ یا جماعت جنگ کے لیے جلتے اس کے

سردار کو وہ اپنے ہاتھوں سے ایک علم یا تہنڈا بنا کر لے اور علم کا پڑا سفید ہو یہ عطا یہ ایک نیک شگون سمجھا جاتا تھا۔ مسلم ممالک میں آج تک بھی یہ روایت عملاً دیکھنے میں آتی ہے۔

بدوی قبائل میں یہ دستور تھا کہ قبیلہ کا سردار کبھی کوئی فیصلہ اپنی مرضی سے صادر نہیں کرتا تھا بلکہ جو بات بھی اہم ہوتی وہ قبیلے کے افراد کے سامنے لائی جاتی تھی۔ سردار قبیلہ کے خیمے میں سارے لوگ جمع ہوتے تھے۔ بحث و مباحثے ہوتے تھے اور سب کی مرضی سے کسی بھی بات کو قطعیت دی جاتی تھی۔ قصی نے اسی پرانی روایت کے پیش نظر کعبہ کے بالکل سامنے ایک عمارت تعمیر کروائی جسے دارالندوہ کہا جاتا تھا۔ اس مقام پر ہر سال حج کو آنے والے جمع ہوتے اور آپس میں صلح مشورہ کرتے تھے۔

دارالندوہ جیسے شریک نفعی رکھنے والے نام سے اس غلط فہمی میں نہیں پڑتا چاہیے کہ وہ کوئی عظیم الشان عمارت تھی۔ دارالندوہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جو پتھر ریت اور کچھ پڑوٹی سے بنایا گیا تھا۔ اس کی چھت لکڑیوں کی تھی۔ قصی کا انتقال ۵۰ھ اور ۶۰ھ عیسوی کے مگ بھگ ہوا۔ اس نے اپنا جائزہ اپنے بڑے لڑکے کو بنایا جس کا نام عبدالدار تھا۔ عبدالدار کی دوسری نسل میں یہ صلاحیت نہ رہی کہ وہ کعبہ کی تولیت کو سنبھال سکیں۔ ان کی تنظیمی قابلیت کے فقدان نے عبدالمناف کی اولاد کو قیاد کیلئے ابھارا اور انہوں نے عبدالدار کے جائزہ کو چیلنج کیا۔ دونوں خاندانوں میں مصالحت ہوئی۔ عبدالدار کے جائزہ نے کعبہ کی تولیت اور دارالندوہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا اور اس کے ساتھ ساتھ جنگ پر جانے والوں کو علم دینے کا مجاز بھی اپنے آپ کو قرار دیا۔ عبدالمناف کے جائزہ نے رفادہ وصول کرنے کا ذمہ لیا اور کعبہ کی زیارت کرنے والوں کو غذا اور پانی فراہم کرنے کی بھی ذمہ داری لی۔ خاندان کے مختلف افراد میں مختلف فرائض تقسیم کے گئے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ بیل نامی بت کے سامنے جو تیر پھینکے جاتے تھے ان کو جمع کیا جائے اور نیر کے گرنے کے انداز سے نیک شگون یا بد شگون کو ظاہر کیا جائے اور تیر مارنے والے کو اس کے فال کی تعبیر دی جائے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ مکہ کے لوگوں کی امارت یمن کی تباہی کا نتیجہ رہی۔ اس دور میں عبدالمناف اور بنی مخزوم کے لوگ اچھے خاصے امیر ہو گئے دوسرے قبیلے دولت کی دوڑ میں ان سے پیچھے رہے۔ مکہ کے لوگوں میں تجارتی ذہنیت جگہ پانے لگی۔ مکہ کے اکثر پیشتر لوگوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جس طریقے سے بھی ہوا اپنی

بچت کو کسی نہ کسی طریقے سے کسی نہ کسی تجارت میں لگائیں۔ کچھ لوگ اپنی بچت کو بچا کر کے کسی تجارتی کاروان کو ملک سے باہر روانہ کرتے اور اس سے جو بھی منافع ہوتا آپس میں تقسیم کر لیتے۔

عرب کے سربراہ اور وہ صرف اونٹوں کے کاروانوں پر ہی گزر بسر نہیں کرتے تھے بلکہ ان میں سے بہت سے حقیقی معنوں میں کافی مالدار تھے۔ ان میں سے بعض مدین جایا کرتے تھے جہاں سے وہ ہندوستان سے آنے والے جہازوں کے سامان کو خود خریدتے اور وہاں سے مکہ لے آتے تھے۔ مکہ سے پھر یہ سامان شام، غزہ اور مصر کے لیے روانہ کیا جاتا تھا۔ جو لوگ ہندوستان کا سامان لے کر مصر، شام اور غزہ وغیرہ جاتے اس سامان کو فروخت کر دیتے اور وہاں سے مقامی سامان لے کر مکہ آتے اور یہ سامان مکہ سے پھر ہندوستان وغیرہ فروخت کے لیے روانہ کر دیتے تھے۔ مکہ کے مقامی میلوں میں بھی مصر، شام اور ہندوستان کا سامان خوب بکتا تھا۔ اس سامان کو مقامی قبیلوں کے لوگ خرید کر لیتے تھے۔

جو لوگ ہندوستان اور چین کا سامان خرید کر باز لفظی اور ایران کی سلطنتوں میں بیچا کرتے تھے یقیناً ان میں سے ساری خصوصیات رہی ہوں گی جو بڑے تجارتی ہو کرتی ہیں۔ ان کی تنظیمی قابلیت، ان کا علم ان کی دہ اندیشی اور ان کا تہہ بر اور دنیا کے اہم ممالک سے تجارتی روابط رکھنے کی صلاحیت اور تجارتی نکتوں کو سمجھ کر ان کو کام میں لانے کی سعی ان کو دن بہ دن ترقی کی طرف لیتی گئی۔

عبدالمناف کا بڑا لڑکا عبد اللہ جس تجارت میں بڑا ہی کامیاب رہا۔ اس کی جد و جہد اور تجارتی کوششوں میں اس کی قسمت اس کا بڑا ساتھ دیتی رہی۔ اپنی تجارت میں وہ اتنا منہمک رہنے لگا کہ اس کی مکہ سے بے عرصے کے لیے غیر معاضری اس کے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں مانع ہونے لگی۔ تجارت کے سلسلے میں اس کو بے بس سفر کرنے پڑتے تھے۔ اس کی وجہ سے مقامی اور خاندانی ذمہ داریاں عبد المناف کے دوسرے لڑکے ہاشم نے سنبھال لیں۔ ہاشم حج پر آنے والوں کی جو خاطر داری کرتا تھا اس کے پیش نظر اس کی مقبولیت دن بہ دن عربوں میں پھیلتی گئی۔ اس کی نیک نامی میں اضافہ ہوتا گیا اور اس نیک نامی نے اس کی دولت میں کافی اضافہ کیا۔ اپنے ایک تجارتی سفر کے دوران مکہ کے جنوب میں تقریباً ۱۵۰ میل دور یشرب کے مقام پر ہاشم نے یشرب کے ایک ممتاز قبیلے بنی النجار کی ایک لڑکی سے شادی کی۔ ہاشم کی بیوی کا نام سلمیٰ تھا جو اپنے وقت کی

ایک ممتاز خاتون تھیں۔ سلمیٰ کے بطن سے ۹۶ء میں عبدالمطلب پیدا ہوئے۔

عبدالمناف کے اسی لڑکے ہاشم نے سالانہ دو منظم کاروائیوں کی مکہ سے روانگی کی ابتدا کی۔ ایک یمن کی طرف روانہ کیا جاتا تھا جو ہندوستان سے آنے والے سامان کو خرید کر مکہ لے آتا۔ دوسرا کاروان مکہ سے شام کی طرف روانہ کیا جاتا تھا۔ ہاشم کا انتقال غزہ میں ہوا جبکہ وہ ایک تجارتی کاروان کے ہمراہ وہاں گئے ہوئے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائی المطلب نے حاجیوں کو پانی پلانے اور ان کی حاجت روائی کی ذمہ داری اپنے سر لی۔

ہاشم کے انتقال کے بعد ہاشم کی بیوہ سلمیٰ اپنے چھوٹے لڑکے کو لے کر اپنے میکے یثرب چلی گئیں۔ جب سلمیٰ کا لڑکا سن شعور کو پہنچا تو لڑکے کے چچا المطلب اسے یثرب سے مکہ لے آئے۔ جب مکہ کے لوگوں نے دیکھا کہ المطلب کے اونٹ پر ایک نوجوان لڑکا بیٹھا ہوا ہے تو انہوں نے خیال کیا کہ شاید المطلب کوئی نیا غلام خرید کر لایا ہے اور اس لڑکے کو انہوں نے عبدالمطلب پکارنا شروع کر دیا یعنی المطلب کا غلام۔ اس نوجوان کا نام شیبہ تھا لیکن وہ مشہور عبدالمطلب کے نام سے ہوئے۔ المطلب کا انتقال یمن میں ہوا۔ یثرب، غزہ، یمن میں قریش کے سربر آوردہ لوگوں کے انتقال ہونے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح وہ لوگ تجارت میں ہنہک رہا کرتے تھے اور اکثر و بیشتر تجارت کے سلسلے میں اپنے مستقر سے دور رہتے تھے۔ عبدالمناف کے تمام بیٹوں میں صرف عبدالمطلب ہی ایسے رہے جن کا انتقال مکہ میں ہوا۔ عبدالمناف کے سب سے چھوٹے بیٹے نوفل کا انتقال سلمان میں ہوا جو اپنے کاروان کو EUPHRATES کے علاقے حیرہ لے گئے تھے۔ عبدالمطلب اپنے چچا المطلب کے جانشین ہوئے۔ حاجیوں کو پانی پلانے اور ان کے خورد و نوش کے انتظام کی ذمہ داری سنبھالی۔ اسلامی مورخین کا کہنا ہے کہ عبدالمطلب ہی نے خانہ کعبہ کے حدود میں ایک کنواں کھدوایا تھا جس کو زم زم کہا جاتا ہے۔ اس کنویں کی وجہ سے حج پر جانے والے لوگوں کو پانی کی سہولت ہو گئی۔ اگرچہ کہ مکہ کی وادی میں اور بھی کنویں ہیں لیکن زم زم اپنی نوعیت میں اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ وہ حدود کعبہ میں واقع ہے۔ عبدالمطلب نے تاریخ میں ایک ممتاز مقام اس لیے بھی حاصل کیا کہ ان ہی کی زندگی میں اور ان ہی کی سرداری کے دوران ۶۱۰ء میں حبشی گورنر ابرہہ نے فوج کشی کی تھی۔ یہ سال عام الفیل کہا جاتا ہے۔ مکہ

کے لوگوں نے اس جینے کی کوشاقت نہیں کی اور کچھ نہیں کراپنے ملل و اسباب کے ساتھ اطران کے ملاقوں میں پناہ
 گزیریں ہوئے۔ روایات کے مطابق عبدالمطلب نے اپنے خدا سے دعا کی کہ وہ کعبہ کی حفاظت فرمائے۔ ان کی دعا
 مقبول ہوئی۔ پرندوں نے اپنی چوہوں میں نوک مار کئے اٹھائے ہوئے ابرہہ کی فوجوں پر اس طرح یلغار کی اور
 سنگریزے برسائے کہ ابرہہ کا لشکر جزار تباہ و برباد ہو گیا۔ چونکہ عبدالمطلب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے
 دادا ہوتے ہیں اس لیے ہر کتاب سے کہ مسلم مورخین نے عبدالمطلب کو موجد کالقب دے کر دعا اور لشکر کی تباہی
 کو ان سے موسوم کر دیا ہوتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کی عظمت اس طرح سے بھی ظاہر کی جائے
 یہ بات قابل ذکر ہے کہ عرب کے بت پرستوں کے ہاں بھی ایک عظیم اور واحد خدا کا تصور تھا۔ ساتھ ہی ساتھ
 وہ اپنے مقامی چھوٹے چھوٹے خداؤں کی بھی پرستش کیا کرتے تھے۔ اپنا اپنا بت اپنے ساتھ لیے پھرتے تھے
 کہ جب پناہیں اپنے بت کی پرستش کر کے اپنی عبادت کی تشکی کو سیراب کر سکیں۔ اس کے علاوہ اس وقت نیسایت
 اور یہودیت کے ماننے والے بھی عرب کے برعکس میں مل جاتے تھے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے ایک قریبی رشتہ دار ورتہ ابن نوفل نوید پرست
 تھے۔ ان کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے انجیل یا توریت کے کچھ حصوں کا عربی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔
 ورتہ کی تحقیقی بہن کے متعلق بھی یہ کہا جاتا ہے کہ وہ توریت کا بروقت مطالعہ کرتی رہتی تھیں عبدالمطلب، ہم
 کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ خدا نے ان کو دس بیٹے عطا فرمائے۔ عبدالمطلب نے اپنی جوانی میں کعبے کے خداؤں
 سے منت مانگی تھی کہ اگر ان کو دس بیٹے ہوں تو ان میں سے وہ ایک کو خدا کی راہ میں قربان کریں گے جب
 واقعی ان کو دس بیٹے ہو گئے تو ان کو اپنے لیے ہوئے عبد کا خیال آیا۔ وہ سوچنے لگے کہ عبد کو کس طریقے سے
 پورا کیا جائے۔ انہوں نے قرعہ اندازی کی اور پورے دس بیٹوں کے نام اس میں شامل کیے۔ قرعہ اندازی
 میں عبد اللہ کا نام نکل آیا جو ان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ عبد اللہ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔
 عبدالمطلب ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار نہ ہوتے تھے کہ عبد اللہ کو خدا کی راہ میں قربان کیا جائے۔
 اپنی ذہنی کش مکش کو دور کرنے کے لیے انہوں نے اور لوگوں کی رائے لی۔ ان میں ایک مقامی کاہنہ بھی شامل
 تھی۔ اس نے عبدالمطلب کو مشورہ دیا کہ جان کا بدلہ مال کی صورت میں بھی دیا جاسکتا ہے اور بہتر یہ ہوگا کہ

عبداللہ کی جان کے عوض بہت سے اونٹوں کی قربانی کی جائے۔ اگر خداؤں نے اونٹوں کی تعداد پر اعتراض کیا تو اس میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اونٹوں کی تعداد میں مسلسل اتنا اضافہ کیا جانا چاہیے جو خداؤں کے لیے قابل قبول ہو اور ان کی خوشنودی کا باعث ہو۔

عبدالطلب نے دس اونٹوں کی قربانی کی پیشکش کی۔ جب تیر پھینکا گیا تو قیافہ شناسوں کے سردار نے اعلان کیا کہ بہل بت کے لیے یہ پیشکش ناقابل قبول ہے۔ اونٹوں کے پیشکش میں ہر تیر کے ساتھ دس اونٹوں کا اضافہ کیا جاتا رہا اور دسویں تیر پر قیافہ شناس نے اعلان کیا کہ بہل کے لیے سواونٹ قابل قبول ہیں اور یہ اونٹ عبداللہ کی جان کے عوض قربان کیے جائیں۔

عجیب اتفاق کی بات ہے کہ یہ پورا واقعہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسحق کے واقعے سے ملتا جلتا ہے۔ مسلم مورخین نے حضرت اسحق کی جگہ حضرت اسماعیل کا ذکر کیا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسماعیل کو ذبح کرنے کے لیے ابراہیم نے وہی مقام چنا تھا جس کو صدیوں بعد عبدالطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کی قربانی کے لیے انتخاب کیا تھا۔ حضرت اسماعیل کی جان بخشی خدا کے حکم سے ہوئی تھی خدا نے اسماعیل کی جگہ ایک دینے کو حضرت ابراہیم کے آگے ذبح کے لیے رکھ دیا۔ بعض مسلم مورخین نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے حضرت اسحق کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ اسماعیل کو۔

قریش کے قبیلے سے تعلق رکھنے والے ایک خاندان بنی زہرہ کی ایک خاتون آمنہ سے عبداللہ نے شادی کی۔ شادی کے کچھ مہینوں بعد عبداللہ کا انتقال شہر میں ہوا جبکہ وہ تجارت کی عرض سے وہاں گئے ہوئے تھے۔ شہر میں حضرت آمنہ کے بطن سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ کی پیدائش ہوئی۔ محمد نامی یہی بچہ آگے چل کر دنیا کا ایک عظیم ترین انسان اور پیغمبر بنا قریش کا یہ معاشرتی دستور تھا کہ بچے پیدا ہونے کے بعد ان کو خانہ بدوش قبیلوں کے حوالے کر دیا جاتا تھا کہ وہ اپنی شیرخواری کا زمانہ مکہ کے باہر گزاریں۔ مکہ کے باہر کی تازہ آب و ہوا کو وہ لوگ بچوں کے لیے بہتر اور صحت مند سمجھتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے چند دن بعد ہی سعد کی عورتوں کی ایک جماعت جن کا تعلق ہوازن قبیلے سے تھا بچوں کو حاصل کرنے کے لیے مکہ آئی۔ نوجوان بیوہ آمنہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے محمد کو حسب دستور ان عورتوں کے حوالے کرنا چاہا لیکن آمنہ کی بیوگی اور عزت

کے پیش نظر ان عورتوں نے اس بچے کو اپنے سے انکار کر دیا۔ بچوں کو دودھ پلانے اور سحر میں ان کی پرورش اور نجات کرنے والی عورتوں کو بچوں کے باپ نامی طور پر بڑی بڑی رقبے بلکہ معاوضہ دیا کرتے تھے۔ مائیں اس سلسلے میں ذرا کجگوس ہوتی تھیں۔ یہ بات حضرت آمنہ کے ساتھ بھی ہوئی۔ جتنی عورتیں جماعت کی سعادت میں بچوں کے لیے وہاں آئی تھیں ان میں سے سوائے ایک عورت کے باقی تمام کو پرورش کے لیے ایک ایک بچہ مل گیا۔ جس عورت کو کون بچہ ملے اس کا نام ملیہ تھا۔

بچوں کو لے کر جماعت کی ساری عورتیں اپنے اپنے مقام پر روانہ ہو رہی تھیں لیکن ملیہ خالی ہاتھ واپس ہونا پسند نہیں کرتی تھیں۔ مجبوراً ملیہ نے اس تہمت بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔ یہی وہ بچہ تھا جس کو اپنے سے جماعت کی ساری عورتوں نے انکار کیا اور اسی بچے کو ملیہ نے بادل تا خواست اپنی گود میں لے لیا۔

جب تک بنی سعد کے درمیان حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقیم رہے کئی معجزے ظہور پذیر ہوتے رہے۔ ان میں سے ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار دوسری پوش نمودار ہوئے۔ بچے کو فرش پر لایا۔ اس کا سینہ پاک کیا۔ دل نکالا۔ دل کو دھو کر پھر سینے میں رکھ کر روپوش ہو گئے۔

جہاں تک معجزوں کا تعلق ہے ان پر بحث کرنا بے سود ہے اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی معجزوں کو اہمیت نہیں دی۔ آپ نے یہاں تک فرمایا کہ آپ معجزہ دکھانے سے قاصر ہیں۔ حضور کی اس صاف گوئی نے دشمنوں کو یہ موقع دیا کہ وہ حضور پر طعنہ کہیں کہ حضور معجزہ ہونے کے باوجود معجزے دکھانے سے قاصر ہیں۔

اگر حضور اپنی تبلیغ کے زمانے میں صرف ان معجزوں کا ذکر فرمادیتے جو آپ کے بچپن سے لے کر تبلیغ کے زمانے تک آپ سے منسوب کیے گئے ہیں تو صرف یہی معجزے مخالفین کی زبان بند کرنے کے لیے کافی تھے لیکن حضور نے کبھی بھی معجزوں کی آڑ نہیں لی اور نہ ہی معجزوں کو اہمیت دی۔

حضور نے بچپن کے چھ سال اپنا دودھ پلانے والی ماں حلیمہ اور ان کے شوہر کے ساتھ بسر کیے۔ ملیہ کے دوسرے بچوں کے ساتھ کجگیاں چرانے کے لیے حضور بھی جایا کرتے تھے۔ حضور نے اپنے عروج اور بلند اقبال کے زمانے میں اپنی زبان مبارک سے فخر یہ یہ فرمایا تھا کہ میں تو ایک ایسا پیغمبر ہوں جو اپنے بچپن میں کجگیاں چرایا کرتا

تھا اور گلوں کی ننگی بان کیا کرتا تھا۔ چھ سال کی عمر میں یعنی ۵۷ء میں حضورؐ اپنی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کے ہاں مکہ آگئے۔ حضورؐ کو اپنی ماں کے پاس آکر ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ حضورؐ کی والدہ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یتیم تو تھے ہی اب یہ سیر بھی ہو گئے۔ ایک مختصر عرصے کے لیے حضرت آمنہ کی ایک لونڈی آپ کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ پھر آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کو اپنے ہاں بلالیا اور اپنے پوتے کا ہر طرح سے خیال رکھنا شروع کیا۔ دادا کی چاہت اپنے پوتے سے اتنی زیادہ تھی کہ وہ پوتے پر اپنی جان بچھاؤرتے تھے۔ دل بہلانے کی خاطر وہ معصوم پوتے سے کھیلا کرتے تھے۔

دو سال بعد شفقت و محبت کا یہ دنیاوی سہارا بھی اٹھ گیا۔ ۵۸ء میں عبدالمطلب کا انتقال ہو گیا۔ ماں کی رحلت پھر چھپتے دانہ کی مفارقت نے حضورؐ کی کم عمری میں زندگی کو چھنچور کر رکھ دیا۔ عبدالمطلب نے اپنی وفات سے قبل اپنے ایک بیٹے ابوطالب سے کہا کہ حضورؐ کی کفالت کا ذمہ لیں۔ ابوطالب حضورؐ کے والد حضرت عبدالمطلب کے حقیقی بھائی تھے۔ عبدالمطلب کے دوسرے بیٹے ابوطالب کے سوتیلے بھائی ہوتے تھے۔

ایک روایت کے مطابق جبکہ حضورؐ کی عمر ۱۲ سال تھی اور دوسری روایت کے مطابق ۹ سال حضرت ابوطالب تجارتی قافلے کے ساتھ شام گئے۔ جاتے ہوئے اپنے اس سفر میں حضورؐ کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ مسلم مورخین اس سفر کو فخریہ انداز میں اس لیے بھی بیان کرتے ہیں کہ اسی سفر کے دوران شام کے ایک عیسائی پادری نے حضورؐ کو دیکھ کر یہ پیش گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر پیغمبر بنے گا۔

یہ ملاقات یقیناً ہوئی ہوگی اس لیے کہ اس زمانے میں شام میں بہت سے عیسائی رہا رہا کرتے تھے۔

حضورؐ بچپن ہی سے سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے۔ حضورؐ کے بچپن کا ابتدائی زمانہ جس مصیبت اور اور ذہنی کرب میں گزرا اس کے پیش نظر سنجیدگی کا غالب آنا ایک فطری بات تھی۔ شاید یہی وہ سنجیدگی تھی جس کو دیکھ کر عیسائی پادری نے ایک ۹ یا ۱۲ سالہ لڑکے کو یہ کہہ دیا ہو کہ اس ہونہار کا مستقبل یقیناً تابناک معلوم ہوتا ہے۔ ۵۸ء اور ۵۹ء کے لگ بھگ جبکہ حضورؐ کی عمر ۲۰ سال کی ہوگی بنی قریش اور ان کے خلیفہ بنی کنانہ اور قبیلہ ہوازن کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ جنگ کا جو سبب تھا وہ چھٹی صدی عیسوی کے عرب

لوگوں کے طرز فکر اور طرز معاشرت کی اپنی خاصی تر جہاں کرتا ہے۔

نعمان بنعجم ابو قابوس محمد نامدان کا بادشاہ تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ مکہ کے قریب وجوار میں ہونے والے

سیلوں میں اپنے ملک کو سامان فروخت کے لئے روانہ کرے۔ ان سیلوں میں ایک بڑا سید عکاظ کے مقام پر

لگا کرتا تھا۔ یہ سید عکاظ کے موقع پر ہوا کرتا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ جو کاروان مختلف علاقوں سے

گزرتے تھے ان کاروانوں کے امیر گزرنے والے علاقوں کے سرداروں سے اپنی اور اپنے سامان کی حفاظت کی

ضمانت لیتے تھے۔ جو قبائل اس ذمہ داری کو قبول کر لیتے تھے اپنے فرض کو پوری عمدگی سے انجام دیتے تھے۔

نعمان بنعجم نے اپنے کاروان کی حفاظت کے لیے ہوازن کے ایک زبیر کا تعاون حاصل کیا۔ بنی کنانہ کے ایک

فرد نے جو اپنی چوری اور ڈکیتی میں ممتاز تھا، نعمان کو اپنی خدمات کی پیشکش کی لیکن اس کی بجزمانہ عادات کے

پیش نظر نعمان نے اس کی پیشکش کو رد کر دیا۔ اس کے باوجود بھی وہ اس کے تجارتی کاروان کے ساتھ ساتھ

ہو گیا جو میرہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوا تھا۔ دو پہر کی دھوپ میں جبکہ اہل کاروان سستارہے تھے بنی کنانہ کے

ایک فرد نے قبیلہ ہوازن کے ایک شخص کو قتل کر دیا اور ان کا کچھ سامان لے کر چلتا بنا قاتل کا تعلق نہ

صرف بنی کنانہ سے تھا بلکہ وہ قریش کے عرب ابن امیہ کے طرف داروں میں بھی تھا۔ جرم کی شدت اس وجہ سے

بھی محسوس کی گئی کہ وہ حج کے مہینے سے ایک ماہ قبل یعنی ذی قعدہ کے مہینے میں عمل میں آیا تھا یہ مہینہ عربوں

کے لیے ایک مقدس مہینہ تھا۔ اس مہینے میں کسی بھی قسم کی بے ہودگی اور بدترین قوی طور پر بہت بری کبھی جاتی تھی

اس واقعہ کے نتیجے کے طور پر قریش اور ہوازن کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ تقریباً سال تک ان دونوں قبیلوں کے

درمیان جھڑپیں ہوتی رہیں۔ پانچ سال تک ہر سال ایک بڑی لڑائی ہوا کرتی تھی۔ اس واقعہ کے وقت حضور کی عمر

شاہدہ سال ہوگی۔ اس لڑائی میں حضور نے بھی حصہ لیا تھا۔ اپنے چچا کی مدد و عمل طور پر اس طرح کی تھی کہ جو بھی تر

دشمن کی طرف سے آکر ان کے قبیلے کے قریب گرتے حضور ان تیروں کو جمع کر کے اپنے چچا کے حوالے کرتے

تاکہ وہ ان تیروں کو دوبارہ استعمال میں لائیں۔

حضور کے بچپن لڑکپن اور جوانی کے بہت ہی کم واقعات کا ہم کو علم ہے۔ گو حضور کے دادا عبدالمطلب

مکہ کے ایک بہت ہی بڑے آدمی تھے لیکن ان کے صاحبزادے حضرت ابوطالب کو غربت کی زندگی گزارنی پڑی۔

اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عبدالمطلب کی جائداد اور دولت اُن کے کئی فرزندوں میں تقسیم ہوئی اور ہر ایک کے حصے میں تھوڑی بہت جائداد آئی۔

اپنے چچا کی کفالت اور سرپرستی میں آنے کے بعد حضور کو پھر چند دن تک چرواہے کا کام کرنا پڑا حضور جب سن بلوغ کو پہنچے تو آپ نے اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح تجارت میں حصہ لینا شروع کیا۔ اس وقت کے دستور کے مطابق آپ اپنے چچا کے ساتھ تجارتی ٹولے کے ہمراہ یمن بھی گئے۔ ٹولے کے لوگوں میں آپ امین سے مخاطب کئے جاتے تھے۔ ٹولے واپس آئے آپ کی سنجیدگی اور متانت سے بہت متاثر ہوا کرتے تھے۔ آپ نے بعد میں ایک دفعہ یہ فرمایا کہ سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد اپنے عنقوانِ شباب میں آپ نے کبھی کوئی بے راہ روی اختیار نہیں فرمائی خدیجہ بنت خویلد قریش کی ایک مالدار خاتون تھیں۔ ان کی دو بار شادی ہو چکی تھی۔ وہ تجارت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ اپنے کاروانِ عرب کے دوسرے حصوں میں روانہ کرتی تھیں۔ اپنی تجارت کا حساب و کتاب خود کرتی تھیں۔ ۵۹۵ء میں جبکہ حضور کا سن مبارک ۲۵ سال کا تھا ابو طالب نے خدیجہ سے حضور کی سفارش کی اور اس سفارش کے نتیجے کے طور پر خدیجہ نے حضور سے خواہش کی کہ آپ ان کا کاروانِ تجارت اپنی نگرانی میں شام لے جائیں۔

خدیجہ نے حضور سے کہا کہ جو سامان آپ شام لے جا رہے ہیں وہاں فروخت کر دیں اور اس فروخت سے جو رقم وصول ہو اس سے شام کا سامان خریدیں جس کی کئی کے بازاروں اور میلوں میں کھپت ہو سکے گا ابو طالب کی سفارش بظاہر کام کر گئی لیکن حضور نے اپنے تجارتی تجربے، سنجیدگی، متانت اور دیانتداری میں سارے قریش میں وہ شہرت حاصل کر لی تھی کہ خدیجہ کو اپنا فائدہ اسی میں نظر آیا کہ قریش کے ایماندار ترین آدمی کے ذریعہ اپنی تجارت کو فروغ دیں اس لیے انہوں نے کاروانِ تجارت حضور کے حوالے کیا۔

روایات میں ہے کہ جب کاروانِ شمال کی طرف جا رہا تھا وہ پہر میں دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے کس جگہ قیام ہوا۔ حضور ایک درخت کے سائے میں آرام کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ ایک عیسائی پادری حضور کے قریب آیا جب اس نے دیکھا کہ حضور ایک خاص درخت کے نیچے لیٹے ہوئے ہیں تو اس نے کہا کہ اس درخت کے نیچے تو صرف پیغمبر ہی کو جگہ مل سکتی ہے۔ اس روایت کو صحیح ماننے میں ذرا

تکلف اس لیے مانع ہے کہ جس مقام پر اس واقعہ کا ہونا بیان کیا جاتا ہے وہاں کئی ایک درخت ہیں اور
 کرما کی دھوپ میں ہر درخت سایہ کا کام دیتا ہے اور ہر درخت کے نیچے اب تک شاید ہزاروں لاکھوں آدمی
 بیٹھتے اور سوتے آئے ہوں گے لیکن آج تک وہ درخت اردن میں موجود ہے آج بھی لوگوں کو وہ درخت اُس
 واقعے سے منسوب کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔

حضور کے ذریعہ حضرت خدیجہؓ نے جو کاروان تجارت شام روانہ کیا تھا اس کے مالی نتائج بہت بہتر
 صورت میں نکلے حضور کی انتظامی اور کاروباری صلاحیت سے حضرت خدیجہؓ بہت متاثر ہوئیں۔ اس
 کاروان سے جو خاطر خواہ فائدہ ہوا وہ بی بی خدیجہؓ کی دلی خوشی کا باعث ہوا۔ ابن اسحق لکھتے ہیں کہ
 حضرت خدیجہؓ بہت ہی سمجھدار، شریف النفس اور اپنے اصولوں کی بڑی ہی پابند خاتون تھیں۔ خدیجہؓ
 کی سمجھدار طبیعت نے ان کو اس بات پر مائل کیا کہ وہ حضور کی خدمت میں ان الفاظ میں شادی کا پیغام
 روانہ کریں کہ اے میرے چچا کے فرزند میں آپ کو بہت پسند کرتی ہوں۔ آپ اور میں ایک ہی خاندان سے
 ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ عوام میں کافی مقبول ہیں۔ میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔

حضرت خدیجہؓ کا یہ پیغام روانہ کرنا چند باتوں کی وجہ سے بہت ہی دلچسپ بن جاتا ہے۔ ایک طرف
 تو یہ شادی حضور کی زندگی کو ایک اہم موڑ پر لے آتی ہے اور دوسری طرف اسلام سے قبل عورتوں کی جو
 اہمیت تھی اس کا بھی اظہار ہو جاتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ ایک خود مختار خاتون تھیں۔ اپنے معاملات کو
 آپ چلایا کرتی تھیں۔ اپنی مرضی سے انہوں نے اپنے ہونے والے شوہر کا انتخاب کیا تھا۔ یہ پیغام
 حضور کی طرف سے نہیں گیا تھا بلکہ حضرت خدیجہؓ نے اس میں پہل کی تھی حضور نے اپنے چچا ابوطالب
 سے مشورہ کیا۔ چچا نے اپنے بھتیجے کو اس پیغام کو قبول کرنے کا مشورہ دیا۔

حضرت خدیجہؓ کے والد ایک قبیلہ وارانہ جنگ میں مارے گئے تھے۔ خدیجہؓ کے چچا عمر ابن
 اسد خاندان کے سرپرست تھے اور سرپرست کی حیثیت سے شادی کے لیے ان کی منظوری ضروری تھی
 اس منظوری کو حاصل کرنے کے لئے ابوطالب، حضور کے ایک اور چچا حمزہ اور خود حضور حضرت خدیجہؓ
 کے مکان گئے۔ بی بی خدیجہؓ نے اس بات کو ابھی راز ہی میں رکھا تھا ابھی تک اپنے چچا سے اپنی اس

خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ عمر ابن اسد حضرت خدیجہؓ کی مرضی اور منشاء سے قطعی لاعلم تھے۔

اس وقت کے رسم اور رواج کے مطابق حضرت خدیجہؓ نے اپنے چچا کی توامع مشروبات سے کی۔ اسد نے اتنی پی ل کہ ان پر نشہ کا عالم طاری ہو گیا۔ جب عمر ابن اسد مستی کے عالم میں تھے ابو طالب نے ایک قبیلہ کی تقریر کی اور عمر ابن اسد سے شادی کی منظوری کے لیے درخواست کی۔ درقہ ابن نوفل نے ابو طالب کی درخواست کی حمایت کی۔ عمر ابن اسد نے خاموشی اختیار کی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کی خاموشی کو رضامندی سے تعبیر کیا گیا اور شادی ہو گئی۔ چند گھنٹے بعد جب اس ابن اسد کا نشہ کا فور ہوا اور ہوش میں آیا تو اس نے سوال کیا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ حاضرین نے جواب دیا کہ وہ شادی کی محفل میں لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دلہا محمد ابن عبداللہؓ ہیں اور دلہن خدیجہؓ۔ حضرت خدیجہؓ کے چچا عمر ابن اسد نے کہا کہ یہ سب کچھ میری اجازت کے بغیر ہو رہا ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ وہ آپ ہی تو ہیں جنہوں نے میری شادی کر ڈالی اور اپنے چچا کی ناراضی پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا۔ عمر کو اس بات کا پتہ ہی نہیں چلا کہ دو تین گھنٹے پہلے اس کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا اس لیے اس نے اسی میں اپنی خیریت سمجھی کہ اب اس شادی پر اپنی رضامندی کا اظہار کرے حضرت خدیجہؓ نے اپنے چچا کے ساتھ جو کچھ کیا وہ اس لیے بحث طلب نہیں ہے کہ وہ آپ کا اپنا انفرادی فعل تھا بعثت سے قبل حضورؐ کی شادی ہوئی تھی۔ نشہ آور مشروبات پر اس وقت کوئی پابندی نہیں تھی حضرت خدیجہؓ عاقل و بالغ تھیں۔ یہ شادی ان کی اپنی مرضی سے ہوئی تھی حضرت خدیجہؓ نے خود یہ پیغام روانہ کیا تھا۔ رسمی طور پر چچا کی مرضی اور ان کی منظوری مانگی جا رہی تھی۔ حضرت خدیجہؓ نے منظوری حاصل کرنے کے لیے جو بھی بہتر طریقہ ہو سکتا تھا خود ہی منتخب کیا ہو گا پروفیسر سید نواب علی نے اپنی کتاب سیرت رسول اللہؐ کے ایک حاشیے میں لکھا ہے کہ

”روض الالف صفحہ ۱۲۲ میں ایک عجیب روایت منقول ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے اپنے والد کو شراب پلا کر نشہ کی حالت میں نکاح پڑھوایا۔ جب باپ کو ہوش آیا تو بیٹی کی اس کاروائی پر بہت ناراض ہوئے اس روایت سے اموی دربار کی سیر مستی کی بُرائی ہے۔ عروہ بن زبیرؓ نے حضرت عائشہؓ سے اور عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے جو روایت نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ نکاح حضرت خدیجہؓ کے چچا عمر ابن اسد نے پڑھا۔

حضرت کا دامن اس واقعہ سے اس لیے طوٹ نہیں کیا جاسکتا کہ بقول ابن اسحق "پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جوان ہوئے اور اللہ ہر ایک شر و فساد سے آپ کی حفاظت کرتا تھا اور جاہلیت کی ہر ایک ناپاکی سے آپ کو پاک رکھتا تھا کیوں کہ وہ آپ کو کرامت اور رسالت عطا کرنے والا تھا۔ چنانچہ جب آپ بالغ ہوئے تو اپنی قوم میں سب سے بڑھ کر بامروت صاحب اخلاق، شریف، منساہر بڑے عظیم راست گو، امانت دار تھے۔ نقش و افلاق ذمیر سے جو شرافت انسانی کے لیے حضرت رسال ہیں، بہت دور تھے یہاں تک کہ قوم نے آپ کو الامین کے لقب سے یاد کیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے امور صحابہ آپ میں جمع فرما دیے تھے (ابن ہشام جلد اول صفحہ ۱۴۲)

(حضرت کے اخلاق عالیہ سے یہ بات میل نہیں کھاتی کہ حضور کو خدیجہ اور اسد کے درمیان جو ذہنی فصل تھا اس کا علم ہو اور حضور کو ان کے طریقہ کار سے اتفاق بھی ہوا ہو۔ چونکہ مسلم مورخین نے اس روایت کو بیان کیا ہے اس لیے گھب پاشاہ نے بھی اس واقعہ کو اپنی کتاب میں جگہ دے دی واللہ اعلم۔ حبیب)

روایات کے مطابق حضرت خدیجہ کی عمر شادی کے وقت ۱۴ سال تھی۔ ایک مورخ کے بیان کے مطابق ان کی عمر ۲۸ سال تھی۔ شادی کے بعد حضرت خدیجہ کے چھ بچے ہوئے جن میں دو لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔ یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ شادی کے وقت خدیجہ کی عمر ۱۴ سال ہوگی۔ خدیجہ کے بطن سے ہونے والی اولاد سب کی سب ۱۴ سال سے کم عمر میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ان کے بچوں میں سے کسی نے بھی ۱۴ سال سے زیادہ کی عمر نہ پائی۔ اکثر تو بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ دو لڑکیوں کا انتقال ایام منوینت ہی میں ہوا۔ اس سے قطع نظر یہ شادی باقی تمام پہلوؤں سے کامیاب رہی۔ شادی کے وقت حضور کی عمر ۲۵ سال تھی۔ حضور خاموش اور تنہا پسند تھے۔ اس کے باوجود ذات اقدس کو اپنے بچوں سے بڑا ہی پیار تھا۔ جب بھی وقت ملتا اپنے بچوں کے ساتھ گزارنے ازدواجی زندگی بہت ہی خوشگوار اور کامیاب ترین رہی اپنی بیوی بچوں کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ ان سے ہمیشہ خوش مزاجی سے پیش آتے تھے۔

یادگار تاریخیں

- ۶۴۲۰ خزانہ قبیلہ کے سردار کی لڑکی سے قصی کی شادی
- ۶۴۴۰ مکہ پر قصی کا اثر و نفوذ
- ۶۴۹۰ حضور کے دارا عبد المطلب کی پیدائش
- ۶۵۱۰ سال فیل -
- ۶۵۱۰ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش
- ۶۵۱۸ عبد المطلب کا انتقال
- ۶۵۴۸ حضور کا ابوطالب کی سرپرستی میں آنا
- ۶۵۹۵ حضور کا خدیجہ سے نکاح

پیغمبر از دعوت

شادی کے کچھ عرصہ بعد تک حضور بھارت ہی میں معروف رہے۔ تواریخ میں پوری طریقے سے اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ آیا حضور شادی کے بعد بھی حضرت قدیمؑ ہی کے مال کی تجارت کیا کرتے تھے یا آپ نے خود اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔ چونکہ آپ کے تمام رشتہ دار بھارت ہی میں لگے ہوئے تھے۔ اس لیے آپ کو بھی بھارت ہی میں حصہ لینا پڑا۔ قرآن پاک میں کی جگہ بھارتی زبان استعمال ہوتی ہے۔ جس میں انھنی پہلوؤں کا ذکر ہے۔

۶۰۵ میں حضور کی عمر ۲۵ سال تھی۔ قریش نے فیصلہ کیا کہ کعبہ پر چھت ڈالی جائے۔ اس وقت تک کعبہ صرف چار دیواروں پر مشتمل تھا اس پر کوئی چھت نہیں تھی چھت ڈالنے کے لیے ضروری تھا کہ اس کی دیواریں مضبوط ہوں۔ چونکہ دیواریں بوسیدہ ہو گئی تھیں اس لیے کعبہ کی دیواروں کو گرا کر اہنی کی جگہ نئی دیواریں کھڑی کرنی تھیں۔ ان لوگوں کو دیواریں ڈھانے اور نئی دیواریں کھڑی کرنے میں یہ خطرہ تھا کہ جو بت کعبہ میں نصب ہیں کہیں غلاب نازل نہ کر دیں۔ غصے میں نہ آجائیں۔ ان میں سے ایک آدمی جو زیادہ جرات مند تھا آگے بڑھا اور اپنے ہاتھ میں کدال لیے ہوئے ایک دیوار کے قریب کھڑا ہو کر زور سے چلانے لگا کہ اے بتو! ہم یہ کام تمہاری بھلائی کے لیے کر رہے ہیں گھبرانا نہیں۔ کہہ کے لوگ تمام رات اسی گھبراہٹ سے نہ سو سکے کہ کہیں ان لوگوں پر کعبہ کی دیواریں گرانے سے کوئی آفت نہ آجائے۔ کہیں ان لوگوں کے بت ان سے ناراض ہو کر ان کا نقصان نہ کر دیں۔

جب صبح ہوئی تو مکہ کے تمام لوگ کیسے کے اطراف جمع ہو گئے۔ خوشی کا اظہار کرنے لگے کہ ان کے بتنا ان کے اس کام سے راضی ہیں جب ہی تورات میں ان پر کوئی بلا نازل نہیں ہوئی۔

جدہ کے ساحل پر ایک یونانی جہاز تباہ کن حالت میں ملا تھا۔ جہاز کی لکڑی مکہ لائی گئی۔ اس لکڑی سے کعبہ کی چھت بنائی گئی۔ ایک مصری تبار کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اسی نے چھت کے کام کو پورا کیا۔ لکڑی کی کمی اور تباہی اور فن کاروں کے فقدان نے ہی شاید اس وقت تک کعبے کو بغیر چھت کے رکھا ہو۔ کعبے کے اطراف رہنے والے بھی اکثر ڈینٹسٹ ڈیروں اور قنائوں کا استعمال کیا کرتے تھے۔ یونانی جہاز کی تباہی، لکڑی کی فراہمی اور مصری تبار کی موجودگی چھت کی تعمیر کا وسیلہ بن گئی۔

کعبہ کی عمارت پر چھت کا نہ ہونا اس وقت کوئی ایسی بات نہ تھی جی وجہ سے اس کی حرمت میں کوئی فرق آتا۔ پہلے تو یہ کہ مکہ میں بہت ہی کم بارش ہوتی ہے۔ دوسرے ڈیرے اور قنائیں گرمی اور لو کو روکے رکھتی ہیں۔ مکہ میں ایسے کوئی بڑے درخت نہیں آگے تھے جس کو کاٹ کر لوگ اپنے گھروں کے چھت بناتیں۔ اذمٹوں کے ذریعہ شام یا مین سے لکڑی لانا مشکل تھا۔ جب لکڑی ہی نہ ہو تو لکڑی کے کام کرنے والے کہاں ہوں گے۔ اس معاملہ میں مکہ جزیرہ نائے عرب کے دوسرے حصوں سے قنلت تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس وقت سے ہزار سال پہلے مین میں لوگ پتھروں کی بنی ہوئی کئی منزلیں بہترین عمارتوں میں رہا کرتے تھے ان کی عمارتیں فن تعمیر میں اپنی مثال آپ ہوا کرتی تھیں۔ بعض علاقوں میں تو سنگ مرمر کا بیشتر استعمال ہوتا تھا۔ کعبہ کی قدیم عمارت میں ایک کالا پتھر نصب تھا۔ اس پتھر کو حجرِ اسود کہا جاتا ہے عرب اس کو بہت ہی مقدس مانتے تھے۔ جب دیواروں کی تعمیر کے دوران وہ حصہ آگیا جہاں حجرِ اسود نصب ہونا تھا تو قریب کے سردار کی یہ خواہش تھی کہ یہ سعادت وہ اپنے ذمے لے۔ بات نے بہت طول کھینچا اور بخت و مباحثہ اتنا بڑھا کہ ہاتھ پائی تک کی نوبت آگئی۔

عبدالدار کے قبیلے کے لوگ جن کے ذمہ کعبہ کی تولیت تھی اپنے اس حق پر مصر تھے انہوں نے ایک بڑے کٹورے میں خون بھرا۔ اپنے خاندان کے افراد سے کہا کہ وہ خون میں ہاتھ ڈال کر قسم کھائیں کہ حجرِ اسود کو ان ہی کے قبیلے کا سردار نصب کرے گا۔

بنی قریظہ کی شاخ کا ایک آدمی ابو امیر بیست بنی قریظہ اور قبرہ کا تھا اس نے تجویز پیش کی کہ تمام مہاجرین
 اس بات پر متفق ہوں کہ اس لمحے کے بعد جو آدمی بھی باہر سے مدد کعبہ میں پہلے آئے اس کو تمام مہاجرین اپنا
 بیٹا مقرر کریں۔

اس تجویز کو مہاجرین نے منظور کر لیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ چند ہی منٹ بعد حضورؐ وہاں اچانک تشریف
 لائے۔ لوگوں نے اس قسم کی ساری روداد حضورؐ کے آگے رکھی۔ آپ نے فرمایا کہ ایک چادر لائی جائے۔
 جب چادر لائی گئی تو آپ نے اس چادر پر قبر اسود رکھا اور تمام فائدہ انوں کے سر پر ایسوں سے کہا کہ چادر کے کونے
 تختے رکھیں۔ لوگوں نے چادروں حلقے سے اس چادر کو کپڑا کر اٹھایا۔ جب وہ چادر اتنی اونچی ہو گئی
 جتنی پر قبر اسود نصب ہوا تھا تو حضورؐ نے اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو اسکی مقرر کردہ جگہ پر نصب
 فرمادیا۔

ہی وقت کعبہ میں ماضی دینے کے چند شرائط تھے۔

جب مکہ سے باہر کے لوگ کعبہ میں ماضی دینے کے لیے آتے تو اپنے ساتھ حرم کعبہ میں حرام یا
 ناجائز غذا قسم کی سے کوئی چیز نہیں لاسکتے تھے۔ حرم میں ماضی دینے والوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ سات دفعہ
 کعبہ کی عمارت کا طواف کریں۔ حرم کعبہ میں لباس کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اس وقت کے جائز قسم کے
 لباس کا پہنا ضروری تھا۔ لباس کی پانپندی کی وجہ سے مکہ کے کپڑا بیچنے والے تاجروں کو یہ فائدہ ہوتا تھا کہ
 سال میں ایک دفعہ ان کے کپڑے کی اچھی خاصی تجارت ہو جاتی تھی۔ خوب کپڑا بکتا تھا۔ جو لوگ اس خاص
 قسم کے لباس کو اپنی غربت کی وجہ سے نہیں پہن سکتے تھے ان کے لیے اس بات کی اجازت تھی کہ وہ
 برتنہ کعبہ کا طواف کریں۔

حضورؐ کی شادی کے بعد اور نبوت کا اعلان کرنے سے پہلے تاریخ یہ کہتی ہے کہ چار آدمی
 مکہ میں ایسے موجود تھے جنہوں نے کعبہ میں بتوں کی پوجا سے توبہ کر لی تھی۔ ان میں سے ایک ورقہ بن
 نوفل تھے جو حضرت خدیجہؓ کے رشتہ کے بھائی تھے۔ ورقہ بن نوفل نے اہل امی کتب کا مطالعہ کیا تھا
 دوسرا آدمی حبشہ چلا گیا وہاں عیسائیت اختیار کر لی۔ تیسرے نے اہل یمن کو ہجرت کی اور اس نے بھی

عیسائیت کو قبول کر لیا۔ چوتھے توحید پرست تھے جن کا نام زید ابن عکرا بن طفیل بنا یا جاتا ہے۔ انہوں نے بت پرستی سے توبہ تو کی لیکن نہ یہودیت کو اختیار کیا اور نہ عیسائیت کو۔ زید کے انتقال کے کئی سال بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ کی صاحبزادی اسماءؓ لوگوں سے کہا کرتی ہیں کہ زید اپنے بڑھاپے کے زمانے میں خانہ کعبہ کے ایک کونے میں بیٹھے کہا کرتے تھے کہ اے اللہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تیری پرستش اور عبادت کس طرح سے کی جائے تو میں اسی طریقے کو اختیار کرتا لیکن افسوس میں اس علم سے محروم ہوں۔ ان کے خاندان کے لوگ ان کی باتوں کا مذاق اڑاتے اور وہ ان لوگوں کے مذاق سے تنگ آ کر ایک بار عراق اور شام کی طرف بھی نکل گئے۔ عیسائی اور یہودی علماء سے اپنی ذہنی کشمکش کا اظہار کرتے لگے۔ ان علماء کے جوابات سے ان کو تشنی نہ ہوئی۔ جب وہ اپنے سفر سے مکہ واپس ہو رہے تھے راستے میں چند لٹیروں نے ان کو قتل کر دیا۔

اوپر کی مثال سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کس طرح مکہ میں لوگوں کے ذہن آہستہ آہستہ تبدیل ہو رہے تھے اور کس طرح ان کے انداز فکر میں تبدیلی آرہی تھی۔ مذہبی تعصب نام کو بھی نہیں تھا۔ عیسائی اور یہودی تاجر تجارت کی غرض سے مکہ کے میلوں اور بازاروں میں جا یا کرتے تھے۔ بلا کسی خوف و خطر اپنے اپنے مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ جب مکہ کے لوگ اور خصوصاً قریش ایران، شام اور مصر جاتے اور وہاں کے عیسائیوں یا یہودیوں کو دیکھتے تو دل ہی دل میں اپنی بت پرستی پر لعن طعن کرتے اور دوسرے مذاہب کو پیش نظر رکھ کر اپنی غامیوں کا جائزہ لیتے تھے۔ مکہ کے رہنے والوں کی مذہبی نگرانی کے تجارتی مفاد سے وابستہ رہتی تھی۔

مکہ میں بھی ایسے سنی اور نیک بخت لوگ تھے۔ جو غریبوں کی غلی مدد کرتے تھے۔ جن نومولود بچوں کو ان کے مال باپ اپنی غربت کے باعث اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتے تھے ان بچوں کو وہ ان کے مال باپ سے لے کر ان کی پرورش کرتے تھے۔ قیدیوں کو رہا کروایا کرتے تھے۔ غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے ان کے مالکوں کو کثیر رقم دیا کرتے تھے۔ ان سب خوبیوں کے باوجود بھی وہ لوگ کسی خاص مذہب سے وابستہ نہیں تھے۔

عربوں کے تعلق سے یہ بات بڑی مشہور کی گئی ہے کہ وہ اپنی پیموں کو پیدا ہونے کے بعد ہی زندہ دفن کر دیا کرتے تھے معنی قہر کوئی ہے۔ بعض قبیلے تو ایسے بھی تھے جو لڑکیوں کی پیدائش کو اپنی بند اقبال کی نشانی سمجھتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ چند جنوبی ایسے بھی ہوں جو اس ڈر سے کہ ان کی پیمیاں بڑی ہو کر کہیں آوارہ اور بدکار نہ نکلیں ان کو پیدا ہونے کے بعد ہی مار ڈالتے ہوں۔ پیموں کی شادیاں ۸ یا ۹ سال میں کر دینے کا ہوا نہ بھی ان کی اس ذہنیت میں ملتا ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کی عنف و عنست کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس معاملے میں اسلامی مورخین نے قبل اسلام کے عربوں کے ساتھ بہت ہی زیادتی کی ہے۔ اس رنگ آمیزی کا ثبوت شاید یہ ہو کہ لوگوں کے دلوں میں قبل اسلام کی گھناؤنی تصویر پہلے پیش کی جائے اور پھر اسلام کی خوبئوں کا ذکر کیا جائے۔

دوسری طرف تاریخ جس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ یہ کہ ٹوڑتیں بہادر ہوتی تھیں۔ خانہ بدوش قبیلوں کی ٹوڑتیں میں بہت کا عنقر کوٹ کوٹ کر بھرا گیا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے حضرت خدیجہؓ اپنی تجارت کی آپ نگہبان تھیں۔ عرب کی ٹوڑتیں شاعری اور علم نجوم میں بہت ممتاز تھیں۔

مکہ کے سالانہ میلوں اور بازاروں میں شاعری کے مقابلے ہوتے تھے ان مقابلوں میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش حصہ لیا کرتی تھیں۔ عربوں کی ونداری اور خوش اخلاقی بھی تاریخ میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ وہ باتیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے اوپر کی بیان کردہ خصوصیات و صفات ان کا قومی سرمایہ بن گئیں۔ ایک تو آپس میں قبیلہ واری رقابت اور دوسرے پولیس کا نہ ہونا۔

پولیس کی عدم موجودگی اور قبیلہ واری رقابت ان لوگوں کو مجبور کرتی تھی کہ وہ لوگوں کو اپنانے کے لیے خوش اخلاقی سے پیش آئیں اور قبیلے کی ونداری کے اظہار کا خاص اہتمام کریں۔ اپنے ناموس کی حفاظت اور کسی کے قتل کا بدلہ ان کو دوسروں کے قتل کے لیے مجبور کیا کرتا تھا۔ عربوں کی قومی خصوصیات میں زمین آسمان کا تضاد پایا جاتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ ان کی اکثریت کی جہالت تھی۔ مختلف حصوں میں مختلف قسم کے لوگ پائے جاتے تھے۔ ان مختلف قسم کے لوگوں میں مختلف قسم کی خصوصیات کے حامل لوگ تھے ایک طرف تو سماوت کے دریا بہتے تھے۔ یہاں تواری اپنا جواب نہیں رکھتی تھی بہادری اور شجاعت ہر لمحہ

ایک نئی شان دکھاتی تھی اور دوسری طرف وعیشیانہ پن اتنا کہ بات بات پر تلوار نیام سے باہر نکل آتی تھی۔ نسل در نسل قائدانی دشمنی کا چکر پلٹا رہتا تھا۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی باتیں کی جاتی تھیں۔ عشق و محبت کی داستانوں کو دہرایا جاتا تھا۔

یہی وہ تضاد تھا جس نے زید ابن عمر ابن طفیل جیسے لوگوں کو وحدانیت کی طرف مائل کر دیا تھا اس وقت کے معاشرہ کا مادی یا ذہنی تضاد آج کی بیسویں صدی میں پوری طریقے سے ہماری سمجھ میں آئیے نہیں آتا کہ ہمارے ہاں اخبارات میں، ریڈیو میں، ٹیلیوژن میں اور بہت سے ایسے وسائل ہیں جن کی بدولت ہمیں دینا اتنی چھوٹی نظر آتی ہے کہ ہم ساری دنیا کے مسائل کو بیک وقت دیکھ سکتے ہیں۔ ان کا تقابل کر سکتے ہیں۔ اس عالمی نظریہ عالمی فکر کی عمر بمشکل پچاس سال ہوگی۔ اس سے پہلے کے مسائل اور لوگوں کے حالات میں جو تضاد نظر آتا ہے۔ وہ صرف اسلام سے قبل ہی کے لیے مخصوص نہیں رہا ہے۔ وہ تضاد لاطینی اور بے بصری سے ہر جگہ نمایاں ہوتا رہا ہے

حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد حضورؐ کی زندگی کے ۱۵ سال یعنی ۵۹۵ء سے ۶۱۰ء تک عام حالات میں گزرے۔ کچھ وقت تو تجارت میں صرف ہو جاتا تھا۔ شادی کے بعد آپؐ کوئی بڑا تجارتی سفر نہیں فرمایا۔ فکر روزگار کو حضرت خدیجہؓ کی دولت نے کچھ کم کر دیا تھا۔ آپؐ اللہ کی اس دی ہوئی نعمت سے خوب واقف تھے۔ قرآن کریم کی ابتدائی کئی آیتوں میں اس نعمت کا ذکر ہے۔ سورہ ضحیٰ کی آیات ہیں جن کا مفہوم ہے۔

”آپؐ کا خدانہ ہی آپؐ کو بھولا ہے اور نہ ہی آپؐ سے ناراض ہوا ہے۔ کیا آپؐ کو اس وقت سہارا نہیں دیا گیا جبکہ آپؐ یتیم تھے؟ کیا آپؐ کی اس وقت رہنمائی نہیں کی گئی جبکہ آپؐ مہلک رہے تھے؟ آپؐ احتیاجات کی تکمیل کے لیے کوشاں تھے اور اللہ نے آپؐ کو عینی کر دیا۔“

اس زمانے کے دو واقعات کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہوگا۔ حضورؐ ایک ایسے یتیم تھے جس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا اور اپنے چچا ابوطالب کے زیر سایہ پروان چڑھ رہے تھے۔ اس کے بعد غربت کا ساتھ رہا۔ شادی کے بعد حضورؐ نے اپنے چچا کا احسان اس طرح چکایا کہ ان کے صاحبزادہ علیؓ ابن ابی طالب کو اپنے زیر پرورش لے لیا۔ گو حضرت علیؓ حضورؐ کے چچا زاد بھائی تھے لیکن حضورؐ

حضرت نے ان کو اپنا بیٹا بنایا تھا۔

زید بن مارثہ ایک عیسائی لڑکا تھا۔ جنوبی شام میں اسکی پیدائش ہوئی تھی۔ جب وہ بچہ تھا تو ڈاکوؤں نے اسے لوٹ لیا تھا۔ انکو اگر کے اسے غلام کی حیثیت سے بیچ دیا۔ حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے جبکہ وہ بھارت کے لیے شام گئے تو اسے بھی اس غلام زید کو خرید کر مکہ لے آئے اور اپنی چچی حضرت خدیجہؓ کے حوالے کر دیا شادی کے بعد جب حضورؐ نے حضرت خدیجہؓ کے گھر میں اس غلام کو دیکھا تو اس طرح سے شفقت مہربانی سے پیش آئے کہ بی بی خدیجہؓ نے اس غلام کو حضورؐ کی نذر کر دیا۔

کچھ دنوں بعد زید کے باپ جو اپنے انوشادہ بیٹے کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے مکہ پہنچے زید کو مکہ میں پایا تو حضورؐ کی خدمت میں ایک بڑی رقم کی پیش کش کی اور کہا کہ زید کو آزاد کر دیں۔ حضورؐ نے زید کو طلب فرمایا اور زید کے سامنے دو صورتیں رکھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ واپس چلا جائے۔ دوسری یہ کہ اگر وہ چاہے تو حضورؐ کے ساتھ مکہ ہی میں رہے۔

زید نے دوسری صورت کا انتخاب کیا۔ اپنے باپ کے ساتھ واپس جانے سے انکار کر دیا۔ زید کے اس اپنائیت کے جذبے نے حضورؐ کو اتنا متاثر کیا کہ فوراً زید کو حدود کعبہ میں لے گئے اور اعلان فرمایا کہ اب زید غلام نہیں ہیں بلکہ بیٹے ہیں۔

حضورؐ کے دو صاحبزادے جو حضرت خدیجہؓ کے بطن سے ہوئے تھے ایام طفولیت ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ اب حضورؐ کے گھرانے میں دو لڑکوں کا انفاذ ہو گیا۔ ایک تو تھے علیؑ ابن ابی طالب اور دوسرے زید بن مارثہ۔

حضورؐ ان دونوں لڑکوں کو اپنے حقیقی بیٹوں کی طرح سے عزیز رکھتے تھے اور شفقت پدرانہ کا اظہار روز و شب ہوا کرتا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا رہا حضورؐ کی عبادت و ریاضت میں انفاذ ہوتا رہا۔ مکہ کی معروف تجارتی زندگی سے بیزار ہو کر آپ اکثر و بیشتر پہاڑوں کا رخ کرتے تھے جہاں سے تنہائی میں اپنے مولیٰ سے راز و نیاز میں اپنے آپ کو معروف رکھتے۔ ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر آپ کو تنہائی میں عبادت کرنے

میں خوب لطف آتا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ آپ نے شام کے سفر میں عیسائی راہبوں کو ایسا کرتے دیکھا تھا ان کا بیٹرز عبادت شاید حضور کو پسند آیا ہو۔

اس قسم کی عبادت کا طریقہ اس وقت کے بت پرستوں میں بھی رائج تھا جب لوگ دنیا کی گہما گہمی سے بیزار ہو جاتے تو پہاڑوں کا رخ کرتے اور تنہائی میں اپنے بتوں کی پوجا کرتے تھے۔

حضور کے دادا عبدالمطلب کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ رمضان کا پورا مہینا غار میں بسر کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اسلام سے پیشتر مکہ کے بعض اور بھی افراد رمضان میں روزے رکھتے تھے۔ شراب سے پرہیز کرتے تھے اور دوسری لغویات سے احتراز کرتے تھے۔

حضور کے خیالات، مشاہدے اور فکر و نظر پر عیسائیوں اور نصرائیوں سے ملنے ملانے سے شعوری یا لا شعوری طور پر ان کے عقیدے کی گہری چھاپ پڑی تھی۔

مکہ کا قدرتی محل وقوع، پہاڑوں کا سلسلہ، ترکاریوں، پھولوں اور پھلوں کا فقدان اور دن کی طبعی دھوپ کے ذہن میں دوزخ کا اچھا فاصلہ نقشہ پیدا کر دیا تھا۔ حضور پہاڑوں پر چڑھتے اترتے اور اور دشوار گزار راستوں سے آتے جاتے اور زندگی کا گہرا تعلق عقیقی سے جوڑا کرتے تھے اور حضور کی ہمنوائی کے لیے حضور کی نگسارا اور وفادار رفیقہ حیات حضرت خدیجہؓ حضور کے ساتھ تھیں۔

حضرت عائشہؓ جو حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد حضور نبی کریمؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ ازواج سے منسلک ہوئیں فرماتی تھیں کہ حضور کو تنہائی بہت پسند آنے لگی تھی آپ اکثر غارِ حرا تشریف لے جاتے تھے۔ وہاں کسی کئی راتیں غور و فکر میں بسر ہوا کرتی تھیں۔ غارِ حرا کی عبادت سے فارغ ہوتے تو اپنے گھر کا رخ فرماتے جہاں گھر کی ساری ضروریات کی تکمیل کا انتظام فرماتے تاکہ پھر غارِ حرا جا کر سکون سے عبادت کر سکیں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رمضان ۶۱۰ء کی ایک رات نھی جبکہ حق کا انکشاف حضور پر ہوا اور کہنے والے نے کہا کہ اے محمدؐ آپ خدا کے پیغمبر ہیں۔ حضور فرماتے ہیں کہ جس وقت یہ آواز آرہی تھی میں کھڑا ہوا تھا۔ اس آواز کو سن کر سر پہ سجود ہو گیا۔ وحی لانے والے نے کہا، پڑھ، حضور نے فرمایا، میں پڑھ نہیں سکتا، یہاں میں پڑھنا نہیں جانتا، وحی لانے والے نے حضور کو اپنے سینے سے اتنی سختی سے چمٹا لیا کہ حضور کو سانس

لینا مشکل معلوم ہوتے گا۔ یہ عمل تین بار دہرایا گی۔

عربی الفاظ کی ذمہ داری تہا کی یہاں مسئلہ کھڑا کر دیا۔ حضورؐ کا جواب تھا: "ما اقرارہ اس کے معنی ایک تو یہ ہوتے ہیں کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس کے دوسرے معنی ہوتے ہیں "میں کیا پڑھوں؟" میں پڑھ نہیں سکتا یا پڑھنا نہیں جانتا۔ یہی معنی اکثر مسلم مفسرین نے اختیار کیے ہیں۔ اس آیت سے مسلم علماء یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضورؐ اسی معنی میں حضورؐ کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ یہاں مسلم علماء کا یہ کہنا کہ حضورؐ کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس وقت مکہ کے اکثر تاجرانہ اور حضورؐ کو تاجرانہ جو شام وغیرہ کا سفر کیا کرتے تھے پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ چونکہ حضورؐ کی سرپرستی ابو طالب کر رہے تھے اس لیے ممکن ہو کہ آپؐ کی تعلیم اوسط سے کچھ درجے کی رہی ہو۔ حضورؐ کی امی قرار دینے وقت شاید قرآن کے مجوزہ کو ظاہر کرنا مسلم علماء کا جتنا ربا ہو۔ عربی کے طالب علم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ حضورؐ کے زمانے میں شام کے عیسائی قرآن کے معنی قرأت کے لیتے تھے نہ کہ پڑھنے کے۔

جو کچھ بھی ما اقرارہ کے معنی بیان کیے جائیں یا اسکی تاویل کی جائے وہ بذات خود نزول وحی کے واقعہ پر کسی طریقے سے بھی اثر انداز نہیں ہوتا۔ صرف یہ بات میں فرق پیدا کر دیتا ہے کہ حضورؐ پڑھنا لکھنا جانتے تھے یا نہیں۔

وحی لانے والے نے تین دفعہ حضورؐ سے پڑھنے کیلئے کہا اور حضورؐ نے ما اقرارہ کا جواب دیا۔ قاصد وحی نے حضورؐ کو تین دفعہ اپنے سینے سے پھٹایا اور چھوڑا اور اس کے بعد سورہ اقرار تلاوت کرنے کے لیے حضورؐ سے کہا۔ جیسے ہی وحی لانے والا قاصد ہوا حضورؐ پر ایک انتظار کی کیفیت طاری ہوئی۔ آپؐ ایک عجیب و غریب ذہنی کرب میں اپنے آپ کو پانے لگے۔ ذہنی انتشار میں آپؐ نے فرمایا کہ میں ایک پہاڑی کی اونچی چوٹی پر جاؤنگا اور وہاں سے اپنے آپ کو نیچے گرا کر ہلاک کر لوں گا تاکہ مجھے ذہنی سکون ملے۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ جب میں اس ارادہ کو عملی جامہ پہناتے کے لیے پہاڑ کی بلندی کی طرف بارہا تھا مجھے عجیب سے آواز آئی "اے محمدؐ آپؐ تو خدا کے پیغمبر اور رسول ہیں۔ میں اس آواز کو غور سے سنتا رہا۔ آسمان کی طرف میری نظریں اٹھنے لگیں۔ وحی لانے والا ایک آدمی کی شکل اختیار کر گیا۔

افت کے ایک سکرے دوسرے سکرے تک اس آدمی کا وجود مجھے نظر آ رہا تھا۔ میں اس وقت تک کھڑا رہا جب تک وہ شکل مجھے نظر آتی رہی۔ جب وہ شکل غائب ہوگی تو میں اپنے گھر واپس چلا آیا۔ سیدھے خدیجہ کے برابر بیٹھ گیا اور خدیجہ کو اپنے قریب سے قریب تر آنے کے لیے کہا۔

چونکہ غارِ حرامہ سے صرف دو یا تین ہی میل کے فاصلے پر ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ حضور اس واقعہ کے ایک گھنٹے کے اندر ہی اپنے گھر پہنچ گئے ہوں۔

وحی کی آمد دو طریقے سے ہوتی تھی۔ ایک تو یہ ہے کہ وحی لانے والا نظر آتا تھا۔ دوسری یہ کہ صرف آواز سنائی دیتی تھی۔ بعض اوقات کچھ دیکھنے میں آجاتا تھا اور کچھ سن لیا جاتا تھا۔ حضور کی پہلی وحی اور بیت المقدس میں تشریف آوری کا تعلق وحی کی پہلی قسم سے تھا۔ جہاں حضور سب کچھ دیکھ رہے تھے حضور کی ذات گرامی پر قرآن کا نزول وحی کی دوسری قسم میں ہے۔ جہاں حضور وحی کو سن کر قرآن پاک کو اکٹھا فرما رہے تھے۔ وحی کا یہ سلسلہ حضور کی ساری زندگی تک جاری رہا۔

جب آپ گھر تشریف لائے تو سارا واقعہ حضرت خدیجہ کو سنایا جو کچھ بھی آپ نے دیکھا، جو کچھ بھی آپ نے سنا اور جو کچھ بھی آپ پر گزری اس کا اظہار جوں توں کر کے اپنی رفیقہ حیات کے سامنے کیا۔ آپ ہر سال اور پریشان تھے کہ کہیں مشاہدہ اور تجربہ آپ کو غلط راہ پر نہ بھٹکا دے۔ اس لیے کہ اس وقت کے زمانے میں خلافت معمول باتیں بعض بعض لوگوں سے سرزد ہو جایا کرتی تھیں۔

جب حضرت خدیجہ نے ساری روداد سنی تو بڑے ہی جوش و خروش سے حضور سے فرمایا کہ آپ کو مبارک ہو۔ جس کے ہاتھ میں خدیجہ کی جان ہے اسکی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ خدائے آپ کو رسالت اور پیغمبری عطا فرمائی ہے آپ ہم سب لوگوں کے لیے پیغمبر اور رسول ہیں۔ خدا آپ کو بھی رسوا نہیں کرے گا وہ آپ کے غلوں اور آپ کی سچائی سے اچھی طرح سے واقف ہے۔

جب آپ کو کچھ سکون ہوا تو خدیجہ اپنے رشتہ دار ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ واضح رہے کہ ورقہ بن نوفل ایک مذہبی آدمی تھے۔ خدا کے متلاشی اور اسی شوق نے ان کو عیسائیت کی طرف بھی راجع کر دیا تھا۔ انہوں نے عیسائی مذہبی کتابوں کا عربی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ حضرت خدیجہ نے حضور پر

نزول ہوئی ساری باتوں کا ذکر ورقہ بن نوفل سے کیا اس سلسلے میں ان کی رائے دریافت کی۔
 ورقہ نے کہا کہ اگر یہ ساری باتیں سچ ہیں جو تم نے مجھ سے بیان کی ہیں۔ تو یہ وہی اسی انداز کی ہے
 جیسی حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی تھی۔ مگر اسے جا کر کہہ دو کہ مبارک ہو۔ خدا نے ان کو رسالت اور پیغمبری سے
 سرفراز فرمایا ہے۔

حضرت خدیجہ بنی سید سے اپنے مکان واپس ہوئیں۔ ورقہ نے جو کچھ بیان کیا بے کم و کاست حضور کے
 آگے بیان کر دیا۔ ورقہ اور حضرت خدیجہ کی ہمت افزائی نے حضور کے حوصلے بہت بلند کر دیے
 ابن اسحاق اور طبری کے بیان کے مطابق حضور نے یہ فرمایا کہ پہلی وحی لانے والے جبرائیل تھے۔ بہت
 سے علماء کا بیان ہے کہ مکہ کے ابتدائی دور میں نزول قرآن کے دوران کسی جگہ بھی جبرائیل کا ذکر نہیں کیا گیا ہے
 حضرت عائشہ کے بیان کے مطابق وحی ہی سورت حق کا نزول ہوا تھا۔ یہی وہ حق تھا جسے سورہ اقرآن کی
 تلاوت حضور سے کروائی اور حضور کو رسالت عطا فرمائی۔ اسی لیے ہم نے بھی ابتدائی سطروں میں جہاں
 حضور کی بعثت کا ذکر ہے جبرائیل کے نام سے اسے لیا ہے اور صرف حق یا وحی لانے والے کے الفاظ
 استعمال کیے ہیں۔

مغرب دنیا میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو ہر زمانے سے اپنے اپنے طریقوں سے
 پیش کیا۔ غریب و غریب تاویلات کی باتی رہیں۔ قرون وسطیٰ میں حضور کو نفوذ بالذات ایک گنہگار کی شکل
 میں پیش کیا جاتا رہا۔ اٹھارویں صدی میں جبکہ حقیقت شناسی عام ہو رہی تھی۔ حضور کو ایک عقلمند قانون
 داں اور اپنی ہر بات کو منوانے والے کی صورت میں پیش کیا گیا۔ اب ہمارے اپنے عہد میں اور خصوصاً
 وہیں میں اسلام کی ابتداء اور اس کی نشوونما کا باعث بعض اس بات کو سمجھا گیا کہ مکہ کے عام آدمی یعنی مزدور
 طبقہ ویاں کا سرمایہ دار بوزوا طبقے کے خلاف کھڑا ہو گیا تھا اور مزدور طبقے کو اکٹھا کر کے سرمایہ داروں سے
 لڑانے کے فرائض ذات رسالت نے اپنے ذمے لیے اور اس میں حضور کو کامیابی ہوئی۔ سرمایہ
 داروں کا استعمال ہوا۔ مزدور طبقہ خوشحال ہوا۔ جیسے کارل مارکس یا لینن ایک انقلاب کا باعث
 ہوتے اسی طریقے سے مگر بھی ایک کامیاب انقلابی تھے۔ ہر وقت مصنفین اور دیگر لکھنے والوں

نے اپنے وقت کے انداز سے فکر و نظر کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں کرنے کی کوشش کی۔
اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قاری جو پاپے نتیجہ اخذ کرے لیکن اس حقیقت سے انکار کرنا محال
ہے کہ حضور کی ذات گرانی میں وہی مشابہت ہے جس کا ذکر توریت اور انجیل میں انبیاء کے تعلق سے
ہے۔ سارے انبیاء کی صفات حضور میں جمع ہو گئی تھیں ایسی ہی چند خصوصیات ہم عیسائی اولیا اور
ہندو مذہب کے اوتاروں میں دیکھتے ہیں۔

حضور پرغیب کے جو اسرار ظاہر ہوا کرتے تھے اسی قسم کے اظہار کا ذکر توریت اور انجیل میں بھی
آچکا ہے جو نبیوں سے تعلق رکھتا ہے ان ہی اسرار کا افتاء انبیاء اور رسولوں کی پیغمبرانہ زندگی کا
ابتدائیہ ہونا ہے۔

علم غیب سے آشنائی اور الہام و وحی کا سلسلہ پرانا رہا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ الہام
وحی سے آشنالوگوں میں باوجودیکہ ان کے درمیان ہزاروں سال کا فاصلہ ہے اور ایک دوسرے کی
جاتے پیدا آتش میں بھی ہزاروں میلوں کا فاصلہ ہے الہام و وحی کی یکسانیت ضرور پائی جاتی ہے۔ وہ
ایک دوسرے کے الہام و وحی سے قطعی ناواقف ہوتے تھے بلکہ ایک دوسرے کے وجود تک سے
بھی لاعلم رہتے تھے لیکن ان کی واردات قلبی مشترک ہوا کرتی تھی۔ ایک بات کی طرف قاری کی توجیہ
منقطع کرنا چاہتا ہوں۔ حضور کے انتقال کے بعد اسلام اور عیسائیت میں ایک ہزار سال تک جنگ
ہوتی رہی ان جنگوں کی حیثیت سیاسی رہی ہے۔ ان کی وجہ اصل میں عربوں اور بازنطینی سلطنتوں کی آپس
میں رقابت رہی ہے۔ مذہبی یا اخلاقی اصولوں کی خاطر یہ جنگیں نہیں لڑی گئیں۔

ان سیاسی جنگوں نے عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان اتنے اختلافات اور ایک دوسرے
سے اتنی نفرت پیدا کر دی کہ یورپ میں حضور کے خلاف بغض و عناد کا ایک پھر پور جذبہ پیدا ہو گیا
اس کا ایک تین ثبوت یہ بھی ہے کہ سارے ایک ہزار سالہ دور میں عیسائی برابر مسلم ممالک میں رہتے چلے
آئے ہیں۔ اس کے برخلاف مسلم ممالک میں رہنے والے عیسائیوں کو بھی عیسائی حکومتیں دشمنوں کی نظر سے
دیکھتی رہیں۔ اگر یہ جنگیں مذہبی نوعیت کی ہوتیں تو عیسائیوں کا مسلم ممالک میں رہنا ناممکن ہونا چو نہ کہ

بگڑوں کی نوعیت مذہبی نہیں تھی بلکہ سیاسی تھیں اسی نے عیسائی بڑے آرام کے ساتھ مسلم ممالک میں اپنی زندگی گزارنے آریے ہیں۔

اسی بغض و عناد کا نتیجہ تھا کہ یورپ میں صدیوں تک حضور کی شخصیت کو عجیب و غریب روپ میں پیش کیا جاتا رہا۔ کچھ عرصے سے مغربی مصنفین کی کوشش کر رہے ہیں کہ تاریخ پر جو گردو بخار ہے اسے مٹائیں اور حقیقت شناسی کے ساتھ اسلامی تاریخ کو پیش کریں۔

عیسائیت اور یہودیت کی اشاعت جن طریقوں سے عمل میں آئی تھی اپنی راستوں سے اسلام نے بھی اپنے آپ کو دنیا کے آگے پیش کیا۔

اسلام کے تعلق سے تو بعض مغربی مصنفین کا کہنا ہے کہ یہ عیسائیت کا چہرہ ہے جو کلیسا کے بعض اصولوں پر خاص طور پر زور دیتا ہے۔ جہاں تک اسلام کے بنیادی اصولوں کا تعلق ہے اور خصوصاً وہ اصول جو اسلام کے ابتدائی دور میں پیش کیے گئے تھے عیسائی اصولوں سے بہت ہی مشابہ ہیں مثلاً انسان کو برہنہ بارگاہِ خداوندی سے عطا ہوئی ہیں ان نعمتوں میں کائنات کا ذرہ ذرہ شامل ہے۔ خود انسان کی پیدائش اللہ کی مہربانی ہے۔ بارش، پھول، پھل، ترکاریاں، غذاؤں کی فراہمی، موسم کا انسانی فطرت سے تعلق یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ کی انسان پر مہربانی ہے۔ خدا کی بارگاہ میں سجدہ عبودیت انسانی فرائض میں شامل ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ عبودیت کا احساس اپنی جگہ باقی رہے۔ سزا اور جزا پر ایمان اور ان کے بنیادی اصولوں میں اسلام اور عیسائیت میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

اس کتاب کا مقصد صرف یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کو من و عن بیان کر دیا جائے۔ اس کے لیے روا داری ضروری ہے۔ تعصب کا گزر کسی بھی گوشے سے نہ ہو سکے میں پڑھنے والوں سے التماس کرونگا کہ جہاں پر حضور کی ذات گرانی پر وحی یا اہام کا ذکر ہے اسے پڑھ کر اپنے دل میں دوسو سے پیدا نہ کریں۔ تعصب اور تنگ نظری کی عینک لگا کر وحی و اہام کو جانچنے کی کوشش نہ کریں۔ وحی نبوت کا فائدہ ہی ہے اور ہر زمانہ کے ادھر ہر مذہب کے پیغمبر کو وحی اور اہام سے سابقہ پڑا ہے۔

یادگار تاریخیں

| | |
|--------------|---|
| ۶۵۷۰ | حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش |
| ۶۵۹۵ | حضور کی حضرت خدیجہؓ سے شادی |
| ۶۶۰۲ سے ۶۶۲۸ | بازنطینی اور ایرانی سلطنتوں کے درمیان عظیم معرکے |
| ۶۶۱۰ | نبوت سے ہفت سترازی |

آزمائش کا زمانہ

حضرت کی نبوت پر سب سے پہلے ایمان لانے والی حضرت کی بیوی خدیجہؓ ہیں۔ دست مبارک پر ایمان لانے کے بعد سے اپنی وفات تک جو نرسال کا زمانہ رہا ہے حضرت خدیجہؓ کے ایمان میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا رہا۔ حضرت خدیجہؓ کے قدم کبھی بھی ڈگمگاتے نہیں۔ جب کبھی دن میں حضورؐ کو لوگوں کی بدتمیزیوں سے سابقہ پڑتا اور شام میں جب آپ گھر واپس آتے تو آپ پر ایمان لانے والی کو اپنے گھر میں پاتے جو آپ کو دلاسا اور تسلی دیتیں اور حضورؐ کی ہمت بڑھاتیں۔

نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد کچھ عرصہ تک حضورؐ پر وحی والہام کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ اس کی وجہ سے بعض اوقات آپ پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی، دل مکر رہنے لگتا تھا۔ آپ متشکر ہو جاتے تھے۔ وحی کے التواء کے زلنے کا قہقہہ کرنا مشکل ہے۔ راویوں کا بیان ہے کہ یہ سلسلہ دو سے تین سال رہا۔ قرآن پاک کی ایک آیت اس موقعی وحی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سورہ نوحی کی تیسری آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تمہارے پروردگار نے نہ تم کو چھوڑا اور نہ ہی تم سے ناراض ہوا۔

یہاں پر قرآن کے تعلق سے کچھ نکتہ دینا ضروری ہے۔ حضورؐ کی ذات گرامی پر وحی والہام کا جو سلسلہ جاری رہا ان سب کو ایک کتابی صورت دی گئی۔ یہی کتاب قرآن کے نام سے موسوم ہے انجیل کے برخلاف قرآن ایک ایسا تسلسل ہے جس میں اللہ نے اپنے الفاظ اپنے پیغمبر محمدؐ کی زبان سے

پنوبیس سال کی مدت میں ادا کروائے۔ ان سب الفاظ کو قرآن میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔
 قرآن کی ابتدائی آیتیں اس وقت نازل ہوئیں جب کہ آپ کی ذات گرامی کو ایک سنہرے اور
 رسول کی حیثیت سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ آیتیں یا تو حضور کو یاد نہیں یا پھر آپ کی زوجہ کرمہ حضرت
 خدیجہؓ کو یا پھر علیؓ ابن ابی طالب یا زید بن عارضہ ان آیات سے واقف تھے۔

بعد میں جب آپ کا عروج ہوا تو آپ پر نزول شدہ وحی کو آیتوں کی صورتوں میں لوگوں نے
 جمع کرنا اور حافظہ میں محفوظ کرنا شروع کر دیا جو لوگ لکھنا جانتے تھے کتابی صورت میں محفوظ کرنے لگے
 تمام آیات ایک کتاب کی صورت میں نہیں تھیں۔ چیدہ چیدہ سورتوں اور آیتوں کو مختلف لوگ اپنے اپنے
 پاس رکھ کر رکھ لیا کرتے تھے۔ ان تمام چیدہ چیدہ سورتوں اور آیتوں کو ایک جگہ اور ایک کتاب کی
 صورت میں حضور کی وفات کے کئی ایک سال بعد کیا گیا۔

جب ان سورتوں اور آیتوں کو جمع کیا جا رہا تھا لوگوں کے لیے یہ ناممکن ہو گیا کہ تمام سورتوں کو
 واقعاتی ترتیب میں اکٹھا کیا جائے۔ نتیجہ کے طور پر ایک درمیانی صورت نکالی گئی۔ جو آیتیں درج ہیں
 طویل تھیں ان کو قرآن کی ابتدا میں رکھ دیا اور جو سورتیں مختصر تھیں ان کو آخری حصے میں جگہ دی گئی
 حالانکہ واقعاتی نقطہ نظر سے قرآن کی یہ ترتیب الٹی تھی۔ حضور کی نبوت کے ابتدائی دور میں مکہ میں
 نازل شدہ آیتیں مختصر سی تھیں۔ شاعرانہ سن تھا۔ جذبات سے اپیل کرتی تھیں۔

حضور کے آخری زمانہ میں جب کہ آپ مذہبی رہنما کے علاوہ ایک سیاسی اور فوجی رہبر کی جگہ
 بھی حاصل کر چکے تھے آپ پر طویل سے طویل سورتوں کا نزول ہوا کرتا تھا جس میں مسلم معاشرے سے تعلق
 رکھنے والی ہر بات کھل کر بیان کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اس بات کا ثبوت بھی فراہم کرنا مشکل ہے کہ
 آیا ایک سورۃ کا نزول ایک ہی وقت میں ہوا تھا یا مختلف اوقات میں ایک سے زیادہ بار۔

ایک ہی سورۃ میں مختلف موضوعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۃ کا عنوان رکھنے میں
 بھی ایک پیچیدگی یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس سورۃ میں اسی عنوان سے ہٹ کر بھی بہت سی باتیں بیان
 کی جاتی ہیں۔

لبن اوقات ایسی آیتیں نازل ہوئی جو پہلے کی آیتوں کی تفسیح کر دیتی تھیں۔ قرآن کے دوسرے سورۃ یعنی سورۃ البقرہ کی ۱۰۶ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے یا اُسے فراموش کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ہر بات پر قادر ہے۔" جیسا یہ وقت گزرتا جاتا ہے حضور پہلے کی نازل شدہ آیتوں کو لبن اوقات بھول جاتے تھے لیکن وہ آیات حضور کے حلقہ مجوسوں کو یاد رہتی تھیں اس لیے کہ وہ ان آیات کو لکھ لیا کرتے تھے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ساری زندگی کبھی بھی کوشش نہیں کی کہ وہ کون فلسفیانہ طریقے سے عوام کے سامنے پیش کریں جیسا کہ موجودہ زمانہ کے اکثر صاحبان علم کا دستور رہا ہے کہ خدا کی ہستی کو منطقی طور پر ثابت کرنے کی کوشش کریں۔

پینمبر کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ خدا کی ذات کی اس طرح سے تجھو کرے کہ اس کی ذات کو سائنٹفک طریقے سے ثابت اور منطقی بنیادوں پر پیش کرے۔ پینمبر اپنے خدا کو بہر حال جانتا ہے۔ خدا اور پینمبر کے آپس کے تعلق کی نوعیت بالکل ہی جدا گانہ ہے۔

پینمبر اپنے خدا کو حاکم کل جانتا ہے۔ اس کو اس بات پر پورا یقین رہتا ہے کہ اللہ جب چاہے اپنے حکم میں رد و بدل کر سکتا ہے

حضور کی وفات کے بعد جب مسلم مفکرین کا ربط دوسرے حکموں کے فلسفیوں اور صاحبان علم سے بڑھنے لگا تو ان مسلم مفکرین نے ایک نیا شو شہ چھوڑا۔ وہ یہ کہنے لگے کہ قرآن لوح محفوظ کی صورت میں ازل سے جنت میں محفوظ ہے اور ابد تک وہ ہے گا۔

اس قسم کا خیال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بھی نہ آیا ہوگا۔ اس لیے کہ حضرت کا ذہن فلانی نہیں تھا۔ یہی ساری بات کے حضور قابل تھے۔ اپنی ہر بات کو ذات رسالت نے یہی سامنے الفاظ میں پیش کیا۔

جبر و اختیار کے مسئلہ کو بھی مسلم فلسفیوں نے ایسا دقیق سے دقیق تر بنایا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

حضور نے ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ خدا نیک و بد دونوں کا خالق ہے۔ خدا کے علم میں نیکیوں کی نیکی اور بدوں کی بدی ہمیشہ رہتی ہے۔

دوسری جگہ حضور نے فرمایا کہ انسان کی نجات انسان کے اپنے عمل پر موقوف ہے۔
ہینمبر سیدھے سادھے ہوتے ہیں۔ اللہ کے اس ہینمبر لے جبر و اختیار کے پورے سناہ کو سیدھے طریقے سے اپنی امت کے آگے رکھ دیا۔ اس مسئلہ کے حل کرنے کو مسلم فلسفیوں اور مفکرین نے اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا۔

یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن کوئی ایسی نصابی کتاب نہیں ہے جس میں صرف عقلیات اور اخلاقیات پر جزوی یا کلی طور پر بحث کی گئی ہو۔

۶۱۰ء سے ۶۳۲ء کا زمانہ جو حضور کی نبوت کے ۲۳ سال پر مشتمل ہے بہت ہی بڑے بڑے اور اہم مسائل کو حل کرنے میں گزرا ہے جب کبھی حضور کو کوئی وقت پیش آتی تھی تو آپ خدا سے رجوع کرتے تھے۔ اس مسئلہ کا حل خدا کی طرف سے ہوتا تھا۔ وہ سورت یا آیت جو حضور کے ایک خاص مسئلہ کے حل کا باعث ہوتی تھی قرآن کا حصہ بن جاتی تھی۔ یہی قرآن بعد میں چل کر اسلامی قانون کی صورت اختیار کر گیا۔

ایک مرتبہ ایک عورت حضور کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ شکایت کی کہ اس کو وراثت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس شکایت کے پیش نظر حضور پر وحی نازل ہوئی جس میں اس عورت کی شکایت کا حل پیش کیا گیا۔ بعد میں یہی شکایت اور شکایت کا ازالہ مسلم قانون کا جزو بن گیا جو اب تک ہر مسلمان کے لیے قابل تعمیل ہے۔

قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور کی زندگی کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ حضور کی زندگی کے واقعات کو پیش نظر رکھنا لازم ہے۔

ایک طالب علم جو قرآن کو پڑھنا چاہے اور وہ حضور کی زندگی سے ناواقف ہو اور حضور کے زمانے کے واقعات سے لاعلم ہو تو وہ قرآن کو کچھ بھی سمجھ نہیں سکے گا۔

قرآن کے پڑھنے کو قرات کہتے ہیں۔ قرات ہو سکتا ہے کہ آج کے مغربی یا مغرب زدہ طالب علم کو اپنی طرف راغب نہ کرے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن نے اشاعتِ اسلام اور تبلیغ میں بہت ہی اہم حصہ ادا کیا ہے۔ جب قرآن کو بہ آواز بلند پڑھا جاتا تھا تو لوگوں پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ قرآن کی عظمت ان کے دلوں میں اس طرح رچی ہوئی تھی کہ قرات کے وقت لوگ ہیبت سے کانپنے لگتے تھے۔ جنگجو اور بہادر سپاہیوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے، ان پر غشی طاری ہو جاتی تھی اور دنیا و مافیہا سے بے خبر کسی اور ہی عالم میں گم ہو جاتے تھے۔ بہت سے ایسے واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن میں مسلمانوں کا قرآن کی آیتوں سے اتنا متاثر ہونا بیان کیا گیا ہے جن سے ان کی دفعتاً موت واقع ہوئی۔ خصوصاً ان آیتوں پر جن میں دوزخ وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان واقعات میں چاہے کتنی ہی مبالغہ آرائی کی گئی ہو، قرآن کی اثر پذیری سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

میرا اپنا مشاہدہ رہا ہے کہ ہنگامی صورتِ حال میں عرب کے بددی انتہائی سکون اور اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے برخلاف انہی حالات میں یورپین اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ ہنگامی صورتِ حال کا خندہ پیشانی سے استقبال عربوں کی ایک خصوصیت رہی ہے اس وضعداری اور خندہ پیشانی کی تہہ میں اضطراب اور جذباتی طوفان چھپا رہتا ہے۔ ان خصوصیات کا فقدان ہم کو یورپین لوگوں میں نظر آئے گا۔

قرآن لوگوں کے جذبات میں نہ صرف ایک طاہم پیدا کرتا ہے بلکہ سننے والوں کے دلوں میں اپنی ہیبت بھی بٹھاتا ہے۔ ساتویں صدی کے عرب سیدھی سادی ذہنیت کے مالک تھے۔ ان کے یقین کے مطابق وہ قرآن کو خدا کا کلام اس طرح سمجھتے تھے جو ان میں ہیبت اور ڈر پیدا کرتا تھا دوزخ کے بیان سے وہ اتنے ہیبت زدہ ہو جاتے تھے کہ بعض اوقات وہ صرف اسی کے تصور اور خیال سے بے ہوش ہو جاتے تھے۔ بعض کی دل کی حرکت بند ہو جاتی تھی اور انتقال کر جاتے تھے۔

حضرت بناتِ خود دوزخ کے خیال سے بہت گھبراتے تھے۔ خصوصاً نبوت کے ابتدائی زمانے میں جب کہ دوزخ کا ذکر اکثر قرآن میں آیا ہے اس موضوع نے حضور کو کافی متاثر کیا۔ بعض مواقع پر آپ نے زمین کی تباہی، زلزلہ، آسمان سے آگ کے برسنے کا بھی ضمنی طور پر بطور عذاب ذکر فرمایا ہے۔

گزشتہ کچھ عرصے سے مغرب کے عیسائیوں کے نزدیک دوزخ کی وہ اہمیت نہیں رہی جیسی ان کے پیش روؤں میں تھی۔

جہاں تک خوف اور ڈر کا تعلق ہے عیسائیت کی بنیادوں میں سے یہ ایک اہم بنیاد ہے ایک بڑے پادری TOR ANDRAE کے بیان کے مطابق چھٹی صدی عیسوی میں کلیسا میں دوزخ کا جو تصور تھا وہ وہی تھا جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے بیان کے مطابق لوگوں کے آگے رکھا۔ کلیسا کے دوزخ اور اسلام کے بیان کردہ دوزخ دونوں کے خاکوں میں ہو بہو مشابہت ہے۔

خوف اور ڈر حضور کی تعلیمات کی بنیاد رہی ہے۔ آپ کا یقین تھا کہ گنہگار کو ہمیشہ ڈرنا چاہیے۔ خوف اور ڈر کے تعلق سے آپ نے جو بیان فرمایا ہے، اسی قسم کا بیان شام کی عیسائیت کی تسلیم رہی ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ پہلی وحی کے بعد دو تین سال تک آپ پر پھر کوئی وحی نہیں آئی۔ اس وقفے کے بعد وحی کا سلسلہ جو آپ پر شروع ہوا وہ آپ کی وفات تک برقرار رہا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ وحی خدا کی طرف سے آتی ہے اور قرآن خدا کا کلام ہے۔

قرآن پڑھتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رہے کہ ناطقِ خدا سے عز و جل ہے مختلف لکھنے والوں نے اس بات کی کوشش کی کہ قرآن کے نزول کو مختلف عنوانات کے تحت پیش کیا جائے۔

روایات کے مطابق جب حضور سے دریافت کیا جاتا کہ وحی کا نزول کس طرح سے ہوتا تھا تو آپ جواب میں فرماتے کہ ایک گھنٹی کی سی آواز آتی ہے جب گھنٹی کی آواز ختم ہو جاتی تو آپ خدا کے کلام سے واقف ہو جاتے یا واقف کر دیا دیتے جاتے۔ یہ جواب اس بات کی ترجمانی نہیں کرتا کہ واقعی آپ خدا کا کلام الفاظ کی صورت میں سنتے تھے بلکہ اس گھنٹی کی آواز کے دوران آپ کے ذہن پر مختلف موضوع نقش ہو جاتے تھے بعد میں آپ ان کی مراد لے لیا دیتے تھے یا اپنے الفاظ میں مضمون کو ادا فرمادیتے تھے۔

بعض روایات کے مطابق خدا اپنے پیغمبر سے پس پردہ ہم کلام ہوتا تھا ان موقعوں پر آپ لفظ بلفظ ہر بات کو سنتے تھے۔ ان خدا کی الفاظ کو اپنے حافظہ میں محفوظ رکھتے تھے۔ پھر لوگوں کے سامنے بیان فرماتے تھے۔

تیسری صورت وحی کے نزول کی یہ تھی کہ خدا اپنے فرشتہ جبرائیل کو انسان کے جیسے میں حضور کی خدمت میں روانہ کرتا تھا اور اپنے پیغمبر سے ہم کلام ہوتا تھا۔

ان نبیوں صورتوں میں پیغمبر کو وحی کے نزول کا فوری علم ہر جاتا تھا۔ عام طور سے حضور و کملی یا روشنائی کو اپنے اوپر ڈالے رکھتے تھے جس وقت وحی کا نزول ہوتا تھا انتہائی سردیوں کے زمانے میں بھی آپ پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے۔ وحی کے نزول کے فوری بعد آپ بیٹھ جاتے اور اللہ کی طرف سے آئے ہوئے الفاظ کا اعادہ فرماتے تھے۔

بعض اوقات وحی کا نزول اس وقت بھی ہوتا تھا جب کہ آپ سفر میں ہوتے تھے اونٹ پر سفر کرتے ہوئے یا کسی بڑے مجمع سے خطاب کے وقت بھی حضور پر وحی نازل ہوتی۔ بعض اوقات لوگ جب سوال کرتے تھے تو جواب تک بھی وحی کے نزول کے مطابق دیا جاتا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حضور پر جو وحی نازل ہوتی تھی اس کی مشابہت حضرت موسیٰ پر نازل کردہ وحی سے بہت زیادہ ہے۔ مثلاً توریت میں ہے 'خدا نے موسیٰ سے کہا کہ کہہ دو ان اسرائیلی بچوں سے کہ جب خدا زمین پر آئے گا' یا پھر وہ سری جگہ ذکر ہے 'وہ تم سے پوچھتے

ہیں کہ ان کے لیے کون کون سی چیزیں جائز ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ ساری اچھی اور پاک چیزیں ان کے لیے جائز ہیں۔“

تیسری جگہ اللہ فرماتا ہے کہ ان اسرائیلیوں سے پوچھو کہ ہم نے تم کو کیسی کیسی نشانیاں دی ہیں“
 قریت میں جہاں خدا موسیٰ سے ہمکلام ہے صریحاً موجود ہے کہ خدا نے موسیٰ سے کہا لیکن
 قرآن میں ہر آیت کے آگے خدا نے محمد سے کہا کہ ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ سارا قرآن خدا کا کلام
 ہے اور ہر آیت خدا کی کہی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود توریت اور قرآن کا انداز بیان بہت ملتا جلتا
 ہے۔ دونوں جگہ خدا براہ راست اپنے بندوں سے مخاطب ہے۔ اس کے حکم براہ راست اس
 کے بندوں تک پہنچ رہے ہیں۔

قرآن میں موسیٰ کا جتنی بار ذکر آیا ہے کسی اور فرد کا نہیں۔ حضور خود اپنے آپ کو زمرہ سہیلین
 میں شامل کرتے تھے اور موسیٰ اسی زمرہ کے ایک فرد تھے۔

اس بات کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ حضور نے حضرت علی ابن ابی طالب کو اپنے گھر والوں میں
 شامل کر لیا تھا تاکہ اس طرح سے اپنے سچے ابی طالب کی مدد کر سکیں۔ حضور کو حب نبوت سے سرفراز
 کیا گیا تو حضرت علیؑ کی عمر دس سال کی تھی اور اس دس سالہ بچے کو یہ فخر حاصل رہا کہ مردوں میں مسلمان
 ہونے والوں میں سب سے پہلا نمبر اسی کا رہا۔ وحی کے اترنے کے چند دن بعد حضور نے نماز کی ابتداء
 کی۔ حضرت عائشہؓ کے قول کے مطابق خدا نے حضور کو مکہ دیا تھا کہ نماز دو رکعت پر مشتمل ہو بعد میں اس
 میں اضافہ کیا گیا۔ تین اور چار رکعتوں پر مشتمل نمازیں پڑھی جانے لگیں۔

روایات کے مطابق حضور اپنے کم سن بھتیجے حضرت علیؑ کو ساتھ لے کر مکہ کے باہر پہاڑیوں سے
 گھری ہوئی وادیوں کا رخ کرتے تھے جہاں پر آپ تنہائی میں عبادت فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ
 ہی کے قول کے مطابق ایک دن جب کہ حضور نماز ادا فرما رہے تھے اچانک ابو طالب وہاں پہنچ گئے
 اور تعجب سے حضور سے دریافت کیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ حضور نے جواب دیا کہ خدا نے آپ کو پیغمبر
 بنا کر اس دنیا میں روانہ کیا تاکہ آپ انسانوں کو انسانیت کی تعلیم دیں اور اپنے مذہب کو اس تعلیم

کا ذریعہ بنائیں۔ آپ نے اپنے چچا سے اسی موقع پر درخواست کی کہ وہ آپ کے مذہب کو قبول کر لیں تاکہ ان کی رہنمائی سرپرستی اور مدرسے حضور کے کام میں آسانی ہو۔ ان بڑے حضرت نے جواب دیا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے پائے ہوئے مذہب کو ترک کر کے ایک نئے مذہب کو قبول کرنے سے تاسر میں اور نہ ہی وہ اس بات کے لیے تیار ہیں کہ عبادت کا کوئی اور طریقہ اختیار کریں جیسا کہ نماز۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ابو طالب نے حضور کو یقین دلایا کہ وہ حضور کی کسی بھی طریقے سے مخالفت نہیں کریں گے۔

حضرت عائشہ کی بیان کردہ روایت ابو طالب کی شخصیت کو ابھار رہی ہے کہ کس طرح وہ اپنے پرانے عقیدے پر جمے ہوئے تھے اور اس کا اظہار کتنی بے باکی سے کر دیتے تھے اس کے باوجود وہ حضور کی ذات کے لیے ایک بڑا سہارا بنے رہے۔ اپنے بھتیجے کے کاموں میں ہر طرح سے دلچسپی لیتے تھے اور ان کے مشن کی ہمت افزائی کرتے تھے۔

حضرت خدیجہ اور حضرت علیؑ کے بعد اسلام لانے والوں میں زید ابن حارثہ ہیں۔ ان کے تعلق سے بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ ایک غلام لڑکا تھا جس کو حضرت خدیجہ نے حضور کی نذر کر دیا تھا۔ اور حضور نے اس غلام کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔

اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کرنے والوں میں چوتھا نمبر ایک ابو میسر عمر کے آدمی کا تھا جس کا تعلق قبیلہ قریش کی ایک جماعت بنی تمیم سے تھا۔ اس آدمی کا نام عقیق تھا، لیکن بعد میں یہی عقیق سارے عالم میں ابو بکرؓ کے نام سے مشہور ہوا، ان کے والد کا نام ابو قحافہ تھا۔ حضرت ابو بکرؓ ایک مالدار تاجر تھے اگرچہ کہ ان کا شمار عرب کے امیر ترین لوگوں میں نہیں ہوتا تھا وہ عوام میں کافی مقبول اور ہر دل عزیز تھے۔ نسب ناموں اور شجرہ نویسی سے انہیں کافی دلچسپی تھی۔ اس فن کے وہ امام مانے جاتے تھے۔

بہت سی باتیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ حضورؐ طبعاً خلوت پسند تھے، شہرت اور نام و نمود کو ناپسند کرتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ کے مشورے سے

آپ اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ اپنے مذہب کی خفیہ طریقے سے پیروی کی جائے۔ جیسے ہی حضرت ابو بکرؓ اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے رازداری کی مخالفت کی۔ وہ خود ملائیہ پرچار کے شائق تھے۔

۶۱ء میں حضرت ابو بکرؓ کی عمر ۳۲ سال تھی جب کہ حضورؐ کا سن مبارک ۴۰ سال حضورؐ حضرت ابو بکرؓ سے عمر میں تین سال بڑے تھے۔

جن چار لوگوں نے اب تک اسلام قبول کیا تھا ان میں نسبتاً سب سے زیادہ تجربہ کار اور سختگوئے عقل کے مالک حضرت ابو بکرؓ تھے۔ ان چاروں کے بعد اسلام لانے والوں میں حضورؐ کے ایک رشتہ کے بھائی زبیر ابن العوام ہیں۔ یہ ابھی بیس سال کے بھی نہیں ہوئے تھے۔ ان کے بعد سعد ابن ابی وقاص مسلمان ہوئے۔ ان کی عمر صرف ۱۷ سال تھی۔ یہ تیر بنانے کی مشق کیا کرتے تھے۔ آگے چل کر ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلام کس طرح نوجوانوں کی تحریک اور ان کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔

بہت سے تاریخ دانوں نے اس بات کو اس زمانے کے معاشی بحران کا نتیجہ قرار دیا ہے قریش اصل میں ایک خانہ بدوش قبیلہ تھا۔ اس قبیلے کی اکثر جماعتیں معاشی ابتری کا شکار تھیں یہ معاشی ابتری نہ صرف اس وقت کی خانہ بدوش زندگی کا فاصلہ تھی بلکہ چودہ سو سال بعد بھی یعنی ہمارے اپنے زمانے میں خانہ بدوش قبیلوں کی زندگی اور معاشی بد حالی لازم و ملزوم نظر آتی ہے۔ بعضوں نے مکہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان میں قصی کا ذکر اوپر آچکا ہے جو حضورؐ کی پشت سے تقریباً دو سو سال بعد مکہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ ابتدا میں لوگوں کو صرف حج کروانے کی ذمہ داری اس قبیلے نے اپنے سر لی تھی۔

۵۲۵ء میں جب حبشہ کی فوجوں نے حیرلوں کی بلند اقبالی کا خاتمہ کر دیا تو قریش نے تجارت میں ان کی جگہ سنبھالی شروع کر دی۔ نتیجتاً چند مخصوص خاندانوں میں خوشحالی آئی۔ ان خوشحال گھرانوں میں بنی مخزوم، بنی عبدمناف قابل ذکر ہیں۔ باقی لوگ اسی پرانی مفلسی کا شکار رہے۔

امارت اور عزت کی آپس میں رقابت نے نوجوانوں کو اس بات کی رغبت دلائی کہ کسی نئی تحریک کی ابتدا کریں۔

چونکہ یورپ میں گزشتہ کچھ عرصے سے دنیا کی ہر بات کو معاشیات کی ترازو میں تولایا جاتا ہے اس لیے اسلام کی تاریخ بھی اسی نظریہ کی زد میں آگئی۔

جہاں تک میرے مشاہدہ کا تعلق ہے میرے عزیز سے غریب اور امیر سے امیر عربوں کے درمیان زندگی گزری ہے اور میرے طویل ترین قیام کے دوران مجھے کبھی کوئی ایسا اتفاق نہیں ہوا جس کی بناء پر کہا جاسکے کہ کسی عزیز نے کسی امیر کو دیکھ کر حسد کیا ہو۔

مغربی ممالک کے لوگوں کے ذہن میں یہ بات مشکل ہی سے آئے گی کہ بغیر دولت کے بھی لوگ زندہ رہتے ہیں۔ دولت کی ان لوگوں کو نہ تو خواہش رہتی ہے اور نہ ہی دولت کے نہ رہنے کا علم آج کے مادی اور معاشی نظریات کا اطلاق ہر سو سال پہلے کے زمانے پر کرنا تاریخ پر اگر ظلم کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

عربوں میں رقابت کا مادہ ہمیشہ سے رہا ہے لیکن دولت رقابت کی بنیاد کبھی نہیں بنی۔ اس بات سے ہم بھی متفق ہو سکتے ہیں کہ قریش نے جب خانہ بدوش زندگی کو خیر باد کہہ کر مکہ میں سکونت اختیار کرنی تو ہو سکتا ہے کہ ان کے لرز رہائش کی تبدیلی نے اس وقت کے اور لوگوں کو ان کے خلاف اس بات پر اکسایا ہو کہ قریش نے اپنے اپنے آبائی طرز رہائش کو خیر باد کہہ کر نئی طرز رہائش کیوں اختیار کر لی۔ نئی طرز رہائش کی وجہ سے ان کے رسم و رواج میں بھی تبدیلی آئی ہوگی۔ یہ تبدیلی ہو سکتا ہے کہ اس وقت کے نوجوانوں کو بھی بری لگی ہو۔

موجودہ زمانے میں معاشیات ہماری ہر بات پر بھجائی ہوئی ہے۔ جب بھی ہم تاریخی واقعات کو دہرانے ہیں یا بیان کرتے ہیں تو اس بیان پر بھی موجودہ معاشی نظریات کی چھاپ پڑنے لگتی ہے۔ مشرق نے کبھی بھی مادی دولت کی پرستش نہیں کی۔ مغرب ہمیشہ سے دولت کا پجاری رہا۔ مشرق نے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ خوشی کی بنیاد دولت کبھی نہیں رہی۔ دولت مند کی خوشی اور مفلس کی خوشی کے مابین مختلف ضروری ہیں لیکن خوشی دولت مند اور مفلس دونوں کو حاصل ہو سکتی ہے۔ مشرق میں عزت اور افلاس کا پہلا سبب قدرت

رہی ہے۔ مشرق میں رہنے والوں کو بڑی بڑی زمینیں میسر ہیں۔ جانور ان کے مونس و مددگار ہیں کھلی فضاء میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ کاشت کاری پر گزارہ ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف مغرب میں انسانوں کے بنائے ہوئے ایوان کھنڈروں میں تبدیل ہوتے رہے اور پھر کھنڈر ایوانوں میں کچھ کھنڈروں میں رہنے کے عادی ہو گئے اور کچھ نے ایوانوں ہی کو حاصل زندگی سمجھ لیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ابتدائی اسلام لانے والوں میں قریش کے نوجوانوں کے علاوہ باقی کی اکثریت یا تو غلاموں پر مشتمل تھی یا پھر غریب لوگوں پر۔ اسی حقیقت کا اطلاق تقریباً سب ہی مذہبی تحریکوں پر ہوتا ہے۔ بااقتدار، دولت مند اور اونچے طبقہ کے لوگ اپنے اثر و اقتدار، دولت، ثروت، شان و شوکت اور دنیاوی نعمتوں پر نازاں ہوا کرتے ہیں۔ مذہبی تحریکات ان لوگوں کو ابتدا میں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتیں۔

سینٹ پال نے کہا ہے کہ عیسائیت ابتداء میں اپنے وقت کے عقل مندوں، دولت مندوں، حکمرانوں اور امیروں کو اپنی طرف راغب کرنے میں ناکام رہی لیکن خدا نے اپنے وقت کے غریب ترین اور کمزور سے کمزور تر کو اس بات کے لیے چنا کہ وہ اس عظیم امانت کو اٹھائیں اور اپنے ساتھ بھلیں ہاں جب کوئی تحریک کامیاب ہو جاتی ہے اور عوام میں مقبولیت حاصل کر لیتی ہے تو پھر نام نہاد شرفاء اور وقت کے ہجاری اپنی حیثیت کو اونچا کرنے کے لیے تحریک میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہی بات حضورؐ کے ساتھ بھی ہوئی۔

اسلام کی ابتداء حضرت خدیجہؓ، حضرت ابو بکرؓ اور حضورؐ کے چند قریبی نوجوان رشتہ داروں کے اسلام لانے سے ہوئی۔ اس کے بعد چند غلاموں اور غریب طبقے کے لوگوں نے اسلام کو قبول کیا۔ ان سب نے اپنے لیے دین کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی۔ جب کبھی حضورؐ تلاوت کرنا چاہتے کسی خاموش جگہ چلے جاتے جہاں لوگ ہوں۔ ابو بکرؓ نے اس خفیہ طریقہ کار کو علانیہ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اپنے ملنے والوں سے اسلام کا ذکر کرنا شروع کیا۔ چونکہ اسلام کی اس نئی چھوٹی سی جماعت نے کسی کا کچھ بگاڑا نہیں تھا اور کسی کے خلاف بھی نہیں تھی اس لیے دوسروں نے بھی اس جماعت کے مذہب پر کوئی تعرض نہیں کیا اسی طرح تین

سال گزر گئے۔ ملائیمہ تبلیغ کرنے کا حکم حضور کو ان تین برس کے اختتام پر ہوا۔
 حضرت علیؑ سے یہ روایت منسوب ہے کہ ایک مرتبہ حضور نے علیؑ سے فرمایا کہ
 خدا نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ اپنے خاندان والوں اور رشتہ داروں کو متنبہ کریں۔ حضور یہ بھی
 تھے کہ یہ کام حضور کے بس کا نہیں۔ آپ کو ڈر تھا کہ اگر خدا کا پیغام اپنے رشتہ داروں تک پہنچائیں
 تو وہ برا مان جائیں گے۔ اسی خیال کے تحت حضور نے خاموشی اختیار کی حتیٰ کہ جبریلؑ حاضر ہوئے۔ اور کہا
 کہ اگر حضور اپنے ذمہ کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے تو آپ سے خدا ناراض ہو جائے گا۔ پھر حضور
 نے علیؑ سے فرمایا کہ تم ٹھوسا گوشت تیار کر لو اور ایک کٹورا بھر دو دھرا اپنے ساتھ رکھ لو اور
 چلو۔ گوشت اور دو دھرن ایک آدمی کے لیے کافی ہو سکتا تھا۔ جن لوگوں میں وہ تبلیغ کے لیے
 پہنچے ان کی تعداد چالیس تھی۔ حضور نے ان کی تواضع گوشت اور دو دھرے سے کرنی چاہی اور سب کے
 آگے پیش کیا۔ ہر ایک نے پیٹ بھر کے گوشت کھایا اور جی بھر کے دو دھرے پیار اوی نے اس رات
 سے حضور کا ایک معجزہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک آدمی کا کھانا چالیس آدمیوں کے
 کھانے کے برابر ہو گیا تھا۔

حضور نے ہمیشہ معجزہ کے اظہار سے تامل فرمایا۔ اس بات کا کئی دفعہ آپ نے اعتراف بھی
 کیا کہ آپ معجزہ کی ادائیگی سے قاصر ہیں اس کے باوجود راویوں نے عجیب و غریب قصوں کو گھڑا
 کہ حضور سے منسوب کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔

جیسے ہی سب لوگوں نے سیر تکم ہو کر کھانا کھایا ابوبلب نے جو حضور کا چچا تھا اس محفل کو
 درخواست کر دیا حضور کو موقع ہی نہیں دیا کہ آپ حاضرین سے مخاطب ہو سکیں۔ حضور نے پھر ان
 لوگوں کو مدعو کیا اور فرمایا کہ اے عبدالمطلب کی اولاد۔ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم کو تبلیغ
 کے لیے چنوں۔ تم میں کون ہے جو میری اور میرے بعد میرے جانشینوں کی مدد کے لیے تیار ہے۔
 یہ مختصری تقریر حاضرین کے لیے ایک سکتہ کا باعث بن گئی۔ یہ سکتہ اس وقت ٹوٹا جبکہ تیرہ سالہ
 لڑکے علیؑ ابن ابی طالب نے بھری محفل میں اٹھ کر کہا کہ اے اللہ کے رسول میں آپ کی مدد کے

یہ تیار ہوں اس لڑکے علیؑ کے جواب نے ساری محفل کو کشت زعفران بنا دیا۔ فطرتاً ایک خاموش
 پند اور سنجیدہ لوجوان محمدؑ پر اس محفل کی ناکامی کا جوا اثر ہوا جو گا اس کا اندازہ آپ ہم سب ہی کر سکتے ہیں
 جو پہلا تاثر مکہ کے لوگوں پر حضورؐ کے پیغام کا ہوا وہ یہ کہ انہوں نے سمجھا کہ محمدؑ پر دیوانگی کا
 دورہ پڑا ہے اور نعوذ باللہ حضورؐ کے دماغ میں فتور ہے۔ بعضوں نے سمجھا کہ جن دیویا بھوت یا
 ہری کا سایہ پڑ گیا ہے۔ جب دماغ کی خرابی یا جن بھوت ہری کے سائے حضورؐ سے منسوب ہونے
 لگے تو لوگوں میں یا تو ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے یا پھر آپ کی ذات ان لوگوں کے لیے
 دل لگی اور مذاق کا موضوع بن گئی۔ عداوت اور مخالفت کی ابتدا ابھی نہیں ہوئی تھی۔

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن کی ترتیب واقعات کے تسلسل کے لحاظ سے نہیں ہوئی
 اگر اس ترتیب کی کوشش کی جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ حضورؐ کی ابتدائی تبلیغ اور تعلیم نے ابھی
 لوگوں کو آپ کے خلاف نہیں کیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن حضورؐ کی رسالت و نبوت کی ڈھری
 کا بھی کام انجام دیتا ہے۔ جب بھرے مجمع میں حضورؐ پر آواز سے کہنے لگے تو حضورؐ کو ذریعہ
 وحی رد عمل کا طریقہ بھی بتلادیا جاتا تھا۔ قرآن نے ان باتوں کو بھی محفوظ کر رکھا ہے۔ اگر اسی منطق
 کو قبول کر لیا جائے تو قرآن کی ابتدائی سورتوں میں حضورؐ کی مخالفت کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔
 قرآن کی ابتدائی آیتوں میں ساری باتوں کا مثبت طریقے سے ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی
 عظمت، انسان کی پیدائش، پیدائش کا مقصد، خالق کائنات کا مقام، مخلوق کی عاجزی اور بے
 چارگی، عبودیت کے لوازم اور اسی قسم کے موضوعات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ان ہی ابتدائی
 آیتوں میں جزا اور سزا کا بھی ذکر ہے۔ قریش کو بھی خاص طور سے مخاطب کیا گیا ہے اور اس وقت
 حضورؐ خاص طور پر اہل قریش کے لیے اپنی سرگرمیاں مختص کئے ہوئے تھے۔

یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیتوں ہی میں اپنی عظمت اور اس کے خالق ہونے کا ذکر اس
 کیا ہے جیسے ہاں کے لوگ اللہ کی عظمت اور اس کے خالق ہونے کا تصور اپنے ذہنوں میں پہلے ہی سے رکھتے ہوں
 جہاں جہاں اللہ کی عظمت اور اس کے خالق ہونے کا ذکر آیا ہے ہاں ان الفاظ کی مزید تشریح نہیں کی گئی۔ تشریح کسی بات کی اس

وقت نہیں ہوتی ہے جبکہ الفاظ کے مفہوم سے مخاطب پوری طرح واقف رہیں۔

اپنے اپنے دین سے بڑے ہوئے لوگوں کے ذہن میں بھی ایک خدائے بزرگ و برتر کا تصور تھا۔ حضور کے والد کا نام عبد اللہ تھا۔ عبد اللہ کے معنی اللہ کا بندہ یا اللہ کے غلام کے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ اپنے بتوں کو مادی صورت میں خدا کا مظہر مانتے تھے خدا کی خوشنودی کی خاطر بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

قرآن کی ابتدائی آیتوں نے عربوں کو حضور کے خلاف اس لئے نہیں کیا تھا کہ ان آیتوں میں ان ہی باتوں کا ذکر تھا جن سے مقامی عرب آشنا تھے۔ تمسخر اور مضحکہ اس بات کا تھا کہ حضور نے اپنے آپ کو اللہ کا رسول بتلانا شروع کر دیا تھا۔ پیغمبروں اور رسولوں کی تاریخ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان کی عزت کبھی بھی ان کے اپنے ملک میں نہیں ہوئی۔

ابن اسحق کا کہنا ہے کہ قریش نے رسول اللہ کی اس وقت تک مخالفت نہیں کی جب تک آپ اللہ کی عظمت اور اس کی قدرت بیان کرتے رہے۔ مخالفت کی ابتدا اس وقت ہوئی جبکہ آپ نے ان کے بتوں کو بڑا بھلا کہنا شروع کیا۔ مکہ والوں نے جب دیکھا کہ ان کے خداؤں کی اب تو بین ہونے لگی ہے تو انہوں نے بھی حضور کی مخالفت پر کمر باندھ لیا۔ طبری نے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جو عبد الملک ابن مروان کے نام لکھا گیا تھا۔ عبد الملک بن مروان ۶۸۵ء سے ۷۰۵ء تک مسند خلافت پر متمکن رہا۔ اس خط میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کا پیغمبر لوگوں کو اپنے قریب بلا کر جب ان لوگوں کو اپنی سیادت تسلیم کرنے کے لئے کہتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ لوگ پیغمبر پر نازل ہونے والی وحی کو دل سے قبول کر لیں تو لوگ اطمینان سے پیغمبر کی باتوں کو سن لیا کرتے تھے اور حاضرین اپنی جگہ موجود رہتے تھے لیکن جب مجمع کے سامنے بتوں کو بڑا بھلا کہنا شروع ہوتا تھا تو لوگ پیغمبر کو تنہا چھوڑ کر اپنی اپنی راہ لیتے تھے۔

اس خط کا مضمون اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ابتداء میں لوگ حضور کی باتوں کو ہمدردی سے سن لیتے تھے۔

آہستہ آہستہ جب حضور کی مخالفت میں اضافہ ہونے لگا تو قریش کے بااثر اور سربر آوردہ لوگوں پر مشتمل ایک وفد حضور کے چچا ابوطالب کے ہاں گیا۔ اس وقت ابوطالب ہاشمی خاندان کے رہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس وفد میں دو قابل ذکر لوگ عتبہ اور شیبہ تھے جو آپس میں حقیقی بھائی تھے۔ ان کے باپ کا نام ربیعہ تھا۔ اس وفد میں ابو جہل بھی تھا جو خاندانِ مخزوم کا سرپرست اعلیٰ تھا۔ عبد الشمس خاندان کا سربرآوردہ ابوسفیان ابن حرب بھی وفد میں شامل تھا۔ اس وفد کے تعلق سے کہا جاسکتا ہے کہ اس کے سارے ارکان مکہ کے ان دولت مند خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے جو کاروانی تجارت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔

ابن اسحق سے روایت ہے کہ وفد نے ابوطالب سے کہا کہ تمہارا بھتیجہ ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتا ہے۔ ہمارے آبائی مذہب کی توہین کرتا ہے۔ یا تو آپ آگے بڑھ کر اسے روکیں یا پھر اس معاملہ کو ہم پر چھوڑ دیں۔ ہم جیسے مناسب سمجھیں گے اس سے نمٹ لیں گے۔

ابوطالب نے ان کا جواب بہت ہی مصالحت آمیز انداز میں دیا۔ حضور اپنے مقصد کی تکمیل میں لگے رہے اور تبلیغ کا کام جاری رہا۔

اہل قریش کی کوشش پہلی دفعہ جب ناکام رہی اور حضور حسب معمول اپنے کام میں لگے رہے تو انہی لوگوں پر مشتمل ایک اور وفد دوسری بار پھر ابوطالب کے ہاں گیا اور نہایت ہی سختی کے ساتھ اپنے مطالبات کو دہرایا۔ ان لوگوں کی دکھتی رنگ اس بات سے اور بھڑک اٹھی جب حضور نے فرمایا کہ قریش کے آباؤ اجداد بت پرستی کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوئے اور سب کے سب جہنم کی آگ میں جل رہے ہیں۔

اس وفد نے ابوطالب سے کہا کہ ہم اس بات کے لیے قطعی تیار نہیں ہیں کہ اس طرح ہمارے آباؤ اجداد کی توہین کی جائے اور ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہا جائے۔ وفد نے کہا کہ ابوطالب ہم آپ کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ آپ ایک ذی عزت منصب پر فائز ہیں۔ اگر آپ اپنے بھتیجے کو نہ روکیں تو ہم سب نہ صرف آپ کے بھتیجے کو مزہ چکھائیں گے بلکہ آپ کی مخالفت پر بھی

اُتر آئیں گے اور دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لیں گے۔

دند کے اس رویہ کو دیکھ کر ابوطالب کا دل بہت ہی اُداس ہوا اور ساتھ ہی ساتھ وہ کچھ اور بھی سوچنے پر مجبور ہو گئے۔

یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ دند میں جو لوگ شریک تھے وہ سب کے سب وقت کے بد معاش ترین یا شر و فساد کے مظہر نہیں تھے۔ دو ایک کے سوا باقی تمام نمائندے اپنے وقت کے ممتاز ترین، قابل عزت اور کامیاب ترین تاجر تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مکہ میں امن و امان رہے۔ حضورؐ کی تعلیمات کی وجہ سے جو نقص امن کا اندیشہ ہو گیا تھا اُسے رفع کرنا چاہتے تھے۔ خود ابوطالب بھی اسی انداز فکر کے حامل تھے۔ یہ ایسی ہی بات ہوتی کہ اس زمانہ میں کوئی شخص بٹیک میجر ہو اور اس کا بھتیجہ پکا کیمونسٹ ہو۔ نہ صرف خود ہو بلکہ دوسروں کو بھی کیونزیم کی تعلیم دیتا ہو۔ چونکہ ابوطالب اپنے بھتیجے کو دل سے عزیز رکھتے تھے اس لیے انہوں نے اپنے آپ کو عجیب و غریب موقف میں پایا۔ ابوطالب نے اپنے بھتیجے کو بلویا اور وہ سب کچھ کہا جو سردار ابن قریش نے ابوطالب سے کہا تھا۔ اپنے آپ کو اور مجھے بچاؤ کے الفاظ ابوطالب کی زبان سے نکلے۔ ساتھ ہی ساتھ کہا کہ مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔

حضورؐ نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ ابوطالب بھی سردار ابن قریش کے ہم خیال ہو چکے ہیں ابوطالب سے کہا کہ چچا خدا کی قسم اگر وہ لوگ میرے سیدھے ہاتھ میں سوج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ کر کہیں کہ میں اپنے مقصد سے دست بردار ہو جاؤں میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یا تو میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر رہوں گا یا اس کی خاطر اپنی جان دے دوں گا۔ یہ کہتے ہوئے حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آپ واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

بھتیجے کی اس ادا کو دیکھ کر بوڑھے چچا نے کہا کہ بھتیجے میرے قریب آؤ۔ جب حضورؐ قریب آئے تو ابوطالب نے محبت سے کہا کہ میرے بھائی کے بچے جاؤ اور جو کچھ تم کہنا

چاہتے ہو کہہو۔ اب میں تم کو کبھی نہیں رد کوں گا۔ جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔

دو باتوں نے مکہ والوں کو حضور کے خلاف برنگینہ کر دیا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ ان کے مقامی خداؤں کی توہین کی تھی۔ دوسری بات بت پرستوں کے لیے آپ نے فرمایا تھا کہ وہ دوسری دنیا میں دوزخ کی آگ میں ہمیشہ جلتے رہیں گے۔ یہی دو باتیں تھیں جنہوں نے مکہ والوں کے دلوں میں غم اور غصہ کے جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ وداکثر حضور سے سوال کرتے تھے کہ ان کے بت پرست آباؤ اجداد کا کیا حشر ہوگا۔ حضور فوراً جواب دیتے تھے کہ وہ تو آگ میں جل رہے ہیں اپنے آباؤ اجداد کی عزت نہ صرف ان کی زندگی میں بلکہ مرنے کے بعد بھی کرنا شروع ہی سے عربوں کا قوی دھیرہ رہا ہے۔ آج بھی بدوی عربوں کے خیموں میں بیٹھ کر آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جب کسی عرب کا غصہ ٹھنڈا کرنا ہوتا ہے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ خدا تمہارے باپ کو جنت نصیب کرے۔ مشرق وسطیٰ میں کئی لڑکوں کا باپ ہونا بہت ہی اچھی بات سمجھی جاتی ہے تاکہ پڑھاپے میں نوجوان بیٹوں کا سہارا ہے۔ ابن اسحاق سے ایک اور دلچسپ روایت منقول ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ تیسری مرتبہ جب وفد آیا تو اپنے ساتھ ایک خوب دلنواز نوجوان کو بھی لے آیا۔ وفد نے ابوطالب سے کہا کہ سارے قریش میں یہ نوجوان، مضبوط، محنتی اور خوش رو ہے۔ اس نوجوان کو آپ اپنا بیٹا بنالیں۔ اپنے بھتیجے محمد کو ہمارے حوالہ کر دیں۔ جو ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے اور ہمارے طرز زندگی کا منہکاڑا کرتا ہے۔ ابوطالب نے وفد کی اس تجویز کو رد کر دیا۔

وفد کا تین مرتبہ ابوطالب کے ہاں آنا اور ناکام و نامراد واپس جانا مکہ کے لوگوں کے دلوں میں لگی ہوئی آگ کو مزید مشتعل کرنے کا سبب بنایا اب مکہ کے رئیسوں اور سرداروں نے کھلم کھلا مخالفت شروع کر دی اور ساتھ ہی نئے نئے اسلام قبول کرنے والوں کو بھی اپنے شب و ستم کا نشانہ بنانا شروع کر دیا آج کل مغرب کے لوگوں میں جیسے قومی و فاداری کا جذبہ پایا جاتا ہے اسی طرح اُس زمانے میں قبیلہ کی حمایت اور اُس سے وفاداری کا عربوں میں رواج تھا۔ جس طرح آج حکومت سے اختلاف کے باوجود عوام بیرون دشمن کا مقابلہ حکومت کے ساتھ مل کر اور ڈٹ

کر کرتے ہیں اس طرح زمانہ قدیم میں مختلف قبیلوں کے افراد اپنے سردار اپنے قبیلے سے اختلاف کے باوجود پورے قبیلے کی خاطر اپنے جان و مال کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے۔

ابوطالب چونکہ خاندان ہاشمی کے سربراہ تھے اس لیے اُن کے خاندان کے افراد ہر بات میں اُن کی حمایت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اگرچہ کُن میں سے اکثریت پرست تھے۔ سردار قبیلے کا یہ فرض بھی جاتا تھا کہ اپنے قبیلے کے ہر فرد کی جان و مال کی حفاظت کرے۔ سردار قبیلے اپنے اس فرض میں اتنا پورا اترتا تھا کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ غلطی اس کے اپنے قبیلے کے فرد کی ہے پھر بھی اُسی کی حمایت کرتا تھا۔ وہ اس بات کی پروا نہیں کرتا تھا کہ اُس کے خاندان یا قبیلے کے چند افراد اُس کے کسی فیصلے سے متعلق ہیں یا نہیں۔ یہی سبب تھا کہ ابتدا میں لوگوں نے حضور کے ساتھ تشدد روا نہیں رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس کا نتیجہ بُرا ہوگا۔ بنی ہاشم کے لوگ اس کا پورا پورا بدلہ لیں گے۔

کئی شاعروں نے بنی ہاشم کی عزت و ناموس کی حفاظت اپنی شاعری کے ذریعہ کی۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ابتدا میں اسلام لانے والوں میں یا تو بچے تھے یا غلام یا پھر ایسے افراد جن کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ نہ اُن کا تعلق کسی قبیلے سے تھا نہ کوئی قبیلہ اُن لوگوں کی حمایت کرتا تھا۔ حضور کے دشمنوں نے ان پکاروں پر دنیا ننگ کر دی تھی۔ اُن کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچایا کرتے تھے جس میں مار پیٹ بھی شامل تھی۔

سب نسل پرست بھی واقع ہوئے تھے۔ نہ صرف وہ حسب و نسب پر زور دیتے تھے بلکہ نسلی عزور کو بجا بھی سمجھتے تھے۔ نہ صرف اپنے تعلق سے وہ نسل پرست تھے بلکہ اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کی بھی نسل کی حفاظت کیا کرتے تھے۔

اسی نسلی عزور کا نتیجہ تھا کہ جو لوگ شیخ بہادر اور خاندان میں نام آور تھے اپنی اولاد کو بھی اپنی صفات سے متصف دیکھنا چاہتے تھے۔ اکثر ہوتا بھی ایسا ہی تھا کہ جب کوئی اپنے آباؤ اجداد کی کسی صفت کی تعریف کرتا تھا تو دوسرے معنوں میں وہ خود اپنی ہی تعریف کیا کرتا تھا اس

یہ کہ اپنے آباؤ اجداد کی خاص صفت کا عکس اُس کو اپنے آپ میں نظر آتا تھا۔ اگر وہ اپنے باپ دادا کی بہادری کی تعریف کرتا تو اُسے وہی صفات جذبات خود اپنے میں نظر آتی تھیں یعنی تعریف صفت کی ہوتی تھی اور وہ صفت باپ دادا اور تعریف کرنے والے میں مشترک ہوتی تھی۔ جب حضور مکہ والوں کے آباؤ اجداد کے مذہب کی مذمت کرتے تھے تو اس ندامت میں وہ اپنے آپ کو بھی شریک کہتے تھے۔

ہمارے اپنے زمانہ میں جبکہ انسان انسان برابر ہے کا نعرہ لگایا جاتا ہے نسلی امتیاز ایک بے کار سی چیز سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے ذہنوں میں یہ بات بٹھائی گئی ہے کہ سامے بچے تو اس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں وہ سب برابر ہیں اس لیے ان تمام کا پیدائشی حق ہے کہ وہ یکساں تعلیم حاصل کریں اور یکساں تعلیم کے نتیجے کے طور پر جب وہ بڑے ہوں گے تو آپس میں برادرانہ سلوک اور یکسانیت کا اظہار کرتے رہیں گے۔

عملی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔

ایک موسیقار کی اولاد میں بہت ممکن ہے کہ موسیقی کا شغف زیادہ پایا جائے ہو سکتا ہے کہ ایک فوجی کالڈ کا فوج میں جانے کی زیادہ صلاحیت رکھے۔ فطری استعداد بہر حال کوئی چیز ہوتی ہے۔ اولاد کی نشوونما میں بہت سے عوامل و عناصر کام کرتے ہیں۔ اگر عرب نسلی امتیاز میں حد سے زیادہ تجاؤز کرتے تھے تو ہم نسل اور خون کو حد سے زیادہ حقیر کر دیتے ہیں۔ عربوں کو اس بات کا علم تھا کہ ان کے بڑوں کی بڑی صفات ان کے اپنے لیے اور ان کی آنے والی نسلیں کے لیے ایک قیمتی اثاثہ کا کام دیتی ہیں۔ اولاد کے لیے اپنے باپ دادا کی اچھی صفات مشعل راہ کا کام دیتی ہیں۔ وہ خود بھی اپنے بڑوں کی اعلیٰ صفات کو اپنانے کی کوشش کرتے تھے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ سال میں ایک دفعہ سارے جزیرہ نمائے عرب سے قافلے در قافلے مکہ کو کعبہ کی زیارت کے لیے آیا کرتے تھے۔ ان کے حج کا زمانہ مقدس مہینوں میں

شمار ہوتا تھا۔ حج سے پہلے اور حج کے بعد وہ مختلف سماجی اور معاشی سرگرمیوں میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اب حج کا زمانہ قریب آ رہا تھا۔ عیسوی سنہ ۶۱۳ تھا۔ حضورؐ کا سن مبارک ۳۳ سال تھا۔ سردارانِ قریش کو اب یہ فکر لاحق ہوئی کہ مکہ کو آنے والے قبیلے کہیں حضورؐ کے خیالات سے واقف نہ ہو جائیں۔ کہیں حضورؐ ان باہر سے آنے والوں کے سامنے کعبہ کے بتوں کی توہین نہ کرنے لگیں۔

مکہ کے لوگ زیادہ سے زیادہ قبیلوں کو حج کے موقع پر مکہ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ کیونکہ قریش کی ساری آمدنی کا دار و مدار ہی ان کی آمد پر تھا۔ کعبہ اور کعبہ کے بتوں کی توہین سے مکہ والوں کو ڈر تھا کہ کہیں ان کے ذریعہ آمدنی پر ضرب نہ پڑ جائے۔ قریش کی خوشحال کاخاترہ ان کی نظروں کے سامنے تھا۔ ان کی معیشت کا نظام ہی جس بات پر قائم تھا اب ان کو اس کی بنیادیں لرزتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

حج کا زمانہ شروع ہونے سے کچھ پہلے روسائے قریش کی ایک کانفرنس میں غور کیا گیا کہ حضورؐ کو کس طرح سے باہر سے آنے والے قبیلوں سے نہ ملنے دیا جائے۔ ان کو یقین تھا کہ حضورؐ ضرور ان قافلوں سے کہیں گے کہ بتوں کی پوجا کرنا اپنا وقت ضائع کرنا ہے۔ بت نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ اس طرح سے بتوں اور کعبہ کی عظمت قافلے والوں کے دلوں سے نکل جانے کا اندیشہ تھا۔ اگر وہ آنا بند کر دیں تو اس کے نتائج سارے قریش کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتے تھے۔

ان سب لوگوں نے طے کیا کہ جو طریقہ کار حضورؐ استعمال کرنا چاہتے ہیں وہی حربہ حضورؐ کے خلاف استعمال کیا جائے۔ جب لوگ آنے لگیں تو ان سے کہا جائے کہ مکہ میں ایک جادوگر ہے جو اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے باپ بیٹے میں، بھائی بھائی میں، شوہر بیوی میں آپس میں اختلاف کروا دیتا ہے۔ لڑوا دیتا ہے اور اس فتنہ گری میں وہ طاق ہے۔

اس وقت تک بد قسمتی یا خوش قسمتی سے صرف وہی لوگ مسلمان ہوئے تھے جن کا یا تو کسی قبیلے سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا یا ان کے رشتہ داروں نے خفا ہو کر ان سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اسی قسم کی مثالیں ایسی تھیں کہ سردارانِ قریش بطور ثبوت مکہ میں آنے والے قبیلوں کے سامنے پیش کر سکتے تھے۔

ساتویں صدی عیسوی میں یہی الزام حضور کے تعلق سے ساری دنیا میں دہرایا گیا اس الزام کو سب سے پہلے حضور کی ذات گرامی سے منسوب کرنے والا ولید ابن مغیرہ تھا۔ یہ قریش کے مالدار تاجروں میں سے ایک تھا۔

قرآن میں سورہ مدثر کی ۲۴ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے ”پھر کہنے لگا یہ تو ہے جو راگلوں سے، منتقل ہونا آیا ہے۔ (پھر بولا) یہ (خدا کا کلام نہیں بلکہ) بشر کا کلام ہے۔ اس کے جواب میں خدائے تعالیٰ نے اسی سورہ کی ۲۶ ویں آیت میں ارشاد فرماتا ہے ”ہم عنقریب اس کو سقر میں داخل کریں گے“ یہیں سے قرآن پاک میں جوابات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جب لوگ حضور پر اعتراض کرتے یا سوال کرتے تو جواب خدا کی طرف سے آتا تھا۔ حضور ان اعتراضات اور سوالات کے جواب پر بنائے وحی دیتے تھے۔

اس کا نفرنس میں جو فیصلے کئے گئے ان کے مطابق جب مکہ میں لوگ آنے لگے تو مخالف ان سے حضور کے تعلق سے جو کہنا طے ہوا تھا کہتے رہے۔ اس کا نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ یہ جانتے والے بھی حضور کو جانتے لگے۔ آپ کے نام سے واقف ہونے لگے۔ ان کے کان آپ نے پیغام سے آشنا ہوئے۔ جیسا کہ آج کے زمانے میں شہرت کو کامیابی کا پہلا زینہ سمجھا جاتا ہے قطع نظر اس کے کہ شہرت پانے والا اچھا ہے یا بُرا اسی طرح اس زمانہ میں بھی شہرت اپنا پورا پورا کام کرتی تھی۔ اس سال جتنے قبیلے مکہ کو آئے سب کے سب حضور کے نام اور کام سے واقف ہوئے جب وہ اپنے اپنے مقام پر پہنچے وہ ایسی ہوئے تو دوسروں سے آپ کے نام اور کام کا ذکر کرنے لگے۔

یادگار تاریخیں

| | |
|--------------|---------------------------------------|
| ۵۱۰ عیسوی | حضرت نبی کریم صلی اللہ وسلم کی پیدائش |
| ۵۹۵ ع | کافور بکرہ سے نکاح |
| ۴۱۰ ع | کی بعثت |
| ۴۱۰ سے ۴۱۳ ع | کی خاموش تبلیغ |

جلتہ کو ہجرت

حضور کا سب سے زیادہ جانی دشمن ابو جہل تھا۔ یہ بنی مخزوم کا سردار تھا۔ ابو جہل کے بعد دوسرا دشمن خود آپ کا چچا ابو لہب تھا۔ اس کا اصل نام عبدالعزیٰ تھا۔ ابو جہل کا شمار مکہ کے معززین میں ہوتا تھا۔ سرداروں کے گروہ میں اسے خاص مقام حاصل تھا۔ ابو لہب دوسرے نمبر پر آتا تھا۔

خاندانوں میں اختلاف پیدا کرنے کا الزام ان کی نظروں میں اہمیت اختیار کر گیا، ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کو پہلے پہل قبول کرنے والوں میں اکثر نوجوان تھے جن کی سرگرمیاں اپنے ماں باپ یا خاندان والوں کے خلاف ہو کر تھی۔ قریش کے ایک نوجوان خالد ابن سعید نے مسلمان ہونے کے بعد اپنے گھر سے فرار ہو کر حضور کے گھر میں آکر پناہ لی۔ اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے کہ ابتدا میں مسلمان ہونے والوں پر کیا کچھ بیٹی۔

عام طور پر عرب ہر بان اور ہر چہ بادا باد کے قائل رہے ہیں۔ ساتویں صدی کے عرب بھی ایسے ہی تھے۔ بلاشبہ حضور کو تضحیک اور توہین سے گزرنا پڑا لیکن یہ بدلہ ایسا نہیں تھا جیسے یورپ اور ایشیا میں لوگ اپنے مخالفین سے لیتے رہے ہیں، یورپ اور ایشیا کی تاریخیں اپنے مخالفین کے ساتھ وحشیانہ سلوک سے بھری پڑی ہیں۔ رومیوں نے اپنے مخالفین کو سولیوں پر چڑھایا۔

نیرو کے عہد حکومت میں عیسائیوں کو زندہ جلایا گیا یا بھلو کے شیروں کے سامنے پھینکا

گیا۔ تاتاریوں نے اپنے مخالفین کو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں تہہ تیہ کیا۔ عہدِ وسطیٰ کے یورپ میں ہیرود کو جلتے کوئلوں پر رکھ کر کباب بنایا گیا۔ پابند سلاسل کر کے ظلم و ستم کی شمع جلائی۔

اس قسم کے طریقے ابتدا میں اسلام قبول کرنے والوں کے خلاف نہ تو استعمال کئے گئے اور نہ ہی ان کے خواب و خیال میں اوپر بیان کردہ وحیاً نہ بدلے آئے۔

حضورؐ کے خلاف سرگرمیاں جاری رہیں۔ ابنِ اسحق نے بڑے ہی دلچسپ طریقے سے قریش اور حضورؐ کی آپس میں رشتہ کشی کو بیان کیا ہے۔ یہ روایت عمر بن العاصؓ سے بیان کی جاتی ہے جو اس وقت بت پرست تھے لیکن بعد میں چل کر فاسخ مصر بنے۔ ان سے پوچھا گیا کہ قریش نے حضورؐ کے ساتھ سب سے زیادہ بد تمیزی کی کون سی حرکت کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ ایک بار میں قریش کے ایک گروہ کے ساتھ کعبہ کے حدود کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ کسی نے حضورؐ کا ذکر پھیرا۔ اس گروہ کے چند لوگوں نے فوری کہا کہ ہم نے اپنی زندگی بھر میں اس قسم کی فتنہ گری کبھی نہیں دیکھی تھی جیسی محمدؐ نے پا کر رکھی ہے۔ اس شخص نے پوری برادری، پورے قبیلے اور پوری قوم کو آپس میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔ لوگ آپس ہی میں سر بہ گریباں ہیں۔ ہم لوگ ابھی یہ باتیں کر رہے تھے کہ حضورؐ تشریف لائے حجرِ ابروؓ کو بوسہ دیا۔ کعبہ کا طواف کرنے لگے۔ جب حضورؐ اس گروہ کے سامنے سے گزرے تو ان لوگوں نے حضورؐ کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہے میں حضورؐ کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جو متغیر تھا۔ حضورؐ نے ایک طواف پورا کیا اور دوسرے طواف کے لیے پھر حضورؐ کا گزر ہمارے سامنے سے ہوا، ہم لوگوں نے پھر سے گستاخی کی اور حضورؐ خاموشی سے طواف کے پورا کرنے میں مصروف رہے۔ جب حضورؐ تیسرا طواف کرنے کی غرض سے پھر ہمارے سامنے سے گزرے ہم نے پھر گستاخانہ جملے کہنے شروع کیے۔ اس پر حضورؐ رک گئے اور ہماری طرف مخاطب ہوئے۔ فرمایا

”اے قریش کے لوگو! سنو میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اُس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں ابھی تمہارا خاتمہ کر سکتا ہوں اور تم کو یہیں ڈبیر کر سکتا ہوں۔ یہ الفاظ ایسے اثر پذیر تھے کہ ہم سب کی زبانوں پر تالے پڑ گئے اور سب خاموشی کی تصویر بن گئے یہاں تک کہ ہم میں جو سب سے زیادہ غنڈہ اور بد معاش تھا اس پر کبھی اتنی ہیبت طاری ہوئی کہ اس نے ڈھیمی آواز میں بڑی ہی لجاجت سے کہا کہ اے ابوالقاسم آپ تشریف لے جائیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ لڑائی جھگڑا پسند نہیں کرتے۔ آپ ان آدمیوں میں سے نہیں جو لوگوں سے مار پیٹ کرتے ہیں۔

یہی روایت اور آگے بڑھتی ہے۔ اس واقعے کے بالکل دوسرے دن جبکہ چند لوگ آپس میں بحث و مباحثہ کر رہے تھے حضور تشریف لے آئے۔ سارے کے سارے حضور کے اطراف جمع ہو گئے۔ انہوں نے حضور کو گھیرے میں لے کر حضور سے سوال کیا کہ کیا آپ وہی ہیں جو ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ حضور نے جواب دیا ”ہاں“ اس جواب پر مجمع میں سے کسی نے حضور کی ردائے مبارک پر ہاتھ ڈالا۔ ابو بکرؓ نے مداخلت کی اور اپنے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا کیا تم اُس آدمی کو مارنا چاہتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میں ایک خدا کا ماننے والا ہوں۔ ابو بکرؓ کے اتنا کہنے پر اُس آدمی نے ردا کو چھوڑ دیا اور پھر سب اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔

عمر بن العاصؓ کہتے ہیں کہ یہی وہ بدترین اور گستاخانہ حرکت تھی جو میری آنکھوں نے قریش کو حضور کے ساتھ کرتے دکھا۔ ایک دن بنی مخزوم کے سردار ابو جہل کا حضور سے راستے میں ٹاننا ہو گیا۔ ابو جہل نے حضور کے ساتھ انتہائی بدتمیزی سے بات چیت کی اور اسلام کے خلاف اول قول بکنے لگا۔ حضور نے سکوت اختیار کیا۔ آگے بڑھ گئے کعبہ کے باہر حضور کو قریش کے چند اول بدذات مل گئے۔ اسی اشارے میں حضور کے ایک اور چچا حمزہ ابن ابولمطلبؓ وہاں پہنچ گئے

اپنے شانے پر وہ تیرکمان لیے ہوئے تھے۔ حمزہ شجاع، توانا، مضبوط اور شکار کے بڑے شوقین تھے۔ ایک عورت نے جو ابو جہل کی بدتمیزی اور اس کے اول نول کو راستہ میں سُن چکی تھی اس کا اظہار فوری حمزہ بن عبدالمطلب سے کر دیا۔ حمزہ یہ سُن کر غصے سے آگ بگولہ ہو گئے کعبہ کا رخ کیا جہاں ابو جہل اور لوگوں کے ساتھ بیٹھا گپ شپ ہانک رہا تھا۔ اپنی تیر کا رخ ابو جہل کے سر کی طرف کرتے ہوئے حمزہ نے کہا کہ آئندہ کبھی تو محمد کی توہین کرے گا تو میں محمد کا مذہب قبول کر لوں گا اور دکھیں گا کہ تو میرا کیا بگاڑ لیتا ہے۔ حمزہ کے یہ جوشیے الفاظ سن کر بنی مخروم کے چند لوگ ابو جہل کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ابو جہل نے خاموشی سے اپنے حمایتیوں سے کہا کہ چپ رہو۔ میں نے حمزہ کے بھتیجے کے ساتھ تھوڑی دیر پہلے واقعی زیادتی کی تھی۔

یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ حمزہ پہلے ہی سے آیا یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ حضور پر ایمان لائیں گے یا اس واقعے نے حمزہ کو یہ ضد دلادی کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ بہر حال حمزہ فوری مسلمان ہو گئے حضرت حمزہؓ کا مسلمان ہو جانا مسلمانوں کی چھوٹی سی جماعت کے لیے تقویت کا باعث بنا۔ حضرت حمزہؓ چونکہ ایک نوجوان آدمی تھے اور اپنی شجاعت اور بہادری میں اپنی مثال آپ تھے اس لیے لوگوں پر ان کا کافی رعب تھا۔ ایک اور واقعہ مشہور ہے جس کی صداقت میں تھوڑا بہت شبہ ہے۔ ایک بار سربراہ قریش حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک بہت بڑی رقم کی پیش کش کی اس کے علاوہ حضورؐ سے یہ بھی کہا کہ اگر حضورؐ چاہیں تو مکہ کی بادشاہت مل سکتی ہے۔ رقم اور بادشاہت کے عوض حضورؐ اپنی تبلیغ اور تعلیم سے باز آجائیں اور مکہ والوں کے فداؤں کو بُرا بھلا کہنا چھوڑ دیں۔ اس حکایت کی صداقت میں اس لیے شبہ ہے کہ جس زمانے میں اس واقعہ کا ہونا بیان کیا گیا ہے اس وقت حضورؐ اس موقف میں نہیں تھے کہ لوگ حضورؐ سے ڈریں۔ لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ حضورؐ ایک انقلابی اور موقع پرست ہیں

اور وقت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

شہر مکہ کے رہنے والے لگ بھگ دس ہزار آدمیوں میں سے اس وقت تک موسے بھی کم لوگ مسلمان ہوئے تھے اس چھوٹی سی اقلیت سے اتنی بڑی اکثریت کا دینا سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ حضور کو رقم کالا بلج دیا گیا ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو ان لوگوں نے حضور کو سمجھنے میں سخت غلطی کی۔ اپنا حکم تسلیم کرنے کی بات لغو معلوم ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ فتنہ پرستوں نے یہ الزام لگایا ہو کہ حضور نے دولت کے حصول یا اقتدار کی خواہش میں اسلام کا شوشہ چھوڑا ہو۔

اب مخالفین نے ایک نیا حربہ اختیار کیا۔ وہ یہ کہ حضور سے رسالت اور نبوت کی نشانیاں مانگنے لگے۔ وہ کہنے لگے کہ وہ ایمان لانے کو تیار ہیں اگر کسی جیتے جاگتے فرشتے سے اس بات کی تصدیق کروادیں کہ جس بات کا دعویٰ کر رہے ہیں وہ سچ ہے یا پھر اپنے خدا سے مانگ کر ان لوگوں کو باغات، سونا پانڈی، ہیرے جواہرات، زر و دولت سے نوازیں جنت کو اگر آپ زمین پر لے آئیں تو ہم ابھی آپ پر ایمان لانے کو تیار ہیں۔ اسی قسم کے مہمل مطالبات ہونے لگے۔

چند لوگوں نے کہا کہ آپ انہی باتوں کو دہرایا کرتے ہیں جسے نجد کا رہنے والا پیامبر نامی ایک شخص سکھا دیا کرتا تھا۔ ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ لوگوں کی اس قسم کی باتوں سے آپ بہت دل برداشتہ ہو جایا کرتے تھے۔

قریش کا ایک فرد جس کا نام نصر تھا جو حیرا کے لہجہ بادشاہوں کے دربار میں جایا کرتا تھا اپنے دورانِ قیام میں اس نے ایرانی عشق و محبت کی داستانیں بھی سنی تھیں۔ رستم و سہراب جیسے سورماؤں کے کارنامے بھی اسے یاد تھے۔ ایک بار جبکہ حضور لوگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے قدیم انبیا کا ذکر کر رہے تھے کہ کس طرح آپ سے پہلے آنے والے رسولوں نے اپنے وقت کے لوگوں کو خدا سے خوف و ڈر سے واقف کروایا تھا۔ نصر ایک

کو نے میں بیٹھا ہوا حضورؐ کی یہ گفت گو سن رہا تھا مداخلت کرتے ہوئے اس کم بخت نے کہا کہ
 ”آئیے میں آپ کو ان واقعات سے دلچسپ باتیں سناؤں۔ قدیم انبیاء اور رسولوں کے تقبول سے
 زیادہ رنگین ایرانی عشق و محبت کی داستانیں ہوتی ہیں۔ اجازت ہو تو انہی رنگینیوں کو دہرائوں۔
 قرآن کے سورہ القلم میں غالباً اسی آدمی کی طرف اشارہ ہے۔ اس سورہ کی پندرھویں آیت
 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

”جب اس کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ اگلے لوگوں کے افسانے ہیں“
 تورات کی تعلیم کے عین مطابق حضورؐ برابریوں کا قلع قمع کرنے کے لیے لوگوں کو اس بات
 سے ڈراتے تھے کہ ہر برائی کی سزا یا تو اسی دنیا میں ملے گی اور اگر یہاں نہ ملے تو مرنے کے
 بعد دوسری دنیا میں مل کہی رہے گی۔ اپنے اس نکتے کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کے
 لیے آپ اکثر و بیشتر تورات میں بیان کردہ واقعات کو لوگوں کے سامنے بیان کرتے تھے۔
 مثلاً حضرت موسیٰ کا فرعون کو سمجھانا اور ڈھانا اور فرعون کی غرقابی اور اسی قسم کے کئی واقعات
 حضورؐ کی زبان مبارک سے لوگوں تک پہنچے۔

کہا جاتا ہے کہ تورات میں بیان کردہ واقعات جو حضورؐ نے ارشاد فرمائے ہیں ان کی
 صحت میں سقم واقع ہوا ہے۔ قرآن کے سورہ مریم میں حضرت زکریا کا ذکر آیا ہے۔ زکریا کے
 عبارت خانے میں JOHN THE BAPTIST کی پیدائش۔ مریم کے پیٹ سے بغیر شوہر کے
 عیسیٰ کا پیدا ہونا۔ یہاں پر مریم کو ہارون کی بہن بتایا گیا ہے۔ MARY کو عربی میں مریم
 کہا جاتا ہے۔ اور دوشیزہ MARY کو عربی میں دوشیزہ مریم کا نام دیا گیا ہے۔ اس بات پر
 کافی بحث ہوئی ہے کہ حضورؐ نے بی بی مریم کو ہارون کی بہن بتایا ہے۔ مغربی مصنفین کا خیال
 ہے کہ دو عورتوں کو جن کے نام مریم تھے اور جن کا زمانہ ایک دوسرے سے تیرہ سو سال ادھر
 ادھر بنے غلط مطلق کر دیا ہے۔ مولانا محمد علی نے اس اعتراض کا جواب یوں دیا ہے کہ جو لوگ
 عربی سے پوری طریقے سے واقف نہیں ہیں وہی لوگ اس قسم کا اعتراض کر سکتے ہیں اور

دوناموں کے خلط ملط کرنے کا الزام لگا سکتے ہیں۔ جس طرح یہودی اپنے آپ کو موسیٰ کے بچوں سے مخاطب کرتے ہیں اسی مفہوم میں ہارون کی بہن یہاں استعمال کیا گیا ہے۔ جس طرح یہودی موسیٰ کے حقیقی بچے نہیں ہیں بلکہ معنوی ہیں اسی طرح مریم بھی ہارون کی حقیقی نہیں تھیں۔

بات یہ ہے کہ حضورؐ جب توریت کے واقعات بیان فرماتے ہیں تو اس کی اصلیت کا پتہ چلانے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ ایک غیر مسلم کی رائے اس سلسلے میں یہی ہو سکتی ہے کہ حضورؐ نے ان واقعات کو یہودیوں اور عیسائیوں سے سنا تو ضرور لیکن پوری طریقے سے ان واقعات کو یاد نہ رکھ سکے اس کی شہادت مسلمانوں کے اس دعویٰ سے معنی ہو سکتی ہے کہ حضورؐ کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا تھا اسی لیے سنی سنائی باتیں پوری طریقے سے ذہن میں نہ رہ سکیں۔

موجودہ زمانے کے علماء حقیقی اور واقعات کے تسلسل کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ تسلسل کی اہمیت بعض اوقات حقیقی کی اہمیت کو اس وقت گھٹا دیتی ہے جبکہ اس کے اطلاق سے کوئی اخلاقی ضابطہ پیش کرنا مقصود ہو مثلاً ایک جگہ حضرت عیسیٰ کے تعلق سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے ایک بندہ نے یروشلم یا بیت المقدس سے JERICHO کا رخ کیا۔ اس واقعہ میں دوسری جگہ بجائے JERICHO کے دمشق کی طرف جانا بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ کا JERICHO یا دمشق جانا کسی اور مقام کی طرف رخ کرنا اتنی اہمیت نہیں رکھتا ہے یہاں دیکھنا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کا منشاء اور مقصد کیا تھا اور اس منشا اور مقصد کے پیش نظر کسی بھی مقام پر جانا مقام کی اہمیت کو گھٹا کر مقصد کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اسی منطق کے پیش نظر اگر حافظ نے واقعات کے بیان کرنے میں کچھ کوتاہی کی ہو تو واقعاتی اعتبار سے ان کا تسلسل ٹوٹتا نظر آتا ہے لیکن جس منشاء اور مقصد کو آپ بیان کرنا چاہتے تھے اس میں

آپ عبدنی صد کا مباح رہتے تھے۔
ایک اور مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق قرآن خدا کے الفاظ

کا مجموعہ ہے۔ کئی باب اور سہریں شروع ہی اس لفظ سے ہوتے ہیں "قل" یعنی کہہ۔ کہہ کر
 میں بھی تمہارے ہی جیسا ایک فانی انسان ہوں: "خدا خود اپنے الفاظ اپنے پیغمبر کو دہرانے
 کے لیے دے رہا ہے۔ اس عقیدہ اور یقین میں خدا کا بھی تزلزل ان کے ہاں گناہ ہے۔
 اس مشکل کے پیش نظر ہم کو بھی مسلمانوں کا اپنا یا ہوا فقرہ دہرانا چاہیے۔ "واللہ اعلم"

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اسی دوران مکہ کے لوگوں نے اپنے دو آدمی یہودیوں کے شہر
 یثرب بھیجے۔ یثرب مکہ سے تقریباً ڈھائی سو میل دور ہے اور مکہ کے شمال میں ہے۔ انہوں
 نے یثرب والوں سے حضور کے تعلق سے ان کی دلے دریافت کی۔ یہودیوں نے ان سے کہا
 کہ توریت میں بیان کردہ دو ایک واقعات کی تفصیل پہلے آپ سے دریافت کی جائے۔
 دونوں نمائندے مکہ واپس آئے۔ ایک مجلس میں یہودیوں کے دریافت کئے ہوئے سوالات
 آپ کے آگے رکھے گئے۔ حضور نے سوال کرنے والوں سے کہا کہ آپ دوسرے دن ان کا جواب
 دیں گے۔ دن گزرتے گئے۔ پندرہ دن بعد حضور اپنا جواب لیے ہوئے اسی مجلس میں گئے
 اور قرآن کے سورہ کہف کی تلاوت فرمائی۔ ایک سوال کے جواب میں اصحاب کہف اور ان
 کے کتے کا واقعہ سنا اور دوسرے کا جواب آپ نے دیا کہ وہ آدمی جس کے تعلق سے یہودیوں
 نے دریافت کی ہے وہ وہی آدمی ہے جس کے سر پر دو سینگ تھے یعنی ذوالقرنین۔

یہودیوں کے سوال کرنے کا مقصد یہی تھا کہ قرآن کے ذریعے اپنے سوالات کا جواب
 حاصل کریں۔ یہاں پر یہ بات قرین نیکس نہیں ہے کہ یہودیوں نے اس قسم کے سوالات
 آپ کے ہاں روانہ کئے ہوں اس لئے کہ ان دونوں سوالات اور جوابات کے پیچھے یونانی انداز
 چھپا ہوا ہے۔

ایک بار حضور کے تمام ساتھی جمع تھے ان ہی میں سے کسی نے کہا کہ تشریح کے سامنے اب
 تک ہم لوگوں میں سے کسی نے بھی قرآن کو بہ آواز بلند نہیں پڑھا۔ یہ سن کر عبد اللہ بن مسعود جو
 ایک غلام تھے اور نئے مسلمان ہوئے تھے قرآن سنانے پر رضامند ہو گئے۔ کسی نے کہا

کہ بہتر ہوگا اگر غلام کی بجائے کوئی باعزت گھرانے کا فرد قریش کو قرآن سنائے تاکہ گھرانے کی وجہ سے قرآن سننے والے کی جان محفوظ رہ سکے۔ اپنے ساتھیوں کی اس بات کو سن کر عبداللہ ابن مسعود بصد ہو گئے کہ قرآن وہی سنائیں گے اور لوگوں سے کہا کہ اللہ میری حفاظت کرے گا۔

دوسرے دن صبح سویرے کعبہ سے باہر عبداللہ ابن مسعود نے کھڑے ہو کر بہ آواز بلند قرآن کی تلاوت شروع کر دی۔ پہلے تو لوگوں کو تعجب ہوا اور بڑے غور سے لوگ عبداللہ ابن مسعود کو دیکھنے لگے۔ ان میں سے کسی نے کہا کہ غلام عورت کا یہ لڑکا کیا بک رہا ہے پھر۔ سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ جب دشمنوں کو اس کا علم ہوا کہ عبداللہ ابن مسعود قرآن کی ان آیات کی تلاوت کر رہے ہیں جو حضور پر نازل ہوئی تھیں تو سب کے سب عبداللہ ابن مسعود کے قریب آ کر ان کو مارنے لگے۔ عبداللہ ابن مسعود مار کھاتے جاتے تھے اور تلاوت کرتے جاتے تھے۔ ان کے ساتھی جب انھیں اپنے ساتھ واپس لائے تو عبداللہ ابن مسعود کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔

ساتھیوں میں سے کسی نے کہا کہ ہم کو پہلے ہی سے اس بات کا ڈر تھا کہ تمہارا یہ حشر ہوگا۔ عبداللہ ابن مسعود نے نورا کہا کہ میں کل صبح بھی ایسا ہی کروں گا۔ اس پر ان کے ساتھیوں نے کہا کہ نہیں۔ تم نے اپنا فرض ادا کیا۔ تم نے قریش کو وہ چیز سنا دی جس کو سننے کے لئے وہ قطعی تیار نہیں تھے۔

قریش برابر آپ کے خلاف سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ قریش کے قبیلے کے وہ لوگ جو اسلام لائے تھے اپنی ہی برادری کے لوگوں سے مار کھا رہے تھے۔ ان ہی کے بھائی بندان پر زندگی کے دروازے بند کئے ہوئے تھے ان کو غذا تک سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ باپ کا اپنے بیٹے کے ساتھ یہی سلوک تھا۔ بھائی کا اپنے سگے بھائی کے ساتھ یہی سلوک تھا۔ جو بے چارے بے بہارا تھے اور جن کی حفاظت کی ذمہ داری کوئی اور قبیلہ

ذلیبا تھا ان پر تو شد و جد سے زیادہ بڑھتا جانا تھا۔

افریقہ کا ایک غلام جس کا نام بلال ابن رباحؓ تھا بلاناغہ اپنے آقا امیر ابن خلف کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا تھا۔ اس غلام کا صرف یہی تصور تھا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ آقا سے بیعت ہوئی ریت پر لٹا دینا اور جلتی ہوئی سلاخیں اس کے سینے پر رکھتا اور کہتا کہ یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ تم محمدؐ کے خلاف نہ ہو جاؤ۔ پھر سے ہمارے معبودات اور عزی کی پرستش نہ کرنے لگو۔ بلالؓ بھی اپنے عقیدے میں پکے نکلے۔ ہردن ابتلا و آزمائش کے دردان وہ اپنے اللہ کو پکارا کرتے تھے اور بار بار کہتے تھے: "اللہ ایک ہے" "اللہ ایک ہے"۔

ایک دن جبکہ بلالؓ اسی ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے ابو بکرؓ کا گزر ہوا اور انہوں نے بلالؓ کے آقا امیر سے سوال کیا کہ کب تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا کب تک اس غریب کی جان آفت میں رہے گی۔

بلال کے آقا امیر نے ابو بکرؓ کو درشتگی کے ساتھ جواب دیا کہ بلال کو اس مصیبت میں مبتلا کرنے والے تم ہو۔ ابو بکرؓ نے کہا کہ میرے ہاں بھی ایک افریقی غلام ہے بند رست توانا ہے۔ محنتی اور صحت مند ہے اور ساتھ ہی ساتھ بتوں کی پوجا بھی کرتا ہے۔ اگر تم چاہو تو میرے غلام کو تم لے لو اور مجھے اپنا یہ غلام دے دو۔ امیر غلاموں کے لین دین پر راضی ہو گیا۔ بلال ابو بکرؓ کے حوالے کر دیے گئے۔ ابو بکرؓ نے اپنے حاصل کردہ نئے غلام بلال کو اسی وقت آزاد کر دیا۔

حضور جو فطرتاً رحم و کرم کے خوگر تھے اور سراپا شفقت و مہربانی کا مجسمہ اس بات سے سخت پریشان رہتے تھے کہ آپ کے ماننے والوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ خصوصاً ان لوگوں پر زیادہ آفت آرہی تھی جو بالکل بے سہارا تھے۔ بظاہر جن کا پرسانِ حال کوئی نہیں تھا۔

حضورؐ نے برہمنوں سے تشدد کو دیکھ کر اپنے ملنے والوں میں چند سے کہا کہ بہتر ہوگا کہ وہ حبشہ چلے جائیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ حبشہ کے لوگ ہر بان ہیں۔ وہاں عدل و انصاف کا دور دورہ ہے۔ وہاں کا بادشاہ عیسائی ہے۔ تم لوگ وہاں اس وقت تک ٹھہرے رہو جب تک کہ خدایم کو اس قابل نہ کر دے کہ ہم ظلم و ستم سے نجات پا جائیں۔

یہاں پر یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اس وقت تک حضورؐ مکہ کے بت پرستوں کو اپنا اور اسلام کا دشمن سمجھتے تھے اور عیسائیوں اور یہودیوں پر اتنا اعتماد تھا کہ نازک موقع پر آپ کی نظریں ان ہی پر تھیں۔

ابن اسحاق کے بیان کے مطابق ۸۳ آدمیوں نے آپ کے اس مشورہ کو مان لیا۔ ابن اسحاق نے ان ۸۳ آدمیوں کے نام بھی دیئے ہیں جنہوں نے مشورہ قبول کرنے سے پہلے حبشہ کی ہجرت کی تھی۔ ان میں سے بعض لوگ اپنے ساتھ اپنے اہل و عیال کو بھی لیتے گئے۔ ان ہجرت کرنے والوں میں نابل ذکر عثمانؓ، ابن عفانؓ، ابن جن کا تعلق بنی امیہ سے تھا اور ابوسفیانؓ ان کا چچا زاد بھائی ہوتا تھا۔

حضرت عثمانؓ کا نکاح حضورؐ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ سے ہوا تھا۔ بی بی رقیہؓ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ ابن اسحاق کے بیان کردہ ناموں میں تقریباً ان سب ہی لوگوں کے نام آجاتے ہیں جو اس وقت تک مسلمان ہوئے تھے۔ سارے مسلمانوں کو حبشہ روانہ کر کے ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ آپ مکہ میں رہنے لگے۔ مکہ دشمنوں سے بھرا ٹپڑا تھا۔ اس مخالف فضا میں پیام حضورؐ کی بہادری، شجاعت، اخلاقی بلندی اور اعلیٰ کردار کو نمایاں کرتا ہے۔ علیؓ ابن ابی طالب اور زیدؓ آپ کے ساتھ ہی ٹھہرے رہے۔ وفادار اور جانثار ساتھی ابو بکرؓ بھی مکہ ہی میں رہے۔ حبشہ جانے والے ہاجرین سب کے سب ایک ساتھ نہیں گئے بلکہ آٹھ آٹھ دس دس لوگوں پر مشتمل چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی صورت میں مکہ سے روانہ ہوئے۔ مکہ کے عربوں کے لئے حبشہ کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ وہ تجارت کے سلسلے میں حبشہ سے

خوب واقف تھے اس کے علاوہ حبشہ نے مین پرتقریباً پچاس سال حکومت بھی کی تھی یہ زمانہ ۵۲۳ء سے ۵۷۴ء کا تھا۔

بہت ممکن ہے کہ حبشہ جانے والے مہاجرین سے مقامی لوگوں نے دھچپی کا اظہار کیا ہو۔ اس وقت حبشہ کا دارالخلافہ اُکسم تھا۔ حبشہ میں پوری طرح مذہبی آزادی تھی۔ مسلمان بھی کھلے بندوں عبادت اپنے طور پر کیا کرتے تھے۔ ان کے طریقہ عبادت پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی۔ ان لوگوں کا حبشہ میں ذریعہ معاش کیا تھا اس کے متعلق کوئی معلومات ہیں نہیں ملتی۔ ان میں سے بعض لوگوں نے اس وقت بھی حبشہ ہی میں قیام کرنے کو ترجیح دی جبکہ وہ عرب میں محفوظ طریقے سے واپس جا کر پھر سے وہاں اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکتے تھے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی روزی کا ذریعہ ٹھیک ہی ہوگا۔

حال ہی میں ایک مغربی مصنف منٹگری واٹ نے یہ انکشاف کیلئے کہ مسلمانوں میں آپس میں اختلاف ہو گیا تھا اس لئے ان میں سے چند تنگ اور مجبور ہو کر حبشہ کی طرف چلے گئے جس کو مسلم مورخین نے پھپٹے رکھا۔ ہمارے لیے یہ قطعی ناممکن ہے کہ ہم اوپر کے انکشاف کی کسی بھی طرف سے تصدیق یا حمایت کر سکیں۔ ہجرت کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہو سکتی جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

ابن اسحق کے دیئے ہوئے ۸۳ ناموں کا جب ہم غور سے مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں اکثریت یا تو بنی مخزوم کے لوگوں کی تھی یا پھر ان کا تعلق عبد الشمس کے خاندان سے تھا۔ یہ دونوں قبیلے قریش کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے۔ یہی وہ مالدار طبقہ تھا جو حضور کی مخالفت میں پیش پیش رہا کرتا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان مالدار اور تجارت پیشہ قبیلوں کے چیدہ چیدہ افراد اسلام قبول کرنے کی وجہ سے خاندانی جھگڑوں کا شکار ہو گئے تھے اس کے برخلاف وہ خاندان جو زیادہ امیر نہیں تھے مثلاً بنی ہاشم، بنی مطلب، بنی زہرہ یا بنی تمیم ان کے بہت ہی کم لوگوں نے حبشہ کا رخ کیا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ان خاندان والوں

نے اپنے مسلم افراد نماذان کو اٹنا تنگ نہیں کیا ہوگا جتنا ہی مخزوم یا عبد الشمس کے قبیلوں نے اپنے افراد کو تنگ کیا۔

مکہ کے لوگ اکثر بیشتر حبشہ کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے واقف بھی تھے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ خود حضورؐ بھی بہ نفس نفیس حبشہ جا چکے تھے اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی سے ذاتی طور پر واقف تھے اس کی تصدیق کرنا بھی ہمارے لیے مشکل ہے۔ جب قریش کے لوگوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت ہجرت کر کے حبشہ پہنچ گئی ہے تو انہوں نے اپنا ایک وفد حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی خدمت میں روانہ کیا۔ بادشاہ سے درخواست کی کہ مہاجرین کو اپنے ملک سے نکال دے۔

قریش کا وفد دینماندہ دل پر مشتمل تھا۔ یہ نمائندے مکہ کے بااثر اور صاحب الرائے لوگوں میں شمار ہوتے تھے ان میں سے ایک کا نام عبداللہ ابن ربیعہ تھا اور دوسرے کا نام عمر ابن العاص۔ یہ دوسرے صاحب تو آگے چل کر مسلمانوں کے بہت ہی بڑے فاتح بنے۔ فاتح مصر یہاں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر مکہ والوں نے حبشہ کے مہاجرین کو واپس کرنے کے لیے کیوں بادشاہ سے درخواست کی۔ اگر واقعی ہجرت کئے ہوئے مسلمان فتنہ اور فساد کا باعث تھے تو ان کا مکہ سے ہجرت کرنا اور حبشہ میں جا کر قیام کرنا مکہ والوں کی اپنی فتح تھی اس کی تشریح دو طرح سے کی جاسکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ مکہ کے مالدار تاجر حبشہ کے بادشاہ سے اپنے تعلقات استوار رکھنا چاہتے تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان مہاجرین کی وجہ سے ان لوگوں کے تعلقات شاہ حبشہ سے بگڑ جائیں۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو جو ان کی قومی دولت میں اضافہ کر رہے تھے غیر ملک میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ چمڑے کی مصنوعات مکہ کی خصوصیت تھی۔ قریش کے نمائندے حبشہ جاتے وقت اپنے ساتھ کافی تعداد میں چمڑے کی مصنوعات لیتے گئے جہاں سے پہلے مکہ کے تجربہ کاروں نے اپنے نمائندوں سے کہہ دیا تھا کہ حبشہ کے درباریوں کا خاص خیال

رکھنا۔ جیسے ہی حبشہ میں داخل ہوں خاص خاص درباریوں اور شاہی خدام کے جیب گرم کر دینا تاکہ وہ لوگ دربار شاہی میں تمھاری اور تمھارے سامان کی خریداری کے لیے بادشاہ سے سفارش کریں۔

عبداللہ اور عمر بن العاص جیسے ہی حبشہ پہنچے دربار شاہی میں حاضر ہونے کے لیے بادشاہ سے درخواست کی۔ جب دربار میں پہنچے تو ان دونوں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ ہمارے ملک کے چند لوگ اپنے آبائی دین سے برگشتہ ہو کر آپ کے ملک میں پہنچ گئے ہیں اور یہاں پناہ گزیں ہیں۔ وہ نہ تو اپنے باپ دادا کے دین پر قائم ہیں اور نہ ہی اس ملک میں آکر انہوں نے آپ کا مذہب اختیار کیا ہے بلکہ انہوں نے دونوں مذاہب سے الگ اپنا ایک نیا دین اختیار کیا ہے۔ دونوں نمائندوں نے بادشاہ سے التجا کی کہ آئے ہوئے پناہ گزینوں کو حبشہ سے نکال کر پھر واپس مکررانہ کر دیا جائے۔

درباریوں اور امرا نے جو پہلے ہی سے ان نمائندوں سے ثبوت حاصل کر چکے تھے ان نمائندوں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ بادشاہ سے سفارش کی کہ نمائندوں کے کہے پر عمل ہو تو بہتر رہے گا۔

بادشاہ نے نمائندوں کی درخواست کو رد کر دیا۔ ان سے کہا کہ وہ اس وقت تک مسلمانوں کو اپنے ملک سے باہر نہیں نکالے گا جب تک کہ ان کو بھی صفائی کا موقع نہ ملے۔ دربار میں مسلمانوں کی طلبی ہوئی۔ مسلمانوں نے اپنا نمائندہ جعفر ابن ابی طالب کو بنایا اور دربار میں اپنی نمائندگی کے لئے روانہ کیا۔

جعفر ابن ابی طالب نے حبشہ کے بادشاہ سے کہا کہ ہم پہلے بتوں کی پوجا کرتے تھے اظہانی منزل میں تھے۔ ہر قسم کی برائی میں ملوث تھے۔ خدا نے ہماری یہ حالت دیکھ کر ہمارے لیے ایک رسول بھیجا اس رسول نے ہمیں سکھایا کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔ اپنی زندگی میں سچائی پیدا کرو۔ بتوں کو مہجول جاؤ۔

بادشاہ نے جعفر سے سوال کیا کہ تمہارے ہاں کوئی ایسا کلام ہے جسے صلے تمہارے پیغمبر کو دیا حضرت جعفر نے قرآن کے سورہ مریم کی تلاوت کی اور ایک سے شروع کر کے چالیس آیت پر اپنی قرأت ختم کی۔ ان آیات میں حضرت زکریا اور JOHN THE BAPTIST کی پیدائش کا ذکر ہے اور پھر حضرت عیسیٰ کا بغیر باپ کے بی بی مریم کے بطن سے پیدا ہونا بیان کیا گیا ہے۔ ایک عیسائی بادشاہ کے سامنے تلاوت ہو رہی تھی۔ یہ عین ممکن ہے کہ حضرت جعفر نے ۲۴ ویں آیت پر پہنچ کر اپنی قرأت ختم کر دی ہو اس لیے کہ ۳۵ ویں آیت میں جس بات کی طرف اشارہ ہے وہ عیسائی عقیدے سے میل نہیں کھاتا۔ ۳۵ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

”خدا کو سزاوار نہیں کہ کسی کو بیٹا بنائے۔ وہ پاک ہے۔ جب کسی چیز

کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو یہی کہتا ہے کہ ہو جانو وہ ہو جاتی ہے“

پروفیسر مارکو لیتھ کا کہنا ہے کہ اس آیت کو سورہ میں اس وقت جگہ ملی جب بعد میں چل کر

مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مناقشہ پیدا ہونے لگا۔

حضرت جعفر کی قرأت کو سن کر نجاشی کو یہ گمان گزرا کہ اسلام بھی عیسائیت ہی کا کوئی نیا

فرقہ ہے۔ بادشاہ نے مسلمانوں کی جہت سے واپسی کے مطالبے کو سختی سے رد کر دیا۔

عمر بن العاص نے ابھی ہمت نہیں ہارتی۔ دوسرے دن پھر بادشاہ کے ہاں حاضر ہونے

کی درخواست کی۔ ان کو دربار میں دوبارہ بلوایا گیا۔ انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ مسلمانوں کو پھر

سے دربار میں طلب کیا جائے اور ان سے سوال کیا جائے کہ عیسیٰ اللہ کی مخلوق ہیں یا نہیں۔

جعفر دربار میں طلب کیے گئے۔ ان سے وہی سوال پوچھا گیا۔ جواب میں جعفر نے کہا کہ ہم عیسیٰ

کے تعلق سے وہی کہیں گے جس کو ہمارے پیغمبر نے ہم سے کہا ہے۔ عیسیٰ خدا کا بندہ ہے اس

کے پیغمبر ہیں۔ اس کی روح ہیں۔ اس کے الفاظ ہیں۔ عیسیٰ وہی ہیں جن کو خدا نے بی بی مریم

کے شکم سے اپنی طرف سے روانہ کیا۔

یہاں یہ عین ممکن ہے کہ جعفر کا دوسری بار دربار میں بلوائے جانے کا واقعہ مورخین کی اپنی

اختراع ہو۔ ساتھ ہی ساتھ یہ دائرہ اس بات کی بھی نشان دہی کرتا ہے کہ مکہ کے لوگ چاہے وہ مشرک تھے یا بت پرست، کافر تھے یا مسلمان، سب کے سب عیسائیت کی تعلیم اور اس کے عقیدوں سے واقف ضرور تھے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضورؐ کے ایک قریبی شہزادہ درقہ ابن نوفل نے انجیل کا کچھ ترجمہ عربی میں بھی کیا تھا۔

جعفر کے جواب سے حبشہ کے بادشاہ کو اطمینان ہو گیا۔ عبداللہ اور عمر بن العاص خالی ہاتھ مکہ واپس لوٹے۔

ارتم نے مسلمان ہوتے تھے اس نوجوان کا تعلق بنی مخزوم سے تھا۔ ارتم نے اپنے گھر کو مسلمانوں کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ جگہ اب مسلمانوں کے آپس میں مل بیٹھنے کی جگہ بن گئی۔

ارتم کا مکان مکہ کے شہر کی گلیوں سے کچھ آگے پرسکون جگہ واقع ہوا تھا۔ بغیر کسی شور و غیب کے مسلمان سکون کے ساتھ اس گھر میں مل بیٹھتے تھے جس مقام پر گھر تھا اس کا نام الصفا تھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سخت ترین دشمن عمر بن خطاب بھی تھے ان کا تعلق غدی بن کعب کے قبیلہ سے تھا۔ ان کی تند طبیعت اور جذباتی فطرت سے مکہ کا ہر شخص خائف تھا۔ ایک دن عمر کو خوش آیا اور غصہ میں اپنے گھر سے اس ارادہ سے نکلے کہ ارتم کے گھر جا کر مسلمانوں کی محفل کو تنہہ و بالا کر دیں۔ اس وقت اُس مکان میں بشمول خواتین ۴۰ افراد تھے۔ راستے میں کسی شخص سے ڈبھیر ہو گئی۔ اس شخص نے سوال کیا کہ عمر کہاں کے ارادے ہیں۔ عمر نے جواب دیا کہ میں ارتم کے گھر منعقد ہونے والی مجلس کو درخواست اور ساتھ ہی محمدؐ کو ختم کرنے جا رہا ہوں۔ عمر کا غصہ سے بھرا ہوا جواب سن کر اس شخص نے کہا کہ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ پہلے اپنے گھر والوں کا جائزہ لو۔ عمر نے چیخ کر کہا: "کیوں؟" میرے خاندان والوں میں تمہیں کیا برائی نظر آتی ہے۔ اُس شخص نے جواب دیا۔ حضرت۔ آپ کے بہنوئی سعید اور آپ کی ہمیشہ فاطمہ دونوں تو مسلمان ہو چکے ہیں۔ پہلے گھر جا کر ان کی توخبر لو۔

عمر آپے سے باہر ہو گئے۔ غصے سے کانپتے ہوئے اپنے بہنوئی اور بہن کے گھر کا رخ کیا۔

جو کچھ عمر نے سنا تھا سچ پایا بہن اور بہنوئی کو مسلمان پایا۔ جب عمر دروازہ پر پہنچے اس وقت
 خباب بن ارتؓ نامی ایک مسلمان ان میاں بیوی کو سورہ طہ کی آیات پڑھ کر بنا رہے تھے۔
 یہ آیات تحریری صورت میں بھی خباب کے پاس تھیں۔ جیسے ہی عمر کے آنے کی آہٹ ہوئی
 خباب جو بے چارے غلام تھے اپنی جان کی سلامتی کے لیے پڑھنا پڑھانا بند کر کے گھر کے
 پچھلے حصے میں جا کر چھپ گئے۔ عمر دروازہ کے باہر ہی سے قرأت کی آواز سن چکے تھے۔
 جیسے چلائے گھر میں گھس آئے اور کہنے لگے کہ یہ سب کیا بکواس تھی۔ میاں بیوی نے بیک
 آواز خاموشی سے کہا کہ کچھ بھی نہیں۔ عمر خاموش رہنے والے کہاں تھے۔ فوراً بھاگ کر
 سب کچھ سن چکا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم دونوں نے محمدؐ کا دین قبول کر لیا ہے۔
 عمر اپنے بہنوئی سعید سے دست دگریاں ہو گئے اور مار پیٹ شروع کرنے والے ہی
 تھے کہ عمر کی بہن فاطمہ اپنے شوہر کو بچانے کے لیے درمیان میں آگئیں۔ عمر آپسے باہر تھے
 اپنی بہن کو پیٹنے لگے۔

میاں بیوی دونوں نے پر عزم لہجے میں کہا کہ ہاں ہم مسلمان ہو گئے ہیں ہم خدا پر
 ایمان لائے ہیں۔ اس کے پیغمبر کو بحق مانتے ہیں تمہیں جو کرنا ہے کر لو۔

جب عمر نے دیکھا کہ بہن کے چہرے سے خون ٹپک رہا ہے ان کا عقد کم ہوا۔ کہنے
 لگے جو چیز تم ابھی پڑھ رہے تھے مجھے دو۔ میں بھی تو دیکھوں کہ محمدؐ کیا کہتے ہیں۔ ان کی
 بہن قرآنی تحریر کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئی تھیں۔ جرات مندی سے اپنے بھائی عمر کو
 جواب دیا۔ میرے بھائی تم گندے ہو تم ناپاک ہو۔ اس تحریر کو تو صرف پاک لوگ ہی ہاتھ
 لگا سکتے ہیں۔ بہن کی یہ بات سن کر عمر باہر گئے۔ اپنے ہاتھوں کو دھویا اور پھر اپنی بہن سے
 قرآنی تحریر مانگی اور قسم کھائی کہ وہ پڑھ کر اسے واپس کر دیں گے۔

عمر کافی پڑھے لکھے تھے اور ہر تحریر کو آسانی سے پڑھ لیتے تھے۔ جس سورہ کو عمر پڑھ
 رہے تھے اس میں خدا نے پاک اپنے پیغمبر سے یوں مخاطب ہے۔

اے محمد! ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں بلکہ اس شخص کو نصیحت دینے کے لیے (نازل ہوا) جو خوف رکھتا ہے۔ یہ اس کا اتارا ہوا ہے جس نے زمین اور اونچے اونچے آسمان بنائے۔“

ان آیات کو پڑھ کر بے اختیار عمر کی زبان سے نکلا۔ سبحان اللہ کتنے پیارے الفاظ ہیں۔ خواب جو ایک کونے میں چھپے ہوئے تھے قرآن کی یہ تعریف سن کر باہر نکل آئے اور وحیدیں آکر کہنے لگے۔ عمر خدا کی طرف آؤ۔ عمر خدا کی طرف آؤ۔

عمر نے پھر سے تلوار سنبھال لی۔ سیدھے ارقم کے گھر کا رخ کیا۔ ارقم کے ہاں پہلے تو اس خیال سے جانا چاہتے تھے کہ محفل کو درہم برہم کر دیں لیکن اب دل کی دنیا بدل چکی تھی جب وہاں پہنچے تو دروازہ پر دستک دی۔ مسلمانوں میں سے کسی نے دروازے سے پہلے جھانکا تو فوراً پلٹ کر حضورؐ سے کہا کہ یہ تو عمر ہے جو تلوار لیے دروازہ پر کھڑا ہے۔ خوش قسمتی سے وہاں حمزہؓ بھی موجود تھے۔ حمزہؓ نے کہا کہ عمر کو اندر آنے دو۔ اگر وہ بُرے ارادے سے آئے ہیں تو ہم ان سے نپٹ لیں گے۔

حضورؐ بہ نفس نفیس دروازہ پر تشریف لے گئے تاکہ عمر کو خوش آمدید کہیں۔ عمر کی چادر اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے حضورؐ نے سوال کیا کہ اپنی عصبیت کب ختم کرو گے۔ عمر نے جواب دیا کہ اللہ کے رسول اسی جہالت کو ختم کرنے ہی کے لیے تو میں یہاں حاضر ہوا ہوں۔ یہاں اس لیے آیا ہوں کہ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤں۔ عمر کے اسلام لانے کا یہ واقعہ کافی مشہور ہے۔

حضرت عمرؓ نے جب خود اپنی زبان سے اپنے اسلام لانے کا ذکر کیا ہے تو اس میں کسی جگہ اپنی بہن کو مارنے کا ذکر نہیں کیا۔ حضرت عمرؓ کا حلقہ بگوشِ اسلام ہونا اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اب مسلمانوں کے ہاں دو عظیم شخصیتیں تھیں۔ ایک حمزہؓ اور دوسرے عمرؓ۔ حضرت عمرؓ کا جو عیب و دبدبہ تھا اس کے متعلق خود حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اگر شیطان

بھی دیکھئے کہ عمرؓ آ رہے ہیں تو وہ راستے سے ہٹ جلتے گا۔

حضرت عمرؓ حضورؐ سے عمر میں دس سال چھوٹے تھے! اپنی نوجوانی میں ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بچے شرابی تھے۔ یہی وہ عمرؓ ہیں جن کے زمانہ خلافت میں مکہ کی چھوٹی سی بستی دنیا کی ایک عظیم سلطنت میں تبدیل ہو گئی۔

باوجود اپنی اجداد اور تشدد پسند طبیعت کے حضرت عمرؓ اسلام کے سچے عاشقوں میں شمار کئے جانے لگے۔ قلوب میں نیت کے ساتھ دل و جان سے رسول اللہ کے چاہنے والوں میں سے تھے۔ طبیعت کے لحاظ سے حضرت عمرؓ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی ضد تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نرم خو تھے۔ مسائل کو ہمیشہ نرمی سے حل کرتے تھے۔ ان کے برخلاف حضرت عمرؓ تند خو تھے طاقنت اور قوت کی زبان استعمال کرتے تھے۔ خود اپنے گھر میں اپنی بیوی کو بھی زد و کوب کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے۔

حضورؐ کے مخالفین کے لیے حضرتؓ کا اسلام لانا ایک تکلیف دہ بات تھی۔ مسلمانوں کی اکثریت کے حبشہ ہجرت کرنے کے باوجود اسلام آہستہ آہستہ جڑیں پکڑ رہا تھا۔ لوگ حلقہ جگوش اسلام ہو رہے تھے۔ حبشہ کے بادشاہ کا ہاجرین کو مکہ واپس کرنے سے انکار مکہ کے مالدار اور ماثر تاجروں کے منہ پر ایک طمانچہ تھا۔

مخالفین پھر ایک باجمع ہوتے۔ آپس میں گفت و شنید کرنے لگے۔ طے پایا کہ حضورؐ اور آپ کے تڑپتی رشتہ داروں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ تڑپش کی تمام جماعتوں نے متفقہ فیصد کیا کہ خاندان بنی ہاشم اور خاندان المطلب کا ہر طریقے سے مقاطعہ کیا جائے! ان دونوں خاندانوں کو نہ لٹریاں دی جائیں اور نہ ہی ان خاندانوں کی لٹریوں سے اپنے لٹریوں کا بیاہ کیا جائے۔ نہ ان کو کوئی چیز فروخت کی جائے اور نہ ہی ان سے کوئی چیز خریدی جائے۔

اس مقاطعہ کے فیصلے پر سنجیدگی سے عمل کرنے کی ہر ایک نے قسم کھائی۔ مقاطعہ کی تفصیلات کو ایک دستاویز کی شکل دے کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا گیا۔

جیسے ہی مقاطعہ کا آغاز ہوا بنی ہاشم اور بنی مطلب کے افراد شہر مکہ سے ذرا باہر ایک چھوٹی سی وادی میں جہاں ابوطالب رہا کرتے تھے منتقل ہو گئے۔ اس وادی کے اطراف پہاڑ تھے۔ ایک روایت کے مطابق تقریباً ۴۰ ہزار افراد ایسے تھے جو مقاطعہ کی زد میں تھے۔ یہ تعداد مبالغے پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس وقت مکہ کی کل آبادی تقریباً ۱۰۰ ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ ہو سکتا ہے کہ چار سو کو لوگوں نے چار ہزار بنا دیا ہو۔ ان چار سو میں بھی مرد، عورتیں، بچے، آزاد اور غلام، صحت مند اور بیمار سب ہی شامل رہے ہونگے۔ قریش کے سرداروں کے ارد گرد سارے افراد خاندان کا جمع رہنا اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ قریش کے لوگ خمیں میں رہا کرتے تھے۔ ان میں ابھی بدویت باقی تھی۔

بنی ہاشم میں صرف ابولہب ہی ایسا تھا جو حضورؐ کا چچا ہونے کے باوجود اپنے قبیلے کو چھوڑ کر دشمنوں سے مل گیا اور دشمنوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور رہنے لگا۔ اس وادی میں دونوں خاندانوں کے افراد ابوطالب کی سرپرستی میں اپنی زندگی کے دن کاٹنے لگے۔ ان افراد میں بہت کم ایسے تھے جو مسلمان تھے۔

ابولہب کی بیوی نے اپنا مستغلہ بنا لیا تھا کہ کانٹوں کے ڈھیر کے ڈھیر لاکر حضور کے گھر کے سامنے ڈال دے۔ راستے میں کانٹوں کو اس طرح سے بچھا دیتی تھی کہ حضورؐ جیسے ہی اپنے گھر سے قدم نکالیں کانٹے آپ کی پاپوسی کریں۔

قرآن پاک کے سورہ لہب میں ابولہب اور اس کی بیوی کا ذکر کیا گیا ہے

” ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو۔ نہ تو اس کا مال ہی اس کے کچھ کام آیا اور نہ وہ جو اس نے کمایا۔ وہ جلد بکھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا اور اس کی بیوی بھی جو اپنے سین میں پراٹھائے پھرتی ہے اس کے گلے میں مونج کی رسی ہوگی۔“

گوہاشمی اور بنی مطلبی خاندانوں کے افراد کے ساتھ شادی بیاہ اور خرید و فروخت میں

بایکاٹ ضرور یا لیکن ان کو شہر میں آنے جلنے کی آزادی تھی۔ حضور کے ساتھ جو بدزبانی اور زیادہ گوئی کی جاتی تھی۔ ان ساری بدتمیزیوں اور بے ہودگیوں کے باوجود حضور برابر شہر تشریف لے جاتے، راستوں میں بے خطر گھومنا کرتے، لوگوں سے بحث و مباحثہ کرتے لیکن کبھی کبھی کسی تشدد کا آپ نے مظاہرہ کیا اور نہ ہی کسی نے آپ کے ساتھ بدسلوکی کی۔

اس دوران مکہ میں بحث و مباحثہ کا بازار گرم تھا۔ جب لوگ حضور کی ذرا سی بھی نفقت کرتے مخالفین ان کے پیچھے پڑ جاتے اور کبھی ختم نہ ہونے والی بحث شروع ہو جاتی۔ آپس میں مار دھار، قتل و غارت، قید و بند، ظلم و ستم یا شہادت کی ابتدا ابھی نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے ہاں کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ اس وقت کے بت پرستوں کا عقیدہ آٹھ کیا تھا۔ وہ ایک خدائے واحد کو ماننے کے لیے تیار تھے بشرطیکہ ان کے اپنے بنائے ہوئے معبودوں کو انسان اور خدا کے درمیان ایک وسیلہ یا رابطہ مان لیا جائے۔ ان کے بتوں کو پوجنے کو ان معنی میں نہ لیا جائے کہ وہ پتھر یا لکڑی یا درختوں کو ان کی خاطر پوجا کرتے تھے۔ یہ ایسی ہی بات ہوئی جیسے چرتھ میں پلاسٹر کی مورتیاں ہوتی ہیں۔ ان میں عیسیٰ کی بھی مورتی ہوتی ہے اور مریم کی بھی۔ اس کے باوجود چرتھ میں عیسائی ان مورتیوں کی پوجا کے لیے نہیں جلتے بلکہ اپنے خدا کی عبادت کے لیے جاتے ہیں۔

ان میں سے اکثر لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ان کے بت خدائے واحد کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کے ذریعے خدا تک آسانی سے پہنچا جاسکتا ہے۔ چونکہ حضور خود بھی فرشتوں اور جن کے قائل تھے اس لیے مکہ کے بعض لوگوں نے بت پرستی، فرشتے اور جن کے تصور کے درمیان مماثلت اور مصالحت پیدا کرنی چاہی۔

چند بے دین اس بات کے تو قائل تھے کہ مرنے کے بعد پھر سے زندگی ملے گی مگر اس بات کے قائل نہیں ہونے تھے کہ انسان من و عن و ہی جنم دوسری دنیا میں لے گا جیسے وہ اس دنیا میں لئے ہوئے ہے۔ اس دنیا میں ہمارے جسم اور ذہن و حال جیسے ہیں ان کا دوسری دنیا میں اعادہ ہوگا۔

ایک بار ایک شخص نے پرانی ہڈی حضور کی خدمت میں پیش کی اور کہا اے پیغمبر آپ تو کہتے ہیں کہ خدا اس ہڈی کو پھر سے زندگی دے گا۔ یہاں تو یہ فنا درجے میں ہے حضور نے فرمایا ہاں میں سبح کہتا ہوں خدا اس ہڈی کو اور مرنے کے بعد تم کو دوسری دنیا میں نئی زندگی دے گا اور تم کو اس مسخر کے نتیجے میں دوزخ میں بھیجے گا۔ یہ سن کر سوال کرنے والے کو غصہ آیا اور ہڈی کو ہاتھوں سے ملنے ہوئے اس کی گود کو آپ کی طرف پھونکا۔

حضور کی خصوصیات میں آپ کی خاموش پسند طبیعت، امن پسندی، ہر دلعزیزی اور محبت آمیز سلوک کا ہر ایک نائل تھا۔ آپ مکہ کے لوگوں کو دل سے چاہتے تھے۔ طبری کا کہنا ہے کہ آپ کسی ایسے شخص کو کی تلاش میں تھے جس سے آپ کا اور مکہ والوں کا کسی نہ کسی حکم پر اتفاق ہو جائے۔ طبری اور واقدی کے بیان کے مطابق حضور مجمع عام میں قرآن پاک کے سورہ البقرہ کی تلاوت فرما رہے تھے۔ آپ اس سورہ کی اٹھارویں آیت پر پہنچے جس میں خدائے پاک اپنے رسول کی ان الفاظ میں شہادت دے رہا ہے۔

”انہوں نے اپنے پروردگار (کی قدرت) کی کتنی ہی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ بھلا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا اور تیسرے منات کو؟“

اس مقام پر شیطان حضور کی زبان سے یہ الفاظ بھی ساتھ ہی نکلواتا ہے۔

”یہ بلند مرتبہ بت ہیں اور شفاعت کرنے والے ہیں“

جب قرأت ختم ہوئی حضور سجدہ میں گر پڑے۔ آپ کو دیکھ کر مسلمانوں نے بھی سجدہ کیا۔ جب بت پرستوں نے عزیٰ اور لات و منات کا ذکر باعزت طریقے سے حضور سے سنا اور یہ بھی سنا کہ ان کی شفاعت کی توقع ہے تو یہ لوگ بھی حضور کے ساتھ سجدہ میں شامل ہو گئے۔ خانہ کعبہ میں جتنے لوگ موجود تھے مسلمان اور مشرک سب ہی سر بہ سجود تھے اور ایک ساتھ عبادت کر رہے تھے جب لوگ منتشر ہوئے تو قریش آپس میں ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے کہ چلو مسیحت کی اور مفاہمت کی کوئی صورت تو نکل آئی۔

جدید مسلم غلطی کرام نے عیسائی منصفین کو ہدف ملامت بنایا ہے کہ ان شریکوں نے اس واقعہ کو رنگین بنایا۔ یہ ان کی اپنی اختراعات ہیں، اگر حضورؐ کی ذات گرامی پر کوئی توہین ہوگی۔

فہر کی اور واقدی دونوں نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔ بہت سے مسلم مفسرین بشمول ابن اسحاق نے اس واقعہ کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ نزدیک اس واقعہ کو سب سے نظر انداز کر دینا دیانت کے خلاف ہے۔ حضورؐ نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں فرمایا کہ آپ گناہوں اور غلطیوں سے میرا ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کا یہ عمل دشمنوں کے تالیف قلوب کے لیے ہوا ہو۔

اس واقعہ کی صداقت کے لیے ایک اور ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔ حبشہ کے ہاجرین کو جب اس کا علم ہوا کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت ہو گئی ہے اور ان کے تعلقات آپس میں پھر سے سونے لگے تو کئی ایک ہجرت کیے ہوئے لوگ مکہ واپس آ گئے۔

ابن اسحاق نے ان تمام آدمیوں کے نام بھی گنوائے ہیں جو اس مصالحت کی خبر سن کر حبشہ سے مکہ واپس ہوئے اگرچہ کہ انہوں نے شیطانی الفاظ کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ اگر واقعی یہ صحیح ہے کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت ہو گئی تو اس مفاہمت کی میعاد یقیناً کئی دن بلکہ کئی ہفتے ہونا چاہئے۔ جب ہی تو حبشہ کے لوگ اس بات کو سن کر مکہ واپس آئے۔

طبری جنہوں نے شیطانی دوسرے اور الفاظ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ حضورؐ نے اپنی غلطی محسوس کر کے اسی دن اپنی مفاہمت سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا کہنا ہے کہ حضورؐ نے کبھی بھی شیطانی الفاظ اپنی زبان سے ادا نہیں فرمائے تھے بلکہ بت پرستوں نے حضورؐ کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنی مطلب براری کی۔

(سیرت رسول اللہ میں پروفیسر نواب علی رضوی لکھتے ہیں کہ قاضی عیاض نے شفا میں اور بیضاوی امام رازی نے اپنی اپنی تفاسیر میں اس روایت کی نقلی کھولی ہے اور ثبات کیا ہے کہ

عقلاً اور نقلاً یہ روایت مردود ہے جنہوں نے اس روایت کو بیان کیا ہے ان کو یہ نہ سوجھا کہ اسی سورہ بجم میں اس جھوٹی روایت کی تلی کھولی گئی ہے شروع میں صاف صاف فرمادیا گیا۔

« وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ »

نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں۔ اس کے بعد کی آیت ہے یہ تو حکم خدا ہے جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے۔

بہ کھر شیطان کیونکر تصرف کرتا اور زبان مبارک سے وہ نجس جملہ نکلوانا۔ حبیب (

انسانی کمزوری کا ایک اور واقعہ حضور سے منسوب ہے۔ اس کا وقوع بھی غالباً عین اسی نطق میں ہوا جبکہ اوپر بیان کیا گیا ہوا واقعہ پیش آیا۔ آپ ایک مرتبہ مکہ کے ایک بہت ہی بااثر آدمی سے مصروف گفتگو تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ کسی طرح اس آدمی کو داخل سلام کریں اسی دوران ایک بوڑھا جوان دھا بھی تھا آ موجود ہوا اور حضور سے فرمائش کی کہ آپ اس کو قرآن سنائیں حضور اس بن بلائے ہمان کی آمد اور مداخلت سے اور بے وقت کی فرمائش سے ناراض ہو گئے یعنی اسے کچھ جواب دیئے غصے میں وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ خدا اپنے پیغمبر کی اس حرکت سے خوش نہیں ہوا۔ قرآن کے سورہ عبس میں ارشاد ہوتا ہے۔

” (محمد) ترش رو ہوتے اور منہ پھیر بیٹھے کآن کے پاس ایک نابینا آیا۔ اور تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرنا یا سوچتا تو سمجھانا اسے فائدہ دیتا۔ جو پرواہ نہیں کرتے اس کی طرف تو آپ توجہ کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ نہ سنوے تو آپ پر کچھ الزام نہیں (اور جو آپ کے پاس دڑتا ہوا آیا اور (خدا سے) ڈرتا ہے اس سے آپ بے رخی برتتے ہیں دیکھئے یہ نصیحت ہے۔ جو چاہیں اسے یاد رکھیں “

قرآن کی یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آپ اپنی انسانی کمزوریوں کو تسلیم کرتے تھے۔ آپ نے لات، منات اور عزیٰ مین نسوانی خداؤں کا ذکر تو اپنی زبان سے کر دیا۔ لیکن بعد میں پچھتاتے رہے کہ یہ کیا غلطی ہو گئی اس بات کو آپ کا دل نہیں مانتا تھا۔ اس

معلے میں جب آپ کی تشویش بڑھ گئی تو جبریل حاضر ہوئے اور کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں۔
وہ خدا کے الفاظ نہیں تھے شیطان نے آپ کے دماغ میں کچھ ایسی بات ڈال دی تھی جس سے
بھجور ہو کر آپ نے شیطان کے الفاظ اپنی زبان سے ادا کر دیئے۔ شیطان نے یہ حرکت صرف آپ
آپ کے ساتھ نہیں کی ہے۔ آپ سے پہلے ہر انبیاء اور رسول بھی شیطان کی ان حرکتوں کی زد
میں آچکے ہیں۔

شیطان سے ادا کر دئے گئے ہوتے الفاظ سورہ سے نکال دیئے گئے۔ قریش کے ساتھ
مفاہمت ختم ہو گئی اور مخالفین نے پھر سے اپنی مخالفت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

(اس سارے واقعے کی بنیاد ہی طبری اور واقدی کی روایات پر ہے۔ واقدی کے تعلق سے
ابتداء میں ہم نے پروفیسر نواب علی رضوی کی سیرت رسول اللہ سے کچھ بیان کر دیا تھا۔ پھر
ایک بار اس کا اعادہ ضروری ہے۔ واقدی سیرت رسول میں بے احتیاطی کیا کرتے تھے۔
روایات کو مخلوط کر دیتے تھے۔ امام احمد حنبل نے ان کو کذاب کہا ہے۔ امام بخاری مروج
الحديث کہتے ہیں۔ لسانی نے کہا ہے کہ واقدی رسول اللہ پر جھوٹ بولنے والوں میں سے تھے۔

طبری نے آنحضرت کے واقعات ابن اسحاق سے نقل کیے اور جابجا واقدی کے اختلافات اور
مختلف طریقوں سے جو روایات خود ان کو پہنچی تھیں وہ بھی درج کر دیں مگر بغیر کسی تحقیق کے۔
اسلام کی تاریخ لکھنے والے کے لیے ابن اسحاق، زہری، واقدی، طبری اور بخاری کے
رہنما تلم سے گریز کرنا ممکن نہیں اس لیے حقیقت اور ارادت کے قطع نظر ان قدیم ماخذوں
میں حضور کی ذات کے تعلق سے جو بات بھی کام کی مل جاتی ہے تاریخ داں اس سے
استفادہ کرتے ہیں بد قسمتی سے سیرت کا ایک بڑا حصہ انہی ماخذوں کے ذریعہ ہم تک پہنچا
ہے جن میں واقعات اور حقائق بھی ہیں اور رنگینیاں بھی۔ ان ہی حضرات کو جن کے
نام اوپر دیئے گئے ہیں۔ امام المغازی، نقل روایات کے درپائے ذخار، امیر المؤمنین
فی الحدیث، امیر مجتہدین سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور انہی کو "دجالوں میں سے ایک دجال"

کذاب، متروک الحدیث، لغویانوں کا سردار اور رطب و یابس کا ماہر کہا جاتا ہے۔ جب ایکسری مورخ کو سارے اچھے القاب سے نواز دیتے ہیں اور جب اسی مورخ نے کوئی ایک بات ایسی لکھ دی ہو جو واقعاتی نقطہ نظر سے اس کی نظر میں صحیح ہے تو ہم اس سے نہ صرف لڑنا شروع کر دیتے ہیں بلکہ فتنہ و فساد پر اتر کر اسے گالیوں سے نوازتے ہیں، غرض اس لیے کہ اس کی کہی ہوئی بات ہمارے اپنے عقیدے اور ہماری اپنی محبت یا اپنے انداز فکر سے میل نہیں کھاتی۔ اگر کسی مورخ کو کذاب ہی ٹھہرا دیا گیا تو پھر اس کی ہر بات کذب پر مبنی ہوگی۔ اس کی معلومات یا اس کی کتاب سے استفادہ کرنا ہی غلطی ہے۔

سیرت اور اسلامی تاریخ کی ہر کتاب میں مسلم مورخین کے حوالے دے جاتے ہیں جن میں ابن اسحاق بھی ہیں۔ واقدی بھی ہیں۔ طبری بھی ہیں۔ زہری بھی ہیں بہت سے اسلامی واقعات کا ماخذ ہی ان لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ ایک طرف تو قدم قدم پر ان کی کتابوں سے استفادہ کیا جائے اور واقعات کی بنیاد ہی ان کی دیاات پر رکھی جائے اور ساتھ ہی ساتھ ان کو کذاب یا دجال سے مخاطب کیا جائے کہ عجیب سی بات لگتی ہے۔

دوسرے مورخین کی طرح گلب پاشاہ نے بھی قدیم اسلامی مفسرین اور مورخین کے رشتہات قلم کو پیش نظر رکھا ہے۔ جو بات انہوں نے بیان کی ہے وہ بلا حوالہ نہیں ہے بلکہ اس کی سند ہے۔ اگر ہم میں سے کسی کو گلب پاشاہ کے حوالے اور سند سے اختلاف ہو تو غلطی گلب پاشاہ کی نہیں بلکہ ان قدیم اسلامی مورخین کی ہے جن کے قلم سے نکلی ہوئی تحریریں آج سینکڑوں سال بعد بھی بعض اذقات ہمارے عقیدے اور جذبات کو مجروح کرتی ہیں۔

حبیب

اس دوران معاشرہ کا مسلہ جاری رہا لیکن اس معاشرہ کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ اس کا اثر دونوں قبیلوں پر نہ ہونے کے برابر ہوا۔ بعض لوگ ان دونوں قبیلوں سے بالکل تعلقات نہیں رکھنا چاہتے تھے اور بعضوں نے بنی ہاشم کے ساتھ شادی بیاہ کا مسلہ پھر سے بحال کر دیا۔ راتوں کو اکثر و بیشتر کھانے پینے کے سامان سے لدے ہوئے اذنت مکہ کے شہر سے نکلتے اور ابوطالب کی وادی کا راستہ لیتے۔

جن مسلمانوں کا تعلق بنی ہاشم سے نہیں تھا اپنے قبیلوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی معاشرہ نہیں کیا گیا۔ ہاں ان لوگوں کے ساتھ بے عزتی اور توہین کا سلوک نہ صرف جاری رہا بلکہ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ مجبور ہو کر چند مسلمانوں نے اپنے آپ کو باثریت پر توں کی سرپرستی میں دے دیا تاکہ ان کی سرپرستی کی وجہ سے وہ لوگ شر و فساد سے محفوظ رہیں۔ ابو بکرؓ کے قرابت داروں نے ان کو اپنی قرابت سے نکال دیا تھا۔ ابو بکرؓ نے ہجرت کا ارادہ کیا اور حضورؐ سے ہجرت کی اجازت مانگی۔ جب آپ اپنی منزل مقصود کی طرف جارہے تھے راستے میں ابن دغنے سے ملاقات ہوئی جو اپنے قبیلہ کا سردار تھا۔

ابن دغنے قریش کے حمایتیوں میں تھا۔ قریش کے اذتوں کو اپنی نگرانی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا کرتے تھا۔ ابن دغنے نے ابو بکرؓ سے ہجرت کا سبب دریافت کیا۔ وہ ابو بکرؓ سے اچھی طرح سے واقف تھا۔ ابو بکرؓ کا شمار مکہ کے معززین میں ہوتا تھا۔ وہ اپنی داد و دہش اور احسان و سلوک میں بھی ممتاز تھے۔ یہاں یہ بات دلچسپ ہے کہ خود اس وقت مکہ کی صورت حال سے اتنا بے خبر تھا کہ اس غریب کو پتہ ہی نہیں تھا کہ وہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ قریش کے ہمدردوں نے مطالبہ شروع کیا کہ اس معاشرہ کو ختم ہو جانا چاہیے اس لیے کہ معاشرہ اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہا۔ صرف ابو بکرؓ ہی وہ واحد شخص تھا جو اس مطالبہ کا شد و مد سے مخالف تھا۔

معاشرے کی جس دشا دیز کو کعبے میں لٹکایا گیا تھا دیکھنے پر پتہ چلا کہ اُسے دیک چاٹ گئی

ہے۔ جو الفاظ دکھائی دے رہے تھے وہ صرف یہ تھے » اے خدا تیرے نام پر اس کا مفہیم
 وہی تھا جو بسم اللہ کا ہے اور اسی فقرہ سے دستاویز کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہ واقعہ مقاطعہ کو ختم
 کرنے کا ایک بڑا سبب بنا۔ یہ مقاطعہ تین سال تک جاری رہا اس کی مدت ۱۶۶۷ء سے ۱۶۱۹ء
 تک تھی۔

پروفیسر مارگولینتھ کا کہنا ہے کہ مقاطعہ تو اسی وقت اٹھا دیا گیا تھا جبکہ تشریح سے مسلمانوں
 کی مفاہمت ہو چکی تھی۔ چونکہ خود شیطانی الفاظ ادل کیے جانے کا واقعہ ہی پر دوں میں ہے
 اس لیے پھر مسلمانوں ہی کے الفاظ دہرانا چاہیے۔ واللہ اعلم

یادگار تاریخیں

| | |
|--------------|---|
| ۵۷۰ء | حضورؐ کی پیدائش |
| ۵۹۵ء | حضرت خدیجہؓ سے نکاح |
| ۶۱۰ء | بعثت |
| ۶۱۰ء سے ۶۱۳ء | فترۃ الوحی (وحی کا تین سال تک بند رہنا) |
| ۶۱۳ء | تبلیغ کی ابتدا |
| | مصر، شام اور ایشیائے کوچک پر ایرانیوں |
| ۶۱۲ء سے ۶۲۸ء | کا قبضہ |
| ۶۱۵ء | مسلمانوں کی حبشہ کو ہجرت |
| ۶۱۶ء سے ۶۱۹ء | بنی ہاشم سے مقاطعہ |

بیعت عقبہ

نماز کی ابتدا حضور نے کروادی تھی۔ یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ کس تاریخ اور کس سن سے نماز کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ایک اہم بات یاد رکھنی چاہیے کہ نماز میں اللہ تعالیٰ کی صرف حمد و ثنا کی جاتی ہے۔ نماز کے بعد ذاتی اغراض و مقاصد کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ نماز عیسائیوں کے طریقہ عبادت سے ملتی جلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ حشر میں مذہبی بھجن بھی گایا جاتا ہے۔ نماز میں گانا نہیں ہوتا۔ حضور نے موسیقی کو ناپسند فرمایا تھا اور اپنے چاہنے والوں کو بھی اس سے دور رکھنا چاہا۔

نماز پڑھنے والے کا رخ کعبہ کی طرف ہوتا ہے۔ نماز کی نیت باندھی جاتی ہے۔ دونوں ہاتھوں کو کانوں تک لے جا کر اللہ اکبر کہا جاتا ہے۔ پھر دونوں ہاتھوں کو سینے پر یا ناف کے اوپر باندھ لیا جاتا ہے۔ سورہ فاتحہ کے بعد پھر کوئی اور سورہ یا چند آیات پڑھی جاتی ہیں۔ رکوع کیا جاتا ہے اور پھر سجدہ میں جانا پڑتا ہے۔ ہر رکعت میں ایک رکوع اور دو سجدے ہوتے ہیں۔ فجر میں دو فرض رکعتیں ہوتی ہیں۔ ظہر میں چار رکعت فرض ہیں۔ عصر میں چار رکعت فرض اور مغرب میں تین رکعت اور پھر عشاء میں ۴ رکعت فرض ۲۴ گھنٹوں میں پانچ وقت فرض نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ فرض کے ساتھ سنت نمازیں بھی

پڑھی جاتی ہیں۔ نماز کے بعد دعا مانگی جاتی ہے۔

نمازیں جو کچھ پڑھا جاتا ہے اس میں صرف اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہوتی ہے۔ انگریزی دالوں کے لیے سبب انشاء عبادت نماز کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو اس انشاء سے نماز کا مفہوم پورے طریقے سے ادا نہیں ہوتا۔ نماز میں سورۃ فاتحہ کی اس آیت کے سوا کہ اسے خدا تم کو سیدھے راستہ پر چلا کسی مقام پر بھی حرم و ہوا کے حصول کے لیے کچھ نہیں کہا جاتا۔

حضور نے انفرادی اور اجتماعی طریقہ پر دعا کے طریقوں کے کوئی خاص اصول وضع نہیں فرمائے لیکن احادیث میں دعاؤں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ قرآن پاک میں سورۃ مومن کی ۶۰ ویں آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

”اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔“

حضور نے اس بات کو اہمیت دی کہ انسان اپنے خدا کو ہر حال میں یاد رکھے۔ ہر وقت اُسے پکارے۔ دنیوی دغدغوں اور فکر معاش کی پریشانیوں میں بھی اس کی یاد بہر حال آتی رہنی چاہیے۔

عیسائیت نے بھی ایسی ہی تعلیم دی ہے۔

مشہور محدث مسلم کے حوالہ سے ایک حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ لوگ جب اللہ کو یاد کرنے بیٹھتے ہیں تو فرشتے اور ملائکہ ان کے اطراف جمع ہو جاتے ہیں۔ اللہ کا لطف و کرم ان کو اپنے دامن میں سمیٹے رہتا ہے۔ ذہنی آسودگی اور سکون قلب کی نعمت سے وہ نوازے جاتے ہیں۔ اللہ جل جلالہ اپنے مقربین سے اپنی عبادت کرنیوالوں کا ذکر کرتا رہتا ہے۔

ایک اور حدیث ہے جس میں حضور فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بندہ

جب بھی مجھے یاد کرتا ہے مجھے اپنے قریب پاتا ہے۔

حضور بذاتِ خود اپنے اللہ سے اکثر و بیشتر دعائیں مانگا کرتے تھے۔ آپ کی پروردی میں دعاؤں کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک مسلمان صبح سویرے اپنے کام پر جانے لگتا ہے تو جلتے وقت کہتا ہے "میرے اللہ تجھ پر میرا بھروسہ ہے" سفر پر روانہ ہونے سے قبل کہتا ہے "میرے اللہ تیری ذات پر مجھے اعتماد ہے۔ تو میرا مختار کل ہے"۔

یہ اور اسی قسم کے جملے بار بار مسلمانوں کی زبان سے ادا ہوتے رہتے ہیں اور اس کثرت سے ادا ہوتے ہیں کہ اب یہ بات چیت کا جزو بن چکے ہیں۔ اظہارِ بیان کا ایک طریقہ ہو گئے ہیں اور ان کی مذہبی اہمیت ضمنی ہو کر رہ گئی ہے۔

حضور نے اوراد اور وظیفوں کی اہمیت کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص سو بار سبحان اللہ پڑھے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی ہزار بخششیں ہوتی ہیں اور اس کے ہزار گناہ معاف کیے جاتے ہیں۔

اپنے گناہوں اور غلطیوں سے معافی مانگنا بھی دعاؤں کا ایک بڑا جزو ہے۔ اکثر مذہبی لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا جاتا ہے کہ اے اللہ میرے گناہوں کو معاف کر دے میری خطاؤں کو درگزر فرما اسی قسم کے جملے بار بار دہرائے جاتے ہیں۔

مکہ کے قیام کے دوران حضور کے مخالفین کو نماز لے جس بڑی طریقے سے مخالفت پر آمادہ کیا کسی اور چیز نے نہیں کیا۔ حضور کی تعلیمات میں سے کسی اور بات نے لوگوں کو اتنا دشمن نہیں بنایا جتنا نماز کی تعلیم نے۔ خصوصاً بدوی قبیلوں کی طرف سے بڑی مخالفت ہوئی۔ نماز کی پابندی ان کی آزادانہ زندگی اور لامحدودیت کو نظم و ضبط کا جامہ پہنارہی تھی۔ ان کی زندگی میں ایک تنظیم پیدا کر رہی تھی۔ ایک مخصوص وقت پر ایک مخصوص طریقے سے نماز ادا کرنا ان کے لیے بارِ خاطر ہو رہا تھا، نماز میں رکوع اور سجدہ میں جانا ان

عربوں کے لیے ان کے اپنے نقطہ نظر سے انسانی عظمت کے منافی تھا۔
 رکوع اور سجدہ جب بیت کے اظہار کا طریقہ تھا جس میں انکار، عجز اور نکاری کے عناصر
 شامل تھے۔ بندہ کا اپنے آپ کو حقیر سمجھنا ان عربوں کو بجا نہیں رہا تھا۔
 گو بدوی نماز کی مخالفت کرتے تھے لیکن دغاویہ حملے ان کی زبان سے بھی نکلا کرتے تھے
 اپنے خدا کو بہت ہی پیار سے وہ پکارا کرتے تھے: اے میرے پیارے اور ننھے منے خدا
 سے مخالفت ہوتی تھی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے حضور پر ایک زمانہ ایسا بھی آچکا تھا کہ
 آپ قریش کے بت پرستوں کو اپنا دشمن سمجھ رہے تھے اور یہودیوں اور نصرا نیوں کو اپنا دوست۔
 قرآن کی آیات میں اور حضور کے مواعظ میں تورات کی کئی کہانیوں کا ذکر ہے جس میں
 اخلاقی سدھار کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ حضور نے مسلمانوں کو جوشہ ہجرت
 کرنے کا مشورہ دیا تھا اور اس وقت جبکہ ایک نصرانی ملک تھا۔

جب سے آپ نے نماز کی باقاعدہ ابتدا کی اپنا قبلہ بیت المقدس یروشلم کو بنائے رکھا
 اس وقت یروشلم ایک مقدس شہر مانا جاتا تھا۔ آپ کے ملنے والوں اور دوستوں دجن میں یہودی
 اور نصرانی بھی شامل تھے، ان سب کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا۔ ان ہی دنوں ایک دن آپ
 نے اعلان فرمایا کہ آپ گزشتہ رات بیت المقدس ہو آئے ہیں۔ شب معراج کا ذکر بھی اسی
 واقعے سے متعلق ہے۔

ایک روایت کے مطابق جبریل نے آپ کو ایک رات زمین سے جگایا، ایک جانور جس
 کا نام براق تھا اُپر بٹھایا۔ براق کی تیز رفتاری حدنگاہ کے برابر بیان کی جاتی ہے۔ جبریل کی
 معیت میں آپ بیت المقدس تشریف لے گئے، یہاں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت
 عیسیٰ سے آپ کی ملاقات ہوئی جو آپ کا وہاں انتظار کر رہے تھے۔ ان تمام انبیاء نے
 ایک سانچہ وہاں عبادت کی۔

روایات میں ہے کہ آپ بیت المقدس سے ساتویں آسمان پر لے جائے گئے جہاں پر

آپ نے حضرت آدم، نوح، موسیٰ، ابراہیم اور عیسیٰ علیہم السلام سے ملاقات کی۔ ان تمام انبیاء سے ملنے ملتے اب آپ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں جبرئیل کی بہت نہ ہوئی کہ کچھ اور آگے بڑھ سکیں آپ تین ماہ اس مقام پر پہنچے جہاں اللہ جل جلالہ نے جلوہ فرمایا ہے۔ یہیں سے آپ کو حینت اور دروخ کا نفاذ کروایا گیا۔ اسی موقع پر آپ کو پانچ وقت کی نماز کی باقاعدگی کا حکم ملا۔ واپسی براق ہی کے ذریعہ ساتویں آسمان سے سیدھے کچھ چند منٹوں میں ہو گئی۔

دوسرے دن علی الصبح صحن کعبہ میں حضور نے اعلان فرمایا کہ حضور گزشتہ رات یروشلم تشریف لے گئے تھے اور اسی رات واپس بھی ہوئے۔

ابن اسحاق کے بیان کے مطابق بہت سے لوگوں نے کہا کہ خدا کی قسم یہ تو بالکل لغو بات ہے۔ کاروان اگر اردن اور شام جاتے تو جانے آنے میں پورا ایک مہینہ لگ جاتا ہے۔ اتنا لمبا سفر محمد ایک رات میں کیسے کر سکتے ہیں۔ کئی ایک مسلمانوں نے اس واقعہ کو سن کر اپنے ایمان اور اعتقاد کو خیر باد کروایا یہیں سے مسلمانوں نے اس واقعہ کا ظہور اور اسکی تفصیلات میں بحث و مباحثہ

کا آغاز کر دیا۔ ابن اسحاق نے حضرت عائشہ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ معراج کی رات حضور کا جسم مبارک بستر پر ہی تھا۔ صرف آپ کی روح کو عالم بالا کی سیر کروائی گئی۔ اس راز سر بستہ سے صرف حضور ہی واقف ہیں کہ آپ نے عالم بالا کو کس طرح دیکھا اور وہاں کیا دیکھا۔ ابن اسحاق کا اپنا کہنا ہے کہ چاہے حضور عالم بیدار می میں ہوں یا ٹیٹھی ٹینڈ کے مزے لے رہے

ہوں اس واقعہ کا ظہور یقیناً ہوا تھا۔ ۶۱۰ء یہ سال حضور کیلئے انتہائی منحوس ثابت ہوا۔ اسی سال آپ کی چہیتی بیوی حضرت خدیجہؓ اس دنیا سے عالم جاودانی کی طرف روانہ ہوئیں۔ نبوت کی سرفرازی کے بعد نو سال تک حضرت خدیجہؓ حضور کیلئے ایک بڑا سہارا تھیں۔ آپ کا دست و بازو تھیں۔ آپ کی معتد علیہ نہیں۔ آپ کے ہاتھ پر سب سے پہلے ایمان لائی تھیں۔

حضور اپنے شکوک و شبہات، تفکرات اور تکالیف کا ذکر اگر کسی سے کرتے تو سب

سے پہلے اپنی اس نیک نخت بیوی سے کرتے جب آپ پر نا امید یوں اور یا یوسیوں کے بدل چھا جاتے تو آپ کی دلجوئی اور ہمت بڑھانے والی خدیجہ کو اپنے نزدیک پاتے حضور اور بی بی خدیجہ کی ازدواجی زندگی کے ۲۴ سال انتہائی رفاقت اور محبت کے ساتھ گزرے۔ آپ اپنی عمر سے بڑی بیوی کے نہ صرف ہمیشہ ہی خواہ اور وفادار رہے بلکہ ہمیشہ اپنی محبت کی مالا اپنی بیوی کے گلے میں پہنائے رکھی حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد حضور کا نکاح سودہ بنت زمعہ سے ہوا۔ یہ نکاح سوائے اسکے اور کچھ نہ تھا کہ امور خانہ داری میں سہولت ہو حضور کا سن مبارک اس وقت ۴۹ سال تھا۔ حضرت سودہ ادریس عمر سے زیادہ تھیں۔ فریبہ بدن تھیں حضور سے نکاح ہونے سے قبل یہ بڑھ ہو گئی تھیں۔

حضور کی صاحبزادیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ حضور دو بچوں یعنی علی اور زید کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ بی بی سودہ سے نکاح ہو جانے کے بعد گھر کی تمام ذمہ داریاں ان کے سپرد کر دی گئیں۔ حضور کی زندگی تک بی بی سودہ حضور کے پاس ہی رہیں سیرت نگاروں نے حضور کی سوانح مبارک میں بی بی سودہ کا بہت ہی کم ذکر کیا ہے۔

حضرت خدیجہ کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد حضور کے چچا ابوطالب بیمار ہو گئے۔ مکہ کے معززین بن میں غلبہ، شبیبہ، ابوہل وغیرہ شامل ہیں ابوطالب کی مزاج پرسی کے لیے بستر مرگ پر آئے۔ ابن اسحق کے بیان کے مطابق مکہ کے معززین ابوطالب سے یوں مخاطب ہوئے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے اور آپ کے بھتیجے کے درمیان کن کن باتوں کی وجہ سے خلیج حال ہے۔ ہماری آپ کے درخواست ہے کہ آپ اپنے بھتیجے کو یہاں طلب کریں تاکہ وہ اور ہم کسی مصالحت پر پہنچیں۔ وہ ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دے تاکہ ہم بھی ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔

ابوطالب نے حضور کو طلب کیا۔ معززین مکہ نے جو کچھ کہا تھا

ابوطالب نے حضورؐ کے آگے دہرا دیا۔ فرمایا ان معززین سے میں صرف ایک ہی بات کی درخواست کرتا ہوں یہ سب مل کر کہہ دیں کہ لا الہ الا اللہ۔ محمد رسول اللہ۔ مزاج پر سی کو آئے ہوئے معززین حضورؐ کے اس جواب کو سن کر ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ آپس میں کہنے لگے کہ یہ شخص تو کسی بات سے بھی دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہے۔ ہم اُس سے جو حاصل کرنا چاہتے ہیں ذرہ برابر بھی حاصل نہیں کر سکتے یہ کہتے ہوئے جھنجھلا کر واپس چلے گئے۔

حضورؐ کی بڑی خواہش تھی کہ ابوطالب اپنے آخری لمحات میں کلمہ شہادت پڑھ لیں گے ابوطالب نے خاموشی اختیار کی اور اسی خاموشی میں اُن کا انتقال ہوا۔

ابوطالب بڑی ہی دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ حاضر جواب، حق پسند، حضورؐ کے وفادار خیر خواہ اور انتہائی ہمدرد۔ اپنے بھتیجے کی رضا کی خاطر انہوں نے ذہنی اذیتوں کو برداشت کیا۔ مخالفین کی الزام تراشیوں اور بہتان بازیوں کا شکار رہے نقصان پر نقصان اٹھاتے رہے۔ ان سب باتوں کے باوجود انہوں نے اپنا عقیدہ نہیں بدلا اور حضورؐ کے دین کو قبول نہیں کیا۔ مسلمانوں کے نزدیک ان کی کوئی خاص اہمیت اس لیے نہیں ہے کہ اسلام قبول کیے بغیر ہی اس دنیا سے انہوں نے آخرت کا سفر اختیار کیا۔ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر ابوطالب اپنے بھتیجے کی ہمت نہ بڑھاتے اور اسلام کی حمایت میں ہر وقت کمر بستہ نہ رہتے تو شاید اسلام اپنے ابتدائی دنوں ہی میں اس دنیا سے زحمت ہو جاتا۔

حضرت خدیجہؓ اور حضرت ابوطالب کی وفات کے بعد مکہ میں حضورؐ کی مخالفت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ ان مخالفتوں کے پیش نظر حضورؐ نے مکہ چھوڑ دینے ہی میں اپنی بھلائی سمجھی اور طائف کو ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔

طائف مکہ کے مشرق میں تقریباً بیچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ اپنی ٹھنڈی

آب دہوا اور میوے کے باغات کی وجہ سے وہ اس زمانے میں کافی مشہور تھا طائف میں رہنے والے اکثر لوگ قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ مکہ کے مالدار لوگوں نے بھی وہاں باغات اور جائیدادیں خرید رکھی تھیں۔

بعض روایات میں ہے کہ آپ طائف اکیلے تشریف لے گئے۔ بعض روایات کے مطابق حضور کے منہ بولے بیٹے زید بھی آپ کے ساتھ گئے۔ آپ طائف پہنچے وہاں کے تین مقامی اکابرین سے ملاقات کی۔ یہ تینوں آپس میں حقیقی بھائی تھے۔ بہت ہی عمدہ پیشانی سے ان تینوں بھائیوں نے حضور کا استقبال کیا۔ جب حضور نے گفتگو شروع فرمائی تو یہ تینوں مسخے تہقہ مار کر ہنسنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اگر خدا کو کسی پیغمبر ہی کو بھجوانا تھا تو کیا اُسے آپ سے زیادہ کوئی اور موزوں آدمی نہیں ملا۔ دوسرے نے طنزاً کہا کہ واقعی اگر آپ خدا کے رسول ہیں تو آپ کا مجھ سے بات کرنا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ اس موقع پر حضور نے اپنے آپ کو بہت ہی بے بس محسوس کیا۔ ان تینوں سے کہا کہ اگر تم کو میری باتوں پر یقین نہیں آتا ہے نہ آئے۔ کم از کم اتنا تو کرو کہ میری بیان کی ہوئی باتوں کو کسی اور سے نہ کہو۔

تینوں اکابرین طائف خاموش رہنے والے کہاں تھے۔ ان بدذاتوں نے سارے شہر میں اپنی اور حضور کی گفتگو کا ڈھنڈورا پڑا دیا۔ آپ کے اطراف مجمع لگنا شروع ہوا۔ پتھر پھینکے جانے لگے۔ آپ اس پتھراؤ کے دوران پناہ کی تلاش کرتے ہوئے انگوڑ کے ایک باغ میں چلے گئے۔ روایات کے مطابق انگوڑ کا یہ باغ قبیلہ قریش کے دو افراد عقبہ اور شیبہ کی ملکیت تھا۔ یہ وہی عقبہ اور شیبہ ہیں جو چند دن پہلے ابو طالب کی ملائت کے دوران جب وہ بستر مرگ پر تھے تو ان کی مزاج پرسی کے لیے گئے تھے عجیب اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت عقبہ اور شیبہ دونوں اپنے باغ میں کام کر رہے تھے۔ ان دونوں کو حضور کی اس حالت پر بہت ترس آیا۔ انہوں نے اپنے نصرانی غلام سے

کہا کہ انگوڑ سے بھری آٹنی پلیٹ لاکر آپ کے آگے پیش کی جائے۔

کہتے ہیں کہ خدا کے رسول نے طائف میں یہ دعا فرمائی۔

”مے میرے خدا۔ تو نے جسمانی طور پر مجھے اتنا طاقتور نہیں بنایا کہ میں ان لوگوں کا
ڈٹ کر مقابلہ کروں۔ اے رحمن۔ اے رحیم تو کمزوروں کا والی ہے اور مجھ جیسے کمزور کا

تو ہی واحد سہارا ہے۔“

ابوطالب کی پشت پناہی سے محروم ہو جانے کی وجہ سے اب آپ مکہ واپس جانے
سے گھبرارہے تھے۔ آپ نے اپنا ایک نمائندہ مکہ کی ممتاز شخصیتوں کی خدمت میں روانہ
کیا۔ ان سے آپ نے درخواست کی کہ وہ آپ کی حفاظت کا ذمہ لیں۔ دوسر داروں نے
تو آپ کی درخواست کو مسترد کر دیا البتہ قبیلہ قریش کی ایک شاخ نوفل کے سردار مطعم ابن
عدی نے حفاظت کا ذمہ لیا۔ دوسرے دن علی الصبح مطعم ابن عدی ہتھیاروں سے مسلح
ہو کر اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کے ہمراہ خانہ کعبہ گیا اور اعلان کیا کہ آپ ان کے قبیلے کی حفاظت
میں ہیں۔

مطعم ابن عدی کی اس پیشکش پر حضور مکہ واپس گئے لیکن اب آپ کی تبلیغ میں وہ
گرمی نہیں رہی، ہو سکتا ہے کہ مطعم ابن عدی جو خود بھی بہت پرست تھا حفاظت کی ذمہ داری
لیتے وقت حضور پر تبلیغ نہ کرنے کی شرط عائد کر دی ہو۔

ایک مختصر سے عرصہ کے لیے حضور نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ جو قافلے وقتاً فوقتاً
مکہ آیا کرتے تھے صرف ان ہی کی حد تک تبلیغ کو محدود رکھا جائے۔

مکہ کے سالانہ اجتماع کے وقت سینکڑوں قافلے مکہ کے اطراف اپنے خیمے ڈالتے
حضور گھوم پھر کر ان کے سامنے اسلامی تعلیمات کو پیش فرماتے۔

میلوں کا انعقاد حج کی تاریخوں سے چھ ہفتے پہلے ہوا کرتا تھا۔ ذی قعدہ کے
فوری بعد کا مہینہ ذی الحجہ ایک مقدس مہینہ سمجھا جاتا تھا۔ پہلے ۲۱ دن میں عکاظ

کے مقام پر ایک بڑا میلہ لگتا تھا۔ نامی گرامی شعراء کے درمیان شاعری کا مقابلہ بھی اسی زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد کے دس دن جنتہ میں میلہ بھرتا تھا پھر اس کے بعد ۸ دن تک کے لیے ذوالحجاز میں لوگوں کا اجتماع ہوتا تھا۔

ان سالانہ میلوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضور خانہ بدوشوں کے درمیان اپنی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ آپ کے پیچھے پیچھے ابو جہل ہوتا اور کہتا پھرتا تھا کہ ان کی باتوں کو نظر انداز کر دو۔ ان کا دماغی توازن بگڑا ہوا ہے۔ غالباً انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک شخص ٹیفیل ابن عمر و جو قبیلہ دوس سے تعلق رکھتا تھا حضور کے ہاتھ پر ایمان لے آیا۔ اور درخواست کی کہ آپ اس کے قبیلے والوں کی امان میں آجائیں۔ ٹیفیل کی یہ درخواست حضور نے منظور نہیں کی۔ اس کے کیا اسباب تھے۔ اُس کا کوئی علم نہیں ہے۔

اس سال حضور کو اپنی تبلیغ میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ مکہ والوں نے بھی یہ خیال کرنا شروع کر دیا کہ اب یہ تحریک دم توڑ رہی ہے۔ شاید اسی خیال کے تحت ان لوگوں میں رواداری کا جذبہ ابھر آیا۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہی وہ زمانہ تھا جس میں اکابرین قریش نے آپ کو دولت و ثروت اور اقتدار کا لالچ دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ہر مادی چیز دینے کو تیار ہیں بشرطیکہ آپ اپنی تبلیغ سے دستبردار ہو جائیں۔ اپنے آپ کو خدا کا رسول کہنا چھوڑ دیں۔ یہ روایت اس لیے ضعیف معلوم ہوتی ہیں کہ آپ اس زمانہ میں اپنے رفیقوں اور ہمراہوں یعنی بی بی خدیجہ اور ابوطالب کی وفات کی وجہ سے اتنے مایوس اور پست ہمت ہو گئے تھے کہ آپ کا مشن دشمنوں کی نظر میں ناکام ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اگر دولت، ثروت اور اقتدار کی پیشکش واقعی کی ہی گئی ہوتی تو وہ زمانہ ہو سکتا ہے جب کہ ابوطالب زندہ تھے۔ ایک دوسری دلخراش بات یہ ہوتی کہ آپ کے چچا ابوطالب کی وفات پر بنی ہاشم کی جائزینی حضور کے سخت ترین دشمن ابولہب کے حصے میں آئی۔

ابوطالب کی وفات کے فوری بعد بولہب کے رویہ میں کچھ تبدیلی آئی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے بھتیجے کی حفاظت کا ذمہ لے گا۔ کچھ ہی عرصہ بعد بولہب اپنی پرانی روش پر لوٹ آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا خاندان بنی ہاشم حضورؐ کا دشمن ہو گیا۔ یہی وہ بنی ہاشم تھے جو ابوطالب کی زندگی میں حضورؐ کی جان و مال کی حفاظت کو اپنا فرضِ اولین سمجھتے تھے۔ بدوی قبیلے رضنا و رغبت سے تو حضورؐ کے وعظ کو کیا سنتے البتہ تحبس کے پیش نظر اس پیغام کو سن لیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ تقریباً صفر کے برابر نکلتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک قبیلہ کے شیخ نے حضورؐ کو اس شرط پر آمادہ کرنا چاہا کہ اگر اس کو اپنا نائب اور فرائضِ منسبہ کا حصہ دار بنالیں تو وہ آپ کا ساتھ دے گا۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ نبوت کے فرائض ایسی چیز نہیں جس کے حصے بجز سے انسانوں کی طرف سے کئے جائیں۔ یہ خدا کی طرف سے تفویض کیے جاتے ہیں، نبوت خدا کی دین ہوتی ہے۔ حضورؐ کے اس جواب نے شیخ اور اس کے قبیلہ کو مایوس کر دیا۔

یثرب کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ مکہ سے شمال کی جانب تقریباً ڈھائی سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حضورؐ کے زمانہ سے تقریباً چار سو سال قبل یمن کا بادشاہ اسد البقراب یثرب پر قبضہ کر کے یہاں سے دو یہودی علماء کو اپنے ساتھ یمن لے گیا تھا۔ یہ دونوں یہودی علماء جنوبی عرب میں یہودیت کی تبلیغ کرنے لگے۔

یثرب میں جا کر لوگوں کے بسنے کی داستاں مکہ والوں سے بالکل مختلف ہے۔ مکہ میں پینے کا پانی تک مشکل سے ملتا۔ پھل اور ترکاریاں عنقا۔ زراعت کا فقدان۔ چچلاتی دھوپ، پہاڑوں کی وادیوں میں خیمے پڑے ہوتے۔ مکہ میں رہنا اور بتا صرف اس لیے تھا کہ بدوی قبیلوں کے لیے کوئی تو ایسا مقام ہو جہاں سے وہ اپنا سفر شروع کر سکیں۔ جہاں وہ واپس آکر اپنا سفر ختم کر سکیں۔ مکہ میں رہنے والے یمن، مہر، شام اور ایران آیا جایا کرتے تھے۔

یشرب کی معیشت اور معاشرت بالکل مختلف تھی۔ پانی کی افزائش۔ زراعت کے دائرہ
وسائل۔ زرخیز زمین، کھجوروں کے باغات یشرب کا خاصہ تھے۔

بہنے والوں کا ذریعہ معاش یا تو زراعت تھا یا پھر گھریلو قسم کے جانوروں کی
پرورش۔ قبیلہ واریت یہاں بھی تھی۔ ہر قبیلہ کی اپنی زمین ہوتی تھی۔ اس زمین کے بچوں
بچہ وہ اپنی بستی بسایا کرتے تھے۔

سارے یشرب کی ہری بھری اور زرخیز زمین پر بھری بھری بستیاں، چھوٹے چھوٹے
گھروں اور پھیل پھیل آباری ایک پرسکون فضا مہیا کئے ہوئے تھی۔

۶۲۰ میں یشرب میں صرف پانچ چھوٹے سے قبیلے رہا کرتے تھے۔ ان پانچ قبیلوں
میں سے تین قبیلے یشرب کی سب سے زیادہ زمین پر اپنا تصرف رکھتے تھے۔ یہ تینوں زمیندار
قبیلے یہودی تھے۔

ساتویں صدی عیسوی میں عرب کے لوگوں میں ایک دوسرے کے مذہب کے تعلق سے نہ
تجسس تھا نہ ہی ان کو اس بات کی پروا تھی کہ دوسرے کا مذہب کیا ہے۔ اس بات کی
کوئی شہادت نہیں ہے کہ تو یہودی اس وقت یشرب میں آباد تھے ان کے آباؤ اجداد کا سلسلہ
یروشلم کے قبیلہ یہودہ سے ملتا تھا یا نہیں یا یہ وہ مقامی عرب تھے جو یہودیت کو اپنا مذہب
بنا چکے تھے جیسا کہ مین کے عرب اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر یہودیت کو قبول کر چکے تھے۔
یشرب کے یہودی بظاہر عرب تھے۔ مادری زبان عربی تھی۔ رہن سہن اور طرز زندگی
پر عربیت کی چھاپ تھی۔ ان کے نام عربوں جیسے نام تھے۔

جہاں کہیں بھی یہودی جلتے ہیں اپنے ساتھ اپنے نام ضرور لے جلتے ہیں جیسے
ابراہیم، ہارون، موسیٰ، داؤد، یوسف وغیرہ۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی یہودی ملیں گے یہ
نام ضرور ان میں ملیں گے لیکن یشرب میں اس زمانے میں رہنے والے کسی بھی یہودی کا نام
ان ناموں میں سے نہیں تھا۔ وہ لوگ عربیت کو اس حد تک اپنا چکے تھے کہ اپنے قومی

ناموں تک کو خیر باد کر دیا تھا۔

آج ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ ہم ان تین یہودی قبیلوں کی اصل کے تعلق سے کچھ بیان کر سکیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ سیکڑوں سال قبل یہودی علماء تبلیغ کے سلسلے میں یثرب گئے ہوں اور وہاں انہوں نے مقامی عربوں کو ان کے اپنے آبائی مذہب سے ہٹا کر یہودی بنا لیا ہو۔

حضرت عیسیٰ کے عہد میں اور ان کے بعد یہودی علماء نے تبلیغ کا سلسلہ بڑے ہی زور و شور سے شروع کر رکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اسی زمانے میں یثرب کے عربوں نے یہودیت اختیار کر لی ہو۔

دو اور قبیلے یثرب میں رہا کرتے تھے جو اپنے آبائی دین کو اختیار کئے ہوئے تھے یہ لوگ ہر سال کعبہ کے بتوں کی پوجا کے لیے مکہ جایا کرتے تھے۔ ان دو قبیلوں کے نام اوس اور خزرج تھے۔ یہ وہ مبنی تھے جو مارب کا بند ٹوٹنے کے بعد تباہی کے سبب ہجرت کر کے یثرب پہنچے تھے۔

جب یہ دونوں قبیلے ہجرت کر کے یثرب کی وادی میں پہنچے تو تین یہودی قبیلوں کو ساری زمیں کا قابض اور مالک پایا۔ کسی طریقے سے لڑ لڑا کر کچھ زمینوں پر انہوں نے بھی اپنا قبضہ جما لیا۔ کچھ باغات کو بھی انہوں نے اپنے تصرف میں لے لیا۔

۶۲۰ تک ان دونوں قبیلوں نے اپنی دولت و ثروت، امارت اور اقتدار میں اتنا اضافہ کر لیا تھا کہ اب یہودی قبیلے ان دو بہت پرست قبیلوں کے سامنے ہیچ تھے۔

یہودی قبیلے چونکہ نسبتاً ایک ارفع و اعلیٰ مذہب کے ماننے والے تھے اس لیے بہت پرستوں کے مقابلے میں زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج افریقہ میں عیسائی پڑھے لکھے ہیں اور مقامی باشندے ان پڑھے۔

چونکہ یہودی اُس وقت کے ایک روشن مذہب کے ماننے والے تھے اس لیے صنعت و

ترفت کے مختلف شعبوں میں بھی آگے تھے۔ مالی اعتبار سے یہ بت پرست قبیلوں سے بہتر تھے۔ یہ ساہوکاری بھی کرتے تھے۔ لوگوں کو سودی قرض دینا ان کا پیشہ تھا۔

فوجی اعتبار سے بت پرست قبیلوں کا تسلط ان یہودی قبیلوں پر تھا بنی خزرج کی ایک شاخ بنی کینز کو یہودی قبیلے ہر سال ایک رقم تراج کے طور پر پیش کرتے تھے۔ اس رقم کے قرض بت پرست قبیلے یہودی قبیلوں کی جان و مال کی حفاظت اپنے ذمے لے لے ہوتے تھے۔

یہودی قبیلوں کی دو شاخیں بنو نضیر اور بنی قرینہ سالانہ خراج نہیں دیتی تھیں ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق بت پرست قبیلوں سے تھا۔

یہودی قبیلوں کے اپنے در سے تھے۔ بچوں کو ان مدرسوں میں توریت پڑھائی جاتی تھی۔ ان یہودی قبیلوں کے تقریباً تمام افراد خصوصاً مرد پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ سالانہ میلوں کے موقع پر یہودی شعراء، شاعری کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔

شرب کے بت پرستوں کی اکثریت زراعت پیشہ تھی۔ یہ لوگ بہت ہی کم سفر کیا کرتے تھے۔ باہر کی دنیا میں جو ہوتا رہتا تھا اس سے وہ لاعلم تھے۔ اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کی مالی حالت ابتر تھی۔

ہجرت کے ۱۲ سال بعد جب حضور کا انتقال ہوا تو کہا جاتا ہے کہ آپ کے ہمتیار یا ذرہ بکتر ایک یہودی کے ہاں رہن رکھتے ہوئے تھے پوری وادی شرب میں شادی کا جوڑا اور شادی میں پہنائے جانے والے زیورات کا صرف ایک سٹ تھا۔ جب بھی کسی بت پرست قبیلہ کی کسی لڑکی کی شادی ہوتی تھی تو یہ شادی کا جوڑا اور شادی کے زیورات یہودیوں کے پاس سے کرایہ پر لیے جاتے تھے۔

تقریباً ۶۱۶ء میں اوس اور خزرج کے درمیان تنازعہ ہو گیا۔ جھگڑوں کی ابتداء اکثر و بیشتر جن باتوں پر ہوتی تھی ان میں سب سے بڑا سبب کسی کی حفاظت کا ذمہ

لینا ہوتا تھا۔ اپنے اس فرزند کو نبھانے کی خاطر وہ بڑی سے بڑی مصیبت اپنے سر لے لیتے تھے۔

قبیلہ اوس کے ایک آدمی نے ذوالبیان سے آنے والے ایک بدوی کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ یہ آدمی یثرب آ رہا تھا۔ قبیلہ خزرج کے ایک تاجر نے ایک مقامی یہودی کو کچھ رشوت دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ آنے والے بدوی کے منہ پر ایک زور دار طمانچہ مارے۔ طمانچہ اس وقت مارے جب کہ بدوی یہودیوں سے اپنا معاملہ طے کر رہا ہو۔

جب اوس کے آدمی کو معلوم ہوا کہ اس کی حفاظت میں آتے ہوئے آدمی کو طمانچہ مارا گیا ہے تو وہ فوراً مقام واردات پر پہنچ گیا جس یہودی نے اس کے بدوی کو طمانچہ مارا تھا اسے قتل کر دیا۔

خزرج بدلہ لینے کے لیے اوس کا پیچھا کرنے لگے۔ قاتل فرار ہو چکا تھا۔ قبیلہ خزرج نے اوس کے کسی اور آدمی کو پکڑ کر اس کو قتل کر دیا۔ اب دونوں قبیلوں میں قتل و غارت کالا تناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ آخر کار اوس فتح یاب ہوتے۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہودی قبیلوں کی دونوں جماعتوں نے اس جنگ میں حصہ لیا۔ ایک نے اوس کی طرف داری کی اور دوسرے یہودی قبیلے نے خزرج کا ساتھ دیا۔

یثرب میں سارے قبیلے اور خاندان ایک دوسرے کے قریب رہا کرتے تھے وہ ایک دوسرے کے ہمسایہ اور پڑوسی تھے۔ اسی باعث خزرج کے ایک سردار نے ان لڑائی جھگڑوں میں حصہ لینے سے نہ صرف احتراز کیا بلکہ ہر ممکنہ کوشش کی کہ اوس اور خزرج کے درمیان مفاہمت ہو جائے۔ ان کے آپس کے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ اس سردار کا نام عبداللہ ابن ابی تھا۔

میں اس زمانے میں جب کہ اون اور خزرج کے قبیلے آپس میں سر بگریباں تھے حضور نے اپنی تبلیغ کو مکہ کے ولے قبائل کی مدد تک محدود کر رکھا تھا۔

۶۲۰ء میں یثرب کے کچھ لوگ مکہ آئے۔ حضور کو یہ موقع ملا کہ ان تک اپنا پیغام پہنچا دیا۔ سات آدمیوں پر مشتمل ایک جماعت تبلیغ سے متاثر ہوئی۔ وہ جانتے تھے کہ یہودیوں کی روایات کے مطابق اہل یہود ایک مہسیا کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کو یقین ہو گیا کہ وہ مہسیا بن کی آمد کا یہودیوں کو انتظار ہے، آپ ہی کی ذات مبارک ہے۔ دوسری بات جو ان کے ذہن میں آئی وہ یہ کہ خزرج اور ادیس کے قبیلوں میں حضور کو ثالث بنا دیا جائے۔

حج کے اختتام پر ان ہی تاثرات کے ساتھ یہ جماعت یثرب واپس ہوئی۔ اس جماعت کے افراد میں صرف ایک شخص ایسا تھا جو اپنی جماعت کا ہم خیال نہیں تھا۔ ۶۲۰ء سے ۶۲۱ء کا زمانہ حضور کے لیے بہت ہی مایوس کن اور حوصلہ شکن رہا اس دوران بظاہر ایک فرد بھی اسلام میں داخل نہیں ہوا۔ آپ نے مکہ میں اپنے تبلیغی سلسلے کو بھی تقویاً بند کر دیا تھا۔

حج کا موسم پھر سے آیا۔ وہ سات آدمی ہو گزشتہ سال حج کے لیے مکہ آئے تھے اور جنہوں نے آپ سے ملاقات کی تھی پھر اس سال حج کے لیے آئے اور آتے وقت مزید پانچ آدمیوں کو اپنے ساتھ لاتے مکہ سے باہر ایک چھوٹی سی وادی میں ان بارہ آدمیوں نے حضور سے ملاقات کی۔ بات چیت کرنے کے بعد حضور نے قرآن کی چند سورتوں کی تلاوت فرمائی۔

یہ بارہ آدمی آپ کی باتوں اور قرآن کی آیات سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے فوری اعلان کیا کہ آئندہ سے وہ بتوں کی پرستش گناہ سمجھیں گے۔ چوری سے اجتناب کریں گے۔ نومولود بچوں کو زمین میں زندہ دفن نہیں کریں گے۔ اپنے ہمالیوں کو تکلیف

نہیں دیں گے۔ حضورؐ کی اطاعت کریں گے۔ ان لوگوں کے اس عہد و پیمان کے ضمن حضورؐ نے ان کو جنت کی بشارت دی۔

ان بارہ آدمیوں کے عہد و پیمان اپنی نوعیت میں ممتاز اس لیے ہیں کہ اس سے پہلے کسی سے بھی اس طرح کا عہد نہیں لیا تھا۔ ان کے عہد نہیں کریں گے "پر ختم ہوتے تھے بتوں کی پوجا نہیں کریں گے۔ بچوں کو زندہ دفن نہیں کریں گے، ہسایوں کو تکلیف نہیں دیں گے وغیرہ۔ یہاں پر صرف اعمال کو اہمیت دی گئی ہے۔ عقیدہ پر اتنا زور نہیں دیا گیا۔ یہ اسی طریقے کی تعلیم اور تبلیغ تھی جو وادی بینا میں عصلے ربانی کے ذریعہ ہوئی تھی۔ اس موقع پر خیالات اور جذبات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ محبت اور نفرت، عقیدہ اور یقین کا کسی جگہ ذکر نہیں۔

اس عہد کو بیعت عقبہ کہا جاتا ہے اس میں صرف وفاداری کا وعدہ تھا۔ ساتھ ہی ان کی یہ وفاداری ان کو حضورؐ یا اسلام کے لیے کسی سے لڑنے پر مجبور نہیں کر رہی تھی۔ ان کو اس بات پر مجبور نہیں کیا گیا کہ وہ حضورؐ کی خاطر کسی سے لڑیں۔

جب یہ بارہ آدمی شرب واپس ہو رہے تھے تو حضورؐ نے ان لوگوں کے ساتھ مصعب ابن عمیر کو شرب روانہ کیا۔ یہ عبد الداد ابن قصی کی اولاد میں تھے۔ ان کو روانہ کرنے کا منشا یہ تھا کہ وہ شرب کے لوگوں کو قرآن سنائیں۔ نماز پڑھنا سکھائیں لوگوں کے ایمان و ایقان اور عقیدے کو پختہ کریں۔

حضورؐ اس کے بعد آنے والے سال کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے ۶۲۲ء میں شرب کے بت پرستوں کی ایک بڑی جماعت حج کے لیے مکہ آئی۔ ان بت پرستوں کے ساتھ وہ چند مسلمان بھی آئے جو گزشتہ سال اسلام قبول کر چکے تھے۔ بت پرستوں نے اپنے عقیدے اور رواج کے مطابق جب حج کی تکمیل کر لی تو اسی رات ان کے ساتھ آئے ہوئے مسلمان چپکے سے ان کا ساتھ چھوڑ کر مکہ کی اسی وادی میں جمع ہو گئے

جہاں وہ گزشتہ سال جمعہ کو حضور کے ہاتھ پر ایمان لے آئے تھے۔ یہ مسلمان اپنے ساتھ دوڑوں کر بھی لیتے گئے۔ اس طرح جمعہ ہونے والوں کی کل تعداد ۷۲ مردوں اور ۲ عورتوں پر مشتمل تھی۔

ستاروں کی جنگ مکہ اور رات کے سناٹے میں ریجستان میں بیٹھے ہوئے یہ لوگ حضور کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ آپ کے ساتھ آپ کے چچا عباس بھی تھے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ شاید یہ آپ کی حفاظت کرتے ہوئے ساتھ آئے تھے۔

ابن اسحاق کے بیان کے مطابق پہلے عباس نے یثرب کے لوگوں کو مخاطب کیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ کے لوگ حفاظت کا ذمہ لینے کو تیار ہوں تو حضور یثرب والوں کے ساتھ رہنے کے لیے تیار ہیں۔ عباس کے بعد حضور نے ان لوگوں سے خطاب کیا پہلے قرآن کی چند سورتوں کی تلاوت کی اس کے بعد فرمایا کہ میں تم لوگوں سے اس بات کا اطمینان چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھتے ہوئے میری حفاظت کرو گے۔

یثرب سے آئی ہوئی جماعت کے سردار البراء ابن معرور نے حضور سے اس بات کا وعدہ کیا کہ وہ اور ان کی جماعت کے لوگ آپ کے وفادار رہیں گے اپنے ہتھیاروں کے ساتھ آپ کی حفاظت اسی طریقے سے کریں گے جیسے وہ اپنے گھر والوں کی حفاظت کیا کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک بااثر آدمی نے کہا کہ اگر حضور کے ساتھ ہم لڑیں اور فتح یاب ہو جائیں تو حضور یثرب چھوڑ کر مکہ واپس تو نہیں چلے آئیں گے۔

جب یثرب والوں نے اپنی محبت اور خلوص کا برملا اعلان کر دیا تو حضور نے ان کی اطاعت کے جذبہ کی قدر کرتے ہوئے اور اپنی حفاظت کا فرض ان کو سپرد کرتے ہوئے یہ اعلان فرمایا کہ اب میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔ میں ان سب لوگوں

کے ساتھ لڑنے کو تیار ہوں جن سے تم لڑنا چاہتے ہو۔ جن سے تم امن قائم رکھنے کے خواہش مند ہو، میں بھی اس خواہش کا احترام کروں گا۔

یشرب کی جماعت نے اپنے میں سے ۱۲ لیڈروں کو چُنا جن میں سے ۹ قبیلے خزرج سے اور ۳ قبیلہ اوس سے تھے۔

مجلس کے اختتام پر یشرب والوں نے سوال کیا کہ ان کی اظہار کردہ وفاداری کے صلہ میں انہیں کیا انعام ملے گا۔ حضورؐ نے سیدھا سادہ جواب صرف ایک لفظ میں دیا۔ وہ یہ تھا ”جنت“

یشرب کی جماعت کے سارے افراد نے فرداً فرداً آپ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اپنی وفاداری اور اسلام کو قبول کرنے کا اظہار کیا۔ ان لوگوں کی بیعت عقبہ کی دوسری بیعت کہلاتی ہے۔ بیعت کے بعد یہ سارے لوگ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی صورت میں جا کر اپنے بقیہ لوگوں کے ساتھ مل گئے جو رات کی تاریکی میں گہری نیند کے مزے لے رہے تھے۔

رات کا یہ عقبہ اجلاس باوجود انتہائی کوششوں کے راز میں نہ رہ سکا۔ دوسرے دن صبح سارے مکہ میں اس بات کی تشہیر ہو گئی۔ مکہ کے بُت پرست اس بات سے پریشان ہو کر اپنا وفد یشرب کے لوگوں کے پاس لے گئے۔ ان کے سردار پر یہ الزام دھرا گیا کہ اس نے باقاعدہ سازش کر کے حضورؐ کے ساتھ ربط قائم کیا۔ یشرب کی جماعت کے سرداروں نے قسم کھا کر کہا کہ جو افواہیں مکہ میں پھیلی ہوئی ہیں ان میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ چونکہ ان لوگوں کو خود بھی اس بات کا علم نہیں تھا اس لیے ان کو بیعت کی حقیقت معلوم نہ ہو سکی۔ وہ اپنے آپ کو گزشتہ رات کے سارے واقعے سے لاعلم قرار دے رہے تھے۔

کاہرواں یشرب کی طرف روانہ ہوا۔ اس اثناء میں قریش کے اکابرین واقعہ

کی مزید تحقیقات کر رہے ہیں۔ جب ان کو علم ہوا تو انہوں نے کاررواں کا تعاقب کرنے کے لیے چند لوگوں کو روانہ کیا۔ اس جماعت نے پیچھا کیا مگر ان کو کاررواں نہ مل سکا۔ البتہ انہوں نے سعد ابن عبادہ کو پکڑ لیا۔ سعد نے خود تو بیعت نہیں کی تھی مگر ان بارہ آدمیوں میں سے ایک تھے جن کو بیعت کرنے والی جماعت نے اپنا لیڈر چنا تھا۔ سعد ابن عبادہ کو پکڑ کر وہ لوگ مکہ لے آئے راستے میں ان کی خوب پٹائی بھی ہوئی۔ وہ ایک باغزت آدمی تھے۔ قبیلہ خزرج کے سرداروں میں سے ایک سردار تھے۔ سعد کے تجارتی تعلقات مطعم ابن عدی کے بیٹے جبیر سے تھے۔ جبیر مکہ کے ایک ممتاز تاجر تھے۔ مطعم ابن عدی حنظلہ کی حفاظت کا ذمہ بھی لیے ہوئے تھے۔ جب ایک قیدی کی طرح سعد مکہ لائے گئے تو سعد نے چلا کر کہا کہ میں جبیر ابن مطعم کی حفاظت میں ہوں۔ سننے والوں میں سے ایک شخص فوراً بھاگا بھاگا جبیر کے ہاں گیا اور ان کو اس واقعہ کی اطلاع کر دی۔ جبیر موقع واردات پر پہنچے۔ سعد ابن عبادہ کو اپنے دشمنوں سے چھڑوا کر اپنے گھر لے آئے۔

اس بات کا امکان ہے کہ عقبہ کی دوسری بیعت سے کچھ قبل حضورؐ پر وحی نازل ہوئی ہو جس میں مسلمانوں کو اسلام کی خاطر لڑنے کی اجازت دے دی گئی ہو۔ اس سے قبل آپ کو صرف یہ ہدایت تھی کہ لوگوں کو جمع کریں۔ ان کی خامیوں کی نشاندہی کریں۔ ہدایت کے باوجود جہالت پر قائم رہنے والوں کو ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ اب حضورؐ کو اس بات کی اجازت مل گئی کہ اپنے دشمنوں کے خلاف باقاعدہ لڑیں۔

ابن اسحاق کے بیان کے مطابق خدا نے اپنے پیغمبر کو پہلی بار لڑنے کی ہدایت قرآن کے سورہ حج کی ۲۹ سے ۴۲ میں دی۔

”جب مسلمانوں سے لڑائی کی جاتی ہے تو ان کو اجازت ہے کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور خدا یقیناً ان پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناسحق نکال دیئے گئے

ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا نہ کرتا رہتا تو صومعد اور عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں اللہ کا بہت ذکر کیا جاتا ہے ویران ہو چکی ہوتیں اور جو شخص اللہ کی مدد کرتا ہے، اللہ اس کی ضرورت دے دیتا ہے بے شک اللہ تو انا اور غالب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو توفیق دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں۔ سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ اگر یہ لوگ تم کو جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے نوح کی قوم اور عاد و ثمود کو بھی جھٹلا چکے ہیں۔“

یہاں لڑنے کی اجازت مدافعت کے لیے تھی۔ یثرب کے لوگوں نے مدافعت کا یہ پہلو قبول کر لیا تھا۔ اسی بنا پر حضور نے مکہ کے مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ مکہ سے ہجرت کر کے یثرب جائیں اور یثرب کے مسلمانوں سے اپنے تعلقات مستحکم کریں۔ مکہ کے بعض مشرکوں نے اب اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کی ہجرت کو روکا جائے چند مسلمانوں کو ان کے رشتہ داروں نے زبردستی روک رکھا۔ اجتماعی طور پر جو مسلمان ہجرت کرنا چاہتے تھے اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

یہیں سے مکہ کے لوگ جس بات میں بھی حضور کی مخالفت کرنا چاہتے تھے کھل کر نہیں کرتے تھے۔ اب ان کے تشدد میں وہ دور باقی نہیں رہا تھا۔

جس بات کی بھی ابتدا ہوتی تھی وہ اب مسلمانوں کی طرف سے ہوتی تھی۔ مکہ کے مشرکین اور مخالفین مسلمانوں کے لیے اقدامات کو صرف روکنے کی کوشش کرتے تھے مکہ کے مشرکین کی مدافعت اب غیر موثر ہو رہی تھی۔ جس شدت سے مدافعت ہونی چاہیے تھی، نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکابرین قریش تاجر تھے ان کو اپنی روزی کی خاطر اور بہت سے کام کرنے پڑتے تھے۔ وہ اپنا سارا وقت تو اس مخالفت میں صرف نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے ہاتھ مدافعت کی خاطر

جنگ کا ہدایت نامہ بھی آگیا تھا۔

بت پرستوں نے منفی طریقہ کار اختیار کیا تھا۔ یعنی مسلمانوں کی جو باتیں انہیں ناگوار گذرتی تھیں اس کی روک تھام اور بس۔ یہ منفی طریقہ کار کسی طریقے سے بھی ان کے لیے سود مند نہ ہوا۔ ایک اور بات جو مسلمانوں کے حق میں مفید رہی وہ یہ کہ مسلمانوں میں اب اکثریت جوانوں اور نوجوانوں کی تھی۔ ان کے برخلاف مشرکین کی اکثریت بوڑھے اور عمر رسیدہ لوگوں پر مشتمل تھی۔

حضورؐ اس لحاظ سے خوش قسمت رہے کہ آپ کے مذہب کی مخالفت اس شد و مد سے نہیں ہوئی جیسے یہودیوں کی مخالفت خود عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے یارومن کیجیٹو تک چرچ کی مخالفت ریفرمیشن کے دوران ہوئی تھی۔

عرب بت پرست چیدہ چیدہ، پھیلے پھیلے اور منتشر نہ صرف مادی اعتبار سے تھے بلکہ ذہنی طور پر بھی۔ ان کی کوئی ایسی موثر جماعت یا تنظیم نہیں تھی جس نے یہ کوشش کی ہو کہ اس مشن کی مخالفت یا قاعدگی سے کرے۔

مسلمانوں کی اکثریت جو مکہ سے یثرب ہجرت کر گئی تھی۔ یثرب کے مسلمانوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگی تھی۔ ان لوگوں کی وہاں کافی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ یثرب کے مسلمانوں نے ایشار اور ہمدردی، مینربانی اور لطف و کرم کا عملی مظاہرہ کیا تھا۔ مسلمانوں نے اپنی عبادت کے لیے قبلہ میں ایک جگہ چُنی۔ یثرب کے جنوب میں قباد واقع ہے مکہ سے گئے ہوتے لوگوں نے قباد ہی میں اپنی رہائش اختیار کی تھی۔

حضرت ابو بکرؓ نے حضورؐ سے درخواست کی کہ آپ بھی یثرب ہجرت کر جائیں لیکن آپ مکہ ہی میں ٹھہرے رہے۔ شجاعت و مردانگی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ مخالفین کے ہجوم میں آپ صرف حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ کے ساتھ مکہ میں تھے اور مکہ ہی کے قیام کو ترجیح دے رہے تھے۔

اوپر کے واقعات نے اب قریش کی آنکھیں کھول دیں۔ ان لوگوں کی اپنی زندگی کی بنیادیں اپنے اپنے قبیلے کے افراد کی وفاداری پر قائم تھی۔ ایسی جگہ جہاں نہ فوج ہو اور نہ پولیس اور نہ کوئی باقاعدہ حکومت، افراد کی وفاداری ہی قبیلے کی بقا کی ضامن تھی۔ آپ کی تعلیم ان کے لیے بالکل نئی تھی۔

حضورؐ نے وفاداری کا سبق تو دیا لیکن یہ وفاداری کی تلقین ان کے لیے اس لیے نئی تھی کہ اہل قبیلہ کی قبیلے سے وفاداری کی بجائے مسلمانوں کو اسلام سے وفاداری کی تلقین کی۔ ایک مسلم کا دوسرے مسلم سے ذہنی اشتراک اور انہی بنیادوں پر مسلمانوں کو آپس میں متحد رہنے کی تعلیم دی۔

حضورؐ کے پیش کردہ اسلام نے خاندانوں میں بڑا اختلاف پیدا کر دیا تھا۔ قبیلوں کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ وہ نوجوان جو آپ کے ہاتھ پر ایمان لاکے تھے اپنے والدین سے باغی ہونے لگے۔ یہ بات قریش کے لیے ایک بہت بڑے حادثے سے کم نہ تھی۔ آپؐ کی تعلیمات کی وجہ سے ان کی صدیوں پرانی روایات اور ان کی اپنی سماجی زندگی کی بنیادیں ہلتی اور مسمار ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ مسلم نوجوان جو شرب جاچکے تھے، وہاں کے لوگوں کو اس بات پر تیار کر رہے تھے کہ مکہ والوں سے جنگ کریں اور مکہ والے بھی کون؟ ان نوجوانوں کے باپ، بھائی، چچا، ماموں، خالو اور دوسرے رشتہ دار جو پال پوس کر ان کو طفولیت سے جوانی کی منزل تک لے آئے تھے۔ اب یہ جوان ہو کر اسلام قبول کر کے اپنے ہی پالنے پوسنے والوں سے لڑائی کی باتیں کر رہے تھے۔

یہ ایسی ہی بات ہوئی جیسے آکسفورڈ یونیورسٹی کے طلباء جن میں سے کئی ایک کے باپ یا چچا یا ہوں برٹش گورنمنٹ میں وزیر ہیں یا اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہیں، روس چلے جائیں اور وہاں جا کر ساری دنیا کے خلاف بشمول انگلستان اعلان جنگ کر دیں۔ اس صورت حال سے جو عام تاثر سارے انگلینڈ میں ہو گا وہی تاثر اس وقت مکہ

میں ہوا ہوگا۔

قبل اس کے کہ ہم اس باب کو ختم کریں جس میں آپ کے مکہ میں قیام کا ذکر ہے، ان باتوں کا ذکر ضروری ہے جو حضور کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوئیں۔

یہ اپنی جگہ صحیح بات ہے کہ اس سارے طویل سفر سے میں نہ کسی نے آپ کو صلیب پر چڑھایا اور نہ ہی کسی اور اسلام قبول کرنے والے کو۔ نہ کسی کو زندہ جلایا گیا اور نہ ہی پہاڑوں پر لے جا کر کسی کے ساتھ دہشت انگیزی کی گئی۔ اس کے باوجود نفسیاتی طور پر یہ زمانہ آپ کے لیے بہت ہی ہمت شکن اور مایوس کن ثابت ہوا۔ دس سال تک زندگی کا ہر لمحہ مکہ میں اسلام کی تبلیغ میں گزرا۔ تبلیغ ہی آپ کی زندگی کا واحد مقصد رہی اسلام کی تبلیغ کے لیے آپ نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ ان ساری باتوں کے باوجود نتیجہ بنتا ہر بہت ہی مایوس کن نکلا۔ جو لوگ آپ کے ہاتھ پر ایمان لائے تھے وہ بڑی منتشر حالت میں تھے۔ اپنے ہی رشتہ داروں کے ہاتھوں آپ کی ہتک ہوتی رہی منجملہ خیزی اور ہنسی مذاق کا مرکز آپ کی ذات کو بنانے کی کوشش کی گئی۔ بعض اوقات عوام کو صورت دکھانے میں آپ شرم محسوس کرتے تھے۔

کیا دنیا میں کوئی مثال اور بھی ایسی مل سکتی ہے جس میں مقصد کے حصول کے لیے اٹھنے والے کی اتنی زیادہ مخالفت کی گئی ہو؟ ایسے وقت جب کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام ہوتا، وہ ابھی نظر آ رہا ہو؟ اس کے باوجود جس صبر کی مثال آپ نے پیش کی وہ اپنی آپ نظیر ہے ان سارے حوصلہ شکن واقعات کے باوجود صبر کا دامن آپ کے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ اس خیال سے لاشعوری طور پر شاید آپ کو کچھ اطمینان ہوتا ہو کہ اسلام کے مخالفین دوزخ کی آگ میں جلائے جائیں گے اس کے باوجود آپ نے اپنی اس وقتی ناکامی کو ذہنی طور پر قبول بھی کیا۔ یہ بات حضور کے مخالفین خصوصاً مغربی مسلمانوں کے لیے ایک تازیانہ ہے جو یہ کہتے ہیں کہ آپ ایک غیر محتاط

قسمت آزما تھے۔

آنے والے دور کی کامیابیوں کو دیکھ کر آپ کو غیر محتاط قسمت آزما کے لقب سے یاد کرنا بہت آسان ہے لیکن بعثت کے بعد کے بارہ سال جیسے اور جس طرح سے بھی گزرے وہ آپ کے لیے گراں ترین سال تھے۔ اس عرصے میں بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ نہ صرف اپنے مقصد سے بلکہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

یادگار تاریخیں

| | |
|--------------|---------------------------|
| ۶۵۷۰ | حضور کی پیدائش |
| ۶۶۱۰ | بعثت |
| ۶۶۱۳ | تبلیغ کی ابتداء |
| ۶۶۱۵ | ہجرت حبشہ |
| ۶۶۱۹ سے ۶۶۱۶ | بنی ہاشم کا مقاطعہ |
| ۶۶۱۹ | معراج |
| ۶۶۱۹ | خدیجہ کی وفات |
| ۶۶۱۹ | ابوطالب کی وفات |
| ۶۶۱۹ | طائف کا سفر |
| ۶۶۲۰ | شرب کے پہلے مسلمان |
| ۶۶۲۱ | بیعت عقبہ اول |
| ۶۶۲۲ | بیعت عقبہ دوم |
| ۶۶۲۲ | مدافعت کیلئے جنگ کے احکام |

انصار اور مہاجرین

اکابرین قریش نے خاص طور پر ایک جلسہ کا انعقاد کیا۔ اس میں مکہ سے مسلمانوں کے فرار پر بحث و مباحثہ ہوا۔ حسبِ معمول اس دفعہ بھی مکہ کے مشرکین نے تاخیر سے کام لیا۔ یہ اس وقت بحث و مباحثہ کر رہے تھے جب کہ مسلمان مکہ سے شربِ جلعکے تھے۔ ایک پرانی کہاوت ہے، قدیم اقوام ہمیشہ ایک حکومت یا ایک بادشاہ کی اطاعت کرتی آئی ہیں۔ عربوں کے پاس نہ تو حکومت تھی اور نہ ہی بادشاہت۔ اس لیے ہر عرب اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتا رہا ہے وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی بھی اس کے کہے یا کیے پر کسی قسم کا اعتراض کرے۔

ہمارے اپنے تجربہ کے مطابق جمہوریت کے زیر سایہ زندگی خوشگوار تو گزرتی ہے لیکن جب ناگہانی صورتحال کا سامنا کرنا پڑے تو اس سے نمٹنے کے لیے جمہوریت سے زیادہ وہ اصولِ سیاست کا مہیا بنظر آتا ہے جس میں اقتدار سمٹ کر ایک ذات میں مرکوز ہو جاتا ہے اگر مکہ میں کسی ایک آدمی کا اقتدار ہوتا تو اسلام کو بہت زمانہ پہلے ہی دبا دیا جاتا۔ اکابرین قریش کی لمبی لمبی نشستوں، طویل طویل مباحثوں لچھے دار تقریروں نے ان کو صرف نشستوں و گفتگو برخواستہ تک ہی محدود رکھا۔ عملی طور پر وہ کچھ نہ کر سکے۔ ان کے برخلاف مسلمان اگرچہ تعداد میں بہت ہی کم تھے مگر

ایک رہبر کی رہبری انہیں حاصل تھی۔

ابن اسحاق کے بیان کے مطابق اکابرین قریش کے ہاں اس مسئلہ کا صرف ایک ہی حل رہ گیا تھا اور وہ تھا حضورؐ کا قتل۔

ابو جہل نے تجویز پیش کی کہ ذات رسالت کا اب خاتمہ کر دیا جائے قبیلہ واری خونی رقابت کے پیش نظر یہ طے پایا کہ قریش کے ہر قبیلہ یا جماعت کا ایک ایک فرد اپنے آپ کو اس کام کے لیے پیش کر دے۔ اس فرض کو اس طرح پورا کیا جائے کہ ہر شخص کی تلوار محمدؐ کے جسم مبارک پر پڑے تاکہ قتل کی ذمہ داری سب ہی قبیلوں میں بٹ جائے اگر ایک آدمی کا راج ہوتا تو وہ خاموشی سے کسی کو کہہ دیتا کہ محمدؐ کو قتل کر دے۔ مغربی جہوریت میں ہر آدمی یہ توقع رکھتا ہے کہ پالیسی وضع کرنے میں اس سے صلاح و مشورہ کیا جائے اور اس صلاح و مشورہ کے درمیان بعض اوقات خاص خاص مواقع ہائمتوں سے نکل جاتے ہیں اسی طرح اس وقت کی جہوریت بھی کچھ ایسی ہی ثابت ہوئی۔

اکابرین قریش کی کونسل کی نہ تو رکنیت محدود تھی اور نہ ہی رکنیت کی کوئی خاص شرائط تھیں۔ کوئی بھی بالغ آدمی ان کی محفل میں شریک ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی اکابرین قریش نے قتل کا فیصلہ کیا، آپ کو یہ اطلاع پہنچ گئی۔ ایک روایت کے مطابق حضرت ابو بکرؓ کے صاحبزادہ عبداللہ قریش کی اس محفل میں شریک تھے۔ عبداللہ نے حضور کو یہ خبر سنا دی۔ ایک اور روایت کے مطابق حضورؐ کی چچی یا پھوپھی رقیقہ کے ذریعے یہ اطلاع حضورؐ تک پہنچی۔ رقیقہ بنی زہرا کے ایک سردار سے بیاہی گئی تھیں۔

حضورؐ اس خبر کو سننے کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے گھر تشریف لے گئے حضرت ابو بکرؓ کے گھر جانے سے پہلے آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ وہ حضورؐ کے بستر پر لیٹ جائیں آپ نے حضرت علیؓ کو یہ تسلی بھی دی کہ انہیں کوئی آفت نہیں آئے گی۔ حضرت علیؓ حضورؐ کے بستر پر لیٹ گئے۔ حضورؐ کی چادر اپنے پر ڈال لی۔

عالمِ روایات کے مطابق قتل کے ارادہ سے آنے والے حضورؐ کے گھر کے سامنے جمع ہو گئے۔ خدا کی قدرت سے وہ اپنی بصارت کھو بیٹھے جس کے نتیجے کے طور پر رات تمام وہ آپؐ کے گھر کے سامنے ہی بٹھکتے پھرے۔ صبح جب ان کی بصارت لوٹ آئی تو ان کو معلوم ہوا کہ آپؐ گھر چھوڑ کر جا چکے ہیں اور بستر پر حضرت علیؓ دراز ہیں۔

حضورؐ کے معتقدین نے جہاں اور قسم کی باتوں سے آپؐ کی زندگی کو آراستہ کرنے کی کوشش کی اس واقعہ میں بھی معجزانہ باتوں کو لا کر اس واقعہ کو رنگین بنانے کی کوشش کی۔ آسانی سے یہ بات تصور میں آسکتی ہے کہ ایک جماعت جو مختلف جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو اور جس کے ذمہ یہ کام ہو کہ ایک وقت مقررہ پر قتل کے لیے ایک مقررہ مقام پر جمع ہوں ایک رات میں تو ان سب کو اس اقدام کے لیے آمادہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ بات قدرتی ہے کہ اپنا فیصلہ کرنے کے بعد انہوں نے چند جاسوسوں کو آپؐ کے گھر کے اطراف متعین کر دیا ہوتا کہ نقل و حرکت پر نگرانی رکھی جاسکے۔ جب ان جاسوسوں نے دیکھا کہ بستر پر کوئی چادر اوڑھے ہوئے لیٹے ہیں تو وہ اپنے یقین میں اپنی حد تک صبح تھے کہ بستر پر حضورؐ ہی دراز ہیں۔

یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے صاحبزادے عبد اللہؓ کا برین کی محفل سے اٹھ کر سیدھے آپؐ کے مکان گئے ہوں تاکہ دشمنوں کے منصوبہ سے واقف کریں اور اس انکشاف کے فوری بعد آپؐ حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹا کر اپنی چادر اوڑھا کر سیدھے ابو بکرؓ کے مکان چلے گئے ہوں۔

حضورؐ کا حضرت علیؓ سے یہ فرمانا کہ تم پر کوئی آفت نہیں آئے گی اس بات کا ثبوت ہے کہ آپؐ خود یہ محسوس فرما رہے تھے کہ اس رات صرف جاسوسوں کو چھوڑا گیا ہے۔ قاتلوں کو نہیں۔ وہ رات صرف جاسوسی کی رات تھی۔ قتل کی رات نہیں تھی۔

یہ بات ہمارے لیے تعجب کا باعث ہے کہ مورخین اس واقعہ کی ڈرامائی صورت کو پیش کرنے کی بجائے اس میں معجزیت کا عنصر داخل کر دیتے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں یہ رات ایک عجیب و غریب رات ہے۔ گرم ہواؤں سے بھرپور اور چھوٹی سی وادی مکہ سے حضورؐ جگمگاتے اور جھلملاتے تاروں کی روشنی میں اب رقت سفر باندھتے ہیں۔

دنیا آج کتنی مختلف ہوتی اگر اکابرین قریش اپنے منہمکہ خیز پلان کی بجائے سیدھے سادھے فارمولے کو اختیار کرتے بجائے اس کے کہ منتخب کردہ نمائندوں کو قتل کے لیے تیار کرتے کسی ایک جبری اور بہادر کی خدمات مستعار لے کر حضورؐ کا قتل کروادیتے اگر ایک آدمی اس خدمت پر مامور کر دیا جاتا تو وہ سیدھے حضورؐ کے گھر کا راستہ لیتا اور حضورؐ کا کام تمام کر دیا ہوتا۔

قریش کے جاسوس جب کہ اپنی جاسوسی کے فرائض انجام دے رہے تھے، آپؐ ابو بکرؓ کو ساتھ لیے گھر کے پیچھے کے دروازہ سے خاموشی سے باہر نکل جاتے ہیں اور شہر سے تین میل دور حبزب کی طرف ایک غار میں جو غارِ ثور کہلاتا ہے چھپ جاتے ہیں۔ یہ غار یثرب کے راستے میں واقع ہے۔ آپؐ کا پیچھا کرنے والے اس خیال میں رہتے ہیں کہ آپؐ یثرب چلے گئے ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ جو تجربہ کار تاجر تھے جلتے ہوئے ایک تھیلی میں اپنے ساتھ پانچ ہزار درہم رکھ لیتے ہیں۔ لے دے کے یہی وہ رقم تھی جو حضرت ابو بکرؓ کے پاس رہ گئی تھی۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے آپؐ کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آپؐ نے اپنا سارا اثاثہ اسلام پر نچاؤ کر دیا تھا۔ غریب مسلمانوں کی مدد کرتے تھے۔ غلاموں کو ان کے مالکوں سے خرید کر آزاد کر دیا کرتے تھے۔ حضورؐ کے پاس اس موقع پر کوئی رقم نہیں تھی۔

حضرت ابو بکرؓ کے بیٹے عبداللہ اپنے باپ کی خواہش پر مکہ ہی میں مقیم رہے۔ تمام دن کی خبریں رات میں غار میں جا کر آپ سے اور حضرت ابو بکرؓ سے بیان کرتے تھے۔ حضرت علیؓ مکہ ہی میں قیام پذیر تھے آپ کی زوجہ مطہرہ بی بی سودہؓ بھی مکہ ہی میں تھیں۔ عامر ابن ہمیدہ ایک غلام تھے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا حضرت ابو بکرؓ نے ان کو ان کے مالک سے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ عامر ابن ہمیدہ اپنے محسن کی حفاظت کی خاطر روزانہ صبح سویرے بکریوں کا گلہ لے کر غار کے دہانے تک چلے جلتے تاکہ رات میں غار میں آنے والوں کے پاؤں کے نشانات جو ریت پر پڑ جاتے تھے بکریوں کے گزرنے کی وجہ سے مٹ جائیں۔

حضورؐ کی شجاعت اور بہت و مردانگی کا اعتراف ہم اوپر کر چکے ہیں کہ سارے مسلمان شرب چلے جانے کے باوجود آپ اکیلے مکہ میں ٹہرے رہے صرف حضرت ابو بکر اور حضرت علیؓ آپ کے ساتھ تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے کئی دفعہ ہجرت کی درخواست کی لیکن آپ اس میں تامل فرماتے رہے۔ جس شام حضرت ابو بکرؓ کے مکان گئے آپ نے حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا کہ اللہ نے اب مجھے ہجرت کی اجازت دے دی ہے۔ یہاں پر فوراً ہمارا ذہن اس بات کی طرف جاتا ہے کہ اللہ آپ کی ہجرت کو گوارا نہیں کرتا تھا لیکن جب مشرکین نے آپ کے قتل کا فیصلہ کر لیا تو اللہ نے آپ کو ہجرت کی اجازت دے دی۔

مشرکین کو جیسے ہی آپ کے روپوش ہونے کی اطلاع ملی انہوں نے گرفتاری کے لیے سوا دنوں کا اعلان کیا۔ گرفتاری کے لیے انعام کا تو اعلان کر دیا لیکن گرفتاری کی کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی۔

قریش کے چند سربراہوں نے اندر ہی اندر اطمینان کا سانس لیا۔ اس صورت حال کو انہوں نے خوش آمدید اس لیے کہا کہ بغیر مزید خون بہائے انہوں نے آپ سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ ان کی نظر میں آپ کی ذات فتنہ و فساد کی جڑ تھی۔ اب جرد اپنی جگہ چھوڑ

پسلی تھی۔

ہمیشہ کی طرح اکابرین قریش کی راہیں اس معاملہ میں بھی ایک دوسرے مختلف رہیں۔ ان میں کوئی آدمی بھی کسی دوسرے کو کسی بھی ذمہ دارانہ کام کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ آپس کی یہ عدم اعتمادی اور نا اتفاقی نے ان کو حضورؐ کے خلاف بہت ہی کم اکسایا۔

حضرت ابو بکرؓ کے ذہن میں چونکہ پہلے ہی سے ہجرت کا ایک خاکہ موجود تھا، اس لیے انہوں نے احتیاطاً بہت پہلے ہی سے سواری کے دو اونٹ خرید کر رکھے تھے ان اونٹوں کو عبد اللہ ابن ارقیط کی حفاظت میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس وقت تک عبد اللہ بت پرست ہی تھا ان کا تعلق بنی کنعانہ سے تھا۔

تیسری رات حضرت ابو بکرؓ کے بیٹے عبد اللہ غارِ ثور گئے۔ حضورؐ اور حضرت ابو بکرؓ سے کہا کہ دشمن اپنی سرگرمیوں میں اب اتنے تیز نہیں ہیں۔ بیٹے نے اپنے باپ کو مشورہ دیا کہ جتنی جلد ہو سکے۔ غار چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں۔

تین دن تک غار میں چھپے رہنا اللہ کے ان دونوں بندوں کے لیے گھبراہٹ اور پریشانی کا باعث بنا رہا۔ حضرت ابو بکرؓ نے تو اپنی پریشانی کا اظہار کر دیا۔ حضورؐ نے انہیں دلاسا دیا کہ اللہ ان دونوں کی حفاظت فرمائے گا۔

قرآن نے بھی حضرت ابو بکرؓ کی اس پریشانی اور حضورؐ کے دلاسا کا ذکر کیا ہے سورہ توبہ کی ۴۹، ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

”اگر تم ہینبر کی مدد نہ کرو گے تو اللہ ان کا مددگار ہے۔ وہ وقت تم کو یاد ہو گا کہ جب ان کو کافروں نے گھر سے نکال دیا۔ اس وقت دو ہی شخص تھے جن میں (ایک ابو بکرؓ تھے) دوسرے (خود رسول اللہ) جب وہ دونوں غارِ ثور میں تھے اس وقت ہینبر اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کرو۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اللہ نے ان پر تسکین نازل فرمائی اور ان کو ایسے شکروں سے مدد دی جو تم کو نظر نہیں آتے تھے اور

کافروں کو پست کر دیا۔ ہاتھ تو اشد ہی کی طرف بلند تھے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔“
 اسی آٹنا، عبداللہ ابن اریقط حضرت ابو بکرؓ کے دو اونٹ لے کر غارِ ثور پہنچ گیا، اپنا
 اونٹ بھی ساتھ لیتا گیا۔ حضرت ابو بکرؓ کی صاحبزادی اسماءؓ جو عبداللہ کی بہن تھیں، کھانا
 وغیرہ پکا کر اپنے والد ماجد کے پاس گئیں۔ سفر کا توشہ حضرت ابو بکرؓ کے حوالے کر دیا۔ وہ
 آتے وقت اپنے ساتھ ڈوری یا رسی لانا بھول گئیں جس سے وہ توشہ دان اور کھانے پکانے
 کا سامان اونٹ سے باندھ سکیں۔ حضرت اسماءؓ نے کمر سے اپنا کمر بند نکالا اور سامان کو اپنے کمر
 بند سے باندھ کر ناقہ پر لٹکا دیا۔

حضرت ابو بکرؓ نے عبداللہ ابن اریقط کو اپنا رہبر مقرر کیا تھا۔

ہم لوگوں کی عادت یہ رہی ہے کہ عربوں سے ہماری مراد وہ سارے عرب ہوتے
 ہیں جو تمام عرب ممالک میں رہتے ہیں۔ اس میں فرق نہیں کرتے کہ عرب مختلف حصوں
 اور مختلف ممالک میں رہتے ہیں۔

شہری اور دیہاتی عرب میں کافی فرق ہوتا ہے۔ ایک مقام کا عرب دوسرے مقام
 کے عرب سے بہت سی باتوں میں مختلف ہوتا ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی شخص
 لفظ یوروپین استعمال کرے اور اس بات کو ملحوظ نہ رکھے کہ یوروپین میں فریج بھی ہیں، جرمن
 بھی ہیں، انگریز بھی ہیں، اطالوی بھی ہیں۔

آج بھی عربی بولنے والے ملکوں کے لوگ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔
 حتیٰ کہ جزیرہ نمائے عرب کے شہری بدلیوں سے مختلف ہیں۔

ایک مشہور مشرق پر و فیس مار گولیتھ اپنی کتاب ”محمد اور اسلام کے عروج“ میں لکھتے ہیں
 کہ محمدؐ نے کار والوں کی آمد و رفت کے دوران جاسوسی کا جو فن سیکھ لیا تھا یہی فن اس
 بات کے لیے کافی رہا کہ آپؐ آگے چل کر سر پھروں کی سرگردگی کریں۔ میرے نزدیک اس
 مشرق کا یہ بیان انتہائی گمراہ کن اور غلطی پر مبنی ہے۔ عرب کے تاجر ریگستانوں میں نہیں

رہا کرتے تھے۔ اپنے کارروائیوں کے ساتھ وہ ریختنوں سے ایک مسافر کی حیثیت سے گزارتے تھے۔ ان کی رہنمائی اور راستوں کی نشاندہی بدو کیا کرتے تھے۔ ان بدویوں کے فرانسس اس زمانے میں ایسے ہی تھے جیسے آج ایک طیارہ چلانے والے کے جس طریقے سے آج کا تاجر ایک ہوائی جہاز چلانے والے پر ضرور سو کر کے اطمینان سے ہوائی جہاز میں بیٹھ جاتا ہے، اسی طرح اس زمانے کے تاجر اپنے کارروائیوں کی رہنمائی کے لیے بدویوں کو مقرر کرتے تھے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے ان بدویوں پر لوگوں کو اسی طرح اعتماد ہوتا تھا جیسے آپ اور ہم ہوائی جہاز کے سفر کے دوران پائیلٹ پر کیا کرتے ہیں۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اور حضرت ابو بکرؓ ایک ٹبت پرست بدوی کو اپنا رہبر بنانے پر اس نے مجبور تھے کہ وہ مکہ سے یشرب جانے والے راستے پر ان کی رہنمائی کرے یہ صحیح ہے کہ اگر آپ عام راستے سے سفر کرتے تو وہ بغیر اس بدوی کی مدد کے بھی مکہ سے مدینہ پہنچ جاتے چونکہ آپ دونوں کا بیچا، سرد رہا تھا اور معلوم راستے سے گزرنا آپ دونوں کے لیے خطرے کا باعث تھا اس لیے آپ نے بدوی کو اس بات کے لیے مقرر کیا کہ وہ حجاز کے پہاڑوں اور چھوٹے چھوٹے راستوں سے آپ دونوں کو مکہ سے یشرب لے جاتے حضرت ابو بکرؓ ہجرت کرتے ہوئے اپنے ساتھ اپنے آزاد کردہ غلام عامر ابن فہیدہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے وہ آگے آگے تھا اور حضورؐ اور ابو بکرؓ کے پیچھے پیچھے۔

یہ واقعہ ۱۸ یا ۱۹ جون ۶۲۲ء کا ہے۔

دوسرے دن صبح صبح بنی کنعانہ کا ایک گھوڑے سوار ان تھکے ماندے مسافروں کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ اس نعرے سے راستوں کی تلاش کر رہا تھا کہ اے حضورؐ اور حضرت ابو بکرؓ مل جائیں تاکہ قریش کا اعلان کردہ انعام جو سواروں پر مشتمل تھا اُسے مل جائے۔

حضورؐ اور حضرت ابو بکرؓ نے اس گھوڑے سوار کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ان کا بیچا کرنا چھوڑ دے اور مسافروں کو اپنے حال پر چھوڑ دے اور کسی سے اس مقام اور ملاقات کا ذکر

نہ کرے۔

دو دن کے مسلسل سفر کے بعد یہ چھوٹی سی جماعت عثمان پٹنچی۔ یہ مقام مکہ سے تقریباً ۵۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ سواری میں استہمال ہونے والے اونٹ ۲۴ گھنٹوں میں اسی سے سو میل کا فاصلہ آسانی سے طے کر لیتے ہیں۔ اس جماعت نے فاصلے کے طے کرنے میں جو دیر لگائی اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ آپ لوگ دن میں پہاڑیوں میں چھپ جاتے ہوں اور صرف رات میں اپنا سفر جاری رکھتے ہوں۔ ذرا آگے بڑھنے پر امج کے مقام پر آپ حضرات کو اسلام کا کیمپ ملا۔ یہ جماعت بنی خزائمہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اتفاق سے حضرت ابو بکرؓ کی ایک چھوٹی لڑکی اپنی دایہ کے ساتھ اس کیمپ میں پائی جاتی ہے اس قبیلے کے لوگ حضرت ابو بکرؓ کا استقبال کرتے ہیں۔ حضورؐ کی خدمت میں سواری کا اونٹ پیش کرتے ہیں۔ آپ کا اپنا اونٹ سفر کی وجہ سے شاید بہت تھک گیا تھا۔

جب ان تھکے ماندے مسافروں نے غارِ ثور کے باہر خاموشی اور رازداری سے عبداللہ اور اسماء کو خدا حافظ کہا اور عرب کی خاموشی اور سنسان راتوں میں جگمگانے تاروں کی روشنی کے سہارے آگے بڑھنے کا قصد کیا تو عالم انسانیت نے دنیا کے ایک بہت بڑے اور تاریخی ڈرامہ کو ظہور پذیر ہوتے دیکھا۔

سینر اور کینخرو نے اپنے اطراف افواج کا ایک عظیم الشان لشکر جمع کر لیا تھا۔ یہ لوگ دنیا سے لمبی لمبی جنگیں کرتے رہے۔ معرکتہ الآرا مقابلوں کا سامنا محض اس لیے کرتے تھے کہ دنیا پر ان کی بالادستی قائم ہو لیکن دنیا جانتی ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب رہے اور کس حد تک ناکام۔ ان کے برخلاف بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس یہ چار عرب خاموشی سے حجاز کے پہاڑوں کے درمیان سے اس طرح نکلتے ہیں کہ ان کا وہاں سے اس بے سرو سامانی کی حالت سے نکلنا ایک ایسی تحریک کی کامیابی کا باعث بنتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر دنیا میں ایک عظیم الشان اور عالمی

سلطنت کا وجود مل میں آتا ہے۔ سیزر اور کنخسرو کی اپنی اپنی سلطنتیں نیست و نابود ہو جاتی ہیں اور ان کے حدود منکلت پر اسلامی علم لہرانے لگتا ہے۔ عبداللہ اور ان کی بہن اسماء غار ثور کے باہر پہاڑوں کی اونچی نیچی سطح پر حسرت دیاس کے محسے بنے کھڑے رہتے ہیں۔ یہ لے پاتا ہے کہ فی الحال بھائی اور بہن دونوں مکہ ہی میں رہیں گے۔

دوسرے دن صبح قریش کے سربراہ اور وہ حضرت ابو بکرؓ کے گھر جلتے ہیں۔ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ حضورؐ اور حضرت ابو بکرؓ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ اسماء دروازہ پر جاتی ہیں۔ آنے والے اسماء سے دریافت کرتے ہیں۔ اسماء اپنی لاطمی کا اظہار کرتی ہیں۔ ابو بکرؓ تو ایک کثنت اور بدتمیز آدمی تھا ابن اسحق کی روایت کے مطابق اسماء کو اس زور سے قہر مارتا ہے کہ اسماء کے کان کے بندے زمین پر گر جلتے ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ کے والد ابو قحافہ مکہ ہی میں رہتے تھے۔ وہ ضعیف بھی تھے اور بڑی مدت تک بسمارت سے بھی محروم۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ حضرت ابو بکرؓ مکہ چھوڑ کر چلے گئے ہیں تو اپنی پوتی اسماء کے گھر گئے۔ اسماء سے کہا کہ ان کا خیال ہے کہ ابو بکرؓ جاتے وقت شاید کچھ رقم چھوڑ گئے ہیں تاکہ تمہاری ضروریات کی تکمیل ہوتی رہے۔

اسماء کی عمر اس وقت بمشکل ۱۹ یا ۲۰ برس ہوگی۔ بڑے باپ کی اس بڑی بیٹی نے اپنے دادا کو جواب دیا کہ ہاں حضرت ابو بکرؓ بہت ساری رقم ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ اسماء نے کچھ پتھر جمع کر کے اس مقام پر رکھوائے جہاں حضرت ابو بکرؓ اپنی رقم رکھا کرتے تھے ان پتھروں پر اسماء نے ایک کپڑا ڈال دیا تھا۔ اپنے نابینا دادا کا ہاتھ ان پتھروں کے قریب لے جا کر اور انہیں مس کر دیا کہ اپنے دادا سے اسماء کہنے لگیں کہ دیکھیے دادا جان کتنی بڑی رقم آبا ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ دادا نے اپنی پوتی سے کہا کہ بیٹی پھر تو ہمارے لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ انہوں نے بہت اچھا کام کیا جو ہمارے لیے اتنی رقم چھوڑ کر گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ جلتے ہوئے اسما کے لیے کوئی بڑی رقم چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔

ہجرت کرنے والی جماعت نے یثرب کا بیدعا راستہ اختیار نہیں کیا وہ سمندر کے ساحل سے ہوتے ہوئے پہلے تو عسفان پہنچے پھر شمال کی طرف جاتے ہوئے قدید سے گزرے اور پھر ہیاڑوں کے درمیان سے شمال مشرق کی طرف روانہ ہوتے۔

یثرب کے مسلمانوں کو حضورؐ کے مکہ سے غائب ہو جانے کی اطلاع تو مل چکی تھی لیکن آپ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں اس کے متعلق وہ بالکل لاعلم تھے اس لیے کافی پریشان تھے۔

ہر روز صبح تڑکے وہ اپنی سواریوں کو لے کر یثرب کے اُس اونچے مقام پر چلے جاتے تھے جہاں سے ان کو مکہ سے آنے والے قافلے دورا ہی سے نظر آ جاتے تھے۔ روزانہ دوپہر تک وہ انتظار کرتے اور پھر جب سورج اپنی پوری نمازت پر آ جاتا تو مایوس ہو کر پھر اپنے مقام پر قبائیں لوٹ جاتے۔

۲۸ جون ۶۲۲ء کی دوپہر جب کہ حضورؐ کا انتظار کرنے والے صبح سے ۱۲ بجے تک انتظار کرنے کے بعد مایوس ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس ہو جاتے ہیں۔ تین تھکے ماندے اونٹ یثرب کی شاداب وادی میں داخل ہوتے ہیں اور قبا کی حدود کے باہر ایک زیتون کے درخت کے نیچے یہ مسافر اپنی سواریوں پر سے اترتے ہیں اور اونٹوں کو ستانے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

سب سے پہلے ان مسافروں پر ایک یہودی کی نظر پڑتی ہے وہ مسلمانوں کے پاس دوڑا دوڑا جا کر اطلاع دیتا ہے کہ جس آدمی کے آنے کا تم سب کو انتظار ہے وہ آچکا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے گھر سے باہر نکل آتا ہے، مسرت و انبساط کی کیفیت ہر ایک پر طاری ہو جاتی ہے اور سب کی زبانوں پر وہ آگے "وہ آگے" کے استقبالی

نعرے تھے، توش و جذبہ اور فرط مسرت کے ساتھ جانے والوں میں سے بعض کو یہ جاننا مشکل ہو گیا تھا کہ آنے والی جماعت میں کونسی ہستی رسول اللہ کی ہے۔ کون ابو بکرؓ ہیں۔ یہ مسمہ خود بہ خود اس طرح حل ہو گیا کہ جب لوگ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ حضرت ابو بکرؓ ایک چادر کو لکڑی پر تھامے حضورؐ کو سایہ کر رہے تھے تاکہ دھوپ کی تہازت اور شدت نہ بچیں۔ کمنثوم ابن ہدم نے جو اس مقام کے قریب رہتے تھے حضورؐ کو دعوت دی کہ ان کے مکان میں ہمان رہیں۔ حضرت ابو بکرؓ ایک دوسرے مکان میں جو کمنثوم کے مکان کے قریب تھا ٹھہر گئے۔ مکہ سے آئے ہوئے کافی مہاجرین اس جگہ مقیم تھے جو آپ کی آمد سے پہلے ہی شرب پیچ چکے تھے۔

آپ کے مشن کا پہلا باب اب ختم ہو چکا۔ یہاں کوئی حضورؐ کی بے حسرتی اور ہمتی کرنے والا یا مخالفت کرنے والا نہیں۔ یہاں سے حضورؐ کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہونے والا ہے۔

شرب پیچنے کے بعد آپ نے تین دن تک قبا میں آرام کیا۔ تیسرے دن حضرت علیؓ مکہ سے شرب پیچے۔ حضورؐ کے غیاب میں مکہ میں جو رقیمی معاملات حضورؐ کی طرف سے طے کرنے تھے حضرت علیؓ نے اس کی تکمیل کی۔ جن جن کو رقیمی یا قرض وغیرہ دیتے تھے حضرت علیؓ نے ادا کر دیئے۔ اچانک مکہ چھوڑنے کی وجہ سے آپ کو یہ موقع نہیں ملا تھا۔ کہ ان ذرائع کی تکمیل کریں۔ آپ کی غیر موجودگی میں حضرت علیؓ نے حضورؐ کی نیابت کی۔ حضرت علیؓ اس وقت ۲۱ سال کے تھے۔

شرب آنے کے بعد آپ کو کئی راتوں تک نیند نہیں آتی تھی۔ یہاں آپ نسبتاً محفوظ تھے۔ خطروں کے امکانات کم تھے۔ ہو سکتا ہے کہ مکہ میں چونکہ آپ کے قتل کی سازشیں ہو رہی تھیں شاید اسی لیے آپ کے ذہن پر اس کا بار پڑا، ہو یا پھر تین دن تک غارِ ثور میں آپ جس بے سرو سامانی کی حالت میں رہے اس کا بھی اثر ہوا ہو۔ اس کے علاوہ

جس طریقے سے آپ مکہ سے رخصت ہوئے اس کا بھی اثر ہو سکتا ہے۔ یہ سب باتیں آپ کا نیند پر یقیناً اثر انداز ہوئی ہوں گی۔

آہستہ آہستہ ان سب باتوں کا اثر زائل ہوا۔ حسبِ معمول پھر آپ کو راتوں میں نیند آنے لگی۔

قریش نے یا تو اپنے روایاتی تجاہل اور تغافل کے پیش نظر یا پھر اپنی قومی روایات کے مطابق اپنے آپ کو اتنا نیچے نہیں گرایا تھا کہ ہجرت کی وجہ سے آپ کے یا ابو بکرؓ کے رشتہ داروں سے اس کا بدلہ لیں جیسا کہ یورپ میں طریقہ رہا ہے کہ عورتوں، بچوں یا رشتہ داروں کو معتوب کیا جائے۔

حضرت کی زوجہ سوریہؓ حضرت علیؓ ابن ابی طالب، حضرت ابو بکرؓ کے فرزند عبد اللہؓ اور عبد اللہ کی بہنوں نے خیریت و سلامتی کے ساتھ مکہ کو خیر باد کہا۔ کسی نے بھی ان کے قریب ترین لوگوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ابو جہل نے اسماؓ کو طمانچہ مارا تھا، سوتے اس واقعہ کے کسی کا بھی بال بیکا نہیں ہوا۔

چونکہ تمام مسلمان مکہ چھوڑ چکے تھے اس لیے ان مسلمانوں کے بت پرست قرابت داروں نے اپنے مسلمان رشتہ داروں کی جائداد اور دیگر اثاثوں کو بیچ کر اس کی رقم خود ہی رکھ لی۔ مکہ کے بہت سے بت پرست اس صورتحال کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ مکہ سے مسلمانوں کا لکل جانا ان کے لیے مکہ میں امن و امان اور اس کی پائیداری کا ضامن تھا۔ اب مذہبی مناظرے اور گراگرم بحثوں اور اس کی وجہ سے خواہ مخواہ کی تلخیوں کا بہت ہی کم امکان تھا۔

حضرت نے اپنی آمد کی اطلاع اسعد بن زرارہ کو کرادی تھی۔ شرب کے جو لوگ پہلے پہل مسلمان ہوئے تھے، ان میں سے ایک اسعد تھے۔ اسعد پہلی بیعت عقبہ میں

شریک تھے اور دوسری بیعت عقبہ میں نہ صرف عہد کرنے والوں میں تھے بلکہ ان بارہ آدمیوں میں سے بھی ایک تھے بن کو سب مل کر جماعت کا لیڈر چنا تھا۔ ان کا تعلق خزرج کی شاخ بنی نجار سے تھا۔ اسی شاخ سے سلمیٰ کا تعلق تھا جو ہاشم سے بیابھی گئی تھیں۔ ہاشم حضور کے پڑدادا ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر حضور بنی نجار سے خاندانی تعلقات کے بھی خواہش مند تھے۔

دوشنبہ کے دن حضورؐ قبا تشریف لائے، جہودہ کو قبا کے شمال کی طرف روانہ ہوئے یہ مقام یشرب کے مرکزی مقام پر واقع ہے۔ روایات کے مطابق جہاں جہاں سے آپ گزرتے تھے لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل کر آپ سے درخواست کرتے تھے کہ ان کے مہمان رہیں۔ حضورؐ کسی کو رنجیدہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ جہاں پر اور جس کسی کے گھر کے سامنے اس اونٹ کو ٹھہرا دے گا میں وہیں اتر جاؤں گا اور اسی کے ہاں قیام کروں گا۔

حضورؐ کے رشتہ دار بنی نجار کی رہائش گاہ کے سامنے جہاں ایک سامان بھی تھا اور جو کھجوروں کے گوداموں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اونٹ رک جاتا ہے۔ رک کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر دوبارہ اٹھنے سے انکار کرتا ہے۔ حضورؐ اونٹ سے اتر جلتے ہیں۔

بنی نجار کا ایک نوجوان خالد بن زید آپ کا سامان اپنے گھر میں لے جاتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ آپ اس کے مہمان رہیں۔ خالد ان لوگوں میں ہیں جو بہت پہلے ایمان لائے تھے اور دوسری بیعت عقبہ میں حضورؐ کے ہاتھ پر عہد کیا تھا۔ کچھ لوگ آپ کے پاس آکر عرض کرتے ہیں کہ ان کے مہمان رہیں، حضورؐ جواب میں فرماتے ہیں کہ آدمی اور اس کا سامان الگ الگ نہیں رہتا چاہیے۔ حضورؐ کا سامان پہلے ہی خالد کے مکان میں جا چکا تھا۔ حضورؐ نے دریافت کیا کہ یہ کھجور کا باغ کس کی ملکیت ہے

جواب دیا جاتا ہے کہ یہ باغ دو تیمیم بچوں کی ملکیت ہے۔ ان تیمیم بچوں کے والی باغ کو فروخت کرنے کی پیشکش کرتے ہیں۔ باغ کی رقم تیمیم بچوں کے والی کو اسی وقت دے دی جاتی ہے۔ یہ رقم حضرت ابو بکرؓ ادا کرتے ہیں۔ اس باغ کو خریدنے کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے پاس جو رقم بچ جاتی ہے وہ دنیا کی اس پہلی مسجد کی تعمیر پر صرف کی جاتی ہے۔ حضورؐ نے مکہ سے یرب ہجرت کر جانے والے مسلمانوں کو مہاجرین سے مخاطب کیا اور یرب کے مقامی مسلمانوں کو انصار کا لقب دیا۔ اب مہاجرین اور انصار دونوں نے مل کر رضنا کارانہ کام شروع کر دیا۔ زمین کو ہموار کرنا، اینٹیں بنانا اور مختلف عمارتوں اور گھروں کی تعمیر ان کا مشغلہ بن گیا۔ حضورؐ خود بھی ان سب کے ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ عرب کام کرتے ہوئے اکثر گایا کرتے ہیں۔ ایک ہی مصرعہ یا شعر کو اس وقت تک دہرتے ہیں جب تک کہ ان میں سے کوئی کسی اور مصرعہ یا شعر کو موزوں کر کے گرہ نہ لگائے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔

ان میں سے ایک گاتا ہے کہ اگر اللہ کے رسول کام کرتے رہیں اور ہم بیٹھے رہیں تو کہا جائے گا کہ ہم ناکارہ لوگ ہیں۔

دوسرا کہتا ہے کہ اصل زندگی تو وہ ہے جو آنے والی ہے۔ اسے اللہ مہاجرین اور انصار کو وہ اصل زندگی عطا کرے۔

یہ سن کر علیؓ ابن ابی طالب کہتے ہیں۔ دن اور رات محنت کر کے گارے اور مٹی سے کوئی مسجد بناتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دل کے گرد و غبار کو بھی صاف کرتا رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گرد و غبار میں آلودہ ہونا عثمانؓ ابن عفان کو پسند نہیں تھا وہ عمارتوں وغیرہ کی تعمیر میں جسمانی طور پر حصہ نہیں لیا کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی شادی حضورؐ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ سے ہوئی تھی۔

عمار ابن یاسر جو ایک آزاد کردہ غلام تھے اینٹوں کا وزن اپنے سر پر اٹھائے لوگوں

سے کہتے تھے کہ لوگ مجھے مارنا چاہتے ہیں۔ اتنا زیادہ وزن وہ خود تو نہیں اٹھاتے کہ میرے سر پر لا دیتے ہیں۔

اُم سلمہؓ جو آگے چل کر حضورؐ کی زوجیت میں آئی ہیں فرماتی ہیں کہ عمار ابن یاسر کے الفاظ سن کر حضورؐ تھوڑی دیر خاموشی اختیار کی اور پھر نئے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے عمار سے کہا کہ تم کو یہ لوگ نہیں ماریں گے۔ تم کو مارنے والے تو چند خبیث ہوں گے۔

حضورؐ کے وصال کے کئی سال بعد جب حضرت علیؓ کی طرف سے عمار ایک خانہ جنگی میں جیتے کر لڑ رہے تھے حضرت علیؓ کے مخالفین نے ان کو نشانہ بنایا اور عمار لڑائی میں مارے گئے۔

یہاں پر حضورؐ کی پیش گوئی پوری ہوئی کہ عمار کا قتل جیشوں کی ایک جماعت کر لیگی۔ حضورؐ عمار توں پر بے دریغ پیسہ خرچ کرنے کے مخالف تھے۔ اس کے باوجود شہان اسلام نے عالی شان اور پُر شکوہ مساجد، خوبصورت محلات اور مضبوط قلعے تعمیر کروائے۔ مسجد کے متصل آپ کے لیے اہل و عیال کے لیے کمرے بنائے گئے۔ کچھ کی بنی ہوئی اینٹیں ان کمروں کی تعمیر کے لیے استعمال کی گئیں۔ ککڑی کم یاب تھی۔ چند حجروں میں دروازے لگانے گئے۔ چند حجروں سے بغیر دروازوں کے رہے۔ ان پر ٹاٹ کے پردے ڈال دیئے گئے۔ مسجد اور حجروں کی تعمیر میں ایک سال کے قریب عرصہ لگ گیا۔

حضورؐ کی زوجہ حضرت سودہؓ کے لیے ایک کمرہ مختص کر دیا گیا۔ شرب آنے کے قورے ہی عرصہ بعد حضرت ابو بکرؓ کی صاحبزادی بی بی عائشہؓ حضورؐ کے نکاح میں آئیں۔ اس وقت عائشہؓ کی عمر ۹ سال تھی اور آپ ۵۳ سال کے تھے نکاح کے بعد جب حضرت عائشہؓ حضورؐ کے گھر لائی گئیں تو وہ اپنے ساتھ اپنے کھلے بھی لیتی آئیں۔ فرش پر بیٹھے اکثر وہ اپنے کھلونوں سے کھیلا کرتی تھیں۔

زندگی کے آخری وقت تک بی بی عائشہؓ حضورؐ کی سب سے چہیتی بیوی بنی رہیں۔

شرب میں آپ کا آکر بس جانا مقامی نام یعنی شرب کی تبدیلی کا باعث ہوا۔ اب یہ جگہ شرب کی بجائے مدینہ النبی کہلانے لگی۔ اس کے لفظی معنی ہوتے ہیں نبی کا شہر۔ لگے چل کر یہ مقام مدینہ النبی سے مدینہ کہلایا جانے لگا۔

حضور کو اپنے دشمنوں سے چھڑکارا گیا تھا۔ اب آپ اپنے دوستوں اور چاہنے والوں کے درمیان تھے۔ اس کے باوجود مستقبل خود آپ کے ذہن میں ایک سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔

تقریباً ۷ مہاجرین مکہ سے مدینہ چلے آئے تھے۔ کچھ لوگوں کے ساتھ ان کے اہل و عیال بھی تھے۔ کچھ اپنی بیوی بچوں کو مکہ ہی میں چھوڑ کر آئے تھے۔ انصار تعداد میں زیادہ تھے۔ اوس اور خزرج قبیلوں کے اکثر لوگ ابھی بنت پرست ہی تھے۔ ان کے علاوہ یہودی قبیلے جو تعداد میں اوس اور خزرج کے قبیلوں سے نسبتاً کم تھے وہ بھی اپنی جگہ آپ کے لیے ایک مہم بنے ہوئے تھے۔

ایک اہم بات جو اکابرین قریش کو مکہ میں آگ بگولہ کرتی تھی وہ یہ تھی کہ ایک شخص جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس پر وقتاً فوقتاً اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے کس طرح حکومت اور سیاست میں دخل اندازی کر سکتا ہے۔ کوئی آدمی بھی جس کو قدرت کی طرف سے مختلف احکام ملتے رہتے ہیں۔ اس بات کے لیے تیار نہ ہوگا کہ وہ اپنی برادری یا جماعت یا ملک کے لوگوں پر حکومت کرے جب کہ برادری کی ہر بات اللہ کی طرف سے آنے والی وحی میں نہ صرف رد کی جاتی ہے بلکہ برادری کے ہر فیصلے کی توہین کی جاتی ہے اور اسے غلط قرار دیا جاتا ہے۔

یہاں اس بات کا اعادہ کرنا ضروری ہے کہ شرب کے دو بڑے قبیلے اوس اور خزرج آپس میں برسر پیکار تھے۔ خزرج کے ایک نامی گرامی سردار عبداللہ ابن ابی نے اس آپس کی خانہ جنگی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔

عبداللہ ابن ابی کی اعتدال پسندی اور فراست نے ان دونوں قبیلوں کو مفاہمت پر آمادہ کیا۔ ان دونوں قبیلوں نے عبداللہ ابن ابی کی قیادت پر اپنے اعتماد کا اعلان کیا۔ اُسے شرب کا سبب بڑا بااثر اور ذمہ دار سربراہ قرار دیا۔

اب شرب کے ایسے ہیچ پر حضور نمودار ہوتے ہیں۔ آپ کے اطراف آپ کے حمایتی اور چاہنے والے جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک نئے آدمی کی آمد اور اس کا اس طرح سے استقبال اور روز بروز اس کی مقبولیت میں اضافہ نے فطری طور پر شرب کے پرلے سربراہ کے دل میں حسد کی آگ کے شعلے بھڑکا دیئے۔ اس نئی صورت حال نے عبداللہ ابن ابی کو حضور کا حامد بنا کر رکھ دیا۔

اس حسد کے باوجود ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ عبداللہ ابن ابی فطری طور پر ایک امن پسند اعتدال پسند اور فرس آدمی تھا۔

حضور کو اب شرب کے حالات کے پیش نظر اپنی پالیسی متعین کرنی تھی۔ آپ نے دونوں باتوں کو اپنا یا ایک تو یہ کہ آپ نے انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ پیدا کیا۔ برادرانہ تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش کی۔ اس بھائی چارگی کے نتیجے کے طور پر حضرت ابو بکرؓ قبیلہ خزرج کے خارجہ ابن زہیر کے بھائی بن گئے۔ عمرؓ بن خطاب قبیلہ خزرج کے التہبان ابن مالک کے بھائی بنائے گئے۔ اسی طرح مکہ سے آیا ہوا ہر مہاجر مسلمان شرب کے کسی نہ کسی مسلمان انصاری کا بھائی بن گیا۔

اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ایک ایسی جگہ جہاں نہ کوئی حکومت ہو اور نہ ہی پولیس یا فوج فطری طور پر ہر آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کی اپنی ذات اور اس کے مال و اسباب اور اہل و عیال کی حفاظت ہوتی رہے۔ اس انفرادی حفاظت کی ذمہ داری قبیلہ پر ہوتی تھی۔ مسلمانوں نے اسلام قبول کر لینے کے بعد اپنے اپنے قبیلوں سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ ان کے لیے اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اپنی حفاظت کا ذمہ دینہ

کے قبیلوں کو، ہی دے دیں جن میں سے اکثر مسلمان بھی ہو گئے تھے۔

حضور کے مدینہ تشریف لانے کے کچھ ہی عرصہ بعد نبی بنجار کے سردار اسعد ابن زرارے کا انتقال ہو گیا۔ حضور کی پڑوسی سلمیٰ کا تعلق بنی بنجار سے تھا۔ اسعد کے انتقال کے بعد اسی خاندانی تعلق کے باعث لوگوں نے مل کر حضور کو اسعد ابن زرارہ کا جانشین مقرر کیا۔ اس جانشینی کی وجہ سے مدینہ میں حضور کا اثر و رسوخ اور بڑھ گیا۔

دوسرا قدم جو آپ نے اٹھایا وہ یہودیوں سے دوستی کا معاہدہ پر مبنی تھا۔ حضور کا کہنا تھا کہ جس مذہب کی آپ تبلیغ کر رہے ہیں وہ وہی مذہب ہے جو مذہب ابراہیمؑ کا تھا۔ آپ کے الفاظ میں آپ مذہب ابراہیمی کی ہی ترویج کر رہے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ توریت کے قصص قرآن میں بیان کیے گئے ہیں اور حضرت موسیٰ کا ذکر بار بار قرآن میں آیا ہے۔ یہاں پر یہ فرض کیا گیا تھا کہ یہودی اپنے مذہب سے ذرا ہٹ گئے ہیں۔ مذہب ابراہیمی سے دور ہو گئے ہیں۔ اسی لیے آپ کا جو داس غرض سے عمل میں لایا گیا کہ آپ لوگوں کو راہ راست پر لائیں۔ جن غلطیوں کے وہ مرتکب ہو رہے تھے ان غلطیوں سے ان یہودیوں کو پاک کریں۔

آپ نے فرمایا کہ آپ حضرت ابراہیمؑ کے اصل مذہب کو اس کے اصلی رنگ و روپ میں پیش کر رہے ہیں۔ بت پرستوں کے برخلاف اہل یہود اور اہل اسلام دونوں ایک اللہ کو ملتے ہیں۔ حضور نے جب مسلمانوں کے لیے نماز کی ابتداء کی تو آپ نے یروشلم کو اپنا قبلہ بنایا۔ تمام مسلمان یروشلم کے رخ پر نماز پڑھا کرتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ آپ کا معراج کا سفر یروشلم سے شروع ہوا تھا۔ اسی یروشلم سے شروع کیے ہوئے سفر معراج میں آپ کو آسمانوں کی سیر کروائی گئی۔ آپ اللہ کے دیدار سے مشرف کیے گئے۔

یہ تمام باتیں امید دلاتی تھیں کہ آپ کی تحریک اور تبلیغ میں اہل توریت نہ صرف پارہ دگر

ثابت ہوں گے بلکہ وہ آپ کو اپنا میسما تک بھی تسلیم کر لیں گے۔ مدینہ میں ابتدائی قیام کے دوران یہودیوں کے تعلقات آپ سے انتہائی دوستانہ رہے۔

ابن اسحاق نے اپنی تاریخ میں ایک ایسی دستاویز کا ذکر کیا ہے جو ایک معاہدہ تھی۔ یہاں برین انصار اور یہودیوں کے درمیان۔ اس دستاویز کے چند اقتباسات یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

’ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمن اور رحیم ہے۔ یہ دستاویز اللہ کے رسول محمد کی طرف سے ہے۔ مسلمانانِ قریش اور مسلمانانِ مدینہ اور ان تمام لوگوں کے تعلق سے جو محمد رسول اللہ کی پیروی کرتے ہیں۔ مسلمانانِ قریش، مسلمانانِ مدینہ اور دیگر پیردان محمد رسول اللہ ایک خاص جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو مختلف ہے دیگر تمام لوگوں سے۔‘

یہ دستاویز کافی طویل ہے۔ اس میں ایک جگہ ملتا ہے: ’ ایک مسلمان کسی کافر کی خاطر دوسرے مسلمان کو ایذا نہ دے۔‘ چونکہ مناصحت اور دشمنی کی بنیادیں اکثر و بیشتر ایک دوسرے کے قتل پر مبنی ہوتی تھیں اسی لیے ان سے کہا گیا کہ اگر ایک مسلمان کے ہاتھ سے کسی کافر کا قتل ہوا ہو تو دوسرے مسلمان کو اس کافر کے قتل کا بدلہ قاتل مسلمان سے نہ لینا چاہیے۔‘

چونکہ اُس زمانے میں ہر فرد کے جان و مال کی ذمہ داری قبیلہ پر ہوتی تھی اور قبیلہ جان و مال کی حفاظت کرتا تھا اسی لیے قبیلہ واری بنیادوں پر بدلہ لینے کو منع کیا گیا تھا۔

لوگوں کا تعلق ان کے اپنے اپنے قبیلوں سے ختم کر کے ایک اسلامی برادری کو جنم دیا گیا۔ اب لوگوں کی حفاظت کا ذمہ قبیلے سے ہٹ کر اسلامی برادری پر آ پڑا۔ اب مسلمان اپنے قبیلوں کے جواب دہ نہ رہے بلکہ اسلامی جماعت کی وفاداری اور اطاعت کو ان کا فرض قرار دیا گیا۔ جو حقوق اور فرائض ایک قبیلہ اور فرد کے تھے اب ان کو اسلامی جماعت اور ایک مسلمان کے تفویض کیا گیا۔

اسی دستاویز میں ایک جگہ لکھا ہے: ’ وہ یہودی جو ہمارا اتباع کریں گے۔ ہماری مدد

اور برابری کے مستحق رہیں گے۔ ان لوگوں کو نہ تو کوئی نقصان پہنچائے گا اور نہ ہی ان یہودیوں کے دشمنوں کی مدد کی جائے گی۔ یہودی جنگ کے اخراجات میں مالی تعاون کریں گے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ جنگوں میں یہودی مسلمانوں کے طرف دار رہیں۔“

پھر لکھا ہے۔

”بنی مٹوف کے یہودی ایک جماعت کی خنیت سے تسلیم کیے گئے ہیں یہ اور مسلمانوں کا ایک جماعت ہیں۔ یہودی اپنے مذہب پر چلیں گے اور مسلمان اپنے مذہب پر۔“

”آپس میں معاہدہ کرنے والی ان تینوں جماعتوں پر یہ فرض ہو گا کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کریں خصوصاً اس وقت جب کہ شرب پر کوئی حملہ ہو۔“

”غدا ری اور ظلم کو روکنے کے لیے وفاداری شرط ہے۔ اللہ اس دستاویز کو قبول فرمائے۔“

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ یہ معاہدہ بہت ہی طویل طویل ہے۔ ابن اسحق نے اس کو حسب ذیل شرحی دی ہے۔

”مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان معاہدہ۔“

کسی جگہ دستخط کرنے والوں کے نام بیان نہیں کیے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک معاہدہ نہیں تھا بلکہ دو مختلف معاہدے تھے ان کے دریافت ہونے پر مورخین نے دونوں معاہدوں کو یکجا کر کے ایک معاہدہ بنا دیا۔

دستاویز کا ابتدائی حصہ ہاجرین اور انصار کے تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے، اس کا مقصد شاید یہ ہو کہ ہاجرین اور انصار کے تعلقات کو مستحکم کیا جائے اور اتحاد اور برادری کے تعلقات پیدا کر کے ایک اسلامی جماعت تشکیل دی جائے۔

دستاویز کا دوسرا حصہ مسلمان اور یہودی قبیلوں کے تعلقات کو ظاہر کرتا ہے شرب کے یہودی بظاہر تو عرب جیسے تھے لیکن ان میں یہودی خون آجانے کی وجہ سے مخلوط النسل ہو گئے تھے جو یہودی ابتدا میں تبلیغ کی غرض سے شرب گئے تھے ان

کئے ہاں بس جانے کی وجہ سے دو قوموں کی آپس میں آمیزش ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود ان کا طرز زندگی اور رہن سہن دیگر ملکوں کے یہودیوں جیسا ہی تھا۔ منمت و حرقت، تجارت اور لین دین کے کاروبار میں یہ لوگ کافی آئے تھے۔ کئی دولت مند تھے۔ خصوصاً مدینہ کے یہودی سودی کاروبار میں بہت مشہور تھے۔ عربوں کے مقابلے میں یہودی تعلیم میں بھی آگے تھے۔ یثرب میں توریت پڑھانے کے لیے باقاعدہ ایک اسکول تھا۔ ان کی مادری زبان عربی تھی۔ زبان پر ان کو عبور حاصل تھا۔ عربوں میں شعر لکھا کرتے تھے۔ عرب شعراء کے مقابلے میں اپنی شاعری کو بھی پیش کرتے ہیں۔

مسلمانوں اور یہودیوں کے آپس کے معاہدے کے اقتباسات اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ کس طرح مدینہ آتے ہی حضورؐ کی ذات گرامی مقامی سیاست، انتظام مملکت اور انصاف کے معاملات میں بگڑ گئی تھی۔

ایک قابل سربراہ کے لیے جس کی اپنی جماعت رو بہ ترقی ہو اور اس کے ارکان میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہو یہ بات نامگزیر ہو جاتی ہے کہ وہ ان امور پر توجہ نہ دے جو معاشرت میں اور انصاف کے لیے ضروری ہیں۔

یہاں سے آپ کی زندگی میں بگڑتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ کی رسم و رواج بدلنے لگتی ہے۔ ایک بے بس اور ہر طریقہ سے ستائے جانے والا آدمی دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیاست دان اور حکمران میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ تبدیلی اس وقت حتمی تبدیلی سے زیادہ ظاہری تبدیلی تھی اپنے بہت پہلے ہی شاید یہ اندازہ لگایا ہو کہ آپ کا مشن ایک دن آپ کا رخ سیاست کی طرف موڑ دے گا۔

یہودیوں سے معاہدہ کی میناد بہت تھوڑی تھی۔

عرب دن میں کئی کئی گھنٹے اپنے گھروں میں بیٹھے مدینہ کے یہودیوں کے طرز زندگی پر گفتگو کیا کرتے تھے۔

یہودی علماء عوام کے سامنے حضورؐ سے مختلف قسم کے سوالات اور خاص طور پر توریت کے قصص کا اعادہ کرتے۔ ان علماء کے سوالات کرنے کا منشا محض یہ ہوتا تھا کہ آپ کے علمی ذخیرے کا جائزہ لیا جائے اور آپ کی معلومات کو ناقص ٹھہرا کر لوگوں کے سامنے سخر کیا جائے کسی موقع پر انہوں نے آپ سے اس واقعہ کو بیان کرنے کے لیے کہا جس میں حضرت موسیٰؑ نے نور تیبہ آسمانی آفات و بلیات کو اہل مصر پر نازل کیا تھا۔

ایک بار انہوں نے حضورؐ سے کہا کہ وہ آپ کو میسما ماننے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو حضرت داؤدؑ کی اولاد ثابت کریں۔ یہ اس لیے تھا کہ ان کی تعلیمات کے پیش نظر میسما کا وجود صرف حضرت داؤدؑ کی اولاد ہی میں سے ہو سکتا تھا۔

چونکہ آپ اپنے کو داؤد علیہ السلام کی اولاد بتانے سے قاصر تھے اس لیے آپ کی نبوت و رسالت کو تسلیم کرنے سے ان لوگوں نے انکار کر دیا تھا۔

بعض اوقات اس قسم کے منجملہ خیز سوالات کرنے کا منشا یہ ہوتا تھا کہ آپ کو برسبر عام شرمندہ کریں۔ مہمل سوالات کر کے آپ کو غصہ دلائیں۔ بعض اوقات اس قسم کی محفلیں شور و شعف، بڑبڑگ اور خفیف سی مار پیٹ پر ختم ہوا کرتی تھیں۔

ایک دو یہودیوں نے ان کی مذہبی پیش گوئی کے مطابق آپ کو اپنا میسما بھی تسلیم کیا اور اسلام میں داخل ہو گئے۔

مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان آپس کی چپقلش میں آہستہ آہستہ اضافہ ہونے لگا کبھی کبھی یہ رقابت گھونہ بازی کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔

ایک بار حضرت ابو بکرؓ شریب مسلمانوں کے لیے چندہ اکٹھا کر رہے تھے۔ قرآن میں بیان کردہ ایک مضمون کو بار بار دہرا رہے تھے کہ کون ہے جو خدا کو قرضِ حسنہ دے۔ راستہ سے گزرنے والے ایک یہودی نے حضرت ابو بکرؓ کی اس مانگ کو سن کر کہا کہ اگر خدا کو قرض کی ضرورت ہے تو یقیناً تمہارا خدا تلاش ہے اور عسرت و تنگ دستی

میں ہے۔ حضرت ابو بکرؓ تو نظر تازم مزاج تھے، غنٹے میں آگے اور اس یہودی کو ایک گھونرہ سید کیا۔ ان دنوں مدینہ کے دو بڑے تلبیہ اویس اور خزرج کے لوگ بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہے تھے۔

تاریخی مواد سے کسی بھی بڑے آدمی کی شخصیت اور اس کی کامیابی کا جائزہ لینا اور اس کی کامیابی کی کئی دھونڈ نکالنا بڑا مشکل مسئلہ ہے۔ بڑے آدمیوں کی شخصیتیں پراسرار ہوتی ہیں ان کی شخصیت پر سے پردہ اٹھانا تاریخی مواد کے بس کی بات نہیں۔ تاریخیں اس سلسلے میں بالکل مدد نہیں کرتیں۔

اس میں کوئی مبالغہ نہیں اگر کہا جائے کہ حضورؐ کی شخصیت غیر معمولی طور پر پرکشش اور جاذب نظر واقع ہوئی تھی۔ آپ لوگوں کے دل موہ لیتے تھے۔ دوسروں کو متاثر کرنے کا آپ کو ملکہ حاصل تھا۔

بہت سے واقعات ایسے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ بیت پرست اور کافر آپ کے ہاں تمسخر اور مذاق کے ارادے سے آتے تھے۔ مگر مختصر سی ملاقات کے بعد ان کا یہ حال ہوتا تھا کہ نہ صرف وہ مسلمان ہو جاتے تھے بلکہ زندگی بھر اسلام کے ایک سچے خادم بنے رہتے تھے۔ حضورؐ کی دن دوئی رات چوگنی ترقی نے عبد اللہ ابن ابی کی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی چونکہ آپ کے مدینہ آنے سے قبل عبد اللہ ابن ابی کی حیثیت شرب کے سب سے بڑے سردار کی تھی اس لیے آپ کی کامیابی سے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ عبد اللہ ابن ابی نہ صرف ایک فریسی اور چالاک آدمی تھا بلکہ اس کو اپنے دل کی بات چھپانے میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ اس نے اپنے مسلمان ہونے کا زور شور سے اعلان کیا، مسلمان ہو جانے کے بعد ایک حد تک وہ ان لوگوں کا سرغنہ بنا رہا جو علانیہ یا خفیہ طور پر آپ کی تعلیمات کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ مسلمانوں کے ہجرت کر کے مدینہ میں آکر رہ جانے سے جو نتائج پیدا ہونے کے امکانات تھے ان کے تاریک پہلو بیان کر کے شرب کے لوگوں کے جذبات کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

ایسے لوگ جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے لیکن جن میں خلوص کا فقدان تھا ان کو اسلام نے منافقین سے خطاب کیا ہے۔ حضور پر اکثر وحی کا نزول ہوا ہے جن میں ان سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں جن کو لوگ آپ کے دریافت کیا کرتے تھے اور ساتھ ہی منافقین کی مذمت کی گئی ہے۔ ایک آدمی حنظل ابن حارث حضور کی مجلسوں میں باقاعدہ شریک ہوا کرتا تھا۔ ان مجالس میں جو کچھ بھی بیان کیا جاتا نہ کہ مزح لگا کر وہ منافقین کو سنایا کرتا تھا۔ ایک بار قبل اس سے منسوب ہوا کہ حضور ہر بات سن لیتے ہیں اور جو کچھ بھی کہا جاتا ہے اس پر یقین کر لیتے ہیں۔

قرآن کے سورہ توبہ کی ۶۱ ویں آیت میں اس کا جواب دیا گیا ہے: "ان میں سے بعض ایسے ہیں جو پیغمبر کو ایزادیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص ہر کہی ہوئی بات پر یقین کر لیتا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ اگر وہ سنی ہوئی بات پر یقین کرتے ہیں تو تمہاری بھلائی کے لیے وہ اللہ کی اور مومنوں (کی بات کا) یقین رکھتے ہیں اور جو لوگ تم میں ایمان لائے ہیں وہ ان کے لیے جہنم ہیں اور جو لوگ رسول اللہ کو رنج پہنچاتے ہیں ان کے لیے عذاب الیم تیار ہے۔"

یادگار تاریخیں

| | |
|-------------|---------------------------------|
| ۶۵۷۰ | آنحضرتؐ کی پیدائش |
| ۶۶۱۰ | بعثت |
| ۶۶۱۳ | اسلام کی تبلیغ کی ابتداء |
| ۶۶۱۹ | ابوطالب کی وفات |
| ۶۶۱۹ | طائف کو روانگی |
| ۶۶۲۱ | عقبہ کی پہلی بیعت |
| ۶۶۲۲ | عقبہ کی دوسری بیعت |
| ۶۶۲۲ | مسلمانوں کی مدینہ کو ہجرت |
| ۶۶۲۲ | حضرتؐ کی مکہ سے مدینہ کو روانگی |
| ۱۸ جون ۶۲۲ء | قبائیں آنحضرتؐ کی آمد |
| ۲۸ جون ۶۲۲ء | |

غزوہ بدر

مدینہ آنے کے بعد ابتدائی چند مہینے مہاجرین کے لیے بڑے صبر آزار ہے۔ مدینہ میں پانی کی افراط اور باغبانی کی وجہ سے مچھر پاتے جاتے تھے۔ ان مچھروں کی وجہ سے لوگوں کو بخار آیا کرتا تھا۔ مکہ میں پانی کی کمیابی کی وجہ سے لوگ لمبریا سے واقف نہ تھے۔ چونکہ مکہ کے لوگوں میں اس بیماری کے تعلق سے قوت مدافعت نہیں تھی اس لیے ان میں سے اکثر و بیشتر اس نئی بیماری کا شکار ہونے لگے۔

مہاجرین کی اکثریت اپنا سارا اثاثہ مکہ میں چھوڑ آئی تھی۔ اس لیے مالی حیثیت سے بہت ہی کمزور تھے۔ ان میں سے بعض اپنے بیوی بچوں تک کو چھوڑ گئے تھے اس لیے نہ صرف مالی پریشانی کا شکار رہے بلکہ بیوی بچوں کے قریب نہ رہنے سے انسان کو جو مختلف مادی اور ذہنی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان سے بھی یہ گزر رہے تھے۔ ان کے اپنے گھر نہ تھے۔ خوش قسمتی سے مدینہ میں بارش بہت کم ہوتی ہے اور آب و ہوا معتدل ہے اس لیے لوگ مسجد میں یا پھر کھلے میدان میں یا گھروں کے صحن میں سو جایا کرتے تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آنحضرت نے مہاجرین اور انصار میں بھائی چارہ پیدا کر کے مدینہ کے مسلمانوں کو مکہ سے آئے ہوئے مسلمانوں کا بھائی بنا دیا تھا۔ مینربان اور مہمان

دونوں خاندان کے افراد ایک ساتھ رہنے لگے۔ بہا بر اور انصار ایک دوسرے کی غلطی طور پر مدد کرتے تھے۔ غلوں دل سے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔

فطری طور پر انصار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ مکہ سے آئے ان کے مسلمان بھائی یعنی بہا برین اپنا ذریعہ معاش آپ تلاش کریں اور کام کریں۔ بد قسمتی سے مکہ کے لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ زراعت کس کو کہتے ہیں اور زرعی کام کس طرح سے کیا جاتا ہے زراعت بجادہ واحد پیشہ تھا جو مدینہ میں عام تھا۔ مکہ میں زراعت نہیں ہوتی تھی جلد لوگوں کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔

آنحضرت نے حضرت عبد الرحمن بن عوف کو جب ایک انصاری کا بھائی بنا یا تو انہوں نے حضرت عبد الرحمن بن عوف کو بڑی خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ اپنا سارا مال و اثاثہ اکران کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ یہ میری زندگی بھر کا اثاثہ ہے۔ اس میں سے آپ آدھا لے لیں اور آدھا میں رکھ لیتا ہوں۔ میری دو بیویاں ہیں۔ ان دونوں میں سے جس کو آپ پسند کر لیں اسے میں طلاق دے دیتا ہوں اور آپ اس سے شادی کر لیں۔

حضرت عبد الرحمن نے یہ سب سن کر جواب میں کہا کہ خدا کی رحمتیں تمہارے اور تمہارے خاندان کے شامل حال ہوں۔ مہربانی کر کے مجھے صرف اتنا بتا دو کہ یہاں کا بازار کہاں ہے۔

ایک چھوٹی سی رقم قرض لے کر حضرت عبد الرحمن بازار گئے۔ کسی چیز کو خریدا اور منافع پر بیچ دیا۔ خرید و فروخت کا سلسلہ اسی طرح جاری رکھا۔ اللہ نے ان کے کاروبار میں وہ برکت دی کہ انہوں نے اپنی تجارت کے منافع سے مدینہ میں ایک مکان خریدا۔ مقامی لوگوں سے شادی کی۔ شادی کے دن ایک بڑی دعوت کی۔ اس مثال سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ مدینہ کے زراعت پیشہ اور مکہ کے تجارت پیشہ لوگوں میں کتنا بڑا

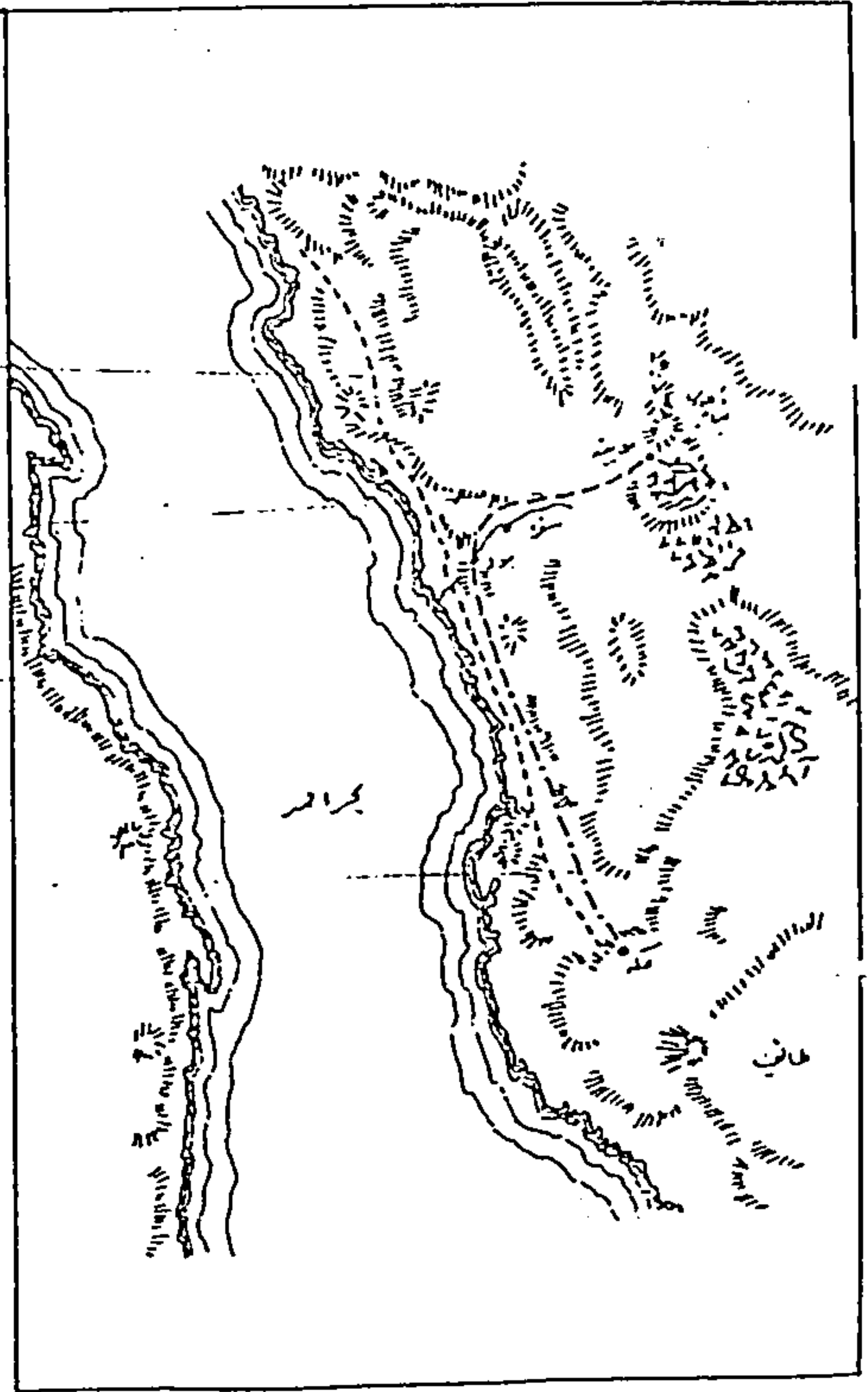
برد کا نقشہ

ابو سیبیاں کا کنارہ

سمازوں کا ایشیا
نہن کا دریا

ابو سیبیاں کے کنارے

کاروان کو بچانے
کے لیے کھینے والے
اردن کا ایشیا



ذوقِ تماذری طریقوں سے لاطمی کی وجہ سے حضورؐ کو خود بھی کئی بار کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ مدینہ کے لوگ عام طور پر کھجور کے نخل تانوں کو اپنا ذریعہ معاش بنائے ہوتے تھے۔ ان درختوں میں بنس اور درختوں کی طرح چند زرخست ہوتے ہیں اور چند مادہ۔ کھجوروں کی فصل کی تیاری کے لیے آدمیوں کو زرخست پر چڑھنا پڑتا ہے۔ اوپر جا کر اس کا منفر نکلنا پڑتا ہے اور پھر اُسے مادہ درختوں میں داخل کرنا پڑتا ہے۔ آنحضرتؐ نے اس عمل کو ناپسند فرمایا اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ اس عمل سے باز رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب فصل کے پکنے اور کٹنے کا زمانہ آیا تو مسلمانوں کے درخت کھجوروں سے خالی تھے۔ یہ دیکھ کر آنحضرتؐ نے اپنی لاطمی محسوس کی اور اس کا اعتراف بھی فرمایا۔

یہاں مسلمانوں کے لیے ایک نکتہ نکل آیا۔ آنحضرتؐ جب کوئی بات کسی وحی کی بنا پر فرماتے تو وہ مسلمانوں کے لیے واجب التعمیل ہو جاتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے اس حکم پر عمل کرنا فرض ہو جاتا تھا۔

وحی سے بہت کر اگر کوئی بات آنحضرتؐ اپنی طرف سے کہتے تو یہ بات ایک بشر کی بات ہوتی تھی۔ انسان کی باتوں میں خطا و نسیان کی گنجائش ہوتی ہے۔ جیسے عام انسانوں سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں ایک انسان ہونے کے ناطے حضورؐ سے بھی سرزد ہو سکتی تھیں اس لیے حضورؐ کی باتیں جو وحی سے ہٹی ہوئی ہوتی تھیں لوگوں پر فرض نہیں ہوتی تھیں۔

بخاری کی روایت کے مطابق مدینہ میں اس وقت پندرہ سو مسلمان رہتے تھے۔ ڈاکٹر جمیل اللہ کے بیان کے مطابق سارے مدینہ کی آبادی دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ اس آبادی میں بُت پرستوں کی تعداد بہ نسبت یہودی قبیلوں کے افراد کے زیادہ تھی۔

یہ اعداد و شمار ناقابلِ اعتماد اور مشکوک ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ

آباری مدینہ کی کچھ ہی کیوں نہ ہو مسلمان بہر حال اقلیت میں تھے۔
 مدینہ میں اس وقت ایک عیسائی کے رہنے کا ذکر آتا ہے۔ اُس کا نام ابو عامر
 تھا۔ یہ قبیلہ اوس سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ایک راہب تھا۔ ابو عامر نے آنحضرت کے
 دعویٰ نبوت کو تسلیم نہیں کیا۔ مدینہ چھوڑ کر مکہ کے حُبت پرستوں کے درمیان جا کر رہنے کو
 ترجیح دی۔

آنحضرت کے مدینہ آنے کے سترہ یا اٹھارہ مہینے بعد مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان
 خلیج پیدا ہونے لگی۔ نتیجے کے طور پر مسلمانوں کے طریقہ عبادت میں ایک بڑی
 تبدیلی آئی۔

واقعہ معراج کے بعد سے حضور نے مسلمانوں کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ نماز کے وقت
 وہ اپنا قبلہ بیت المقدس کو بنائے رکھیں۔ یہودیوں سے مفاہمت اور تعاون کو
 ترک کرنے کے لیے پہلا قدم جو اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ اب مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس
 نہ رہا بلکہ کعبہ ہو گیا۔

مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اب وہ قبلہ رُو ہوں تو مکہ کی طرف ہوں۔ بیت المقدس
 یا یروشلم کے رخ پر نماز نہ پڑھیں۔ دوسری تبدیلی یہ فرمائی کہ ہفتہ کو جو یہودیوں کے
 لیے مبارک اور مقدس دن ہوتا ہے اور جو مقامی طور پر اہمیت کا دن تھا جمعہ سے
 تبدیل کر دیا گیا۔

یہودی اور عیسائی اپنے اپنے مقدس دن یعنی ہفتہ یا التوار کو بہت سے ایسے
 کام ہیں جو نہیں کرتے اور مذہباً ان کاموں کا کرنا منع ہے۔ آنحضرت نے مسلمانوں کو
 جمعہ کے دن اس قسم کی پابندیوں سے آزار رکھا۔ جمعہ کی اہمیت میں اضافہ صرف اس
 طرح کر دیا کہ اُس دن دوپہر کے وقت ایک خاص نماز جو نماز جمعہ کہلاتی ہے ادا کرنے
 کا حکم دیا۔ یہ نماز صرف مساجد ہی میں باجماعت پڑھی جاتی ہے۔

آنحضرت کے مدینہ میں قیام کے پہلے سال سارے مسلمان آپس میں شکر و شکر رہے ان کی تعداد ہزار اور پندرہ سو کے درمیان تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں ان کا اسلام کی تکمیل میں آئی۔ ان ہی ارکان میں سے ایک رکن پانچ وقت کی نماز ہے یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ کونسی تاریخ اور کون سے دن نماز پانچ وقتہ کو مسلمانوں پر باقاعدہ فرض کیا گیا۔

بعض راویوں کا کہنا ہے کہ آنحضرت کے زمانہ حیات میں صرف تین وقت کی نمازیں پڑھی جاتی تھیں۔

مسلمانوں پر نماز کے بعد جو دوسرا فرض اسی زمانہ میں عاید کیا گیا وہ زکوٰۃ تھا۔ زکوٰۃ کی تشریح بڑی ہی واضح اور متعین ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کی انفرادی دولت کا ایک منقسم حصہ ہر سال زکوٰۃ کے طور پر نکالا جائے۔ زکوٰۃ کی حیثیت ایک ٹیکس کی ہے نہ کہ بخشش یا خیرات کی۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں زکوٰۃ غریبوں یا ناداروں میں تقسیم کی جاتی تھی۔ صحابہ زکوٰۃ ہر سال زکوٰۃ کی رقم علیحدہ کرتے اور حاجت مندوں میں تقسیم کرتے تھے۔

اسلام کا تیسرا رکن جو اسی زمانے میں مسلمانوں پر فرض کیا گیا وہ رمضان میں روزہ رکھنا تھا۔

بعض مغربی مصنفین کا بیان ہے کہ آنحضرت نے روزہ کو یہودیوں سے اپنا یا مدینہ میں چونکہ کافی یہودی رہا کرتے تھے اور یہ لوگ بھی سال میں دس دن روزہ رکھا کرتے تھے اس لیے آنحضرت نے بھی ان کے اس عمل کو پسند کرتے ہوئے مسلمانوں میں بھی روزہ کی تردید کی۔ یہودیوں سے امتیاز کی خاطر مسلمانوں کو بجائے دس دن کے رمضان کا پورا مہینہ روزہ رکھنے کا حکم دیا۔

یہاں یہ بات کرنا ضروری ہے کہ نماز، زکوٰۃ اور روزہ یہودی مذہب کی

بنیاد ہے یہی یہودیوں کی مذہبی کتاب MATHEW VI میں جب فرعونوں کی ظاہرداری، دکھاوٹ اور بناوٹ کا ذکر آتا ہے تو فرعونوں کی اسی لیے مذمت کی گئی کہ وہ اپنے آپ کو نیک اور پارسا ظاہر کرنے کے لیے نمازیں پڑھتے تھے، روزہ رکھا کرتے تھے اور زکوٰۃ دیا کرتے تھے۔ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان فراتھن کی ادائیگی کی وجہ سے وہ بھی نیک اور پارسا ہیں۔

مغربی مصنفین جب کہتے ہیں کہ اسلام یہودیت کا چرہ ہے تو مسلمان اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ اسلام دین ابراہیمی ہے۔ حضرت ابراہیم پہلے مسلمان تھے اسلام اور یہودیت میں مشابہت کوئی تعجب کی بات نہیں۔ بہت سی باتوں میں ان دونوں مذاہب میں بڑی مشابہت ہے۔

مسلمانوں کو اجازت ہے کہ نماز چاہیں تو اکیلے پڑھ لیں یا باجماعت ادا کریں۔ جو لوگ نماز کے لیے مسجد جاسکتے ہیں جو ق درجہ مسجدوں کا رخ کرتے ہیں مسجد میں صفیں باندھی جاتی ہیں۔ ان کے آگے ایک امام کھڑا ہوتا ہے جو نماز پڑھاتا ہے تمام نمازی اس امام کی پیروی کرتے ہیں۔ جو عمل امام کرتا ہے وہ عمل اس کے مقتدی کرتے ہیں۔

بعض مغربی ماہرین تفسیات نے مسلمانوں کی نماز باجماعت کا مشاہدہ کیا تو نمازیں جس بے نظیر تنظیم اور اطاعت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اس کو فوج کے نظم و نسق اور اطاعت و تنظیم سے تشبیہ دی۔

جب مسلمان مسجد نبوی میں ہر نماز کے وقت باقاعدہ جمع ہونے لگتے تو اس بات کو محسوس کیا گیا کہ کوئی ایسا طریقہ کار اختیار کیا جائے جس کے نتیجے کے طور پر تمام مسلمان ایک وقت میں نماز کے لیے جمع ہو سکیں۔ یہودی اس مقصد کے لیے ناقوس استعمال کرتے تھے۔ آنحضرتؐ بھی اسی طریقے کو اپنانا چاہتے تھے۔ یہودیوں اور مسلمانوں میں

رقابت زیادہ ہو جانے کی وجہ سے اس خیال کو ترک کر دیا۔

جیسا کہ اس مقصد کے لیے گھنٹہ بجایا کرتے تھے۔ اس پر بھی غور کیا گیا لیکن اس طریق کار کو بھی ناپسند کیا گیا۔ ایک دن ایک انصاری آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ انہوں نے ثواب میں دیکھا ہے کہ نماز کے لیے لوگوں کو مسجد پر بلوانے کے لیے انسانی آواز کو استعمال کرنے کا کسی نے مشورہ دیا ہے۔ آپ نے اس مشورہ کو پسند فرمایا اور اس کو علی جامہ پہنانے کا فیصلہ صادر فرمایا۔

ایک حبشی غلام جس کو اس کے مالک نے مکہ میں ظلم و ستم کا نشانہ بنا رکھا تھا اور جس کو حضرت ابو بکرؓ نے آزاد کر دیا تھا اس کام کے لیے چنا گیا۔ اس غلام کا نام بلالؓ تھا۔ اسلام کے پہلے مؤذن حضرت بلالؓ ہیں جن کو اذان دینے کے فرائض سپرد کیے گئے جن الفاظ کو آنحضرتؐ نے حضرت بلالؓ کے ادا کرنے کے لیے چنا تھا وہی الفاظ آج بھی ہر مسجد کے منارے سے مؤذن کی زبان سے ادا ہوتے ہیں اور سنے جاسکتے ہیں۔

اذان میں کہا جاتا ہے

اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔

نماز کے لیے آؤ۔ نماز کے لیے آؤ۔

نماز تمہاری فلاح و بہبودی کا باعث ہے۔

اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔

ہمیں کوئی معبود سوائے اللہ کے۔

حضرت بلالؓ مسجد نبوی کے قریب کسی ایک گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دیتے

اور اس طرح مسلمانوں کو نماز کے لیے بلاتے۔ منارہ جو بعد میں چل کر مسلم طرز تعمیر کا ایک

جزوبن گیا اس وقت اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔

مدینہ آنے کے کچھ مہینے بعد ہی ہابہترین کو فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہاتھا اس لیے کہ انصاری نے ابتدا میں جوش و خروش اور فیاضی کا مظاہر کیا تھا اس میں آہستہ آہستہ کمی ہونے لگی تھی۔ مکہ سے آئے ہوئے مسلمانوں کے تعلق سے یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ فاقہ سے مجبور ہو کر گھاس پات کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان کا لباس بہ مشکل ان کی ستر لٹھی کرتا تھا۔ جو لوگ مکہ ہی تجارت کرتے تھے اور ہجرت کی وجہ سے اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ آئے تھے پھر سے تجارت کی طرف رجوع ہو گئے، حضرت عبدالرحمنؓ ابن عوفؓ کا ذکر ہم ابھی اوپر کر چکے ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ بازار میں کھڑے ہو کر کپڑا بیچا کرتے تھے۔ حضرت عثمان ابن عفانؓ کھجوروں کا کاروبار کرتے تھے۔

حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو بالٹی میں پانی لے جا کر اس شخص کو دیتے ہوئے دیکھا گیا جو اپنا گھر مٹی کی اینٹوں سے بنا رہا تھا۔ حضرت علیؓ کو اس کام کے معاوضے میں ۱۶ کھجور دیئے گئے تھے۔

آنحضرتؐ کو بھی ان تمام دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ ہاتھا جن سے عام مسلمان گزر رہے تھے۔ بعض اوقات خود آپ کو بھی فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ کے خاندان کے افراد کا گزارہ کھجوروں پر تھا۔ جب کھانے پینے کا کوئی سامان تحفے میں ملتا تو آپ اس کو ان بے بس اور نادار مسلمانوں میں تقسیم کیا کرتے جو اپنی غربت اور محتاجی کی وجہ سے مسجد نبویؐ میں قیام کیا کرتے تھے۔ جب آنحضرتؐ نے حضرت عائشہ بنت ابوبکرؓ سے نکاح کیا تو اس موقف میں نہیں تھے کہ کسی دعوت وغیرہ کا اہتمام کرتے۔ اس وقت حضورؐ کے گھر میں کھانے کی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔

آنحضرتؐ کے مدینہ آنے کے تقریباً سات مہینے بعد مختلف قسم کی مخالفتوں اور رقابتوں

کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ بات واضح ہیں ہے کہ قریش کے تجارتی کاروان پر جو دھاوا بولا گیا وہ مسلمانوں کی ناداری اور غربت کا نتیجہ تھا یا مسلمانوں نے مکہ کے لوگوں سے بدلہ لینے کے لیے ایک سو چار سو منسویہ بنا رکھا تھا۔ چونکہ مسلمان معاشی اعتبار سے اتر ہو گئے تھے اس لیے شاید اپنی اس ابتری کو دور کرنے کے لیے انہوں نے یہ قدم اٹھایا ہو یا پھر مکہ کے بت پرستوں سے بدلہ لینا ان کا مقصد رہا ہو۔ بہر حال اس حملہ کے پس منظر کے تعلق سے کچھ کہنا محض تیسرا آرائی کرنا ہے۔

بعض مسلمان اس حملے کو اللہ کی رضا سمجھ رہے تھے۔ بعضوں نے اسے اسلام کی خدمت سمجھا اور اسی جذبے نے ان کو اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں اور گئے بھائیوں کے مد مقابل ہو جائیں۔

عقبہ کی دوسری بیعت مدینہ کے مسلمانوں نے آنحضرت کے ہاتھ پر کی تھی۔ اس کی روح مدافعت پر مبنی تھی۔ ساری بیعت میں مدافعت پہلو اختیار کیا گیا تھا۔ انہوں نے دشمنوں سے محفوظ رکھنے کا ذمہ تو ضرور لیا تھا لیکن اس بات کا اقرار نہیں کیا تھا کہ وہ آپ کی خاطر قریش کے لوگوں پر حملہ کریں گے یا آپ کے دشمنوں سے جارحانہ طرز عمل اختیار کریں گے۔ بیعت کے اسی پہلو کے پیش نظر قریش کے تجارتی کاروان پر حملہ کرنے والوں میں انصار بالکل شریک نہیں ہوئے۔ حملہ کرنے والے سارے کے سارے ہاجرین تھے۔

یورپ کے مسننین جو عرب کی سماجی زندگی سے واقف نہیں ہیں۔ قریش کو بھی ویسا ہی ایک قبیلہ سمجھتے ہیں جیسے غطفان، ہوازن یا طے تھا۔

بدوی قبیلوں کا وجود باہمی جنگوں کا مرہون منت ہے۔ وہ اپنی بقا کے لیے جنگ کیا کرتے تھے۔ جنگ ان کی زندگی کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ ان بدوی قبیلوں کے بڑھاپا قریش تجارت پیشہ لوگ تھے۔ ان کی زندگی کا منشا، دولت کا حصول تھا۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے وہ سرگرداں رہا کرتے تھے۔ جنگ کے وہ خواہش مند نہیں تھے خصوصاً

ایسی جنگ ان کو بھاتی نہیں تھی جو صرف عزت و شوکت کے اظہار کی خاطر لڑی جاتی ہے
 جنگ چونکہ تجارت کے فروغ میں رکاوٹ بنتی ہے اس لیے قریش کی خواہش یہ رہتی تھی
 کہ سارے عرب میں ہمیشہ کے لیے امن و امان رہے تاکہ ان کی تجارت کامیابی کے ساتھ
 چلتی رہے اور تجارت کے فروغ کی وجہ سے ان کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا رہے۔ جیسا
 کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے قریش کے تاجر رگیستانی راستوں سے اسی طرح ناواقف
 تھے جیسے آج کا ایک تاجر۔ آج کے تاجر کو دنیا کے کسی بھی حصہ میں جانا ہو تو وہ یا تو آپلیٹ
 پر بھروسہ کرے گا یا ٹرین ڈرائیور پر۔ بالکل اسی طرح اس زمانے میں قریش کے تاجر
 راستوں کی رہنمائی کے لیے بدویوں کی خدمات حاصل کرتے تھے۔

شہریوں اور دیہاتیوں میں ہمیشہ رقابت رہا کرتی ہے۔ بدوی شہر میں رہنے
 والے قریش کے لوگوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔

جب عرب تاریخ دانوں اور محدثوں نے کتابیں لکھنی شروع کیں تو اس وقت
 قریش کے خلفاء، بادشاہوں اور شہنشاہوں کا سکہ چلتا تھا۔ قریش خاندانوں سے تعلق
 رکھنے والے ان بااثر لوگوں نے تاریخ دانوں اور محدثوں کو ہدایت کی کہ جب کبھی قریش
 کا ذکر آئے ادب آئے۔ کسی جگہ بھی قریش کے ساتھ بے ادبی یا بے حرمتی نہ ہونے پاتے
 خلیفہ چونکہ خود قریش سے تعلق رکھتا تھا اس لیے وہ نہیں چاہتا تھا کہ تاریخ میں قریش
 کو کسی بھی طریقے سے ہدفِ ملامت بنایا جائے۔ ان کی ان ہدایتوں اور سختیوں کے
 باوجود تاریخ کے بین السطور یہ بات پڑھی جاسکتی ہے کہ عرب کے اور قبیلے قریش
 کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کو بیوی پارسی، دکاندار یا شہری سے مخاطب
 کرتے تھے۔ ان کو بنیے اور بقال سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف مکہ کے لوگ یعنی قریش
 شہر سے باہر رہنے والے بدوی قبیلوں کو جنگلی، وحشی، غیر مہذب اور جاہل سمجھتے تھے
 ان لوگوں کو گنوار اور گاودی کہا جاتا تھا۔

قریش کے اس تجارتی کاروان پر مسلمانوں نے جو پہلا حملہ کیا وہ خاطر خواہ کامیاب نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے حملہ کیا تھا ان کا تعلق مکہ سے تھا۔ ان پر شہریت غالب تھی۔ بدویت کا فقدان تھا۔

اگر عرب کے نقشہ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ ایک ایسے مثالی محل وقوع کا مالک تھا جہاں سے ان کاروانوں پر آسانی سے حملہ کیا جاسکتا تھا جو مکہ سے شمال کی طرف شام جایا کرتے تھے۔

غالباً جنوری ۶۲۳ء میں مسلمانوں نے آنحضرت کے چچا حضرت حمزہؓ کی قیادت میں پہلی مرتبہ قریش کے تجارتی کاروان پر حملہ کر کے اُسے لوٹنے کی کوشش کی۔ حضرت حمزہؓ کی قیادت میں اس کام کو انجام دینے کے لیے تقریباً ۳۰ آدمی تیار ہوئے۔ ابو جہل کی قیادت میں جو تجارتی کاروان اپنا راستہ طے کر رہا تھا اس کو لوٹنا ان لوگوں کا مقصد تھا۔ حضرت حمزہؓ کاروان کو داری میں تک لے آئے۔ جہاں ایک مقامی قبیلہ کے سردار نے بیچ بچاؤ کر کے ان دونوں جماعتوں کو لوٹنے سے باز رکھا۔ کاروان صحیح سلامت گزر گیا۔ حضرت حمزہؓ اپنی جماعت کے ساتھ مدینہ واپس لوٹ گئے۔

فروری ۶۲۳ء میں ساٹھ آدمیوں پر مشتمل مسلمانوں کی ایک جماعت نے قریش کے ایک اور کاروان کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس کاروان کی قیادت ابوسفیان ابن حرب کر رہا تھا۔ رابلج کے مقام پر مسلمانوں نے اس کاروان کو بکڑ لیا۔ اس موقع پر بھی دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے سے لڑنے بغیر اپنا اپنا راستہ لیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ سعد ابن وقاص نے جو ابتدا میں مسلمان ہونے والوں میں سے ہیں اپنا تیر قریش کی طرف پھینکا۔ یہ تیر اسلام کا پہلا تیر تھا اور سعد ابن وقاص پہلے مسلمان ہیں۔ جنہوں نے اسلام کی خاطر تیر اندازی کی۔

جون ۶۲۳ء میں آنحضرت مسلمانوں کا ایک دستہ لیے ہوئے اس امید سے باہر نکلے

کہ قریش کے کاروان کو پکڑ لیں۔ دشمن کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ نبی کنازہ کی ایک شاخ بنی حمزہ کے کچھ لوگ مسلمانوں کو مل گئے۔ آنحضرتؐ بجائے اس کے کہ اس جماعت کے لوگوں سے لڑتے، آپ نے ان لوگوں سے دوستی کا معاہدہ کر لیا۔ ان کے سربراہوں کو اپنا حلیف بنا لیا۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ آنحضرتؐ لڑائی کو ناپسند کرتے تھے۔ آپ کے میٹھے بول اور اخلاقِ حسنہ نے اسلام کی جس بہترین طریقے سے خدمت کی اور اس کو پھیلایا وہ تلوار کے بس کی بات نہیں تھی۔

پندرہ دن تک آنحضرتؐ اور آپ کے ساتھی مدینہ سے اور اپنے اپنے گھروں سے باہر رہے۔

جون اور اکتوبر ۶۲۲ء کے دوران تین تین چار چار آدمیوں کی ایک جماعت قریش کے کاروانوں کی تلاش میں مدینہ سے باہر جاتی تھی اور خالی ہاتھ واپس آتی تھی۔ نومبر ۶۲۲ء میں کچھ بدوی مدینہ کے اوتسوں پر ڈاکہ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے قریش کی دونوں جماعتیں یعنی مکہ کے بت پرست اور مدینہ کے ہماجرین ایک دوسرے سے بدلہ لینے کے لیے بہت ہی بے چین تھے۔ مدینہ کے انصار کو ان کی آپس کی اس چیقلش سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انہوں نے ابتداء ہی سے اپنے آپ کو اس سے الگ رکھا۔

مسلمان یہ محسوس کرنے لگے کہ بدوی قبیلوں کے تعاون اور مدد کے بغیر قریش کے کاروانوں کو روکنا یا ان پر حملہ کرنا ناممکن ہے۔ اس زمانے میں طریقہ تھا کہ ہر قبیلہ یہ ذمہ داری لیتا تھا کہ اس کے اپنے حدود سے کاروان بہ سلامتی تمام آگے بڑھے گا اور کسی بھی کاروان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ قبیلوں کی یہ ذمہ داری کاروانوں کی حفاظت کا مؤثر طریقہ سمجھی جاتی تھی۔ مسلمان اس وقت تک کاروانوں پر حملہ نہیں کر سکتے تھے جب تک کہ وہ مقامی قبیلوں کو اپنی طرف نہ کر لیں۔ یہی وجہ تھی کہ آنحضرتؐ نے نبی صغیرہ

سے دوستی کا معاہدہ کیا تھا۔ یہ معاہدہ قریش اور مسلمان کے تنازعات کے سلسلے میں ایک بہت
راہِ اقدم تھا۔

ستمبر ۶۲۲ء میں آنحضرتؐ ڈیرہ سو آدمیوں کا ایک دستہ لے کر مکہ سے شام جانے والے
قریش کے ایک قافلے کو گھیرنے کے لیے ذی العیشہ تک گئے۔ جس کا روانہ کے تعاقب
میں یہ دستہ نکلا تھا وہ کاروان اس مقام سے آگے نکل چکا تھا۔ آنحضرتؐ نے اس موقع کو
ضائع ہونے نہیں دیا۔ ایک مقامی قبیلہ مد لجن سے دوستی کا معاہدہ کر لیا۔

اس قسم کے حملوں کا مسلمانوں کو کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے منصوبوں
کو راز میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ جب کبھی وہ اس کام کے لیے آجس میں جمع ہوتے ان میں
ہر شخص یہ جان لیتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ آنحضرتؐ نے ان خامیوں کو محسوس کیا اور
دوسری دفعہ چھاپہ مارنے کے منصوبہ کو راز میں رکھا۔

نومبر ۶۲۳ء میں ۸ مسلمانوں پر مشتمل ایک جماعت عبد اللہ ابن جحش کی سرکردگی میں
اس کام کے لیے روانہ ہوئی۔

آنحضرتؐ نے ایک خط عبد اللہ کے حوالے کیا اور فرمایا کہ جب تم مشرق کے راستے پر روانہ
ہو تو دو دن بعد اس خط کو کھول کر اس کی تحریر پڑھنا۔ عبد اللہ نے ایسا ہی کیا۔ خط میں لکھا
تھا کہ اپنی جماعت کے ساتھ نخل کی طرف جاؤ۔ طائف سے مکہ جانے والے راستے پر قریش
کے کاروان کو پکڑو۔ اگر اس کاروان کا تعاقب ہیچ پیدگی اختیار کرے تو یہ کہا جائے کہ ہم
تو محض کاروان اور اہل کاروان کو دیکھنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ ابھی یہ لوگ اپنے بتائے
ہوئے مقام پر پہنچے ہی تھے کہ چار آدمیوں پر مشتمل ایک کاروان مکہ کی طرف جا رہا تھا، ان
کے ساتھ طائف کی پیداوار تھی۔ کشمش، چمڑا، شراب وغیرہ۔ یہ رجب کا آخری دن تھا۔
جب عربوں کے ہاں ایک مقدس مہینہ سمجھا جاتا تھا۔ لڑائی جھگڑا کرنا اس مہینہ میں نہ صرف
ایک عیب بلکہ گناہ سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کر کے اس کاروان پر حملہ کر

دیا۔ کاروان کا ایک آدمی عبداللہ بن حصرتی مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ان میں دو گرفتار ہوئے۔ ان میں ایک فرار ہو گیا۔ کاروان کا سارا سامان مالِ غنیمت کے طور پر مدینہ لایا گیا۔

مسلمانوں نے عربوں کے مقدس مہینے کی بے حرمتی کی تھی۔ عرب سال میں چار مہینوں کو مقدس سمجھتے تھے۔ ان مہینوں میں قتل و غارت کرنا حرام سمجھا جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں جہاں قتل و خون کے سلسلے دوامی طور پر چلتے رہتے ہیں ان چار مہینوں کی تخصیص عام لوگوں کے لیے ایک سکون اور اطمینان کا باعث بنتی تھی۔ ان لوگوں کو ان مہینوں میں اپنی جان محفوظ نظر آتی تھی۔ مال کے لئے کا ڈر نہیں رہتا تھا۔ اس مہینے کی بے حرمتی مدینہ کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے ایک سانحہ تھی۔ سب کے سب اس واقعہ سے رنجیدہ ہوئے۔ مدینہ میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا۔ اس بات کا تصفیہ کرنا ہمارے لیے مشکل ہے کہ آیا آنحضرت نے رجب کے مہینے کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کو حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ تھا یا جب اس کام کا حکم دیا تھا اس مہینے کی حرمت آپ کے ذہن میں نہیں تھی وہ لوگ جب مالِ غنیمت لے کر واپس آئے تو آنحضرت نے اپنا حصہ جو کل مالِ غنیمت کے پانچویں حصہ پر مشتمل تھا قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک بات اور بھی قابلِ توجس ہے کہ آنحضرت نے اپنے بند لفظی میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ ان آٹھ آدمیوں کی جماعت میں سے جو شخص حملہ میں حصہ لینا چاہے وہ بخوشی مدینہ واپس جاسکتا ہے کیا آپ نے اپنے حکم میں اس بات کی گنجائش رکھی تھی کہ اس جماعت کے لوگ جو رجب کے مہینے کی حرمت کے خیال سے لڑنا نہ چاہیں وہ واپس آجائیں یا انسانی کمزوری پیش نظر تھی کہ اس لیے سفر سے اگر کوئی تھک جائے اور آگے بڑھنا نہ چاہے تو وہ واپس روانہ ہو جائے۔

ان آٹھوں میں سے کوئی بھی مدینہ واپس نہیں ہوا۔ البتہ دو آدمی غائب ہو گئے

کچھ دن بعد مدینہ آکر کہنے لگے کہ ان کی سواری کے اونٹ غائب ہو گئے تھے۔ اسی لیے وہ سب کے ساتھ واپس نہ ہو سکے۔ مدینہ کے مسلمان جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے شش و پنج میں مبتلا تھے حتیٰ کہ انھوں پر وحی نازل ہوئی۔ سورہ بقرہ کی ۲۱۷ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے

”اے محمدؐ، لوگ آپ سے مقدس مہینوں میں لڑائی کرنے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ ان میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور وہ اللہ کی راہ سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ میں جانے) سے (بند کرنا) اور اہل مسجد کو اس میں سے نکال دینا (جو یہ کفار کرتے ہیں) اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ (گناہ) ہے اور فتنہ انگیزی، خون ریزی سے بھی بڑھ کر ہے اور یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ اگر بس چلے تو آپ کو آپ کے دین سے پھیر دیں اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر کر کافر ہو جائے گا اور کافر ہی مرے گا تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں برباد ہو جائیں گے اور یہی لوگ دوزخ (میں جانے) والے ہیں، جس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

مقدس مہینہ کی حرمت کا ضرور ذکر کیا گیا ہے لیکن اس کی اہمیت اس وقت باقی نہیں رکھی گئی جب کہ قریش کے جرائم سے مسلمانوں کو سابقہ پڑ رہا تھا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں پہلا خون جو بہا وہ عبد اللہ ابن حضرمی کا تھا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں رجب کے حرمت والے مہینے میں عبد اللہ مارا گیا۔ بد قسمتی سے عبد اللہ مکہ کی مشہور اور ریاض شخصیت عقبہ ابن ربیعہ کا حلیف تھا۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری عقبہ نے لے رکھی تھی۔

مضبوط لوگ کمزوروں کو پناہ دیا کرتے تھے۔ اپنے فریق کو پوری طریقے سے بنا رہے تھے۔ لوگوں کو پناہ دینا اور پناہ دیے ہوئے لوگوں کا مارا جانا عربوں میں اکثر جنگ و

جدال کا باعث ہوا کرتا تھا۔ اس قتل کے نتیجے کے طور پر عقبہ ابن ربیعہ نے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔

کاروان پر قبضہ اور بعد اللہ کا قتل ان دونوں باتوں نے مکہ کے لوگوں اور مسلمانوں کے درمیان بہت بڑی کشیدگی پیدا کر دی۔ اس کا نتیجہ ایک کھلی جنگ کی صورت میں سامنے آیا۔

۶۲۳ء کی خزاں کا زمانہ تھا۔ قریش کا سالانہ تجارتی قافلہ مکہ سے شام کی طرف جا رہا تھا۔ مدینہ کے مغرب سے بحر احمر کے کناروں سے ہوتا ہوا یہ قافلہ آگے بڑھ گیا۔ یہ کارواں ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل تھا۔ بہت سی قیمتی اور انمول تجارتی سامان سے سارے اونٹ لدے ہوئے تھے۔ کارواں کی قیادت ابوسفیان کر رہا تھا۔ یہ مکہ کا ایک بااثر لیڈر تھا۔ مکہ میں حضور کے مخالفین میں پیش پیش رہا کرتا تھا۔ مسلمان اس دفعہ اس کارواں کو کپڑے میں ناکام رہے۔

امید یہ تھی کہ یہ کارواں جنوری ۶۲۲ء میں دمشق سے واپس ہو گا۔ آنحضرت نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کارواں کو پکڑ کر رہیں گے۔ اس کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا وہ اپنی نوعیت سے بہت ہی اہم تھا۔ سارے مکہ کی سالانہ آمدنی کا ایک بیشتر حصہ اس کارواں کے قبضے میں تھا۔ گو مکہ کے امیر تاجروں کا حصہ اس کارواں میں زیادہ تھا۔ لیکن مکہ کے عام لوگ بھی کچھ نہ کچھ سامان اس کارواں کے حوالے کرتے تھے تاکہ اس کی فروخت سے ان کو فائدہ ہو اور اس آمدنی سے ان کا سال بھر کا خرچ چلتا رہے اگر مسلمان اس سالانہ کارواں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو سارے مکہ کی سال بھر کی دولت راتوں رات ان کے قبضے میں آجاتی اور دولت پر قبضہ جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کا ایک بڑا سبب بن جاتا۔

نا تجربہ کاری کی وجہ سے مسلمان اپنے اس منصوبے کو راز میں نہ رکھ سکے کسی طریقہ

سے اس منسوب کی اطلاع البوسنیان کو ہو گئی۔ البوسنیان اس وقت زرہ میں تھا۔ زرہ شام سے جنوب کی طرف تقریباً سو میل دور ہے۔ یہ مقام آج کل اردن کی سلطنت کا ایک حصہ ہے۔ اس اطلاع کے ملتے اسی البوسنیان نے ایک تیز اونٹنی سوار کو فوراً کہ روانہ کیا۔ قریش کو کہلا بھیجا کہ کاروان کی مدد اور حفاظت کے لیے ایک مسلح دستہ فوری روانہ کیا جائے جو اس کاروان کو بحفاظت تمام شام سے مدینہ کے راستے مکہ لے جائے۔

۸۔ مارچ ۶۲۴ء کو آنحضرتؐ تین سو تیرہ مسلمانوں کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔

ان ۳۱۴ میں ۸۳ مہاجرین تھے اور ۲۳۱ انصار، مسلمانوں کی غربت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۳۱۴ آدمیوں کے لیے صرف ۷۰ اونٹ اور دو گھوڑے تھے۔ تین تین چار چار آدمی باری باری سے اونٹ پر سوار ہوا کرتے تھے۔ حضورؐ نے حضرت علیؑ اور حضرت زید بن حارثہؓ کو اپنا ساتھی بنایا تھا۔ ان تینوں حضرات کا ایک ہی اونٹ تھا۔ صحابہ عرب میں اس قسم کی بے سروسامانی مسلمانوں کے لیے ایک کڑا امتحان تھی۔

اس دفعہ مسلمانوں کو مدینہ سے صرف ۸ میل ہی دور جانا پڑا۔

ادھر البوسنیان کا قاصد تیزی سے مکہ پہنچ گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ جیسے ہی وہ مکہ پہنچا اپنے اونٹ کو لے کر سیدھے کعبہ کی دیواروں تک پہنچ گیا۔ اونٹ پر کھڑے ہو کر اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ جو اس باختگی میں زور زور سے چلانے لگا کہ اے قریش کاروان، کاروان۔ محمدؐ اور ان کے ساتھی تمہاری دولت کو جو تم نے البوسنیان کے قبضے میں دے رکھی ہے لوٹنے کے لیے ایک جگہ جمع ہوئے ہیں۔ تم وقت پر البوسنیان کی مدد نہیں کر سکو گے۔ مدد۔ المدد۔

اس کے اس اعلان نے عربوں پر ایک دھماکے جیسا اثر کیا۔ لوگ دایم، بائیں آگے پیچھے دوڑنے لگے۔ ہتھیاروں کو اکٹھا کرنے لگے۔ ایک آدمی نے جو خاموشی سے بیٹھ کھڑا تھا اور بعض مجبور یوں کی وجہ سے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے خود نہ جاسکتا تھا دوسرے

آدمی کو اہرت دے کر اپنا قائم مقام بنا کر لڑنے کے لیے روانہ کیا۔
 حضور کے جانی دشمن اور رشتہ میں چچا ابو لہب نے بھی اہرت دے کر کسی اور کو اور بنیائے
 کی مدد کے لیے روانہ کیا۔

امیہ بن خلف بڑھا بھی تھا اور موٹا بھی۔ گھوڑے یا اونٹ پر اپنی فریبی کی وجہ سے
 سوار نہ ہو سکتا تھا۔ اس ہنگامہ کے دوران شہر کے چور اسے پراطمینان سے بیٹھا ہوا تھا
 اس کو اس اطمینان سے بیٹھا دیکھ کر مکہ کے ایک دوسرے آدمی نے اسے عطر پیش کیا اور
 کہا کہ اپنے آپ کو معطر کر لو اور عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھ کر سولہ سنگھار کرتے رہو۔ بڑھے
 کی حمیت جوش میں آئی۔ اس نے اپنے آپ کو لڑنے والوں کی حمایت میں مرنے کے
 لیے شامل کر لیا۔

آنحضرت مدینہ سے باہر نکل گئے۔ جنگ کا علم مصعب بن عمیر اٹھائے ہوئے تھے
 وہ تمام لوگوں کے آگے آگے چل رہے تھے۔ یہ اسلام کا پہلا علم تھا۔ مصعب بن عمیر اسلام
 کے پہلے علمبردار ہیں۔

حضور کے بالکل آگے دو کالے جھنڈے تھے۔ ایک علی بن ابی طالب تھا مے ہوئے
 تھے اور دوسرا جندہ کسی انصاری کے ہاتھ میں تھا۔ مسلمانوں کا نشانہ یہ تھا کہ کارواں والوں
 کو پریشان اور خوف زدہ کریں۔ قریش کا کارواں بدر کے مقام پر اپنے اونٹوں کو پانی
 پلانے میں مصروف تھا۔ مسلمانوں نے دو مقامی قبیلوں کے آدمیوں کو کارواں تلاش کرنے
 کے لیے پہلے ہی سے روانہ کر دیا تھا۔

یہاں یہ بات پھر دہرائی جاتی ہے کہ مکہ اور مدینہ کے لوگ راستوں کی تلاش اور
 رہنمائی کے لیے بدویوں کو استعمال کرتے تھے اور معاوضے پر ان کی خدمات حاصل
 کر لیتے تھے۔

ان دونوں بدویوں نے کنویں کے قریب اپنے اپنے اونٹوں پر سے پانی کی مشکیں

نکالیں تاکہ ان میں پانی بھر لیں۔ کنویں پر دو مقامی لڑکیاں بھی پانی بھر رہی تھیں۔ ان کے علاوہ جہینہ کا ایک آدمی بھی اسی کام میں مشغول تھا۔ دونوں بدوی جب اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے تو انہوں نے ان دونوں لڑکیوں کو آپس میں بات کرتے سنا کہ قریش کا کاروان پانی لینے کے لیے کل پھر اس کنویں پر آئے گا۔ جیسے ہی بدویوں نے لڑکیوں کی اس بات کو سنا فوراً حضورؐ کی خدمت میں واپس ہوئے اور اس خبر کو گوش گزار کر دیا۔

شمال کی طرف سے کاروان پانی کے لیے اس کنویں پر پہنچ رہا تھا۔ ابوسفیان بڑا پریشان تھا۔ اس کو یقین تھا کہ مسلمانوں کو کاروان پر حملہ کرنا ہی ہے تو ان کے لیے بدر کے کنویں سے بہتر اور کوئی مقام نہیں ہو سکتا۔ اس کو ابھی تک مکہ سے ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی کہ اس کی بدر کے لیے لوگ ابھی رہے ہیں یا نہیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود ہی تنہا بدر کے کنویں تک جائے۔ جب وہ بدر پہنچا تو اس کو جہینہ کا وہی آدمی نظر آیا جو اس وقت بھی وہاں تھا جب کہ مسلمانوں کے روانہ کر رہے دو بدوی کنویں پر پانی لینے گئے تھے۔ ابوسفیان نے بدوی سے دریافت کیا کہ تم نے یہاں کسی اور کو بھی دیکھا ہے یا بدوی نے جواب دیا کسی خاص آدمی کو نہیں۔ البتہ یوں ہی دو اونٹ سوار کچھ دیر پہلے یہاں آکر پانی کے ٹکیڑے بھر کر واپس ہوئے ہیں۔

ابوسفیان ان دونوں اونٹ سواروں کے اونٹوں کے پیر کے نشان جدمر جدمر پڑے تھے ان کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جب اس نے اونٹوں کی منگنیاں دیکھیں تو اسے اپنے ہاتھ میں اٹھا کر ملنے لگا اسے اس میں کھجوروں کے بیج ملے جسے اونٹ ہضم نہیں کر سکتے تھے۔

بدویوں میں آج بھی یہ طریقہ ہے کہ اونٹ کے فضلہ کو دیکھ کر وہ پہچان لیتے ہیں کہ اونٹ کی قسم کیا ہے اور کہاں کا ہے۔ بدویوں کے ساتھ رہنے والے اونٹ لگھاں پات پر اپنی گزر کرتے ہیں۔ شہر میں رہنے والے اونٹوں کو کھجور کھلاتے جاتے ہیں جب

فصلہ میں سے کھجور کے بیج نکل آئے تو ابو سفیان سمجھ گیا کہ اونٹ بدویوں کے نہیں ہو سکتے اونٹ یقیناً مدینہ کے ہیں۔ اونٹ سوار بدوی نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کے خبر رساں ہیں۔

جلدی سے اپنے اونٹ پر سوار ہو کر اونٹ کو ایسا سرپٹ دوڑایا کہ سیدھے اپنے کاروان پر پہنچ کر ہی دم لیا۔ مغرب کی طرف سے سمندر کے ساحل سے ہوتے ہوئے بغیر کہیں رُکے ہوئے اپنے اونٹ کو دوڑاتا رہا۔ رات بھر اپنے سفر کو جاری رکھا مسلمان مشرق کی طرف سے آگے بڑھ رہے تھے۔ مقام صغرا سے گزرنے کے بعد حضور نے اپنی جماعت کو رُک جانے کا حکم دیا۔ یہاں پر مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ قریش کے لوگ کاروان کی حفاظت اور اس کو اپنی نگرانی میں لے جانے کے ارادے سے مکہ سے نکل چکے ہیں۔ آپ کو ابو سفیان کی نقل و حرکت کی اطلاع نہ مل سکی۔ تمام مسلمانوں کو اکٹھا کر کے صورت حال پر روشنی ڈالی۔ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور مہاجرین نے با اتفاق اپنی خدمات پیش کیں اور کہا کہ حضورؐ جو بھی فیصلہ کریں وہ فیصلہ ان تمام کے لیے قابل قبول ہو گا اور ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ انصار کے متعلق حضورؐ کو تشویش تھی۔ عقبہ کی دوسری بعثت کی رو سے انصار صرف اسی صورت میں دوسروں سے لڑ سکتے تھے۔ جب کہ لڑائی مدافعت کے لیے ہو۔ یہاں پر حضورؐ کو تشویش اس لیے تھی کہ انصار نے اس سے پہلے کبھی یہ معاہدہ نہیں کیا تھا کہ وہ حملہ آور کی حیثیت سے قریش کے کاروان پر قبضہ کریں گے۔ کاروان والوں سے مدینہ سے آتی میل دور جا کر لڑیں گے۔

انصار سے حضورؐ مخاطب ہوئے۔ اس سلسلے میں ان کی رائے مانگی۔ ایک انصاری حضرت سعد ابن معاذؓ (جو بنی اوس کے سردار تھے) نے بڑے ہی جوش و خروش سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول۔ آپ پر ہمارا ایمان ہے۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے ہمیں حق سے روشناس کروایا۔ ہم آپ سے آپ کی اطاعت کا عہد کر چکے ہیں۔ آپ اگر سمندر

میں چھلانگ لگائیں تو ہم بھی آپ کی پیروی میں کود پڑیں گے۔ ہم آپ کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے ہر طرح سے تیار ہیں۔

دینیکے لوگوں سے اس قسم کی ہمت افزاء اور اطاعت گزاری کی بات سن کر حضورؐ کو یک گونہ اطمینان ہوا۔ جو اباً فرمایا کہ مردانہ وار آگے بڑھو، اللہ کا وعدہ ہے کہ دو جماعتوں میں سے ایک ضرور ہمارے ہاتھ لگے گی اس کے بعد مسلمانوں کی جماعت اور آگے بڑھی۔ چھ سات میل دور جانے کے بعد بدر کے چشموں کے قریب ان لوگوں نے اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔ دوسری دو جماعتیں یعنی کاروان اور مکہ کے قریش بھی اسی طرف رواں دواں تھے۔ ان تینوں جماعتوں میں سے کسی بھی جماعت کو ایک دوسرے کی نقل و حرکت کا علم بالکل نہیں تھا۔

اندھیرا ہو جانے کے بعد جاسوسی کے لیے ایک مختصر سی جماعت بدر کے کنوؤں کی طرف روانہ کی گئی۔ اس جماعت نے چند اونٹ سواروں کو کنوئیں سے پانی لیتا ہوا پایا۔ مسلمانوں کی اس جماعت نے دواونٹ سواروں کو گرفتار کیا اور انہیں حضورؐ کی خدمت میں لے گئے تاکہ ان سے پوچھ گچھ کی جاسکے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کا تعلق اسی جماعت سے ہے جو کاروان کی حفاظت کے لیے مکہ سے روانہ ہوئی تھی۔ یہ لوگ بدر کے جنوب میں دو یا تین میل دور اپنا پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے تفتیش کے دوران مزید اس بات کا انکشاف ہوا کہ مکہ سے آئے ہوئے لوگوں کی تعداد ایک ہزار آدمیوں پر مشتمل ہے۔ قریش کے تمام بڑے سردار اس میں شامل ہیں۔ یہ فیصلہ مسلمانوں کے لیے حوصلہ شکن ثابت ہوئی۔ وہ تو یہ خیال کر رہے تھے کہ کاروان پر رات قبضہ کر کے بے انتہا دولت کے مالک ہو جائیں گے اور ان کو کاروان کے صرف تیس یا چالیس آدمیوں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔

جیسے ہی ابوسفیان نے اپنے آپ کو خطرے سے باہر پایا اس نے اپنا قاصد قریش

کے ہاں روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ وہ معاہدے اپنے کاروان کے بمقاومت تمام بدر سے آگے بڑھ چکا ہے۔ جب قریش کو ابوسفیان کی یہ رپورٹ ملی تو اکابرین قریش میں پھر اختلاف ہو گیا اور دو نقاط نظر پیش کیے گئے۔

قبائلیت ان لوگوں کو لڑنے سے روک رہی تھی اس لیے کہ انہی قبائل کے اکثر لوگ ہاجرین میں شامل تھے۔ وہ اپنے ہی قبیلے کے افراد کی قتل و غارت گری نہیں چاہتے تھے۔ ہاجرین مکہ کے بت پرست قبیلوں ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ بت پرست اپنے ہی خاندان کے مسلم افراد کا خون نہیں بہانا چاہتے تھے۔

حضور کی والدہ محترمہ جس قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں یعنی بنی زہرہ وہ سارے کا سارا قبیلہ مکہ واپس ہو گیا۔ ابو طالب کے سب سے بڑے لڑکے طالب بھی بنی ہاشم کے لوگوں کو لے کر مکہ چلے گئے۔ مگر بنی خطاب کے رشتہ دار بنی عدی ابن کعب بھی مکہ چلے گئے۔ ربیعہ کے بیٹے عتبہ اور شیبہ دونوں قریش کے بڑے سرداروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ یہ مکہ کے معزین اور قابل اعتماد شہریوں میں تھے۔ عتبہ نے قتل و غارت گری اور لڑائی کی مخالفت اس خیال سے کی کہ اپنے ہی قبیلے کے لوگ مارے جائیں گے چاہے وہ قریش کے بت پرست ہوں یا مسلمان۔

یہاں یہ بات ذہن میں تازہ کی جائے کہ عبد اللہ بن حضرمی جس کی حفاظت کا عتبہ نے ذمہ لیا تھا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں نخلہ میں قتل ہوا تھا۔ عبد اللہ کا بھائی عامر حضرمی عتبہ کو طعنہ دے رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اسے جوش دلاد رہا تھا کہ عتبہ اس کے بھائی کے قتل کا بدلہ اور مسلمانوں سے لڑے۔

حضور کا جانی دشمن ابو جہل بڑا ہی کڑیل، صحت مند اور توانا آدمی تھا لڑائی پر شہرت سے مصر تھا۔ اس کا شدید اصرار تھا کہ مسلمانوں سے بہر حال جنگ کی جائے۔ اس کے اصرار اور صند نے قریش کو اس بات پر راضی کر لیا کہ مسلمانوں سے جنگ کی

جائے۔ یہ لوگ جنگ کے ارادے سے ہمد کی طرف بڑھنے لگے۔

جہاں قریش کے لوگوں میں اپنے خون، قبیلہ اور خاندان کا پاس و لحاظ تھا اور اسی بنا پر وہ مسلمانوں سے رونا پند نہیں کر رہے تھے وہیں مسلمانوں کے نزدیک خون، قبیلے اور خاندان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔

بنیادی طور پر آنحضرتؐ نے قبائلی وفاداری کے تصور کو سر سے ختم ہی کر دیا تھا۔ ان تمام پرانی وفاداریوں کی جگہ ایک نئی وفاداری کا تصور پیش کیا اور وہ وفاداری تھی اسلام سے۔ اپنے آپ کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے وقف کر دینا اب وفاداری کا تعناض تھا۔ اس نئے تصور کو جو شیخے مسلم نوجوانوں نے صدقِ دل سے قبول کیا تھا۔

مسلمانوں کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ جب سے انہوں نے وطن چھوڑا غربت و ناداری ان کا پیچھا کرتی رہی۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جن کے بیوی بچے ابھی تک مکہ میں زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ اپنے خاندان کے افراد کو مکہ میں چھوڑنے پر یہ لوگ مجبور ہو گئے تھے۔ سوائے تلوار کے اب دنیا میں ان کے لیے کوئی اور کشت باقی نہیں رہی تھی۔ مال و دولت، جائداد اور اثاثہ، بیوی بچے سب کچھ ان سے چھین چکے تھے۔ ان کو ان تمام مظالم کا بدلہ لینا تھا۔

مسلمان آگے بڑھ کے کنوؤں کے شمال مشرق میں جا کر رک گئے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ مسلمان حضورؐ کے احکام و وحی میں اور حضورؐ کی ذاتی رائے میں کافی فرق کرتے تھے۔ وحی کے احکام کی تعمیل کو فرض سمجھتے تھے اور حضورؐ کی ذاتی رائے سن کر مشورہ دیتے اور سب کے مشورہ سے کسی بھی کام کی تکمیل ہوتی تھی۔

حضورؐ نے مسلمانوں کو جب اُس جگہ رک جانے کا مشورہ دیا تو جناب ابن مندہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کیا اللہ نے آپ کو اس جگہ رک جانے

کا حکم دیا ہے یا یہ آپ کا اپنا فیصلہ ہے اس لیے کہ اس جگہ سے فتح کی صورت میں نہ ہم آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ ہی شکست کی صورت میں پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔

جب حضور نے فرمایا کہ یہاں ٹھہرنے کا فیصلہ میرا اپنا ہے تو حباب ابن منذر نے مشورہ دیا کہ مسلمانوں کو اور آگے بڑھنا چاہیے اور آگے بڑھ کر کنوؤں پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ اس صورت میں دشمنوں کو پانی کے استعمال سے روکا جاسکتا ہے جب کہ مسلمان اپنی ضروریات کے لیے جتنا پانی چاہیں استعمال میں لاسکتے ہیں۔

حضور نے حباب ابن منذر کے اس مشورہ کو قبول فرمایا۔ مسلمانوں نے آپ کے لیے ایک چھوٹا سا سائبان تیار کیا جس پر کھجور کے پتے ڈال دیئے اس سائبان کے عقب میں آپ کا اونٹ باندھ دیا گیا۔

حضرت سعد ابن معاذ نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر تم لوگوں کو اس میدان میں شکست ہو تو اپنے اونٹوں پر سوار ہو کر مدینہ کا رخ کر سکتے ہو۔ اسی لمحہ مسلمانوں نے دیکھا کہ قریش کا لشکر پہاڑی پر سے نیچے اتر رہا ہے اور کنوؤں کی طرف بڑھ رہا ہے۔

۱۵ مارچ ۶۲۴ء سورج ابھی طلوع ہی ہو رہا تھا کہ حضور نے دیکھا کہ دشمن کا لشکر آگے بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ آپ نے جذباتی انداز میں فرمایا کہ اے اللہ قریش کے لوگ بڑے ہی غرور و بکتر اور شان و شوکت کے ساتھ تجھ سے لڑنے یہاں آئے ہیں اور تیرے رسول اور پیغمبر کو جھٹلانا چاہتے ہیں۔ میرے اللہ اپنے وعدہ کے مطابق میری مدد فرما۔ ان کو آج کے آج تباہ و برباد کر دے۔“

اب مسلمان اور کافر آمنے سامنے تھے۔ عربوں کی لڑائی کی رسم کے مطابق ایک آدمی دوسرے کو پکارتا تھا اور دو بہادروں کے درمیان لڑائی ہوتی تھی۔ حضور نے مسلمانوں کی صفیں بیدھی کیں۔ مسلمانوں کا رخ مغرب کی طرف رکھا۔ سورج

جو ابھی طلوع ہو رہا تھا مسلمانوں کی پشت پر تھا۔ سورج کی تیز شعاعوں سے کافروں کی آنکھیں چندھیار ہی تھیں۔ یہ جب آگے بڑھ رہے تھے تو ان کا رخ سورج کی طرف تھا۔

ساتویں صدی کے عربوں کے لیے یہ بات انتہا رکاب باعث تھی کہ ان کا کمانڈر اپنے مخالف فوج کے کمانڈر کو لڑنے کی دعوت دے۔ اس کام کے لیے قریش کا سپہ سالار عقبہ جو بذاتِ خود لڑائی کے خلاف تھا آگے بڑھتا ہے اس کی یہی طرف اس کا بھائی شیبہ اور بایں طرف اس کا بیٹا ولید ہیں۔ یہ تینوں لاکار کر مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے ہی سے تین آدمیوں کو لڑنے کے لیے میدان میں بھجوائیں۔ انصار میں سے تین حضرات اس لاکار کے جواب میں آگے بڑھتے ہیں۔ قریش ان سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کون ہیں؟

جب انصار اپنا تعارف کر دیتے ہیں تو عقبہ جواب دیتا ہے کہ تم تو سادہ لوح اور شریف لوگ ہو۔ ہم اپنے آدمیوں یعنی ہاجرین سے لڑنا چاہتے ہیں۔ پھر چیخ کر کہتے ہیں کہ محمدؐ ہم سے لڑنے کے لیے ہماری برابری کے اور ہمارے اپنے قبیلے کے لوگوں کو آگے کرو۔

حضورؐ اپنے چچا حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ ابن ابی طالب اور حضرت عبیدہؓ ابن

حارث کو طلب کرتے ہیں۔ عبیدہؓ ایک ادھیڑ عمر کے مسلمان تھے۔ حضرت علیؓ حضورؐ کے داماد یعنی سیدہ فاطمہؓ کے شوہر ہیں۔

عبیدہؓ عقبہ سے لڑنے لگے۔ دونوں کی تلواریں خوب خوب چلتی رہیں۔ حضرت حمزہؓ

اور حضرت علیؓ تلوار چلانے میں اپنی مثال آپ تھے۔ حضرت حمزہؓ نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے حریف شیبہ کو قتل کر دیا۔ علیؓ ابن ابی طالب کی تلوار نے ولید کا کام تمام کر دیا۔

عبیدہؓ سخت زخمی حضورؐ کی خدمت میں لائے گئے۔ عبیدہؓ نے سوال کیا: اے اللہ

کے رسول! کیا میں شہید نہیں ہوں؟ حضورؐ نے جواب دیا: بے شک تم شہیدوں میں

ہو۔ حضورؐ کا یہ کہنا تھا کہ عیدہ کے چہرہ پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ان کی روح قفسِ عنصری سے عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔

قریش کے سرداروں کا خاتمہ اب ان کی پست ہمتی، اخلاقی انحطاط اور زوال کا باعث بن رہا تھا۔ حضورؐ نے یہ فرمادیا تھا کہ اللہ مسلمانوں کی طرف سے خود لڑ رہا تھا۔ مکہ کے بہت سے لوگ خوف زدہ ہو رہے تھے کہ ان کے مخالفین یعنی مسلمانوں کو ایک غیبی طاقت اور آن دیکھی مدد حاصل ہے، حضورؐ حضرت ابو بکرؓ کو ساتھ لیے اپنے ساتھیان کی طرف لوٹے۔ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ پروردگار اگر آج یہ تیرے جانثار وفادار اور نام لیوا بندوں کا خاتمہ ہو جاتے تو اس دنیا میں تیرا نام لینے والا پھر کوئی نہیں رہے گا۔ حضرت ابو بکرؓ تھوڑی دیر خاموش رہے پھر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول۔ آپ کی بار بار کی التجا میں شاید اللہ کو ناگوار گزریں۔ اللہ تو آپ کی مدد کا وعدہ فرما چکا ہے۔ حضورؐ اپنے ساتھیان سے پھر میدان کی طرف گئے۔ مسلمانوں سے فرمایا کہ آج کے دن اللہ کی راہ میں جو بھی مارا جائیگا سیدھا جنت میں جائیگا۔ ایک جوان آدمی نے جو حضورؐ کے قریب کھڑا کھجور کھا رہا تھا، سوال کیا کہ میرے اور جنت کے درمیان صرف موت ہی حائل ہے؟ وہ موت جو کافروں کے ہاتھوں واقع ہو۔ حضورؐ نے فرمایا

”ہاں“

کھاتے ہوئے کھجور کو پھینک کر اس نے جوان نے تلوار نیام سے نکالی اوریدھے میدانِ جنگ کا رخ کیا اور شہید ہونے تک لڑتا رہا۔

اب لڑائی میں شدت آچکی تھی۔ سارا میدان تلواروں سے چمک رہا تھا۔ قبیلوں کے لوگوں کو باقاعدہ جنگ کرنا کہاں آتا تھا؟ جنگ کے فن سے وہ کہاں واقف تھے؟ قریش کے لوگوں کو کافی ہزیمتیں اٹھانی پڑ رہی تھیں۔ ان کے اختیار کردہ موقف نے ان کو کئی طریقوں سے جگہ جگہ نقصان پہنچایا۔ کافروں کو مسلمانوں تک آنے کے لیے ریت

میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ ریتیلی زمین نابھواری تھی۔ مسلمان ہموار اور سخت زمین پر کھڑے ہوتے تھے۔ جب کافر اپنی صفوں کو ترتیب دے رہے تھے تو ہوا کے جھونکے چلنے شروع ہوتے کہ کافروں کی آنکھوں میں ریت اڑا کر گرے لگی۔

حضرت نے فرمایا: ”بہر تیل ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ کافروں پر ٹوٹ پڑے ہیں“ اچانک آپ نے مٹھی بھر ریت اٹھائی اور دشمنوں کی طرف پھینکتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ دشمن پر اگندہ ہو جائیں۔

کچھ دیر لڑائی ایسے ہوتی رہی جس میں پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ کون جیت رہا ہے اور کون ہار رہا ہے۔ اب قریش پیچھے ہٹنے لگے۔ مسلمان آگے کی طرف تھے۔ اچانک دشمنوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا جس کو جو راستہ فرار کا ملتا تھا اختیار کر رہا تھا۔ جنگ کا میدان چھوڑ کر سارے کافر فرار ہو گئے۔

اندازہ کے مطابق قریش کے ۴۹ اور سرد آدمیوں کے درمیان لوگ مارے گئے اسی تعداد کے لگ بھگ گرفتار بھی ہوئے۔ مسلمانوں میں سے ۱۲ آدمی شہید ہوئے قریش کے جن لوگوں کی موت واقع ہوئی ان میں بنی مخزوم کا سردار ابو جہل بھی تھا۔ یہی وہ ابو جہل تھا جو حضورؐ کا سخت ترین دشمن تھا۔ آپ نے اپنے خادم کو ابو جہل کی نعش تلاش کرنے کے لیے میدان میں روانہ کیا۔ جب خادم نے ابو جہل کی نعش کا پتہ چلا لیا تو اس کا سر اس کے جسم سے جدا کر کے آپ کی خدمت میں لے آیا اور ابو جہل کے سر کو حضورؐ کے قدموں میں ڈال دیا۔ آپ پر رقت طاری ہو گئی۔ فرمایا ”اللہ کے دشمن کا سر؟ ساری تعریف اللہ ہی کو سزاوار ہے، کوئی معبود نہیں سولتے اللہ کے“

آپ نے مسلمانوں کو تاکید کہا کہ قریش کے ایک سردار ابو لہب خزیمی، کو کوئی قتل نہ کرے، ان کو کسی بھی قسم کا نقصان نہ پہنچاتے، گو وہ بت پرست تھا لیکن مکہ میں ہمیشہ وہ ان لوگوں کو روکا کرتا تھا جو حضورؐ کو اذیت اور نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ ایک

قیدی کی حیثیت سے لاتے گئے۔ ان کے ساتھ ان ہی کے اونٹ پر ایک اور صاحب سوار تھے جن کا نام جنادہ تھا۔ جب مسلمانوں نے انہیں گرفتار کیا تو ان سے کہا کہ حضور کا حکم ہے کہ انہیں قتل نہ کیا جائے۔ ابوالنجرئی نے کہا کہ میرے ہم سفر جنادہ کے متعلق کیا حکم ہوا ہے۔ جواب دیا گیا کہ ہم تو انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ صرف آپ کی جان بخشی کا حکم دیا ہے۔ یہ سن کر اس بوڑھے ابوالنجرئی نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو میں بھی جنادہ کے ساتھ مرجاؤں گا۔ مکہ کی عورتیں یہ طعنہ نہیں دیں گی کہ میں نے اپنے آپ کو تو زندہ رکھا اور اپنے دوست کی جان کی سلامتی کو بھول گیا۔

بوڑھے اور موٹے امیہ ابن خلف جن کو مکہ کے بازار میں عطر پیش کیا گیا تھا اب حضرت عبدالرحمن بن عوف کے قیدی بنے ہوئے تھے۔ حضرت عبدالرحمن اور امیہ بچپن کے دوست تھے۔ ان دو دوستوں کو اسلام نے جدا کر دیا تھا۔ عبدالرحمن کو امیہ نے اپنی تلوار پیش کی جس کو حضرت عبدالرحمن نے قبول کر لیا۔ وہ اب امیہ کو حضور کی خدمت میں لے جا رہے تھے۔ جب یہ دونوں راستہ میں تھے حضرت بلالؓ سے ان کی ڈبھیٹ ہو گئی۔ حضرت بلالؓ امیہ کے غلام رہ چکے تھے۔ حضرت بلالؓ نے جب اسلام قبول کیا تھا امیہ ان کو دھوپ میں باندھ کر وحشیانہ سزائیں دیا کرتا تھا۔ جیسے ہی حضرت بلالؓ نے اپنے پرانے آقا کو دیکھا فوری اس کی طرف لپکے اور کہنے لگے اے ناہنجار خدا کے دشمن۔ امیہ ابن خلف۔ اگر تو زندہ رہا تو میں زندہ نہیں رہوں گا۔ یہ دیکھ کر حضرت عبدالرحمنؓ ابن عوف نے احتجاج کیا۔ عبدالرحمنؓ نے کہا کہ امیہ تو اب میرا قیدی ہے۔ اس نے میرے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں میں نے اسے پناہ دے دی ہے۔ وہ اب میری حفاظت میں ہے۔

حضرت بلالؓ نے اس کے باوجود اپنا غصہ جاری رکھا۔ مسلسل کہتے جاتے تھے اے ناہنجار۔ اے خدا کے دشمن۔ لوگوں کو پکار کر کہتے لگے کہ اے خدا کی مدد کرنے والو۔

بہت سے لوگ ان کی پکار پر جمع ہو گئے۔ سارے مجمع نے امیہ ابن خلف کی تکہ بولی کر کر ڈالی۔ عبدالرحمن ابن عوف منہ تکتے رہ گئے۔

اس موقع پر اس قسم کے کئی واقعات ہوئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عرب جیب کسی کو پناہ دے دیتے ہیں اور حفاظت کا ذمہ لے لیتے تھے تو کس طرح اپنے فرمن کو بہادری سے پورا کرتے تھے۔ یہ اور اسی قسم کی روایات اس وقت سے لے کر آج تک کے بدوی عربوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان سارے چودہ سو سالوں میں عربوں نے اپنی روایات کو باقی رکھنے کی کوشش کی۔ روایات سے انحراف صرف جنگ یا استثنائی صورتوں میں ہوا اور وہ بھی مذہبی بنیادوں پر۔ جب کبھی مذہبی رقابتیں وجود میں آئیں عربوں نے اپنی صدیوں سالہ پرانی روایات کو بالائے طاق رکھ دیا۔ مذہبی جوش اور اسلامی غیرت نے جہالت کی رسموں پر فتح پائی۔ اللہ اور اس کے احکام کی تعمیل نے اولیت اختیار کی۔ امیہ ابن خلف خدا کا دشمن تھا اور مسلمان خدا کے دشمن کی کیا پرواہ کرتے تھے۔

آنحضرت نے حکم دیا کہ ایک بڑا گڑھا کھودا جائے۔ سارے مقتول مشرکین کی لاشیں اس گڑھے میں ڈال دی جائیں۔

جب قریش کے ایک معزز اور بااثر سربراہ عقبہ کی لاش گڑھے میں ڈالی جا رہی تھی تو عقبہ کا بیٹا جو مسلمان ہو چکا تھا اور حضور کے ساتھ ہاجرین میں شامل تھا۔ حضور کے بازو کھڑا اپنے باپ کا یہ حشر دیکھ کر کچھ منگوم سا ہو گیا۔ حضور نے اُن سے سوال کیا: کیا تمہیں اپنے باپ کے مرنے کا غم ہے؟ عقبہ کے مسلمان بیٹے نے جواب دیا: میں جانتا ہوں کہ میرا باپ عقلمند، شائستہ اور کئی خوبیوں کا مالک تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ایک نہ ایک دن ضرور مسلمان ہو جائے گا۔ مجھے غم تو اس بات کا ہے کہ اس کی موت مشرکین کے ساتھ حالت کفر میں ہوئی۔

جب سارے مشرکین کی لاشوں کو گڑھے میں پھینک دیا گیا تو فرمایا کہ اے گڑھے

والو۔ تم کو اب تو یقین آ گیا ہو گا کہ خدا کا غضب تم پر نازل ہو کر رہا۔ میں نے جو پایا وہ یہ کہ میرے خدا نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہو کر رہا۔“

اس اثنا میں مسلمان مالِ غنیمت کی تقسیم پر آپس میں ٹکڑوں میں کر رہے تھے۔ جس کسی نے جس کسی کو مارا مقتول کے ہتھیار اور اس کے ذاتی اثاثہ پر اپنا حق جتا رہا تھا۔ جو لوگ رسول اللہ کی حفاظت کر رہے تھے کسی خاص مقتول کے ہتھیاروں یا اثاثوں پر اپنا حق جتا نہیں سکتے تھے۔ میدان جنگ میں جا کر لڑنے والوں سے یہ لوگ اپنا حق مانگ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر آپ نے حکم دیا کہ سارا مالِ غنیمت ایک جگہ جمع کیا جائے۔ سارے کا سارا مال تمام مسلمانوں میں یکساں اور مساوی طور پر تقسیم کیا جائے۔ آپ نے مالِ غنیمت کی تقسیم کے لیے جس طریقہ سے ابتداء کی اسی کا آگے چل کر مسلمانوں میں ڈاج ہو گیا۔

روانگی سے قبل قاصد مدینہ روانہ فرمائے تاکہ اہل مدینہ کو خوش خبری مل جائے پھر فتح مند فوج کو لے کر حضور مشرق کی جانب آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔ صغرا اور مدینہ کے درمیان اہل مدینہ کے وفد نے تمام مدینہ والوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں فتح کی مبارک باد پیش کی۔

اس قافلے میں وہ قیدی بھی تھا جس کا نام نصر ابن حارث تھا۔ یہ وہی بدبخت تھا جو مکہ میں ہند و نصائح کے دوران ایرانی عشق و محبت کی داستانیں بیان کر کے سوال کرتا تھا کہ کیا میری کہانیاں آپ کے قصوں سے زیادہ دلچسپ نہیں ہیں؟ جب آپ صغرا سے آگے بڑھے تو علی ابن ابی طالب کو حکم دیا کہ نصر کا سر قلم کر دیا جائے۔ اس بات کی کوئی توجیہ نہیں کہ مسلمانوں نے جنگ کے بعد سے اب تک نصر کو کیوں باقی رکھا۔ اُسے جنگ کے فوری بعد کیوں نہ قتل کر دیا گیا۔

ذرا اور آگے بڑھنے کے بعد آپ نے ایک اور کافر عقبہ ابن ابی معیط کے قتل کا حکم

دیا۔ وہ چلانے لگا کہ میرے بعد میرے اہل و عیال کا کیا ہوگا۔ ان کی دیکھ بجالا کون کرے گا۔ آپ نے اس کی ترکات کے پیش نظر سرد مہری سے جواب دیا جہنم کی آگ۔ قریش کے لیڈروں کا قتل اور مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی ذلت نے عام لوگوں میں ایک ٹھیب ذہنی ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ آپ کی بیوی حضرت سوڈہ سے ایک روایت منسوب ہے۔ آپ ہاجرین میں کسی کے گھر پر نہ دینے گئیں۔ اس گھر کے دو افراد جنگ میں کام لے چکے تھے۔ یہ اطلاع بی بی سوڈہ کو اس وقت ملی تھی جب کہ مسلمان فاتحین قیدیوں کو لے کر مدینہ پہنچ چکے تھے۔ ابن اسحاق کے بیان کے مطابق یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ پردہ کے احکام ابھی نہیں آئے تھے۔

حضرت سوڈہ پر سہ دسے کر گھر آجاتی ہیں اور حضور کو اپنے گھر میں پاتی ہیں دیکھتی کیا ہیں کہ ابو یزید سہیل ابن عمرو کے ہاتھوں کو ان کی گردن کے نیچے باندھ دیا گیا ہے اور وہ ایک کونے میں کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر بی بی سوڈہ کہتی ہیں کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری آنکھیں مجھے دھوکہ دے رہی ہیں۔ مجھے ان کی اس حالت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ ابو یزید تم نے بہت ہی آسانی سے اپنی شکست تسلیم کر لی۔ اس سے بہتر تو یہی تھا کہ تم بہادروں کی طرح مر گئے ہوتے۔

حضور نے جیسے ہی بی بی سوڈہ کے یہ الفاظ سنے ڈانٹ کر کہا کہ سوڈہ کیا تم اللہ اور اس کے رسول کے خلاف فتنہ بپا کرنے پر تلی ہوئی ہو۔

بی بی سوڈہ نے حضور سے کہا کہ خدا کی قسم میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں ابو یزید کو اس حالت میں دیکھوں گی۔ جب میں نے ان کو اس حالت میں دیکھا تو بے اختیار میری زبان سے وہ الفاظ نکل گئے جن کو ابھی آپ سن چکے ہیں۔

قرآن کے سورہ انفال میں جنگ بدر کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے (بے محمد مجاہدین) آپ سے غنیمت کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ غنیمت اللہ اور اس

کے رسول کا مال ہے۔ خدا سے ڈرو اور آپس میں صلح رکھو۔ اگر ایمان رکھتے ہو تو خدا اور اس کے رسول کے حکم پر چلو۔ جس طرح آپ کے پروردگار نے آپ کو تدبیر کے ساتھ اپنے گھر سے نکالا اس وقت مومنوں کی ایک جماعت ناخوش تھی۔ وہ لوگ حق بات میں اس کے ظاہر ہوتے بغیر آپ سے جھگڑنے لگے۔ گویا موت کی طرف دھکیلے جاتے ہیں اور اُسے دیکھ رہے ہیں۔ جب خدا نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک گروہ (مسخر) ہو جائے گا اور آپ چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے شوکت ہے وہ آپ کے ہاتھ آجائے۔ خدا چاہتا تھا کہ اپنے فرمان سے حق کو قائم رکھے۔ کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ جب آپ اپنے پروردگار سے فریاد کرتے تھے تو اس نے آپ کی دعا قبول کر لی۔ ہم ہزار فرشتوں سے جو ایک دوسرے کے پیچھے آتے جائیں گے آپ کی مدد کریں گے۔ اُس مدد کو خدا نے محض بشارت بنایا تھا کہ آپ کے دل اس سے اطمینان حاصل کریں۔ مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ بے شک خدا غالب اور حکمت والا ہے۔“

یادگار تاریخیں

| | |
|---------------------|--|
| جون ۱۹۲۲ء | آنحضرتؐ کا مدینہ تشریف لانا |
| جنوری ۱۹۲۳ء | حضرت حمزہؓ کی قیادت میں مسلمانوں کا پہلا حملہ |
| فروری ۱۹۲۲ء | ربیع میں مسلمانوں کا دھاوا |
| فروری ۱۹۲۳ء | اسلام کا پہلا تیر۔ سعد بن ابی وقاص کی کمان سے |
| جون ۱۹۲۳ء | بنی نضیر سے معاہدہ |
| جون سے اکتوبر ۱۹۲۳ء | مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے دھاوے |
| ستمبر ۱۹۲۳ء | قبیلہ مدینہ سے مسلمانوں کا معاہدہ |
| نومبر ۱۹۲۳ء | مسلمانوں کے ہاتھوں پہلا قتل |
| عبداللہ بن الحضرمی | پہلا کافر جو مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا |
| نومبر ۱۹۲۳ء | یہودی قبیلوں سے معاہدہ کا ٹوٹنا |
| ۱۹۲۳ء | بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ بنانا |
| ۱۹۲۴ء | ہفتہ کی بجائے جمعہ کو مسلمانوں کا اہم دن قرار دینا |
| جنوری ۱۹۲۳ء | رمضان میں روزہ رکھنے کی ابتداء کرنا |
| ۱۵ مارچ ۱۹۲۴ء | جنگ بدر |

جنگِ احد

بدر کی فتح نے مسلمانوں کے موقف کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ ان کے انداز فکر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اب وہ مستحکم اور مضبوط تھے۔ ان کے ذہنی ارتقا کا اندازہ کرنا آج ہمارے لیے بہت ہی مشکل ہے۔ بدر کی فتح نے ان میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ کل تک جو لوگ ظلم و ستم کا شکار بنے رہے اور دنیا کی نظر میں معتوب رہے۔ آج وہ اپنے آپ کو فاتحین میں پارہے تھے۔

آنحضرت کے سخت ترین دشمنوں میں سواتے ابوسفیان کے سب کے سب اس جنگ میں مارے گئے۔ وہی مکہ کے لوگ جو مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے اور جن کی زندگی کا مقصد ہی مسلمانوں کو ایذا دینا تھا آج اپنے آپ کو قہرِ مذلت میں پارہے تھے۔ ذلت و رسوائی کی شرم سے پانی پانی ہو رہے تھے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اگر مسلمان اس موقع پر فتح کے نشہ میں خوب مست رہے ہوں۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ فتح اور کامیابی کی سرشاری بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ کامیابی اور فتح مندی کے نشہ کی مثالیں آج بھی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھا کرتے ہیں۔

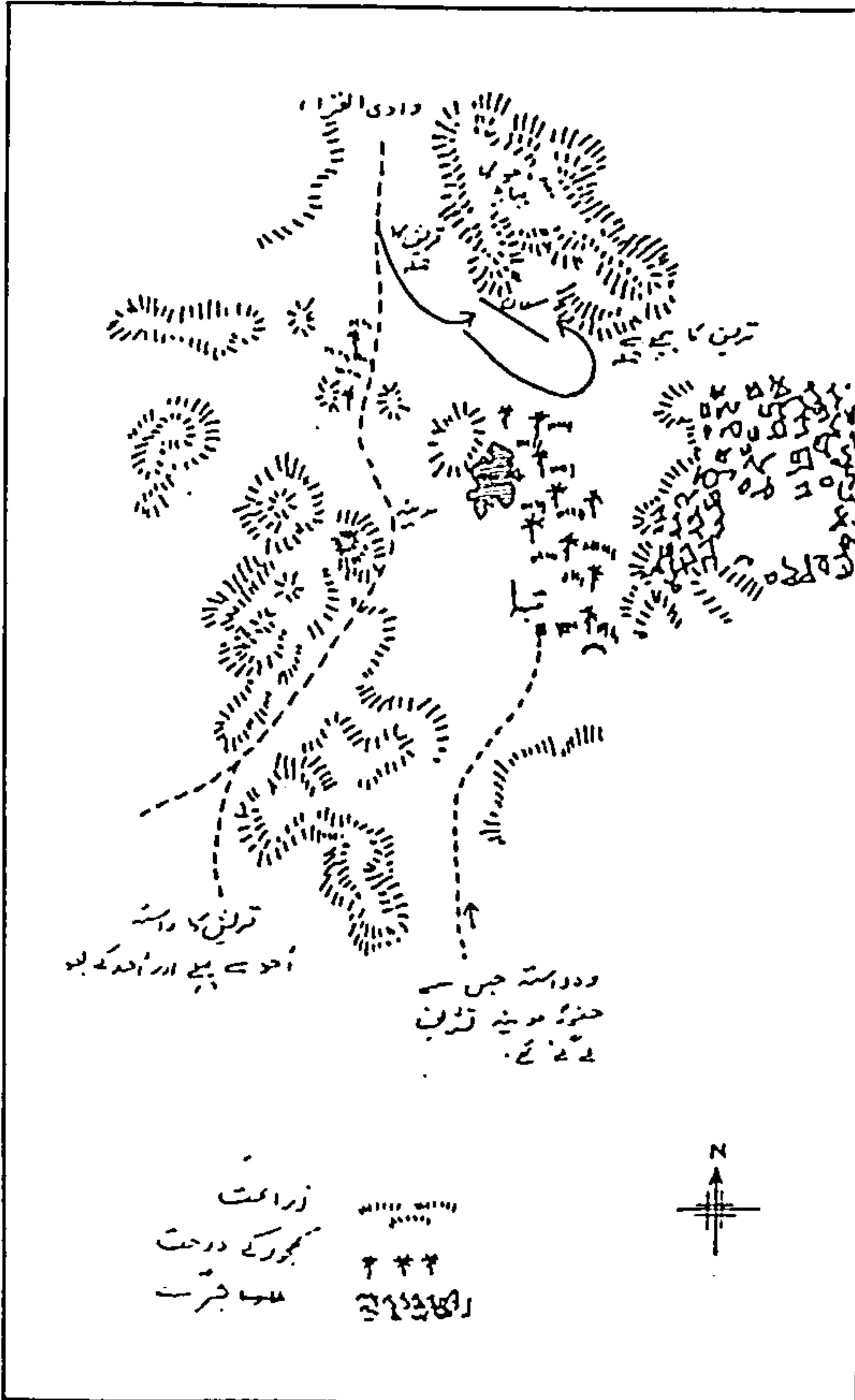
تعجب نہیں اگر حضور خود بھی اس فتح سے کافی خوش ہوتے ہوں۔ آپ بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان تھے۔ حضور نے کئی بار اپنی زبان مبارک سے اس بات کو کہا

ہے۔ جوں جوں وقت گزرنا گیا بعد کی ہونے والی جنگوں میں آپ نے رحم دلی اور حسن سلوک کا مظاہرہ کیا۔ بدر کے موقع پر حضورؐ کے ذہن میں وہ ساری باتیں تازہ تھیں جن کا اہل مکہ سے سابقہ پڑا تھا۔ اس کو حسن اتفاق کہتے کہ حضورؐ کا چچا ابو لہب جو بدترین دشمن تھا اور جو بدر کی لڑائی میں نہ جاسکا تھا جنگ بدر کے چند دنوں بعد ہی مکہ میں کسی بیماری کے باعث اس دنیا سے چل بسا۔

آپ کے ایک اور چچا عباس جو بدر میں مسلمانوں کے خلاف لڑ رہے تھے گرفتار کیے گئے۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ ان کو ان کے دو بھتیجوں کو اس وقت گرفتاری کی حالت میں رکھا جائے جب تک وہ ایک بڑی رقم اپنی جان کے بدلے مسلمانوں کو نہ دے دیں۔ اس حکم کو سن کر عباس نے کہا کہ میں تو مسلمان ہو گیا تھا مگر کم بخت مکہ کے لوگوں نے مجھے آپ کے خلاف لڑنے پر مجبور کیا۔ جو اب دیا کہ چچا آپ کے مسلمان ہونے کا خدا ہی کو علم ہے بظاہر تو آپ کافروں کے ساتھ مسلمانوں سے لڑ رہے تھے آپ کو فدیہ دینا ہو گا۔

جنگ کے قیدیوں میں آپ کے ایک داماد ابو العاص ابن الربیع بھی شامل تھے۔ ان کا نکاح حضورؐ کی صاحبزادی بی بی زینبؓ سے ہوا تھا، حضرت زینب ابھی مکہ ہی میں تھیں ابو العاص خدیجہ کے بھانجے بھی ہوتے تھے۔ بی بی خدیجہ ہی کی خواہش پر ان کا نکاح ابو العاص سے کیا تھا۔ حضورؐ کی بعثت سے قبل یہ شادی ہوئی تھی۔ بی بی زینبؓ نے رقم جمع کی اور اپنے شوہر کو آزاد کرنے کے لیے یہ رقم روانہ کی اسی کے ساتھ وہ ہار بھی روانہ کیا جو بی بی خدیجہؓ نے اپنی بیٹی کو شادی کے موقع پر تحفہ کے طور پر دیا تھا۔ جب حضورؐ نے وہ ہار دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ بی بی خدیجہ حضورؐ کو بے اختیار یاد آ گئیں۔ آپ نے مسلمانوں سے درخواست کی کہ بی بی زینبؓ کے شوہر کو بغیر فدیہ کے آزاد کر دیں اور یہ ماں کی نشانی بیٹی کو لوٹا دیں۔

یہ اور اسی قسم کے واقعات جو ہم تک پہنچے ہیں اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ



کس طرح خاندانوں کا بٹوارہ ہو گیا تھا۔ باپ مسلمان ہے تو بیٹا بت پرست، داماد مسلمان ہے تو خسر کا فر۔

ایک ہی خاندان کے مختلف افراد ایک دوسرے کے حریف اور ایک دوسرے کی جان کے پیاسے۔ اس دشمنی کا کھل کر مظاہرہ جنگِ بدر میں ہوا۔ مسلمانوں کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ کئی خاندانوں میں ایسا ہوا کہ ان کا سب سے کم عمر لڑکا مسلمان ہو گیا اور ماں باپ اپنے دوسرے بچوں کے ساتھ مکہ میں رہے۔

اسلام کا نشہ ان نوجوانوں پر ایسا طاری ہوا کہ خون اور رشتے کے بندھنوں کو انہوں نے سر سے توڑ ڈالا۔ مسلم نوجوان اپنے مشرک ماں باپ کو اسلام کی خاطر جان سے مار ڈالنے پر نہ صرف تیار ہونے لگے بلکہ اس خیال سے خوشی محسوس کرنے لگے۔

حضور کی تعلیمات کا یہ فیضان نہیں تو اور پھر کیا ہے کہ نوجوان مسلمان ایک انقلابی ذہنیت کے مالک ہو گئے۔ عربوں کی ساری معاشرتی زندگی کا دار و مدار ہی ان کی خاندانی شیرازہ بندی پر تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مقاطعہ کے دوران کس طرح بنی ہاشم حضور کے نگران بنے رہے حالانکہ بنی ہاشم کے اکثر لوگ اس وقت بت پرست تھے۔ خونی رشتے اور خاندانی وفاداریاں جاہلیت کی باتیں قرار دی گئیں۔ مسلمانوں میں بھائی چارہ اور برادری کا ایسا گہرا تصور پیش کیا گیا جس کے بعد ایک مسلمان ہی دوسرے مسلمان کا بھائی بن سکتا ہے۔ اخوت اور محبت دو مسلمانوں کے درمیان ہی ہو سکتے ہیں۔ اسلام میں رہ کر ہی آپس کے رشتوں کو مضبوط کیا جاسکتا ہے۔ اس سے ہٹ کر دوسری باتوں پر تعلقات کا استوار ہونا قطعاً پارینہ بنا دیا گیا۔

جنگِ بدر کا جو سب سے اہم نتیجہ لکلا وہ مسلمانوں کے حوصلوں کا بلند ہونا تھا۔ مسلمانوں کے حوصلے بلند ہوئے۔ بہت بلند ہوئے۔ ذہنی طور پر یہ بہت بلند مقام پر

ناز ہوتے۔ مادی طور پر بھی ان کا نائد ہوا۔ مال غنیمت کے طور پر ایک سو چالیس اونٹ
دس گھوڑے اور بے شمار ہتھیار مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ جو لوگ جنگ میں مارے گئے
تھے ان کا بھی ساز و سامان مسلمانوں کو ملا اور جو لوگ گرفتار ہوئے تھے ان کا سامان بھی
مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ قیدیوں کو رہا کرنے کے لیے الگ رقم وصول کی گئی۔ امیر قیدیوں کو آزاد
کرنے کے لیے فی کس چار ہزار درہم مقرر کیے گئے۔ غریب اور اوسط قسم کے قیدیوں سے
کم رقم لی گئی۔

قرآن کے سورہ انفال میں واضح طور پر یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ جنگ سے جو کچھ بھی
ہاتھ آئے وہ سب کا سب خدا اور اس کے رسول کا حق ہے۔ حضور نے مال غنیمت میں سے
پانچواں حصہ اپنے لیے رکھ لیا۔ بقیہ چار حصے تمام مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے۔
ایک اور دلچسپ بات ہوتی رہی۔ مکہ کے مشرکین جو مدینہ میں حالت گرفتاری میں
اپنے اپنے قیدیوں کا انتظار کر رہے تھے (جو ان کے لیے مکہ سے روانہ کیے جا رہے
تھے) مدینہ کے مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے میں مشغول رکھے گئے۔

یہاں یہ بات پھر ظاہر ہو رہی ہے کہ مکہ کے لوگ جن کا ذریعہ معاش تجارت تھا
پڑھے لکھے ہوتے تھے اور مدینہ کے لوگ جو ذراعت پر اپنی گزر بسر کرتے تھے، پڑھنا لکھنا
نہیں جانتے تھے۔

اب مسلمانوں کے موقف میں عظیم تبدیلی ہو گئی تھی۔ اگر قریش کا پلہ بھاری ہو جاتا اور بدر
میں ان کو فتح ہو جاتی تو دنیا سے مسلمانوں کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ جن مسلمانوں نے جنگ بدر میں
عملی حصہ لیا امت کی نظر میں وہ عظیم اور فخر و مباہات کا باعث بنے۔ امت ان کو اپنا
ہیرو سمجھنے لگی۔ حضور نے اس فتح کو تائید ایزدی سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن پاک کے
سورہ آل عمران کی ۱۲۴ ویں آیت میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین ہزار فرشتوں کو
مسلمانوں کی مدد کے لیے روانہ کیا تھا۔

جب تم مومنوں سے یہ کہہ رہے تھے کہ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ پروردگار تین ہزار فرشتے نازل کر کے تمہیں مدد دے۔ ہاں اگر تم دل کو مضبوط رکھو اور (خدا سے) ڈرتے رہو اور کافر تم پر جوٹوں کے ساتھ دفعتاً حملہ کریں تو پروردگار پانچ ہزار فرشتے جن پر شانیاں ہوں گی تمہاری مدد کو بھیجے گا۔

جنگِ بدر کی فتح کے بعد جو سب سے پہلا قدم اٹھایا گیا وہ مدینہ کے مسلمانوں میں تنظیم پیدا کرنے کی صورت میں تھا۔ جس طریقہ سے آج کے زمانے میں اخبارات کو ان کے اداروں کو اور ان میں چھپنے والے مواد کو اہمیت دی جاتی ہے اسی طریقے سے اُس زمانے میں عربوں کی شاعری کو وہی اہمیت حاصل تھی، عربوں کی شاعری ان ہی مقاصد کو پورا کرتی تھی جن مقاصد کو آج کے اخبارات پورا کرتے ہیں۔ حضورؐ نے شعراء کے کلام کو اہمیت دی۔ شعراء اپنے کلام میں حکمرانوں تک کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اسما بنت مروان پانچ بچوں کی ماں تھی۔ یہ اپنے وقت کی ایک ممتاز شاعرہ تھی۔ شاعری میں طنز و مزاح اس کی خصوصیت تھی۔ اس نے اپنی شاعری میں حضورؐ کے خلاف مضمون باندھنے شروع کیے یہ شاعرہ اپنے پانچوں بچوں کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ اس کی موت کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک اور شاعر ابو عصفک مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

بہت سے مغربی مصنفین نے اس قسم کے قتل کی کالی مذمت کی ہے بعضوں نے اسے مسلمانوں کی ظلم و زیادتی پر محمول کیا ہے۔

جہاں قانون کا دور دورہ ہو، جہاں عدل و انصاف کا راج ہو، جہاں فوج اور پولیس کی طاقت موجود ہو، وہاں سیاسی بنیادوں پر اس قسم کے قتل کی کوئی بھی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ ساتویں صدی عیسوی کے عرب میں نہ قانون کا دور دورہ تھا، نہ عدل و انصاف کے لیے کوئی جگہ، نہ فوج اور نہ ہی پولیس، لوگوں کی حفاظت کا دار و مدار خاندانوں پر ہوتا اور ہر قبیلہ اپنے قبیلے کے افراد کی جان و مال کا نگران ہوتا تھا۔ آنحضرتؐ نے مکہ کے خاندانی

اور قبائلی طریقے ہی کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ اسلام کو ساری وفاداریوں کا مرکز قرار دے کر معاشرتی نظام میں ایک بنیادی تغیر پیدا کر دیا تھا۔ اب ایسی حالت میں اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے سولے تشدد کے کوئی اور چارہ باقی نہ رہا تھا۔

سرچارلس پٹرے ایک مستند اور مشہور تاریخ داں گزرے ہیں۔ ایک قتل کے عدالتی فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں جو ۱۵۳۵ء میں ہنری ہشتم کے ہاتھوں سر تھامس مور کا ہوا تھا۔

”یہ بات ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس زمانے میں یعنی ۱۵۳۵ء میں عالمی طور پر سب ہی لوگ اس بات پر متفق تھے کہ لوگوں کے خطرناک قسم کے رجحانات اور باغیانہ انداز فکر کو روکنے کے لیے تشدد بہر حال ضروری ہے۔“

یاد رہے کہ انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم کا زمانہ حضور کے زمانے کے نو سو سال بعد کا زمانہ ہے۔ نو سو سال بعد یعنی ۱۵۳۵ء میں تمام دنیا کے لوگ خطرناک رجحانات کو روکنے کے لیے تشدد ہی کو واحد علاج سمجھتے تھے۔

حضورؐ اپنے آپ کو اسلام کی تبلیغ کے لیے وقف کر چکے تھے۔ آپ کا ایمان اور ایقان تھا کہ آپ خدا کی طرف سے اس کام کے لیے چنے گئے ہیں۔ شعراء اس کوشش میں لگے رہے کہ مسلسل آپ کا مذاق اڑایا جائے۔ کوئی قانونی طریقہ تو ایسا نہیں تھا جس کا سہارا لے کر شعراء کو ان کی بدتمیزیوں سے روکا جائے۔ ہمارے ذہنوں میں یہ بات آتی ہے کہ ان شعراء پر غداری کا الزام لگا کر انہیں گرفتار کیا جانا چاہیے تھا اور پھر ان پر مقدمہ چلایا جاسکتا تھا۔ یہ ذہنیت اس زمانے کی ہے۔ اُس زمانے میں کسی کو اس طرح گرفتار نہیں کیا جاسکتا تھا پولیس کا وجود نہیں تھا۔ پہلے تو ایسا قانون ہی کوئی نہیں تھا جس کی خلاف ورزی کا اسے مورد ٹھہرایا جاسکے اور دوسرے عدالت ہی سرے سے ناپید تھی جہاں لے جا کر اُس پر مقدمہ چلایا جاسکے۔

اپنے خلاف اور اسلام کے خلاف شاعری کرنے والوں کے لیے حضور نے ایک اچھا نسخہ
 دھونڈ لیا۔ وہ یہ تھا کہ آپ نے کچھ ایسے شعراء کو اپنی سرپرستی میں لے لیا جو مدافعت کرتے ہوئے
 مخالف شعراء کو مٹنے توڑ تو اب دے سکتے تھے۔ شعراء وقت میں حسان ابن ثابت ایک
 ممتاز شاعر تھے۔ وہ ادھیڑ عمر کے تھے اور مشرقی شام کے شہزادوں کے درباروں سے بھی
 وابستہ رہ چکے تھے۔

حضور نے حسان سے سوال کیا کہ کیا وہ مخالف شعراء کا جواب دے سکتے ہیں حسان
 ابن ثابت نے جواب دیا کہ کوئی زرہ ایسی نہیں جس کو وہ اپنی شاعری کے نیزے سے پھلنی
 نہ کر دیں۔

ایک طرف شعراء کی طنز و مزاح اور مخالفانہ شاعری سے حضور کو واسطہ پڑ رہا تھا اور
 دوسری طرف جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ویسے ویسے یہودیوں کی شرارتیں نئے
 طریقوں سے سامنے آنے لگی تھیں حضور کو یہ امید تھی کہ مدینہ کے یہود آپ کی ہمنوا کی کریں
 گے۔ بے پرستوں کے خلاف آپ کی مدد کریں گے۔

حضور نے ان سے یہ تک کہہ دیا تھا کہ اگر وہ نہ چاہیں تو آپ کو اپنا میسجیا تسلیم نہ کریں
 آپ نے یہودیوں کی کتاب توریت کے بہت سے قصوں کو اپنی زبان مبارک سے ارشاد
 بھی فرمایا تھا۔ یہودیوں کے قبلے کو اپنا قبلہ بھی تسلیم کر لیا تھا۔ عبادت کے طریقوں میں بھی
 تھوڑی بہت مشابہت پیدا کر دی تھی۔

اگر مدینہ کے یہودیوں میں تھوڑی بہت بھی بصیرت ہوتی اور انداز فکر میں وسعت
 ہوتی تو وہ یقیناً کوئی ایسا فارمولہ اختیار کرتے جس کے تحت مسلمان اور یہودی مل جل رہتے
 اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ حضور کے وصال کے یکڑوں برس بعد تک یہ دونوں قومیں یا دونوں مذاہب
 ایک دوسرے کے دست و بازو بنے رہتے اور ان دونوں قوموں نے مل کر عیسائیوں کا
 ڈٹ کر مقابلہ کیا ہوتا۔ مگر یہودیوں میں بصیرت پیدا ہی کیسے ہو سکتی تھی اور ان کے انداز فکر

میں وسعت کا سوال، ہی کہاں پیدا ہوتا تھا جب کہ ان کا تعلق مدینہ سے تھا۔ جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں وہ مقامی عرب تھے۔ اپنے آبائی مذہب کو ترک کر کے انہوں نے یہودیت اختیار کر رکھی تھی۔ ان کی روزمرہ زندگی کا دار و مدار یا تو باغیانی پر تھا یا چھوٹی موٹی صنعت پر۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں کئی ایک عالم تھے۔ اپنی دینی کتابوں پر انہیں عبور حاصل تھا لیکن ان کا ہی سطحی مسلم ان کو لے ڈوبا۔

حضور نے یہودی کتابوں کے قصص کو جس طریقے سے پیش کیا اور بعض جاگہ حضور کے بیان میں جو واقعاتی غلطیاں ہوئیں ان کو رد کرتے یا ان میں اصلاح یا درستگی کرنے کی نہ ان میں جرات تھی اور نہ ہی ان کے سطحی علم نے انہیں اس قابل رکھا تھا۔ انہوں نے بھی انہیں غلطیوں کا اعادہ کیا جو اس وقت کے شعرا سے سرزد ہو رہی تھیں۔ حضور کا مذاق اڑانا یا طنز و مزاح کے پیرائے میں حضور کی تعلیمات پر تبصرہ کرنا ان کا مشغلہ بن گیا تھا۔ لڑائی کے لیے تو یہ لوگ تیار تھے ہی نہیں۔ بے تیغ و تفلنگ طنز و مزاح کے سہارے مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

بدر کی جنگ نے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کر دی تھی۔ ان کے عزائم میں بلندی آگئی تھی۔ وہ باوجود ہلکے ہو گئے تھے۔ اس خود اعتمادی اور بلند حوصلگی نے حضور کو اب اس بات پر راضی کیا کہ یہودیوں کے خلاف ایک مضبوط قدم اٹھائیں۔

قرآن کے سورہ آل عمران کی ۱۱ سے ۱۳ تک کی آیتوں میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ ان کا حال بھی فرعونوں اور اس سے پہلے لوگوں کا سا ہو گا۔ جنہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی تھی تو خدا نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب عذاب میں پکڑ لیا تھا اور خدا سخت عذاب کرنے والا ہے۔ (بے پیغمبر) کافروں سے کہہ دو کہ تم (دنیا میں بھی) عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے اور (آخرت میں) جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ بڑی جگہ ہے تمہارے دو گروہوں میں جو (بدر کے دن) آپس میں بھڑکنے لگے نشانی تھی۔ ایک گروہ خدا کی راہ میں

لا رہا تھا اور دوسرا گروہ (کافروں کا) ان کو اپنی آنکھوں سے دگنا مشاہدہ کر رہا تھا اور خدا
اپنی نصرت سے جس کو چاہتا ہے مدد دیتا ہے جو اہل بعصیت ہیں ان کے لیے اس میں بڑی
عبثت ہے۔ مسلمانوں نے سب سے پہلے جن یہودیوں کے خلاف قدم اٹھائے وہ بنی قنیقاع
کے یہود تھے۔ ان کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ پیشے کے لحاظ سے مسار تھے۔ ان کا شمار
امیر ترین یہودیوں میں ہوا کرتا تھا۔ ان کی تعداد کے تعلق سے مشہور ہے کہ ان میں تین سو
سے تھے اور چار سو غیر مسلح۔ وہ ہتھیار بھی بنایا کرتے تھے۔ ان کے قبضے میں باغات یا کسی
اور قسم کے زمین نہیں تھی۔

بدر کی جنگ کے تھوڑے ہی دنوں بعد بنی قنیقاع کے بازار میں یہودیوں اور مسلمانوں
کے درمیان ناچاقی ہو گئی۔ اس موقع پر بازار میں حضرت حمزہ اور حضرت علی بھی تھے۔ یہی
ناچاقی آگے چل کر رنگ لائی۔ ابن اسحاق کے بیان کے مطابق ایک یہودی نے ایک عرب
عورت کے ساتھ ناشائستہ حرکت کی اور یہی حرکت جھگڑے کی بنیاد بن گئی۔

جیسا کہ عام طریقہ تھا۔ مدینہ کی وادی میں بنی قنیقاع کے لوگ سب ایک ہی جگہ اور
ایک دوسرے کے قریب رہا کرتے تھے۔ ان کے مکانوں کے اطراف فصیل ہو کر تھی جو
قلعہ کا بھی کام کرتی تھی۔ مسلمانوں کے ہاں ایسے ذرائع مفقود تھے جن سے کام لے کر وہ فصیلوں
کو مسمار کر سکیں۔ دو ہفتوں تک محاصرہ جاری رہا۔ مدینہ کے دوسرے یہودی قبیلوں نے اپنے
ہم مذہبوں کی کوئی مدد نہیں کی۔

دو ہفتے بعد یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان
کوئی خون خرابہ نہیں ہوا۔

بنی قنیقاع نے عرب کے دو قبیلوں سے دوستی کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ ایک قبیلہ
اوس تھا اور دوسرا خزرج۔ ان دونوں قبیلوں کے سرداروں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔
اوس کا سردار عبادہ ابن صامت۔ حضور کی خدمت میں حاضر ہوا، عرض کی کہ

اے خدا کے رسول۔ میری دوستی تو اللہ اور اس کے رسول سے ہے۔ مسلمانوں کا میں نیت ہوں۔ میرا جو معاہدہ دوستی یہودیوں کے ساتھ ہوا تھا اب میں اس کی تینسخ کر دیتا ہوں۔ یہودیوں کا دوسرا حلیف عبداللہ ابن ابی تھا۔ اس کا تعلق خزرج سے تھا۔ یہ آدمی خون خرابہ اور ذلگنا فساد کو ناپسند کرتا تھا۔ اپنی امن پسندی کے لیے مشہور تھا۔ اوس اور خزرج کے درمیان جب لڑائی ہو رہی تھی اس نے اپنے آپ کو غیر جانب دار رکھا۔ اسی غیر جانبداری کی وجہ سے لوگوں نے اُسے سارے مدینہ کا سردار تسلیم کیا تھا۔ حضور کے مدینہ تشریف لانے تک عبداللہ ابن ابی مدینہ کا سب سے زیادہ بااثر آدمی سمجھا جاتا تھا۔ عبداللہ ابن ابی نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔

جیسے ہی عبداللہ ابن ابی کو بنی قنیقاع کے ہتھیار ڈال دینے کی اطلاع ملی دوڑا دوڑا حضور کی خدمت میں گیا اور عرض کی کہ اے محمد۔ میرے حلیفوں کے ساتھ مہربانی کے ساتھ پیش آئیے۔ "حضور یہ سن کر دوسری طرف پلٹ گئے۔ عبداللہ ابن ابی نے حضور کی ردائے مبارک کا ایک کونہ پکڑ لیا۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق حضور کو غصہ آگیا اور حضور کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ حضور نے فرمایا مجھے جانے دو۔ عبداللہ ابن ابی نے کہا کہ خدا کی قسم میں آپ کو اس وقت تک نہیں جانے دوں گا جب تک آپ میرے حلیفوں کے ساتھ رحم و مہربانی سے پیش آنے کا وعدہ نہ کریں۔ چار سو لے ہتھیار اور تین سو مسلح لوگوں نے ہمیشہ مجھے میرے دشمنوں سے محفوظ رکھا۔ کیا آپ ان سب کو ایک دن میں تہہ تیغ کر دیں گے؟ خدا کی قسم میں ان لوگوں میں ہوں جو حالات کے بدلنے کے ڈر سے ہمیشہ خوف زدہ رہتے ہیں۔

یہ سن کر حضور نے جواب دیا کہ صرف تمہاری خاطر ان کو معاف کیا جاتا ہے۔ ابن اسحاق نے عبداللہ ابن ابی کا یہ جو جملہ نقل کیا ہے کہ کیا آپ ان سب کو ایک دن میں تہہ تیغ کر دیں گے اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں نے ان سب کے

قتل کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مسلم مورخین نے عبد اللہ ابن ابی کا ذکر ہمیشہ درشتگی کے ساتھ کیا ہے ان میں سے اکثروں کا خیال ہے کہ عبد اللہ منافقین کا سردار تھا۔ ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ اسلام کے انقلابی نظریہ نے اس کو کتنے مشکل موقف میں ڈال دیا تھا۔ قبائلی معاہدوں پر قائم رہنا اور ان پر پوری طرح عمل کرنا عربوں کے لیے ان کی اپنی زندگی کا ایک قسمی اثاثہ تھا۔

عبد اللہ ابن ابی ان یہودیوں کا منون کرم تھا۔ ان لوگوں نے ہمیشہ اس کی حمایت کی تھی۔ وہ اپنے کئے ہوئے وعدوں کو بہر حال نباہنا چاہتا تھا۔ اب عبد اللہ مسلمان ہو چکا تھا۔ حضور نے قبائلی وفاداریوں کی جڑ کاٹ دی تھی۔ اس کے باوجود عبد اللہ یہودیوں کے ساتھ رحم و کرم کا طالب ہوا۔

مسلم مورخین کے برخلاف ہم کو عبد اللہ ابن ابی پر ترس آتا ہے۔ سورہ مائدہ کی ۵۷ ویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

”اے ایمان والو۔ جن لوگوں کو تم سے پہلے کتابیں دی گئی تھیں ان کو اور کافروں کو جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے دوست نہ بناؤ۔ مومن ہو تو خدا سے ڈرتے رہو۔ جب تم لوگ نماز کے لیے اذان دیتے ہو تو یہ اُسے بھی ہنسی اور کھیل بناتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ سمجھ نہیں رکھتے۔“

اس سے پہلے سورہ مائدہ کی ۵۷ ویں آیت میں ارشاد ہوا ہے۔

”لے ایمان والو۔ یہودیوں اور مسیحیوں کو اپنا دوست مت بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ جو بھی تم میں سے ان کو اپنا دوست بنائے گا وہ ان میں سے ایک ہو گا۔ بے شک خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق) کا مرض ہے تم ان کو دیکھو گے کہ ان میں دوڑ دوڑ کر طے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں خون ہے کہ ہمیں ہم پر زلزلے کی گردش نہ آجائے۔ سو قریب ہے کہ خدا فتح بھیجے اور اپنے پاس

سے کوئی اور امر نازل فرمائے۔ پھر یہ اپنے دل کی باتوں کو جو چھپایا کرتے تھے پشیمان ہو کر رہ جائیں گے۔“

ان آیات کی وجہ سے حضور اور بھی شدت کے ساتھ یہودیوں سے پیش آنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

بنی قنیقاع کو حکم دیا گیا کہ وہ مدینہ چھوڑ کر شام چلے جائیں۔ ان کے مدینہ چھوڑنے سے پہلے ان یہودیوں کی ساری دولت اور ان کے مکانات مسلم مہاجرین میں تقسیم کر دیئے گئے۔ ان مسلم مہاجرین میں اب تک کئی ایسے تھے جن کا گزر بسر خیرات پر ہوا کرتا تھا بنی قنیقاع کا یہ حشر دیکھ کر دوسرے یہودی قبیلے اور بت پرست چوکنے ہو گئے۔

جب مکہ کے شکست خوردہ بدر سے واپس ہوئے تو ابوسفیان نے قسم کھائی تھی کہ جب تک قریش کے مقتولوں کا وہ بدلہ نہ لے گا اس وقت تک وہ کوئی مرغین غذا نہیں کھائے گا

اپریل ۶۲۴ء میں سو اور دوسو کے درمیان آدمیوں کو لے کر اس نے مدینہ کے جنوبی حصہ پر حملہ کیا۔ دو تین آدمی مارے گئے۔ دو گھروں کو جلایا۔ ہنتا کھیلتا مکہ واپس ہو گیا۔

مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ بہت آگے نکل چکا تھا۔ اپنے جانوروں کو ہلکا کرنے کے لیے انہوں نے اپنے ساتھ جو ستور رکھ لیا تھا وہ پھینکنا شروع کیا تاکہ جانوروں پر سے وزن کم ہو جائے اور وہ تیز روڑ سکیں۔

۱۹ مئی ۶۲۴ء میں حضور کی قیادت میں دوسو کے قریب مسلمانوں نے دو بدوی قبائل پر حملہ کیا۔ یہ قبائل بنی غلفان اور بنی سلیم تھے۔ پانچ سو اونٹ مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔

ان جانوروں کو مدینہ لایا گیا۔ اس حملے کو تاریخ میں الکر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بنی طے کا ایک عرب کعب بن اللہ بن ہریرہ کے ایک قبیلے بنی نصیر کے ساتھ رہا

کرتا تھا۔ کعب کے باپ نے ایک یہودن سے شادی کی تھی۔ یہ عورت بنی نبیر سے تعلق رکھتی تھی۔ کعب خود ایک شاعر تھا۔ اس نے بدر میں مارے جانے والے قریش کے لوگوں پر ایک مرثیہ لکھا تھا۔ پھر خود مکہ گیا تاکہ قریش کے سربراہوں سے آئندہ لاکھ عمل کے متعلق بات چیت کرے۔

ابن اسحاق کے بیان کے مطابق حضورؐ نے لوگوں سے پوچھا کہ ابن اشرف سے کون چھٹکارا دلا سکتا ہے۔ ایک انصاری محمد بن مسلمہ آٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے آپ کو اس کام کے لیے پیش کیا۔ محمد بن مسلمہ نے حضورؐ سے کہا کہ مجھے اس سلسلے میں مصلحت سے کام لینا ہوگا۔

محمد بن مسلمہ نے کعب کے مٹنے بولے بھائی سلکان کی خدمات حاصل کیں۔ سلکان مسلمان ہو گئے تھے۔ یہ بھی شاعر تھے۔ محمد بن مسلمہ اور سلکان کعب کے مکان گئے رات کے ابتدائی حصے میں دونوں بھائی اپنی اپنی شاعری سے کعب ابن اشرف کو خوش کرتے رہے جب کافی رات ہو گئی تو محمد بن مسلمہ اور سلکان مل کر کعب کو گھر سے باہر لے آئے اور اُسے قتل کر دیا۔ یہ واقعہ جولائی ۶۲۴ء کا ہے۔

ابن اسحاق کے بیان کے مطابق حضورؐ نے یہ فرمادیا تھا کہ جو یہودی بھی تمہارے ہاتھ آجائے اُسے قتل کر دو۔ اس حکم کو سامنے رکھتے ہوئے حویصہ ابن مسعود نے ایک یہودی تاجر ابن سیمہ کو قتل کر دیا۔ ابن مسعود کو اس مقتول یہودی کے بڑے بھائی نے مازنا شروع کر دیا اور کہا کہ تمہارے اُسے مارا ہے جس کے پیسے سے تم نے اپنے پیٹ کی چربی کو رات دن بڑھایا ہے۔ ابن مسعود نے جواب دیا کہ جس نے مجھے اُسے مارنے کا حکم دیا تھا اسی نے مجھے تمہیں بھی مارنے کا حکم دیا ہے۔ میں اب تمہارا بھی سر تمہارے تن سے جدا کر دوں گا۔

۲۴ جون ۶۲۴ء میں حضورؐ ساڑھے چار سو مسلمانوں کو لے کر غطفان پر حملہ کرنے کے

ارادہ سے نکلے۔ جیسے ہی ان قبیلوں کو اس کی اطلاع ملی وہ اپنے اپنے مقام کو چھوڑ کر کہیں اور نکل گئے۔ مسلمان بغیر لڑے واپس ہو گئے۔ اس حملہ کو ذوالعمر کے حملہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ (۴)

اگست ۶۲۴ء میں پھر تین سو مسلمانوں کو لے کر حضورؐ بنی سلیم پر حملہ کرنے کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ مسلمانوں کی یہ جماعت بحرین تک گئی جو مدینہ کے مشرق میں واقع ہے۔ لڑائی کسی سے بھی نہیں ہوئی۔ مسلمان مدینہ واپس لوٹ آئے۔

اب وہ دن آگئے جس میں مکہ کا سالانہ تجارتی قافلہ شام جایا کرتا تھا۔ قریش کی آمدنی اور دولت کمانے کے دو ہی بڑے ذرائع تھے۔ ایک تجارتی قافلہ شام روانہ کیا جاتا تھا اور دوسرا یمن۔ اسلام سے قبل ان قافلوں کا لوٹا جانا تقریباً ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ جن جن راستوں سے قافلے کا گزر ہوتا تھا وہاں کے مقامی قبائل کا تعاون حاصل کیا جاتا تھا۔ ان قافلوں کی نگرانی اور رہبری میں کاروان ان کے حدود سے بہ حفاظت تمام آگے بڑھتے تھے۔ تعاون، رہبری اور نگرانی کرنے والے قبائل اور افراد کو کافی معاوضہ دیا جاتا تھا۔

بدویوں کے آپس میں ایک دوسرے پر حملے ان کے تفریحی مشغلوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی آپس کی لڑائیاں بہ حیثیت مجموعی ان کی تجارت پر کبھی اثر انداز نہیں ہوتی تھیں۔

موجودہ صدی کی ابتدا تک بھی عرب اس اصول پر پابند تھے۔

مغربی مصنفین کا یہ الزام کہ آنحضرتؐ کے زمانہ میں سارا عرب شروع سے آخر تک ایک خونی حمام بنا رہا سراسر غلط ہے۔ ایک سوچے سمجھے اور مرتب کئے ہوئے نظام پر وہ کار بند تھے۔ آپس کی ناچا قباہ اور قبائلی جھگڑے ان کے معاشی نظام پر یا ان کی تجارت میں خلل انداز نہیں ہوتے تھے۔ سیکڑوں سال کے عرصہ میں اگر اس

نظام میں کبھی کوئی بڑھی ہوئی بھی ہے تو اس کی دو وجوہ رہیں۔

شاہی ناندان جیسے المہر یوں اور بنی عثمان اپنی سیادت منوانے کے لیے بعض اوقات برابرہ طریقے استعمال کرتے تھے۔ ان کی بارگاہہ روش بعض اوقات تجارت پر اثر انداز ہوتی تھی۔

قبیلوں اور تاجروں کا آپس میں جو مربوط نظام تھا اس کو متاثر کرنے میں دوسری چیزندہ ہی تحریکات رہی ہیں۔

ان قبیلوں کے درمیان نہ نسلی امتیاز تھا اور نہ ہی اخلاقی اقدار میں اختلاف سماجی تضادات بھی ایسے نہیں تھے جن کی بنیادوں پر وہ واقعی آپس میں خونریزی کرتے۔ کسی کے دو چار اونٹ یا بھیڑوں کو بھگالے جانا ان کے ہاں ایسا ہی تفریحی مشغلہ تھا۔ جیسے آج کل پولویانٹ بال۔

دو چار اونٹوں اور بکریوں کی خاطر وہ انسانوں کو مارتا نہیں دیکھ سکتے تھے، ان کو معلوم تھا کہ اگر آج وہ کسی قبیلے کے دو اونٹ بھگا کر لے بھی جائیں تو کل اسی قبیلے کے لوگ ان کے چار اونٹ بھگالے جائیں گے۔

مسلمانوں نے جو جنگیں لڑی ہیں ان کی نوعیت ہی سرے سے جداگانہ ہے مسلمانوں نے اپنے آپ کو اونچے مقام پر پایا۔ ان کا ایمان تھا کہ وہ خدا کے حکم پر جنگ کر رہے ہیں خدا کا حکم ہے کہ اس کے دشمنوں کو تہ تیغ کیا جائے۔ بدویوں کی لڑائی میں بہ مشکل ایک دو آدمی مارے جلتے تھے۔ بدر کی لڑائی میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ستر کے لگ بھگ لوگ مارے گئے۔ اسی طریقے سے مسلمانوں کا مکہ کے کاروانوں کی آمدورفت کو روکنے کی کوشش کرنا مخالفت اور دشمنی کا ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ گو وقفہ وقفہ سے عرب میں کاروانوں کو لوٹا جاتا تھا لیکن عام طور پر یہ حملہ کرنے والے پیشہ ور قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ بادشاہ نعمان کا کاروان لوٹا گیا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں ایک بڑی جنگ

بھی کی تھی۔

اپنے اقتدار کو منوانے کے لیے کارروائیوں کی مزاحمت اس وقت کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

یہ کہنا خلاف واقعہ ہے کہ انحصاراً اپنے زمانہ کے ان لوگوں میں سے تھے، جو عرب کے مسلمہ اصولوں پر کاربند ہو کر یا زمانے کی عام راہوں کو اختیار کر کے خون کے پیاسے عزروں سے نبرد آزما ہوتے۔ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

آپ نے جو طریقے اختیار کئے ان میں جدت تھی۔ نیا پن تھا۔ ان طریقوں کو بدویوں کی آپس کی خانہ جنگیوں یا لڑائیوں سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ ہاں اگر مشابہت پائی جاتی ہے تو شاہی خاندانوں کے طریقہ کار سے پائی جاتی ہے۔

جنگ بدر کے بعد سے مکہ کے لوگوں میں اپنی معیشت کے تعلق سے پریشانی بڑھنے لگی۔ آپس میں کافی بحث و مباحثہ کرنے کے بعد انہوں نے بہت ہی غور و فکر کر کے یہ طے کیا کہ شام کو جانے والا قافلہ بحر احمر کے کناروں سے نہ روانہ کیا جائے بلکہ نجد کا راستہ اختیار کیا جائے۔

ابن اسحق کے بیان کے مطابق اس قافلے کو عراق کے راستے سے روانہ کیا گیا۔ اس وقت عراق، شام اور فلسطین پر ایران کی حکومت تھی۔ مکہ کے قافلے کو کسی اور حکومت کے مقبوضہ علاقوں سے نہیں گزرنا پڑتا تھا۔ قریش نے راستہ بتانے اور رہبری کرنے کے لیے بدویوں کی خدمات حاصل کیں۔

قریش میں صحیح قیادت کا فقدان تھا۔ ان کے تساہل، تجاہل، تغافل اور ناکارکردگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ قریش کا یہ منصوبہ اور ان کے راستہ کا منصوبہ بیدھے مدینہ مسلمانوں تک پہنچ گیا۔ دوسری طرف مسلمانوں کی کارکردگی اور تنظیمی صلاحیت میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔

اس موقع پر قریش کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ مسلمانوں نے ان کی

مزاہمت کو منظور بھی بنایا ہے۔

حفصہ کے معنی زید ابن حارثہ کی قیادت میں ایک سو سوار کارواں کی مزاہمت کے لیے روانہ کیے گئے۔

نجد میں قدم رکھنے کے بعد کئی برسوں پر مسلمانوں نے اس کارواں کو جا پکڑا۔ بہت بڑی دولت مسلمانوں کے ہاتھ لگی۔ دولت کا بڑا حصہ ہانڈی پر مشتمل تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ایک لاکھ درہم مسلمانوں کے قبضے میں آئے۔

بدر کی شکست کے بعد قریش میں جو سربراہ باقی رہ گئے تھے ان سب نے مل کر یہ تجویز پیش کی کہ ایک نفاذ اکٹھا کیا جائے۔ اس کی رقم سے ایک ایسی فوج تیار کی جائے جو مسلمانوں پر ایک ہی وقت حملہ کر کے ہیڈ کوارٹر کے لیے ان کو ختم کر دے تاکہ رہے بانس اور نہ بچے بانسری۔ اس تجویز پر قریش کے سارے لوگوں نے بیک کہا۔ دل کھول کر چنڈہ دیا۔ خصوصاً مکہ کے تاجروں نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کا ان کے کاروانوں پر حملہ کرنا ان کی تجارت کی تباہی ہے۔

بنی کنعانہ کے لوگ سمندر کے کناروں پر رہا کرتے تھے۔ روایاتی طور پر یہ قریش کے مساؤ میں تھے۔ مکہ والوں نے اپنے نمائندوں کو بنی کنعانہ کے ہاں روانہ کیا۔ ان سے درخواست کی گئی کہ مسلمانوں سے آئندہ جو جنگیں اور جھڑپیں ہوں گی ان میں وہ مکہ والوں کا ساتھ دیں۔

حسب معمول شاعروں کی خدمات بھی حاصل کی گئیں تاکہ وہ اپنی شاعری سے بنی کنعانہ کے لوگوں کے جذبات برانگیختہ کریں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے ہمدردیاں بھی اپنے لیے حاصل کریں۔

جنگ بدر میں قریش کے بہت سارے اکابر مارے جانے کے بعد مکہ میں ابوسفیان بن حرب کو اب کافی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ سب نے مل کر ابوسفیان کو اس مہم کا سردار

بکھے جن کے افراد

پر مشتمل تھی ان

کا تھے۔ چند

کا جنوبی حصہ

پر کے شمالی حصے

اس لیے ہارڈ

مدینہ کے شمالی

وہ تھی مسلمانوں

کے ساتھ آپس

ہیں کہ نئی تہمتوں کی پختہ ہمارے تلوں پر حملہ کر کے مسلمانوں کو ہچکے تھے۔ اس کے علاوہ قریش کے ہاں سامانِ رسد کی فراہمی کے خاطر خواہ ذرائع نہیں تھے۔ وہ لوگ زیادہ دن تک مدینہ کا محاصرہ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔

آنحضرت نے جنگِ بدر کی کامیابی کو ایک معجزہ بتلایا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ بدر کی جنگ میں خدا نے مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا۔ دشمنوں سے لڑنے کے لیے آسمان سے فرشتے بھیجے گئے تھے۔ اگر تائیدِ نبوی مسلمانوں کے شامل حال تھی ہی تو لڑنے والوں کی تعداد ایک سو تیس تھی اور تعدادِ دشمنوں کا نظر انداز کر دیا جاسکتا ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کئی نوجوان مسلمان اپنی جان کو ہتھیلی میں لیے ہوئے جنگِ بدر کے میدان میں کود پڑے تھے۔ اسی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس موقع پر بھی نوجوان کھلے میدان میں جنگ کرنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ اس طرف عبد اللہ ابن ابی مسعود سے کہا جا رہا تھا کہ جنگ مدافعتی ہو اور شہر میں رہ کر ہو۔

عبد اللہ ابن ابی نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ مدینہ ہی میں ٹھہرے رہیں۔ مدینہ سے باہر تشریف نہ لے جائیں۔ ہم اپنے دشمنوں سے لڑنے کے لیے کبھی بھی مدینہ کو چھوڑ کر باہر نہیں گئے۔ ہم معیشتوں کا مقابلہ کر چکے ہیں۔ جس نے بھی مدینہ والوں پر حملہ کیا اس کو زلت و رسوائی نصیب ہوئی۔ اگر ہم یہیں ٹھہرے رہیں جہاں اب ہیں اور ہمارے دشمن وہیں رہیں جہاں وہ اب ہیں تو ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر وہ ہم پر حملہ کرنے آئیں تو ہمارے آدمی ان سے لڑیں گے۔ ہماری کورتیں اور ہمارے بچے دیواروں پر سے ان پر پتھر برسائیں گے۔

جنگِ شہر کے اندر ہو یا شہر کے باہر کھلے میدان میں یہ بحث جھڑپ کے سارے دن ہوتی رہی اور اس کا سلسلہ جمعہ کی دوپہر تک چلتا رہا۔ حضور نماز جمعہ پڑھا کر جب مسجد سے باہر تشریف لائے تھے تو نوجوان اطراف جمع ہو گئے اور درخواست کی کہ جنگِ شہر سے

جب ہتھیار باندھ کر آپ اپنے مکان سے باہر نکلے تو مجمع نے اپنا ارادہ بدل دیا اور لوگ کہنے لگے کہ ہم نے آپ کے مشورہ کو رد کر کے غلطی کی ہے۔ آپ شہر میں رہ کر لڑنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ شہر ہی میں رہنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے لیے تیار ہیں۔

آپ گزشتہ ۲۶ گھنٹوں سے ذہنی کشمکش میں تھے کہ جنگ شہر کے باہر جا کر ہو یا شہر کے اندر رہتے ہوئے۔ اب آپ شہر سے باہر جا کر لڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ آپ نے مجمع سے کہا کہ نبی کو زینب نہیں دیتا کہ وہ ہتھیاروں سے لیس ہو جائے اور پھر بغیر جنگ کے اپنے ہتھیار اتار دے۔ یہ کہہ کر ایک ہزار آدمی کے ساتھ آپ جنگ کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب یہ فوج کچھ راستہ طے کر چکی تھی تو آپ نے دیکھا کہ مسلمانوں کے پیچھے پیچھے ایک اور جماعت آ رہی ہے۔ دریافت فرمایا یہ کون لوگ ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ یہ یہودی ہیں۔ عبد اللہ ابن ابی کے حلیف ہیں۔ ہماری مدد کے لیے ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے۔ بے دنیوں کی حمایت ہمیں منظور نہیں کیا ایک بے دنیوں کی جماعت دوسری بے دنیوں کی جماعت سے لڑے گی؟ یہودیوں کو کہا گیا کہ وہ واپس ہو جائیں۔

مسلمانوں کی فوج نے رات میں دشمنین کے مقام پر اپنا پڑاؤ ڈالا۔

دوسرے دن صبح صبح مسلمانوں نے آگے بڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ ان پر دشمنوں کی نظر پڑ گئی۔ عبد اللہ ابن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو ساتھ لے کر مدینہ واپس ہو گیا۔ اس نے کہا کہ آپ نے میرا کہا نہ مان کر ان نوجوانوں کی باتوں پر عمل کرنا شروع کیا ہے جن کو زندگی کا کوئی تجربہ ہی نہیں۔

عبد اللہ ابن ابی کو جو پہلے ہی سے حسد کی آگ میں جل رہا تھا یہ بہانہ خوب ہاتھ آیا کہ اس کے مشورہ کو رد کر دیا گیا۔ اس نے مدینہ میں جاتے پناہ ڈھونڈی۔ وہ ڈر رہا تھا کہ قریش کہیں کامیاب نہ ہو جائیں۔ مدینہ پر ان کا قبضہ نہ ہو جائے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو

تاکید کردی تھی کہ اگر قریش فتح یاب ہو جائیں اور شہر میں گھس آئیں تو وہ لوگ عہد اللہ کو قریش کے شر سے محفوظ رکھیں۔

عبداللہ ابن ابی کاتین سو آدمیوں کو لے کر لوٹ جانا اب مسلمانوں کی تعداد کو سات سو پر لے آیا۔ جن کا مقابلہ تین ہزار مشرکین سے تھا۔

حضور نے مشورہ طلب کیا کہ دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مزدوں محل وقوع کیا ہو۔ اچانک حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ قریش کے بمقابلہ مسلمانوں کی فوج آکر ٹک گئی۔ میدان جنگ میں فوج کو ترتیب دینا شروع کیا گیا۔ سات سو مسلمانوں میں کسی کے پاس بھی گھوڑا نہیں تھا۔ صرف سو لوگوں کے پاس زرہ بکتر تھی۔ مسلم مورخین کے بیان کے مطابق قریش کی فوج میں دو سو گھوڑے سوار تھے۔ سات سو آدمی زرہ بکتر میں بلوس تھے۔

آپ نے سچا پس تیر اندازوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی تیر اندازی صرف گھوڑے سواروں پر کریں۔ ان کی طرف سے آئے ہوئے تیر پھراہنی کی طرف لوٹائیں۔ کسی حالت میں بھی چلے لٹح ہو یا نکت اپنی مقررہ جگہ سے نہ ہٹیں۔ حضور نے خود بھی زرہ بکتر پہن رکھی تھی۔ اپنا علم مصعب ابن عمیر کو عطا فرمایا۔ مصعب بن عمیر عبدالدار کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ عبدالدار کا خاندان قریش کے علم کو روایاتی طور پر اپنے پاس رکھا کرتا تھا۔ ان کا خاندان عبدالدار سے قریش کا علم بردار تھا۔ یہاں اس بات کو ملحوظ رکھا جائے کہ آپ نے قبیلہ واری روایات کو ابھی پورے طریقے سے نظر انداز نہیں کر دیا تھا۔

حضور نے اپنی چمکتی ہوئی تلوار نبیام سے نکال کر اعلان فرمایا کہ کون ہے جو اس تلوار کا حق ادا کرے گا۔ روایات میں ہے کہ آپ کے اس اعلان کو سن کر عمر ابن الخطاب اور زبیر ابن العوام آگے بڑھے۔ حضور نے اپنی تلوار ان دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں دی۔ آخر اپنی تلوار ابو جحانہ کے حوالے کی۔ اور فرمایا کہ دشمن پر ٹوٹ پڑو۔ یہاں تک لڑو کہ یہ تلوار بے کار ہو جائے۔

دوڑوں فوجوں کے درمیان ابودجانہ اپنی تلوار چمکاتے جا رہے تھے اور رت بڑھ پڑھتے جا رہے تھے۔ اپنی قسمت پر نازاں تھے کہ رسول اللہ نے انہیں اپنی تلوار عنایت فرمائی کہتے جا رہے تھے کہ اس تلوار کو صحیح طریقے سے استعمال ہونا چاہیے اور خدا کی راہ میں یہ استعمال ہوگی۔

عربوں میں ایک روایت یہ بھی تھی کہ جنگ کے موقع پر وہ اپنے ساتھ اپنی عورتوں کو بھی لے جایا کرتے تھے۔ ان عورتوں کا کام ہوتا تھا کہ وہ ایسے گانے گائیں جس سے فوج کے لوگوں میں دلولہ پیدا ہو۔ جوش اور جذبہ بخود کرائے۔ خون میں گرمی پیدا ہو۔

ابوسفیان اپنے ساتھ اپنی بیوی ہندہ کو لے آیا تھا۔ ہندہ قبیلہ بن ربیعہ کی بیٹی تھی۔ یہ وہی قبیلہ ہے جو جنگ بدر میں حضرت حمزہؓ کے ایک وار سے ڈھیر ہو گیا تھا مسلمانوں کی علمبردار مسعب بن عمیر کی ماں بھی قریش کی فوج میں شامل تھی۔ اس کا ایک اور بیٹا یعنی مسعب بن کعبائی کافروں کی طرف سے لڑ رہا تھا۔

یہ ایک اور مثال ہاتھ آئی کہ کس طرح اسلام نے خاندانوں کا ہٹوارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک بھائی مسلمانوں کی طرف سے لڑ رہا تھا اور وہ بھی مسلمانوں کے علمبردار کی حیثیت سے اور اسی علمبردار کی ماں کافروں کی طرف سے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آئی تھی اسی علمبردار کا مشرک بھائی اپنے بھائی کے خون کا پیا سا بن کر آیا تھا۔ ہندہ اس ارادے سے آئی تھی کہ وہ حمزہؓ ابن عبدالمطلب کو قتل کر کے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک حبشی غلام کی خدمات حاصل کی تھیں۔ غلام کا نام وحشی تھا ہندہ نے غلام سے وعدہ کیا تھا کہ وہ حمزہؓ کو قتل کر دے تو وہ اسے آزاد کروادے گی۔ وحشی نیزہ پھینکنے کے فن میں کافی مشہور تھا۔ اس طریقے سے مارنے کی رسم حبشہ کی تھی۔

قریش نے بھی اپنا علم عبدالدار قبیلہ کے کسی سردار کو دیا تھا۔ ایک دن پہلے ابوسفیان

نے عبدالدار قبیلہ کے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اسے بنی عبدالدار تم نے بدر کے موقع پر بھی ہمارا علم اٹھایا تھا۔ تم دیکھ چکے ہو کہ اس کا کیا حشر ہوا۔ اس موقع پر یا تو اپنے علم کو کامیابی کے ساتھ تھامے رکھو یا اگر ایسا نہیں کر سکتے ہو تو علم ہمیں دے دو۔ ہم تمہیں ہر مصیبت سے محفوظ رکھیں گے۔ ہم وہ ہیں جو اس علم کو تمہیں سونپ رہے ہیں۔

یہ سن کر قبیلہ عبدالدار کے لوگوں نے جواب دیا کہ کل تم دیکھ لینا۔ ہم کس طرح سے لڑیں گے۔

دونوں فوجیں جب ایک دوسرے کے مقابل ہو کر ایک دوسرے سے قریب ہو رہی تھیں قریش کی عورتوں نے فوجوں کی صفوں کے پیچھے سے گانا شروع کیا کہ ہم حسین ہیں، ہم خوبصورت ہیں۔ آگے بڑھو۔ ہم سے بوس و کنار کی تم کو عام اجازت ہے۔ ہمارے معطر بستری تمہاری آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر تم جنگ سے کتر اؤ گے تو ہم تم سے کتر آئیں گے ہماری محبت اور چاہت صرف بہادروں کے لیے ہے۔ آگے بڑھو۔

اب مسلمان اور قریش کی فوجیں آمنے سامنے ہو گئیں۔ علم کو بنی عبدالدار کا سردار طلحہ ابن عبدالعزیٰ نے تھام رکھا تھا۔ ابوسفیان کے طنز اور غیرت دلانے والے الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔ کہتا تھا کہ ہے کوئی مسلمان جو مجھ سے مقابلہ کی جرات کرے۔ علی ابن ابی طالب بے اختیار آگے بڑھتے ہیں۔ اپنی تلوار کے ایک وار سے اس کا فاتمہ کر دیتے ہیں۔ قریش کا علم زمین پر گر جاتا ہے۔ حضرت علیؑ کے اس وار کو دیکھ کر مسلمان جوش سے اٹھ اٹھ کر کالعرہ لگاتے ہیں۔

عبدالدار کے لوگ تو لڑنے اور مرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ جیسے ہی طلحہ اپنے علم کے ساتھ نیچے گرتا ہے اس کا بھائی عثمان آگے بڑھ کر پھر سے علم کو اٹھا لیتا ہے۔ مقابلہ کی دعوت دیتا ہے۔ اس دفعہ حمزہؑ آگے بڑھتے ہیں اور کچھ دیر کی شمشیر زنی کے بعد حمزہؑ عثمان کو قتل کر دیتے ہیں۔ مشرکین کا علم پھر سے زمین پر گرا نظر آتا ہے۔

عثمان کے قتل کے بعد عبدالدار کے اور میں آدمی بکے بعد دیگرے آگے بڑھتے ہیں۔ علم
سنھالتے ہیں۔ لڑتے ہیں تھوڑی ہی دیر میں مارے جاتے ہیں۔ پھر سے ان کا علم زمین
برس نظر آتا ہے۔

میں اس موقع پر مسلمان اپنی اپنی صفوں سے لگے بڑھ کر جوش و غضب سے دشمنوں پر
اسی طریقے سے ٹوٹ پڑتے ہیں جیسے وہ بدر میں دشمنوں پر پل پڑے تھے۔
ابو دجانہ حنفیہ کی تلوار لیے ہوئے دشمنوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے میدان کے
نیچوں نیچ سے دشمنوں کی اس آخری صف تک چلے جاتے ہیں جس کے پیچھے وہ ٹوڑ میں تھیں
جو گلتے بھگتے ہوئے اپنے مردوں کو شجاعت اور بہادری سے لڑنے کے لیے اکسا
رہی تھیں۔

عبدالدار کا ایک حبشی غلام قریش کے ظہر دار سے علم چھین کر اپنی حمیت و غیرت کا مظاہرہ
کرنا ہی چاہتا تھا کہ مسلمانوں نے اس کے دونوں ہاتھ اس کے تن سے جدا کر دیئے۔ اس کے
ہاتھوں میں تھا ہوا علم خون سے لت پت ہو کر نیچے گرنے ہی والا تھا کہ اُس نے اس کو علم
اپنے سینے پر لے لیا۔ مسلمانوں کی تلوار نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ مرتے وقت وہ
کہہ رہا تھا کہ اے خدا کیا میں نے اپنے فرض میں کوئی کوتاہی کی ہے؟ یہ واقعہ اس بات کی
شہادت دیتا ہے کہ حبشی غلام کس طرح اپنے عرب آقاؤں کے وفادار اور ان کے لیے وقف
ہوا کرتے تھے۔

اسی اثنا حضرت حمزہؓ اپنی شجاعت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ کافروں کو تہہ تیغ کیے
جا رہے تھے۔ گھسان کی لڑائی اب شروع ہونے ہی والی تھی کہ عتبہ ابن ربیعہ کی بیٹی ہند
نے وحشی کو دیکھ لیا۔ اس کے قریب گئی۔ کہا کہ نزدیک آ۔ پھر کہا کہ اسے تاریکی کے باپ۔
ہمارے جذبہ انتقام کی لاج رکھ۔

وحشی کا اپنا بیان ہے کہ خدا کی قسم۔ میں حمزہؓ کو دیکھ رہا تھا کہ اپنی تلوار سے ایک

کے بعد دوسرے کا قتل کیے ہی جا رہے تھے۔ کسی کو نہیں بخش رہے تھے۔ میں ان کی سمت بڑھتا گیا۔ جھاڑیوں اور پہاڑیوں کے پیچھے پیچھے سے اس طرح بڑھ رہا تھا کہ مجھے کوئی دیکھنے نہ پاتے۔ میں نے اپنے نیزے کو زہر آلود کر لیا تھا۔ جب میں نے اپنے نشانہ پر حمزہ کو پایا تو فوراً نیزہ پھینکا۔ حمزہ کے جسم کے نچلے حصے کو کاٹتے ہوئے نیزہ پیروں کے درمیان کے حصے میں نکلا۔ حضرت حمزہ لڑکھڑاتے ہوئے آگے کی طرف گر گئے اور بے ہوش ہو گئے۔ میں اپنا کام تمام کر کے لوٹ آیا۔ اس کے علاوہ تو مجھے کوئی اور کام نہیں کرنا تھا۔ جب ہم مکہ واپس ہوئے تو مجھے آزاد کر دیا گیا۔

حضرت حمزہ کی شہادت کے باوجود بنظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کو اس دن فتح نصیب ہوگی۔ مسلمانوں میں فتح کا ہوش اور جذبہ تھا اس جذبہ سے وہ بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ دوسری طرف مشرکین میں سے بعض لوگ رختِ سفر باندھ رہے تھے۔ اسی دوران وہ سپاس تیر انداز جن کو آنحضرتؐ نے مختلف مقامات پر متعین کر دیا تھا اپنے اپنے مقام کو چھوڑ کر ان تلوار چلانے والوں میں شامل ہو گئے جو آگے بڑھ کر لڑ رہے تھے اور مالِ غنیمت پر قبضہ کرتے جا رہے تھے۔

قریش کے گھڑ سواروں کی قیادت خالد بن ولید اور عمر بن العاص کر رہے تھے ان دونوں نے دیکھ لیا کہ مسلمان تیر انداز اپنے اپنے مقام کو چھوڑ چکے ہیں اور مسلم فوج کی حفاظت کے بجائے اب وہ کسی اور ہی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ان گھوڑے سواروں کو موقع ملا۔ انہوں نے اپنے گھوڑوں کو دوڑا کر مسلمانوں کی آگے بڑھتی ہوئی صفوں کے پیچھے پہنچ کر جنگ شروع کر دی۔

چند مسلمانوں کے ساتھ حضورؐ بھی آگے بڑھتی ہوئی صفوں کے پیچھے پیچھے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ دشمنوں نے پیچھے سے حملہ کیا تھا۔ ان کو ابھی یہ نہیں معلوم تھا کہ حضورؐ بنفس نفیس ان ہی صفوں میں ہیں جن پر دشمن حملہ کر رہے تھے۔ بنی کنعانہ کا ایک

آدمی ابن قیہ مسلمانوں کے علم بردار مصعب بن عمیر پر قاتلانہ حملہ کرتا ہے اور مصعب شہید ہو جاتے ہیں۔

مصعب کو شہید کر کے وہ اس غلط فہمی میں رہتا ہے کہ اس نے حضور کو شہید کر دیا ہے۔ قاتلانہ انداز سے نعرہ لگاتا ہے کہ محمد شہید ہو گئے ہیں۔ میں نے محمد کو شہید کر ڈالا ہے۔ ایک طرف اس کے ان نعروں اور چیخ و پکار سے اور دوسری طرف قریش کے مسلسل عقبی حملوں سے مسلمانوں میں ابتری پھیل گئی ان کی صفیں ٹوٹنے لگیں۔

مبشی غلام کے قتل کیے جانے کے بعد سے اب تک قریش کا علم گرد و غبار اور خون میں لت پت پڑا تھا۔ بنی عبد الدار کی ایک باہمت لڑکی امرأہ بنت النعمان کے بڑے کر گرسے ہوئے علم کو اٹھا لیتی ہے۔ اس کو اونچا کرتی ہے۔ علم کو جیسے ہی مشرکین بیتاؤ دیکھتے ہیں اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ مکہ کے مشرکین کا پلہ اب بھاری ہو جاتا ہے اور وہ مسلمانوں پر جوابی حملہ شروع کر دیتے ہیں۔ مسلمان پناہ لینے کے لیے اُحد کی گھاٹیوں کا رخ کرتے ہیں۔ اتنے سو اس باختہ ہو جاتے ہیں کہ حضور کے قریب سے گزرتے ہیں مگر پہچان نہیں سکتے۔ چند مسلمان آپ کو گھیرے رہتے ہیں۔ آپ بہ آواز بلند ارشاد فرماتے ہیں کہ تم لوگ کہہ جا رہے ہو۔ واپس آؤ۔ میں خدا کا رسول ہوں۔“

مسلمان اتنے سراپیمہ ہو جاتے ہیں کہ حضور کی یہ آواز ان تک نہیں پہنچتی۔ ڈاکٹر منگلری واٹ کا خیال ہے کہ مسلمانوں میں یہ ابتری اور سو اس باختگی ان کی تعداد کی زیادتی کی وجہ سے تھی۔ بدر میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی انہوں نے باوجود تعداد کی کمی کے جم کر جرات اور بہت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس وقت اسلام غربت میں تھا مظلوم تھا۔ لوگ محض خلوص اور لہبیت کی خاطر لڑ رہے تھے۔

اُحد میں لڑنے والوں کی اکثریت ان لوگوں کی تھی جن کے پاس خلوص کا فقدان تھا مال غنیمت میں حصہ دار بننے کی خاطر انہوں نے جنگ میں شرکت کی تھی۔ جیب لوگوں

نے سنا کہ حضور شہید ہو گئے ہیں ایک مسلمان انس ابن النضر نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جب رسول خدا شہید ہو گئے ہیں تو ہمارا کیا کام ہے۔ کیوں نہ ہم بھی مر جائیں تلوار لیے ہوئے میدان جنگ میں جاتے ہیں۔ کافروں سے خوب لڑتے ہیں۔ دایں اور بائیں دونوں ہاتھ کا زور دکھاتے ہیں۔ زخموں سے چور چور ہو کر گر پڑتے ہیں۔

دشمن اس مقام پر آجاتے ہیں جہاں حضور مع اپنے چاہنے والوں کے تشریف رکھتے تھے۔ اس چھوٹی سی جماعت پر پتھروں اور تیروں کی بارش کی جاتی ہے حضور کے چہرہ مبارک پر ایک پتھر آ کر لگتا ہے اور آپ کا ایک دانت شہید ہو جاتا ہے۔ تلوار کا ایک وار آپ کے سر پر پڑتا ہے۔ چونکہ آپ خود اوڑھے ہوئے تھے اس لیے وہ کٹ کر آنکھوں تک آجاتا ہے۔ آپ کے چہرے سے خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔

میری خاطر کون اپنی جان بیچنے کو تیار ہے؟ آپ نے حاضرین سے پوچھا۔ پانچ انصار اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں۔ حضرت طلحہؓ حضور کے زخم کو صاف کرتے ہیں۔ یہ زخم اتنا گہرا تھا کہ زندگی بھر اس کا نشان چہرہ پر رہا۔ آپ زمین پر گر گئے۔ کافی خون بہتا رہا۔ مکہ والے آپ کو پہچان نہ سکے۔ اب چاروں طرف مسلمان جمع ہو گئے۔ شجاعت اور مردانگی کے پیکر علیؓ ابن ابی طالب اور حضور کے یار وفادار حضرت ابو بکرؓ فوراً حضور کے پاس پہنچ گئے۔

حضرت طلحہؓ حضور کو سہارا دے کر کھڑا کرتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ مل کر حضور کو اُحد کی ڈھلوان پہاڑیوں پر سے لے کر نیچے اترتے ہیں اور ایک گھاٹی میں پناہ لیتے ہیں۔

حضرت علیؓ ابن ابی طالب زخم کو صاف کرنے کے لیے پانی لے آتے ہیں۔ حضور فرماتے ہیں کہ وہ لوگ کس طریقے سے کامیاب ہو سکتے ہیں جو اپنے

رسول سے اس طرح پیش آتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کو اللہ کے لیے بلائے اور وہ فرار کی راہ اختیار کریں۔

جنگ ختم ہو گئی۔ بہت سے مسلمان فرار ہو گئے۔ بکھرے ہوئے مسلمان اُحد کے میدان کی پہاڑیوں سے نیچے آئے۔

اُحد کے میدان میں قریش اب دند ناتے پھر رہے تھے۔ ابوسفیان کی بیوی ہند مسلم شہداء کی لاشوں کی بے حرمتی کرتی پھر رہی تھی۔ لاشوں کا مثلہ کیا جا رہا تھا۔ جب ہند کو حضرت حمزہؓ کی لاش ملی تو اس نے کلیجہ لکالا اور چبانے کی کوشش کی۔ جب کھا نہ سکی تو اُگل دیا۔ شہیدوں کے اعضاء کے ہار گلے میں ڈالے پھر رہی تھی۔

کلیجہ چبانے کی رسم پرانی تھی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ کسی بہادر اور شجاع مرنے والے کا کلیجہ کھا لینے سے کھانے والے میں مرنے والے کی بہادری آجاتی ہے۔

مسلمانوں نے جہاں پناہ لی تھی اس کے مقابل کھڑے ہو کر ابوسفیان نے کہا کہ جنگ میں فتح کنوویں کے ڈول کی مثال ہے جو کبھی اوپر جاتا ہے اور کبھی نیچے۔ آج ہم نے بدد کا بدلہ لے لیا ہے۔ یہ کہہ کر نعرہ لگایا کہ اے ہیل اپنی طاقت کا مظاہرہ کر۔

حضرت عمرؓ نے خطاب کو جواب دینے کے لیے فرمایا کہ ہمارے شہیدوں کی جگہ جنت ہے۔ تمہارے مقتولوں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ یہ سن کر ابوسفیان نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ قریب آ کر اس سے بات کریں۔ حضرت عمرؓ نے اجازت سے حضرت عمرؓ ابوسفیان کے پاس گئے۔ دونوں نے آپس میں باتیں کیں۔ ابوسفیان نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ کیا ہم نے محمدؐ کو واقعی قتل کر دیا ہے۔ خدا کے لیے سچ سچ کہو۔

حضرت عمرؓ نے جواب دیا بخدا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے آپلے سے باہر ہو کر ابوسفیان سے کہا کہ حضورؐ زندہ ہیں اور ہماری بات چیت بھی سن رہے ہیں۔ جب حضرت عمرؓ یہ کہہ کر واپس جا رہے تھے، ابوسفیان نے حضرت عمرؓ کو پھر سے

آواز دی اور واپس آنے کے لیے کہا۔ جب حضرت عمر واپس آئے تو ابوسفیان نے کہا کہ تمہارے شہیدوں میں سے چند ایک کی بے حرمتی کی گئی ہے اور ان کی لاشوں کا مثلہ کیا گیا ہے۔ میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ ہم آئندہ سال تم لوگوں سے بدر میں پھر ملیں گے۔ قریش نے اپنے مقتولین کے ہتھیار جمع کیے۔ اوسٹوں پر سامان لادا اور خود گھوڑوں پر پابہ رکاب ہو گئے۔

یادگار تاریخیں

| | |
|-------------|---------------------------|
| ۶۵۷۰ | حضور کی پیدائش |
| ۶۶۱۳ | تبلیغ کی ابتداء |
| ۶۶۲۲ جون | مدینہ کو ہجرت |
| ۶۶۲۴ مارچ | جنگ بدر |
| ۶۶۲۴ مارچ | اسماء بنت مروان کا قتل |
| ۶۶۲۴ اپریل | بنی قنیقاع کا اخراج |
| ۶۶۲۴ اپریل | ابوسفیان کا حملہ |
| ۶۶۲۴ جون | ذوالعمر کا حملہ |
| ۶۶۲۴ جولائی | کعب بن اشرف کا قتل |
| ۶۶۲۴ اگست | بحراں پر حملہ |
| ۶۶۲۴ ستمبر | قرہہ میں کاروانوں پر حملہ |
| ۶۶۲۵ مارچ | جنگ احد |

حملے اور مسلمانوں کے قواعد و ضوابط

جس دن اُحد کی جنگ ہوئی مسلمانوں کی صفوں کے پیچھے اُحد کا پہاڑ تھا۔ ان کے سامنے قریش تھے۔ مسلمانوں اور مدینہ کے درمیان اب قریش مائل ہو گئے تھے اپنی فتح کے بعد مکہ کے لوگ اگر مدینہ کا رخ کرتے تو شاید ان کو عبداللہ ابن ابی کی حمایت حاصل ہو جاتی اور ساتھ ہی ساتھ یہودی بھی ان کے ہم لڑا ہو جاتے۔ اس طرح جنگ کی فتح کے ثمرات سے وہ خاطر خواہ مستفید ہو سکتے تھے۔

دوسری صورت جو وہ اختیار کر سکتے تھے وہ یہ تھی کہ جہاں ان کے کئی آدمی مارے گئے وہیں چند اور کی موت واقع ہوتی، اُحد کے پہاڑ پر چڑھ جاتے اور حضور کا اور ساتھ ہی ان جانثار مسلمانوں کا جو پر والوں کی طرح شمع محمدی سے پلٹے ہوئے تھے فائدہ کر دیتے۔ اوسقیان نے جب حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ کیا محمدؐ شہید ہو گئے ہیں اور اُسے جواب دیا گیا تھا کہ بخدا نہیں۔ اس کے باوجود اوسقیان نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

ہمارے اپنے زمانہ میں جنگ کے دوران اور جنگ کے بعد ہر قسم کے سفاکانہ اور ظالمانہ سلوک اپنے دشمنوں کے ساتھ روار کھے جاتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عرب قبیلے محض اپنے دشمنوں کی جان لینے یا ان کو نیست و نابود کرنے جنگ نہیں لڑتے تھے۔ بنی کنانہ اور چند ایک اور قبیلوں کے افراد کے علاوہ جتنے لوگوں نے بھی قریش کی

طرف سے جنگ میں حصہ لینا تھا ان میں خانہ بدوش قبیلوں سے کوئی بھی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ قریش تاجر تھے۔ تجارت کے لیے امن بہر حال ضروری سمجھا جاتا تھا۔

قریش نے اُحد کی جنگ محض اس لیے لڑی تھی کہ بدر میں ان کے ۴۹ اور ۷۰ کے درمیان آدمی مارے گئے تھے۔ ان کو اپنے مقتولین کا بدلہ لینا تھا۔ اُحد کی لڑائی میں نتیجہ بدر کے برعکس ہوا۔ ۷۲ مسلمان شہید ہوئے۔ گو مشرکین کو فتح حاصل نہ ہو سکی لیکن وہ اپنا بدلہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔

ساتویں صدی عیسوی کے ایک عام عرب کے نزدیک مکمل اور کامیاب تین فتح کے تصور سے بڑا اور اہم تصور بدلہ اور انتقام لینا تھا۔ مکہ کے ہر مکتب خیال نے اس بات کو کافی سمجھ لیا کہ انہوں نے بدر میں مارے جانے والوں کا بدلہ اچھی طرح سے لے لیا ہے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ان کو اس بات سے خوشی ہو رہی تھی کہ جس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ یہاں تک آئے ہیں اس میں انہیں کامیابی ہو گئی ہے ابوسفیان کا یہ کہنا کہ یہ بدر کا بدلہ ہے، کہ والوں کی فکر و نظر کی ترجمانی کر رہا تھا۔

بے شک انہوں نے اس بات کو بھی ملحوظ رکھا ہو گا کہ مدینہ کی بستیوں پر حملہ کر کے ان پر قبضہ کر لینا ان کے بس کی بات نہیں۔ گو عبداللہ ابن ابی نے جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن مدینہ واپس ہو کر وہ شہر کی مدافعت کا بند و بست کر رہا تھا۔

عبداللہ ابن ابی کا یہ عمل اس کی ہوشیاری کا نتیجہ تھا۔ قریش اس بات کو ملحوظ رکھے ہوئے تھے۔ اس کا یہ عمل مسلمانوں کے لیے بہت ہی سود مند ہو جاتا اگر قریش مدینہ پر حملہ یا قبضہ کرنے کی کوشش کرتے۔

اُحد کے پہاڑ پر سے مسلمان یہ دیکھ رہے تھے کہ قریش اپنے سامان کو اکٹھا کر کے اونٹوں پر لاد رہے تھے۔ بھنور نے خطرہ کو بھانپتے ہوئے حضرت علیؑ کو مکہ والوں کے پیچھے پیچھے یہ دیکھنے کے لیے روانہ کیا کہ کہیں یہ لوگ مدینہ کا رخ تو نہیں کر رہے ہیں۔

حضرت علیؓ جب واپس آئے تو حضورؐ کو اطلاع دی کہ وہ لوگ مدینہ کی حدود کے باہر سے ہوتے ہوئے مکہ جانے کا راستہ اختیار کر چکے ہیں۔

اب مسلمان اپنی اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکلنے لگے۔ تھکے ماندے اور زخموں سے چور مسلمان اپنے اپنے قرابت داروں کو گنج شہیدان میں ڈھونڈنے لگے۔

حضورؐ نے جب حضرت حمزہؓ کی لاش کی تلاش کی تو وہ مثلہ کی ہوئی ملی۔ اس درناک منظر کو دیکھ کر قسم کھائی کہ وہ حمزہؓ کی نعش کے بدلہ میں ۳ قریشیوں کی نعشوں کا مثلہ کریں گے جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو آپؐ نے اپنی قسم کو توڑ دیا۔ مسلمانوں کو حکم دیا کہ آئندہ جنگوں میں کبھی بھی نعش کا مثلہ نہ کیا جائے۔

جنگِ اُحد میں ۷۲ مسلمان شہید ہوئے۔ ان میں ساٹھ اور ستر کے درمیان انصار تھے۔ چار یا پانچ ہماجرین تھے۔ ۲۲ مشرکین قتل ہوئے جو حضورؐ نے مسلمان شہیدوں کی نماز جنازہ ادا کی اور پھر ان کو دفن کیا گیا۔

اسی اثناء میں کئی ایک مسلمان عورتیں مدینہ سے وہاں پہنچ گئیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گئیں۔ زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ انہی کے ساتھ حضورؐ کی چچی صفیہؓ جو حمزہؓ کی بہن تھیں، اپنے بھائی کی شہادت کی خبر سن کر میدان میں تشریف لائیں۔ صفیہ زبیر بن العوام کی ماں بھی تھیں۔ زبیر وہ ہیں جو حضورؐ کے جانثاروں میں شامل ہو کر اس موقع پر آپؐ کی حفاظت کر رہے تھے۔

حضورؐ نے اپنے منہ بولے بیٹے زیدؓ کو صفیہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ ان کے ذریعہ صفیہؓ کو کہلا بھیجا کہ وہ میدان سے واپس ہو جائیں تاکہ اپنے بھائی کی مثلہ کی ہوئی نعش نہ دیکھ سکیں۔ صفیہؓ نے جواب دیا کہ میں جانتی ہوں کہ میرے بھائی کی نعش کو مثلہ کیا گیا ہے۔ قدرت کی طرف سے جو کچھ بھی ہوا، اس پر میں راضی بہ رضا ہوں۔ میں اپنے آپ کو انشاء اللہ صابر رکھوں گی۔ سب کچھ دیکھ کر بھی اپنی زبان اور اپنے جذبات پر قابو رکھوں

گی۔ یہ کہہ کر وہ خاموشی سے آگے بڑھیں اور اپنے بھائی کے جنازہ پر دعائے مغفرت پڑھی۔
آپ کی دعائے مغفرت کے بعد مسلمانوں نے تمام شہیدوں کو جنگ ہی کے میدان میں
دفن کیا اور تھکے ماندے مدینہ واپس ہوئے۔

دوسرے دن حضورؐ نے مدینہ کی تمام بستیوں میں اپنا نقیب روانہ کیا۔ وہ ان تمام لوگوں
کو حاضر ہونے کے لیے کہہ رہا تھا جو لڑنے کے لیے آگئے تھے۔

آپ ان تمام لوگوں کو لے کر دشمن کے تعاقب میں پھر نکلے اور مدینہ سے کوئی پچاس
میل دور حمرہ الاسد میں جا کر رُکے۔ آگ روشن کی گئی۔ تاثر یہ دیا گیا کہ ایک بہت ہی
بڑی فوج اس مقام پر آئی ہوئی ہے۔ یہ مسلمانوں کے حوصلے بلند کرنے کے بڑا ہی دانشمندانہ
تدبیر اٹھایا گیا تھا۔ جہاں ایک طرف مسلمانوں کے حوصلے بڑھانا مقصود تھا۔ وہیں قریش کو
یہ دکھلانا تھا کہ مسلمان ابھی بارے نہیں ہیں۔

پہلے دن کا سفر ختم کرنے کے بعد رات میں قریش نے اپنا پڑاؤ ڈالا۔ اب وہ کف
انفوس ل رہے تھے کہ موقع ملنے کے باوجود انہوں نے مسلمانوں کا قلع قمع کیوں نہ کر ڈالا۔
لوگوں نے آوازیں لگانی شروع کیں کہ مدینہ واپس چلا جائے۔ فتح کو حتمی صورت دی جائے
اتفاق سے یہاں تبیلہ خزاعہ کا ایک بدوی جو مدینہ سے آ رہا تھا اور حضورؐ کو مہمہ آپ کی
جماعت کے دیکھ چکا تھا مکہ والوں سے ملتا ہے اور مسلمانوں کی جماعت کے بارے میں
ذکر کرتا ہے۔ ابوسفیان اُس بدوی کو اپنے قریب بلا کر اس سے تفصیلات دریافت
کرتا ہے۔

خزاعہ کے تعلقات مسلمانوں سے دوستانہ تھے۔ ابھی ان کی اکثریت بہت پرست
تھی۔ اُس بدوی نے قریش کے سربراہوں سے کہا کہ مسلمان ایک بڑی فوج کے ساتھ قریش
کا پیچھا کر رہے ہیں اور اتنے غضب آلود ہیں کہ وہ اپنے شہیدوں کا بدلہ بہر حال لینا
چاہتے ہیں۔ قریش کی فوج نے جب یہ سنا تو فوراً اپنا بڑا بستر اٹھایا اور جلدی جلدی

کہ کی طرف روانہ ہوئے۔ رات میں کہیں سستانا تک خطرہ کا باعث سمجھا۔
 بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں دنیا میں ایک بڑے تہلکے کا باعث بن جاتی ہیں۔
 چھوٹے چھوٹے اتفاقات دنیا کو ایک نئی موڑ پر لاکھڑا کر دیتے ہیں۔ اگر یہ بدوی اہل سفیان
 کے سامنے مسلمانوں کی اصل صورت حال دکھ دیتا تو شاید اہل سفیان اپنی بڑی فوج لے کر مسلمانوں
 کی جماعت کی تلاش میں نکلتا اور سب کو ہلاک کر دیتا۔

احد کی شکست کا جواز پیش کرنا اس وجہ سے بھی مشکل ہے کہ بدر کی فتح کو حضورؐ نے
 تائیدِ نبوی کا نتیجہ قرار دیا تھا۔

قرآن کے سورہ آل عمران کی ۱۲۰ سے ۱۹۹ آیتوں میں تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کی اس
 شکست کا ذکر آیا ہے۔

متعلقہ آیات کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

”اور (دیکھو) بے دل نہ ہونا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا۔ اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب
 رہو گے۔“

• اگر تمہیں زخم (شکست) لگا ہے تو ان لوگوں کو بھی ایسا زخم لگ چکا ہے اور یہ دن
 ہیں کہ ہم ان کو لوگوں میں بدلنے رہتے ہیں۔ اس سے یہ مقصود تھا کہ خدا ایمان والوں کو
 میسر کر دے اور تم میں سے گواہ بنائے۔ خدا بے انصافوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ بھی مقصود
 تھا کہ خدا ایمان والوں کو خالص (مومن) بنا دے اور کافروں کو نابود کرے۔ کیا تم یہ سمجھتے
 ہو کہ بے آزمائش، بہشت میں داخل ہو جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی خدا نے تم میں سے جہاد
 کرنے والوں کو تو اچھی طرح معلوم کیا ہی نہیں اور (یہ بھی مقصود ہے) کہ وہ ثابت قدم
 رہنے والوں کو معلوم کرے۔ تم موت کے آنے سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے سو تم
 نے اس کو آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اور محمدؐ تو صرف پیغمبر ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے
 پیغمبر ہو گزرے ہیں۔ بھلا اگر یہ مرجائیں یا مارے جائیں تو تم اُسے پاؤں پھر جاؤ گے؟

اور بولے پھرے گا تو خدا کا کچھ نقصان نہیں کر سکے گا۔ خدا نے اپنا وعدہ سچا کر دیا یعنی اُس وقت جب کہ تم کافروں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ جو تم چاہتے تھے خدا نے تم کو دکھا دیا۔ اس کے بعد تم نے ہمت ہار دی اور حکم اپنی گھبراہٹ میں جھک کر کرنے لگے۔ اُس کی نافرمانی کی۔ بعض تو تم میں سے دنیا کے خواستگار تھے اور بعض آخرت کے طالب۔ اُس وقت خدا نے تم کو ن سے پھیر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا۔ خدا مومنوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ (وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے) جب تم لوگ درجہ لگے جاتے تھے اور کسی کو پیچھے پھر کر نہیں دیکھتے تھے اور رسول اللہ تم کو تمہارے پیچھے کھڑے بنا رہے تھے تو خدا نے تم کو غم پر غم پہنچایا تاکہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہی یا جو مصیبت تم پر واقع ہوئی ہے اُس سے رنجیدہ نہ ہو اور خدا تمہارے سب اعمال سے خبردار ہے۔

جو لوگ تم میں سے (اللہ کے دن) جب کہ (مومنوں اور کافروں کی) دو جماعتیں ایک دوسرے گتھ گئی تھیں بھاگ گئے تو ان کے بعض افعال کے سبب شیطان نے ان کو پھلا دیا۔ مگر خدا نے ان کا قصور معاف کر دیا۔ بے شک خدا بخشنے والا اور بردبار ہے۔

مشرکین اور مسلمانوں کی اس باہمی رنجشوں اور مخالفتوں کا اثر اب ان قبیلوں پر پڑنا شروع ہوا جو مکہ اور مدینہ کے قرب و جوار میں رہا کرتے تھے۔

حضور نے پہلے ہی سے خزاعہ اور حبیہ قبیلوں سے دوستانہ تعلقات استوار کر لیے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بنی کنعانہ کے بعض لوگ مکہ کے مشرکین کے ساتھ اُحد میں مسلمانوں سے لڑ چکے تھے۔ اُحد کے واقعہ کے دو مہینے بعد مئی ۶۲۵ء میں کچھ قبیلوں کے لوگ جو مکہ اور مدینہ کے درمیان رہا کرتے تھے۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان لوگوں نے درخواست کی کہ ان کے قبیلے کے لوگوں کو اسلام سے روشناس کروانے کے لیے کچھ مالوں کو ان کے ساتھ ان کے علاقوں میں روانہ کیا جائے۔ حضور نے ان کی اس دعوت کو قبول کر لیا

چھ لیے مسلمانوں کو ان کے ساتھ روانہ کیا جو لکھ پرچھ سکتے تھے۔ یہ جماعت آگے بڑھی۔ مکہ سے تیس میل کے فاصلے پر پانی لینے کے لیے یہ لوگ رُک گئے۔ اُس مقام پر مفضل قبیلے کی ایک شاخ بنی لیمان نے اس جماعت پر حملہ کیا۔ چھ مسلمانوں میں سے تین شہید کیے گئے۔ تین کو حراست میں لے لیا گیا۔ ان تین میں سے بھی ایک مسلمان شہید کیا گیا جو فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ باقی دو جو رہ گئے تھے ان میں سے ایک خبیث بن عدی تھے اور دوسرے زید بن دثنہ ان دونوں حضرات کو قریش کے ہاتھوں بیچ دیا گیا۔

الحارث ابن عامر ابن نوفل کے خاندان والوں نے خبیث کو خرید لیا۔ الحارث جنگ بدر میں خبیث کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ الحارث کے لوگ حضرت خبیث کو قتل کرنے کے لیے مکہ کے باہر ایک ایسے مقام پر لے گئے جو اس غرض سے استعمال میں لایا جاتا تھا اور مقدس بھی سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنے قاتلوں سے درخواست کی کہ قتل سے قبل ان کو دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ ان کی درخواست منظور کی گئی۔ اسی واقعے کے بعد سے مسلمانوں میں یہ روایت چل پڑی کہ اگر کوئی مسلمان قتل ہو رہا ہو تو اپنے قتل سے قبل دو رکعت نماز پڑھے۔

جب حضرت خبیث نے اپنی نماز کی تکمیل کر لی اور اپنے جذبہ عبودیت کو سرشار کر لیا تو ان کو صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ رومی صلیب پر چڑھا کر کیلیں مٹھونکا کرتے تھے۔ عرب دسی سے باندھ دیتے تھے۔

ان کو باندھ کر جب صلیب کو اونچا کیا گیا تو ہونے والے مصلوب نے زور زور سے کہنا شروع کیا۔ اے اللہ۔ تو ان سب سے اپنا حساب لے جو آج یہاں جمع ہیں۔ ان کو ایک ایک کر کے نیت و نابود کر۔ ان میں سے کوئی بھی بچنے نہ پائے۔

اس موقع پر ابوسفیان بھی اپنے بیٹے معاویہ کے ساتھ یہاں تھا۔ معاویہ کا لڑکپن تھا۔ اس واقعہ کے ہم سال بعد حضرت معاویہؓ مسلمانوں کے خلیفہ بنتے ہیں اور عالم اسلام

پر اس طرح حکومت کرتے ہیں کہ روئے زمین پر اس وقت ان سے بڑا کوئی اور بادشاہ یا حکمران نہیں تھا۔

حضرت معاویہؓ اپنی ذہنی یادداشت کو تازہ کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ جب خبیث نے صلیب پر سے کو سنا شروع کیا تو ان کا باپ ابوسفیان غنٹہ سے اُل بگولہ ہو گیا حضرت خبیث کو صلیب پر سے زمین پر رست پٹکا۔ ابوسفیان کا مقصد یہ تھا کہ خبیث کی بد دعا کا شکار سب سے پہلے وہ خود ہوں۔

الحارث کا کم سن بیٹا غلبہ اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے حضرت خبیث کے قریب لایا گیا۔ بچے کے ہاتھ میں ایک نیزہ دیا گیا اور اس کے بازو ایک اور آدمی کو کھرا کیا گیا۔ بچے کے ہاتھ پر اس آدمی کا ہاتھ رکھ کر نیزہ حضرت خبیث کو چھبایا جانے لگا حتیٰ کہ خبیث کی روح نفسِ منشری سے پرواز کر گئی۔

دوسرے قیدی زید تھے۔ ان سے امیہ ابن خلف کا بدلہ لیا گیا۔ زید نے امیہ بن خلف کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا تھا۔ حضورؐ نے ایک اصول یہ بھی وضع فرمایا تھا کہ خون بہا دینے کے لیے سارے مسلمان ایک خاندان تصور کیے جائیں اسی لیے زید مسلم خاندان کے ایک فرد قرار دیے گئے حالانکہ امیہ کے قتل سے ان کو دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

اس قسم کے سفاکانہ اور بہیمانہ قتل پھر ایک بار اس تضاد کو پیش کرتے ہیں جو عربوں میں پائے جاتے تھے۔ ایک طرف تو ان کی بہادرانہ اور جرات مندانہ لڑائیاں تھیں اور دوسری طرف خون کا بدلہ لینے کے لیے ہر قسم کی سفاکانہ حرکت اختیار کرنے پر وہ تیار رہتے تھے۔

ابوسفیان نے احد کے میدان میں عمر بن الخطاب سے ہالمشافہ بات کی تھی۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے کے رشتہ دار کو قتل نہیں کیا تھا۔ اس کے برخلاف ابوسفیان کی بیوی ہند نے حضرت حمزہؓ کی نعش کی بے حرمتی کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت حمزہؓ نے ہند کے باپ عقبہ کو قتل کیا تھا۔ اسی طرح یہاں ایک بچہ کو اکسایا گیا کہ اپنے باپ کے قتل

کا بدلہ لے۔

قبیلہ عضل نے مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ غداری کی تھی۔ ان کو غداری کا مزہ چکھانے کے لیے حضور نے ایک مسلمان کو روانہ کیا۔ جون ۶۲۵ء میں اس مسلم سرکردہ لشکر نے اس قبیلہ کے سردار کا سر قلم کر دیا۔

دو آدمی ابوسفیان کے قتل کے لیے مکہ روانہ کیے گئے۔ ایک تو مکہ ہی کا آدمی تھا اور دوسرا انصار میں سے تھا۔ مکہ کا آدمی تو راستہ میں پہچان لیا گیا۔ جیسے ہی اُسے پہچانا گیا اس نے چیخ و پکار اور آہ و زاری شروع کر دی۔ اس طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اس کا بیچھا کرنے والوں میں سے ایک مارا گیا۔ واپسی میں اس نے دو بت پرستوں کو قتل کیا ایک آدمی کو قیدی بنا کر حضور کی خدمت میں لے آیا۔ حضور نے اس کی تعریف فرمائی۔

حضور کے احکام پر کسی کا قتل کرنا یا قتل ہونا ایک تنازعہ فیہ مسئلہ بن کر رہ گیا ہے چند مغربی مصنفین نے اس قسم کے قتل کو سیاسی استبداد سے تعبیر کیا۔ بعض یہ کہہ کر اس عمل کی حمایت کرتے ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی میں یہ ایک عام طریقہ اور عربوں کا شعار تھا۔ ان دونوں میں سے کسی کا بھی نظریہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ بظاہر تو اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ لوگوں کو قتل کرنا واقعی عربوں کا شعار تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سارے لوگ تشدد اور بہیمانہ طریقے سے قتل کا شکار ہوتے تھے لیکن ان کی دو بڑی وجوہ رہی ہیں۔

ایک تو غصہ میں آپے سے باہر ہو کر کسی کا قتل کر دینا یا میدان جنگ میں مقابلہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کو قتل کرنے کی کوشش کرنا۔

ان دونوں صورتوں میں خاندانی بنیادوں پر قاتل سے بدلہ بہر حال لیا جاتا تھا۔ قاتل کو اور اس کے رشتہ داروں کو اپنی زندگی کی میعاد کم نظر آنے لگتی تھی۔ بدلہ لینے کا تصور اتنا گہرا ہوتا تھا کہ قتل کرنے سے قبل قاتل کو کئی بار سوچنا پڑتا تھا۔ اسی لیے کسی کا قتل کرنا ان کے ہاں بظاہر اتنا آسان نہیں تھا۔

حضرت کی رادی زندگی میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں ملتا کہ کسی نے حضور کو قتل کرنے کے ارادہ سے کسی کو روانہ کیا ہو یا خود اس کی کوشش کی ہو۔ دو آدمیوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ قتل کرنے کے ارادہ سے حضور تک پہنچے مگر جیسے ہی قریب پہنچے ان کے اوسان خطا ہو گئے اور ان کی نین چھوٹ گئی۔ قتل کی ہمت نہ کر سکے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ حضور جب مکہ میں رہتے تھے کس طرح آپ کا خاندان آپ کو ہر قسم کے شر و فساد سے محفوظ رکھتا تھا۔ خاندان والوں ہی کے ڈر سے مکہ کے مشرکین آپ کے ساتھ کسی بھی تشدد سے پیش نہیں آتے تھے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضور جب مدینہ میں تشریف رکھتے تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ مکہ والوں کی توش عالی کا دیوالیہ نکل جائے کہیں یہ ذکر نہیں ملتا کہ قریش کے لوگوں نے کسی شخص کو روانہ کر کے حضور کو قتل کرنے کی کوشش کی ہو۔

اس کے برخلاف مسلمانوں نے اوسنیان کو قتل کرنے کے لیے لوگوں کو مکہ روانہ کیا۔ دشمنوں نے آپ کو قتل کرنے میں جو اجتناب کیا اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے نزدیک ایسا کرنا گناہ تھا۔ ان کو ایسا کرنے سے آپ کے خاندان کا خوف مانع تھا۔

ابن قیمہ کا یہ کہنا کہ احد کی جنگ میں وہ قتل کر سکتا تھا چرب زبانی اس لیے نہیں تھی کہ اس کا تعلق قریش سے نہیں تھا بلکہ بنی کنانہ سے تھا۔

حضور نے قریش کے لوگوں کے خلاف جو قدم اٹھایا وہ آپ کی جرات اور ہمت کا نتیجہ تھا۔ آپ خاندانی ڈر اور حفاظت کے جذبہ کو پس پشت کرنا چاہتے تھے جس کا سہارا لے کر قریش کے لوگ آپ کے خلاف قدم اٹھانے سے ڈرتے تھے۔

مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جانے والے اب وہ لوگ تھے جو اسلامی تحریک کے مخالف تھے۔ حضور سے ذاتی مخالفت ان کے قتل کا باعث نہ تھی۔ نہ ہی آپ کا کسی کو پسند نہ کرنا اس کی موت کا باعث بنا۔ یہی وجہ تھی کہ عبد اللہ ابن ابی کو قتل کرنے کی کوئی کوشش

نہیں کی گئی اس لیے کہ وہ بظاہر مسلمان ہو چکا تھا۔

خاص طور پر اس اصول کا اطلاق یہودیوں پر ہوتا تھا۔ حضورؐ نے یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے وہ شرطیں عاید نہیں کی تھیں جو بت پرستوں کے لیے تھیں۔ ان کو اپنا مذہب بدلنے کے لیے مجبور نہیں کیا گیا تھا۔

مدینہ کے تین یہودی قبیلوں کو شہر بدر کرنے کے بعد بھی کافی تعداد میں یہودی مدینہ میں رہا کرتے تھے۔ اپنے کاروبار کو بغیر کسی روک ٹوک کے جاری رکھے ہوئے تھے۔ یہودی قبیلوں کو جو شہر بدر کیا تھا وہ اس لیے نہیں کہ آپ کو یہودیت یا عیسائیت سے نفرت تھی۔ اس لیے ان کو نکالا گیا کہ وہ اسلام کی تعلیمات کو شک اور شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہر بات میں توریت کے قصص کو بیان کر کے آپ کی تعلیمات میں نقص نکالا کرتے تھے۔

اس بات کو قبول کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کی کہ اس وقت سے لے کر آج تک اس قسم کے قتل مسلم معاشرے کا جزو بنتے گئے اور اپنا دور رس اثر چھوڑتے گئے۔ مسلم مالک میں سیاسی نوعیت کے قتل اکثر و بیشتر ہوتے رہے ہیں۔

ربیع کے سانحے کچھ عرصہ بعد ایک نئی کروٹ لی۔ مئی یا جون ۶۲۵ء میں نجد کا ایک سردار ابو بڑہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ ایک ضعیف العمر آدمی تھا۔ ہوازن کی ایک شاخ بنی امیر ابن ساسا کا سردار بھی تھا۔ اس نے کہا کہ اگر اس کے قبیلے کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر رضامند کر لیا جائے تو وہ بھی اسلام قبول کر لے گا۔ اس نے حضورؐ سے درخواست کی کہ کچھ مسلمان نجد روانہ کیے جائیں تاکہ وہ لوگوں کو اسلام سے روشناس کرائیں۔

الربیع میں چونکہ مسلمانوں کو جو اسی مقصد کے لیے روانہ کیے گئے تھے، شہید کر دیا گیا تھا اس کے پیش نظر حضورؐ اس کی درخواست پر رضامند ہونے سے تامل فرمایا ہے

تھے۔ ابو بترہ نے وعدہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو اپنی حفاظت اور نگرانی میں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ ابن اسحاق کے بیان کے مطابق چالیس مسلمانوں کو اس کے ساتھ کر دیا گیا۔ بلبریا نے ان کی تعداد ستر بیان کی ہے۔ واقفیت نے چالیس اور ستر دونوں کا ذکر کیا ہے۔

مدینہ کے جنوب مشرق میں ۵ میل کے فاصلے پر بیر معونہ کے قریب یہ جماعت رُکئی۔ اس جماعت پر بنی سلیم نے حملہ کیا۔ حملہ پر اگلنے والوں میں امیر ابن طفیل تھا جو ابو بترہ کا بھتیجہ تھا۔ مسلمانوں نے آخر دم تک مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔ اس دوران دو آدمی اپنے اونٹوں کو چرنے کے لیے بیر معونہ سے کچھ دور نکل گئے۔ جب واپس ہوتے تو دیکھا کہ تمام مسلمان اور بنی سلیم کے اکثر لوگ مرے پڑے ہیں ان میں سے ایک نے کہا کہ دشمنوں کی نظر ہم پر نہیں پڑی ہے اس لیے ہم کو سیدھے مدینہ جانا چاہیے اور حضور کو مطلع کرنا چاہیے۔ دو سکر نے کہا کہ اس کے تمام ساتھی شہید ہو چکے ہیں اب وہ زندگی میں لطف حاصل نہیں کر سکے گا۔ یہ کہہ کر اس نے خودکشی کر لی۔

بیر معونہ پر جو مسلمان شہید ہوئے تھے۔ ان میں ایک عامر ابن قبیہ بھی تھے یہ وہی عامر ہیں جن کو حضرت ابو بکر نے غلامی سے چھڑوا کر آزاد کروایا تھا اور ہجرت میں یہ حضور اور ابو بکر کے ساتھ تھے، بیر معونہ کے قتل سے بچا ہوا واحد مسلمان جب مدینہ واپس ہوا تھا اس کو راستے میں ابو بترہ اور عامر ابن طفیل کے قبیلوں کے دو افراد ملے۔ یہ دونوں جو مدینہ سے آئے تھے بیر معونہ کے واقعے سے بالکل لاعلم تھے، ان کے ساتھ کوئی مسلح نگران کار بھی نہیں تھا۔ عامر نے اپنے ساتھی شہیدوں کا بدلہ لینے کے لیے ان دونوں افراد کو قتل کر دیا۔ حضور نے اس کی اس حرکت کو سخت ناپسند فرمایا۔

ابو بترہ اور قبیلہ عامر کے لوگوں سے حضور کے دوستانہ تعلقات تھے۔ انہوں نے خود حضور سے درخواست کی تھی کہ اسلام کی تبلیغ کے لیے مسلمانوں کو ان کے قبیلوں

میں روانہ کیا جائے۔

ابو ترہ کا بھتیجہ اپنے چچا کے اُس اقدام کو جو اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں تھا بذاتِ خود ناپسند کرتا تھا۔ اس کے قبیلے کے لوگ اس کے ہم خیال نہیں تھے۔ اس کی مدد یا حمایت کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ بالآخر اس نے بنی سلیم کو پہکا کر مسلمانوں کی قتل و غارتگری کے لیے آمادہ کیا۔

چونکہ بنی سلیم نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا اس لیے بدلہ اب بنی سلیم سے لینا تھا۔ حضورؐ وانشندی کے پیش نظر بنی عامر سے اب کوئی خصومت نہیں مول لینا چاہتے تھے۔ بنی عامر خود مسلمان ہونے کے قریب تھے۔ طے یہ ہوا کہ مقتولین کا خون بہا مسلمان ادا کریں۔ چار مہینوں کے اندر باہر مسلمانوں کو یکے بعد دیگرے تین ناگہانی حادثات سے دوچار ہونا پڑا۔ اُحد کا واقعہ، الریح میں مسلمانوں کا شہید ہونا، پھر اس کے بعد میر معونہ میں مسلمانوں کا جانی نقصان۔

تاریخ میں کہیں اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ ان واقعات کی وجہ سے آپؐ پست ہمت ہوئے ہوں یا مسلمان ان حادثات سے دل برداشتہ ہو کر دین سے برگشتہ ہوئے ہوں۔ اس کے برخلاف یہ ضرور ہوا کہ مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کرنے اور کافروں کو یہ بتلانے کے لیے کہ مسلمان ان سے ڈرنے والے نہیں، حضورؐ نے ایک فتح مندانہ قدم اٹھانے کی ضرورت محسوس کی۔ اُحد کی جنگ کے بعد عرب کے مختلف قبیلوں میں قریش نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ اب مسلم تحریک زوال پذیر ہے اور مستقبل قریب میں اسلام ختم ہو جائے گا۔

بنی عامر کے بن دو لوگوں کو قتل کیا گیا تھا ان کا خون بہا ادا کرنے کے لیے حضورؐ نے مسلمانوں سے رقم جمع کی۔

حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کو اپنے ساتھ لیے حضورؐ بنو نضیر کے

یہودیوں کی بستی میں تشریف لے گئے۔ ان سے مالی امداد کی درخواست کی۔ یہودیوں نے
خندہ پیشانی سے حضورؐ کا استقبال کیا اور مالی مدد اور تعاون پر رضامندی ظاہر کی۔

ابن اسحاق کے بیان کے مطابق اس موقع پر یہودیوں نے آپس میں مشورہ کرنا شروع
کر دیا کہ حضورؐ کو جان سے مار ڈالنے کا یہ سنہرا موقع ہے۔ اس کو ہاتھ سے دجانے دینا
چاہیے۔ حضورؐ اس وقت کھلم میدان میں ایک گھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر تشریف لے رہے تھے
ایک یہودی علمبردار نے اس بات کے لیے تیار ہوا کہ وہ گھر کی چھت پر چڑھ کر اوپر سے سر مبارک
پر ایک بڑا پتھر پھینکے۔ مسلمان یہودیوں کی اس سازش سے واقف ہو گئے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ حضورؐ کو عینب سے اس خطرہ سے آگاہ کر دیا گیا تھا آپ ذرا
وہاں سے اٹھ کر باغ کی طرف تشریف لے گئے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت فرمائی کہ
وہ وہیں ٹھہرے رہیں۔

حضورؐ وہاں سے مدینہ تشریف لے گئے۔ مسلمانوں کو جمع کیا اور یہودیوں کی سازش
کو بیان کر کے کہا کہ بنی نضیر سے جنگ کرنی چاہیے۔

یہودیوں نے اپنے آپ کو اپنے قلعہ بند قسم کے گاؤں میں محصور کر لیا۔
عبداللہ ابن ابی اور اس کے ہم خیالوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے بنی نضیر
کے یہودیوں سے کہا کہ وہ مسلمانوں کے حملے کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور وہ ان کی مدد کے لیے
تیار ہیں۔ بنی نضیر کاشت کار تھے۔ ان کی بستیوں کے آس پاس بہترین قسم کے کھجور
کے باغات تھے۔

حضورؐ نے حکم دیا کہ سنا کے طور پر ان کے کھجوروں کے درخت کاٹ ڈالے جائیں
بنی نضیر اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر سے واویلا مچا رہے تھے اور کہتے تھے کہ اے
محمدؐ آپ ہی نے تو ہمیں تباہی و بربادی سے منع کیا تھا۔ اب آپ کیوں ہمارے کھجور
کے درختوں کا ناس کر رہے ہیں۔

بظاہر یہ بات تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ ان باغات کی تباہی کا حکم دیا تھا جب کہ وہی باغات مسلمانوں کی خوش حالی کا باعث بن سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اس بات کا خطرہ محسوس فرما رہے ہوں کہ عبد اللہ ابن ابی یہودیوں کی مدد کے لیے آرہا ہو۔ اس کی بدولت کی وجہ سے شاید یہودیوں سے کوئی فیصلہ کن جنگ ہو۔ آپ کے اس فیصلہ پر کسی بھی قسم کے اعتراض کو قرآن نے رو کر دیا ہے

سورہ حشر کی پانچویں آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

” آپ نے جن کھجوروں کے درختوں کو کاٹ دیا ہے یا جنہیں باقی رکھلے وہ سب خدا کے حکم سے کیا ہے اور مقصد یہ تھا کہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔“

نمبر ۶۱۵ء میں یہ محاصرہ ختم ہوا۔ بنی نضیر نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیئے کہ وہ مدینہ سے ہجرت کر کے شام چلے جائیں گے۔ سارا اثاثہ اپنے ساتھ لے جائیں گے اور اپنے ہتھیار مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے۔

سورہ حشر میں بیان فرمایا گیا ہے۔

” وہی تو ہے جس نے کفار اہل کتاب کو حشر اول کے وقت ان کے گھروں سے نکال دیا۔ تمہارے خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور وہ لوگ یہ سمجھے ہوتے تھے کہ ان کے قلعے ان کو خدا کے عذاب سے بچالیں گے۔ مگر خدا نے ان کو وہاں سے لیا۔ جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا۔ ان کے دلوں میں دہشت ڈال دی کہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں اور مومنوں کے ہاتھوں سے اجاڑنے لگے۔ اے آنکھیں رکھنے والو عبرت پکڑو۔ اگر خدا نے ان کے بارے میں جلا وطن کرنا نہ لکھ رکھا ہوتا تو ان کو دنیا میں بھی عذاب دیدیتا اور آخرت میں تو ان کے لیے آگ کا عذاب تیار ہے۔“

بنی نضیر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ شام جاتے وقت اپنی ایک ایک چیز لیتے گئے حتیٰ کہ اپنے گھروں کے دروازے تک اکھاڑ کر لے گئے۔ ان کے دوسرے دار سلام ابن ابی الحقیق

اور محمد ابن اسلم نے یمن میں رہائش اختیار کی۔

یہودیوں نے جلتے وقت اچھا تاثر چھوڑنے کی خاطر مدینہ میں ایک خوشگوار فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بانسریوں کی بین اور لڑکیوں کے ناچ میں یہ لوگ رخصت ہوئے۔ ان میں سے دو یہودیوں نے اسلام بھی قبول کر لیا اور مدینہ ہی میں رک گئے۔ اپنی ساری جائیداد کو اپنے ہی قبضے میں رکھا۔

بنی نضیر کا مسئلہ بغیر کسی خون خرابے کے اپنا آپ طے ہو گیا۔ ان کی چھوڑی ہوئی ملکیت کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا، امن کی صورت میں حاصل کیا ہوا مال پنخیر کی ملکیت ہوتا ہے اور رسول جس کو چاہیں یہ مال و سے سکتے ہیں۔ اس تقسیم میں دو انصار شریک کیے گئے اور بقیہ مہاجرین تھے۔

مکہ کے بڑے لوگ بے سرو سامانی کی حالت میں مدینہ آئے تھے اب دن بدن مال دار بنتے جا رہے تھے۔

احد کی جنگ کے بعد ابوسفیان نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ آئندہ سال وہ مسلمانوں سے بدر کے میدان میں پھر ملے گا۔ حضور نے اس کے اس چیلنج کو منظور کر لیا۔

اپریل ۶۲۶ء میں مسلمانوں کی ایک جماعت بدر روانہ کی گئی۔ ابوسفیان بھی اپنی کہی ہوئی بات کو بھولا نہیں تھا۔ ایک لڑنے والی جماعت کو لے کر مکہ سے نکلا۔ آدھے راستے تک آنے کے بعد پھر وہ کہہ واپس لوٹ گیا۔ اس کی کیا وجوہ تھیں۔ ہمارے علم میں نہ آسکیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے بہانہ کیا کہ بارش کی کمی کی وجہ سے گھاس نہیں ہے چارہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کے جانوروں کے مرجانے کا امکان تھا۔

مسلمانوں کا بدر جانا اور قریش کا چیلنج کر کے بدر نہ آنا مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کرنے میں بڑا معاون ثابت ہوا۔ احد کی جنگ کے بعد مقامی قبائل کا مسلمانوں سے طرز عمل یہ بتلا رہا تھا کہ وہ اس خیال عام میں تھے کہ قریش کو مکمل فتح ہو کر رہے گی۔

اب پندرہ سو مسلمان بدر کے میدان میں قریش کا انتظار کر رہے تھے اور قریش کا وہاں کوسوں پتہ نہیں تھا۔

خاص طور پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ اُحد کی شکست اور بعض دوسرے ناموافق حالات ظہور میں آنے کے باوجود حضور ﷺ میں بدر تشریف لے جاتے ہیں۔ اپنے ساتھ اُس سے دُگنے آدمی لے جاتے ہیں جتنے آپ اُحد میں لے کر گئے تھے۔ آدمیوں کا زیادہ ہونا خود اس بات کی دلیل تھی کہ اسلام میں دن بہ دن لوگ جوق در جوق داخل ہو رہے تھے۔

سلام ابن ابی الحقیق جس کو ابورافع کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہودیوں کا سردار تھا اس نے دوسروں کے ساتھ شام کو ہجرت نہیں کی تھی بلکہ خیبر میں سکونت اختیار کر لی تھی مئی ۶۲۶ء میں مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت نے اس کو ختم کر ڈالا۔

مئی یا جون ۶۲۶ء میں حضور مسلمانوں کی ایک جماعت کو لے کر غطفان پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ مسلمان ذات الرقاع تک پہنچے جو مکہ کے شمال مشرق میں مکہ سے ۶۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں پر بنی غطفان کی ایک طاقتور جماعت سے مسلمانوں کا سامنا ہوا۔ لڑائی نہیں ہوئی۔ دونوں جماعتیں ایک دوسرے سے خائف تھیں۔ دونوں نے دو مختلف راستے اختیار کیے۔ کہا جاتا ہے کہ نماز خوف پڑھنے کی ابتداء حضور نے اسی مقام پر کی۔ یہ نماز آگے چل کر مسلمانوں میں عام ہو گئی۔

اس موقع پر اُدھے مسلمان باجماعت نماز پڑھتے تھے اور بقیہ اُدھے ہتھیار بند کر نماز پڑھنے والوں کی حفاظت کرتے تھے۔

جب کبھی بدوی قبیلے مسلمانوں کے خلاف جمع ہونے لگتے، مسلمانوں کی کوشش ہی ہوتی تھی کہ خواہ مخواہ ان سے نہ لڑا جائے۔ مسلمان ان سے لڑنے میں پس و پیش کرتے خصوصاً ان اوقات میں جب کہ حضور بھی مسلمانوں کے ساتھ ہوں حضور کی موجودگی میں مسلمانوں کا غیر ضروری لڑائیوں سے احتراز کرنا اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ آپ کو بے مقصد اور بے معنی

لڑائیاں ناپسند تھیں۔ خون خرابے سے آپ کو نفرت تھی۔ جب کبھی دشمنوں سے آپ کو واسطہ پڑتا تو آپ کی کوشش ہوتی تھی کہ ان سے بات چیت کی جائے۔ انہام و تفہیم ہونے غلط فہمیوں کو دور کیا جائے۔ حقیقت کا انکشاف کیا جائے۔ اگر یہ طریقے ناکام ہو جاتے تھے تو پھر آپ ان سے دستبردار ہو جاتے تھے۔

جب کبھی جنس و مسلمانوں کے درمیان ہوتے تو مسلمان لڑائی جھگڑے پر تیار نہیں دکھائی دیتے تھے۔ محض اس خوف سے کہ کہیں ان کی لڑائی کا اثر آپ پر نہ پڑے اور ذات گرامی پر کوئی پانچ نہ آئے۔

یہ بات وہ محسوس کرتے تھے کہ ذات گرامی کا خطرے میں آجانا پوری اسلامی تحریک کو خطرے میں ڈال دینے کا باعث بن سکتا تھا۔

بدوی قبائل سے انہام و تفہیم کا طریقہ استعمال کرتے ہوئے اور ان سے لا حاصل جنگ نہ کر کے حضور نے قبائلی بیادوں پر قتل و غارت گری کو ناممکن بنا دیا تھا۔ اس قسم کی جنگوں میں محض خون کا بدلہ لینے کی خاطر قتل پر قتل ہوا کرتے تھے۔ اس کا سلسلہ لاتنا ہی ہوتا تھا۔

ان لوگوں کے درمیان جس قسم کے معرکے ہوتے تھے ان پر انگریزی کے لفظ **WAR** یعنی جنگ کا اطلاق مغربی ذہنوں میں یہ شک پیدا کرنے لگتا ہے کہ اس زمانے کے فائز بدیش بزدل اور سبت ہمت تھے۔ جب ان پر حملے ہوتے تھے تو وہ جم کر مقابلہ نہیں کرتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی آپس کی چیپٹلٹوں کا مطمح نظر ہی کچھ اور ہوتا تھا۔ قبائل آپس میں ایک دوسرے سے نفرت کبھی نہیں کرتے تھے۔ ایک دوسرے پر حملہ کرنا ان کا ایک شغل تھا۔ بیکاری کا مشغلہ تھا۔ دل بہلانے کا ذریعہ تھا۔ جہاں تلخ نظریہ ہو تو ان کی آپس کی نیرہ بازی، تیزباز کا یا تلواروں کی چمک کو جنگ کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

جس طریقے سے مسلمانوں نے بدویوں کے حملوں سے گریز کرتے ہوئے انسانی جانوں

کی حفاظت کی یہ بات قریش کے حملے کے وقت نہ ہو سکی۔

بد اور اُرد کی جنگوں میں آدمی گویا زیادہ نہیں مرے اس کے باوجود یہ جنگیں میدان جنگ میں جم کر لڑی گئیں۔ ان جنگوں کی نوعیت بدوی قبیلوں کے حملوں سے بالکل جداگانہ تھی۔ ان دونوں جنگوں میں نہ تو مسلمان ایک شغل کی خاطر قریش سے لڑے اور نہ ہی قریش نے دل بہلانے کی خاطر مسلمانوں سے جنگ کی۔ ان جنگوں کا واحد مقصد طاقت کا حصول تھا۔ طاقت کے حصول کی خواہش ہی انسان سے سب کچھ کرواتا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمان اپنے مذہب اور اس کی بقا کی خاطر جنگ لڑ رہے تھے۔ یہی وہ جذبہ تھا جو ان کو جنگ کے لیے اکسا رہا تھا۔

ان ہی دو جذبوں کو سامنے رکھ کر وہابیوں نے بھی ۱۹۲۰ء میں ایک قیامت برپا کر دی تھی۔ وہابیوں نے مذہب کی خاطر جنگ کی۔ وہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ہمد اولیٰ کے مسلمانوں کی وہ بازگشت ہیں۔

عرب میں ان کی جنگوں کی وجہ سے بہت ہی خون خرابہ ہوا۔ ان لوگوں نے حملوں کے وہی طریقے اختیار کیے جو تیرہ سو سال پہلے عربوں میں رائج تھے۔ ان کے حملے بھی ایک شغل کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ غیر وہابی قبائل ان کے حملوں کا شکار ہوتے تھے۔ جنگ کے دونوں طریقوں کو یکجا کر کے ان وہابیوں نے بیسویں صدی میں عرب میں وہی صورتحال پیدا کر دی تھی جو آج سے تیرہ سو سال پہلے عرب میں پائی جاتی تھی۔

ساتویں صدی عیسوی کے ایک مکالمے کو ابن اسحق نے محفوظ کر کے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ مکالمہ ذات الرقاع پر حملے کے سلسلے میں پیش کیا گیا ہے حضرت جابر ابن عبد اللہ بیان کرتے ہیں۔

” حضور کے ساتھ میں بھی اپنے بوڑھے اور لاسراؤنٹ پر سوار ہو کر ذات الرقاع گیا تھا۔ جب ہم واپس ہو رہے تھے تو ہمارے بہت سے ساتھی ہم سے آگے نکل گئے

تھے۔ جب میں پیچھے رہ گیا تو حضورؐ واپس تشریف لائے۔ مجھ سے سوال فرمایا کہ تم اتنے پیچھے کیوں رہ گئے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میرا اونٹ بہت ہی آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ حضورؐ نے اونٹ کو بٹھانے کے لیے فرمایا۔ میں نے اپنے اونٹ کو زمین پر بٹھا دیا۔ حضورؐ نے بھی اپنے اونٹ کو بٹھا دیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تمہارے ہاتھ میں جو چھڑی ہے وہ مجھے دے دو۔ میری چھڑی حضورؐ نے اپنے ہاتھ میں لے کر اونٹ کی خوب خبر لی۔ اس کے بعد مجھ سے فرمایا کہ اونٹ پر سوار ہو جاؤ۔ میں اپنے اونٹ پر سوار ہو گیا، حضورؐ اپنے اونٹ پر سوار ہو گئے ہم نے اپنا سفر پیر سے شروع کیا۔ اس کی قسم جس نے حق دے کر اپنے پیغمبر کو اس دنیا میں روانہ کیا ہے میں سچ کہتا ہوں کہ میرا اونٹ تیز تیز چلنے لگا اور حضورؐ کے اونٹ کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔

گفتگو کے دوران حضورؐ نے مجھ سے فرمایا کہ کیا تم اپنا اونٹ مجھے بیچنے کے لیے تیار ہو میں نے کہا کہ میں اونٹ آپ کی نذر کرنے کو تیار ہوں، حضورؐ نے اصرار کیا کہ آپ اس کی قیمت ادا فرمائیں گے۔ میں نے حضورؐ سے اونٹ کی قیمت دریافت کی۔ حضورؐ نے فرمایا ایک درہم میں نے اونٹ کو بیچنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ حضورؐ مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ اس پر حضورؐ نے کہا کہ اچھا تو پھر دو درہم۔ میں نے اس کو بھی رد کر دیا۔ حضورؐ نے اونٹ کی قیمت بڑھاتے بڑھاتے ڈھائی تولہ سونا کر دی۔ جب حضورؐ نے ڈھائی تولہ سونا کہا تو میں نے کہا کہ کیا حضورؐ اس لین دین اور قیمت پر مطمئن ہیں حضورؐ نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اب تمہارا یہ اونٹ میرا اونٹ ہے۔

حضورؐ نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا تم شادی شدہ ہو۔ کیا تمہاری بیوی شادی سے پہلے کنواری تھی یا وہ بیوہ تھی۔ میں نے کہا کہ وہ پہلے شادی شدہ تھی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کیا تمہیں کوئی کنواری لڑکی نہیں مل سکتی تھی، میں نے کہا کہ میرے باپ جنگِ احد میں مارے گئے انہوں نے سات بیٹیاں چھوڑیں۔ میں نے اسی لیے ایک ایسی عورت کا انتخاب کیا ہے جو ان سات لڑکیوں کی اچھی طریقے سے دیکھ بھال کر سکے۔ حضورؐ نے فرمایا تم نے بہت اچھا

کیا۔ انشاء اللہ جب ہم سرارہ پنچیس گئے تو وہاں اونٹوں کو ذبح کریں گے اور اس دعوت میں تم بھی رہو گے۔

سرارہ مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ جب ہم سرارہ پہنچے تو حضور نے اونٹوں کو ذبح کرنے کا حکم دیا، ہم نے تمام دن وہاں گزارا۔ جب رات ہوئی تو ہم سب لوگ اپنے اپنے گھر واپس ہوئے۔

میں نے اپنی بیوی سے وہ تمام باتیں کہیں جو حضور نے مجھ سے کی تھیں۔ میری بیوی نے کہا کہ حضور نے جو فرمایا ہے اس پر عمل کرو۔ جب صبح ہوئی تو میں اپنا اونٹ لے کر رات دس پر پہنچا۔ اونٹ باہر چھوڑ کر میں مسجد نبوی چلا گیا۔ جب حضور باہر تشریف لائے تو فرمایا کہ یہاں اونٹ کس نے چھوڑا ہے۔ میں نے سفر کے دوران جو گفتگو ہوئی تھی اس کا اعادہ کر دیا۔

حضور نے ارشاد فرمایا میرے بھتیجے یہ اونٹ تمہارا ہے۔ تم اسے اپنے گھر لے جاؤ۔ آپ نے بلالؓ کو بلوایا اور حکم دیا کہ مجھے ڈھائی تولے سونا رے دیا جائے۔ حضرت بلالؓ نے حکم کی تعمیل کی۔ ڈھائی تولے سے زیادہ سونا مجھے دیا۔ خدا کی قسم اس واقعہ کا مجھ پر گہرا اثر پڑا۔ اوپر کا واقعہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ حضور کے تعلقات مسلمانوں سے کتنے گہرے تھے۔ کتنے مربیانہ تھے۔ کتنے دوستانہ تھے۔ آپ کی فیاضانہ سرپرستی مسلمانوں کے لیے اور بالخصوص غریب مسلمانوں کے لیے ہمیشہ وقف رہا کرتی تھی۔

یہ واقعہ کہ مدینہ سے باہر قافلے کو روک کر حضور نے ایک دن گزارا تھا اس بات کی تعلیم تھی کہ مسلمان گھر جانے سے پہلے اپنی عورتوں کو مطلع کر دیں تاکہ وہ گھر کی صفائی کر لیں اور واجبی زندگی کا ایک خوشگوار پہلو اس واقعہ میں نمایاں ہوتا ہے۔

بخاری اور مسلم کی روایات کے مطابق حضور نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ جو لوگ ایک لمبے عرصے کے لیے اپنے گھروں سے باہر رہے ہوں رات میں اچانک اپنے گھروں پر نہ پہنچیں۔ اطلاع دے کر جائیں تاکہ عورتیں اپنے شوہروں کا اچھی طریقے سے استقبال کر

سکیں۔ اپنے آپ کو پاک نہا کر لیں۔ گلگھی پوئی کر لیں۔

حضرت بہ نفس نفیس انتہائی معافی پسند واقع ہوتے تھے۔ آپ کے کپڑے ہمیشہ پاک نہا رہتے تھے۔ معافی اور پاکیزگی میں آپ ہمیشہ ہر ایک سے متاثر رہے۔ لابی بونچیں جو کھانا کھاتے وقت بدتمیزی کا باعث بنتی ہیں۔ حضور کو سخت ناپسند تھیں۔ حضور کی مونچیں بہت ہی مختصر تھیں۔ حضور کو خوشبو پسند تھی۔ آپ سخت قسم کی بو کو ناپسند کرتے تھے۔ کھانے میں پیاز یا لہسن کا کبھی آپ نے استعمال نہیں کیا۔ ان کو آپ نے کبھی چھوا تک نہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضور جب سفر سے واپس ہوئے تو آپ کے گھر کے بچوں نے آپ کا استقبال کیا۔ عبداللہ ابن جعفر ابن ابی طالب کہتے ہیں۔

’جب رسول اللہ سفر کے بعد واپس پہنچے تو آپ کے گھر کے بچوں نے آپ کو خوش آمد کہا۔ میں ان سب میں آگے تھا۔ حضور نے مجھے اٹھا لیا۔ سیدہ فاطمہ الزہراء کے دونوں ماجزادے حضور کے لگے لگے گئے۔ حضور نے ان دونوں کو اپنے ہی اونٹ پر بٹھا لیا۔ ماجزادوں کے ساتھ آپ ایک ہی اونٹ پر مدینہ میں داخل ہوئے۔“

بخاری اور مسلم نے ایک اور روایت بیان کی ہے جس سے اس لگاؤ کا پتہ چلتا ہے جو حضور کو اپنے خاندان سے تھا۔ آپ سے یہ قول منسوب ہے کہ سفر ایک طرح کی سزا ہے جو آدمی کو اپنے گھر کے سکون سے محروم رکھتی ہے اپنے مقصد کو پورا کر لینے کے بعد مسافر کا فرض ہے کہ یہ سزا اپنے گھر کا رخ کرے۔ اہل خانہ کے ساتھ وقت گزارے گھر واپس ہونے میں غیر ضروری تاخیر نہ کرے۔

اگست یا ستمبر ۶۲۶ء میں حضور نے ایک اور دستے کی قیادت کی جو تقریباً ایک ہزار مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ رومۃ الجندل پر حملہ کرنے کا ارادہ تھا۔ اب اس مقام کا نام جاثون ہے۔ اس دفعہ بھی بغیر لڑائی کے واپسی ہوئی۔ اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ قریش

چونکہ مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے اس لیے غطفان سے وہ مدد اور دوسنی کے خواہاں تھے۔ یہودی سردار سلام خیبر میں قتل کر دیا گیا تھا اس لیے کہ اس نے نبی غطفان کو اسلام کے خلاف اُکسنے کی کوشش کی تھی۔

سلام کا قتل، ذات الرقاع پر حملہ، پھر دومتہ الجندل کو روانگی ان سب باتوں کا واحد مقصد یہ تھا کہ بدوی قبیلوں پر یہ واضح کر دیا جائے کہ مسلمان طاقت ور ہیں۔ وہ قریش کی کسی بھی دھمکی سے ڈرنے والے نہیں اس لیے بدوی قبیلوں کو مسلم طاقت سے باخبر رہنا چاہیے۔

مغربی مشرقین اکثر و بیشتر حضورؐ کی مکی اور مدنی آیات کے متن میں ایک امتیاز محسوس کرتے ہیں۔ مکہ کی آیات مختصر ہوا کرتی تھیں۔ لہجے میں نرمی ہوتی تھی۔ لوگوں میں ایک جوش و جذبہ پیدا کرتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں حضورؐ کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ حضورؐ کی ذات کو ہر بدتمیزی کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔

قرآن کے سورہ اخلاص میں بیان کیا گیا ہے:-

”کہو کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ کوئی اس کا ہمسر نہیں!“

سورہ نلق میں ارشاد ہوتا ہے۔

”کہو کہ میں صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔ سب چیز کی برائی سے جو اس نے بنائی۔ شبِ تاریک کی برائی سے جب اُس کا اندھیرا چھا جائے۔ گنڈوں پر پھونکنے والیوں کی برائی سے۔ حمد کرنے والے کی برائی سے جب وہ حمد کرنے لگے۔“

سورۃ الناس میں ارشاد ہوتا ہے:-

”کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔ لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی۔ لوگوں کے معبودِ برحق کی۔ دسوہ انداز کی برائی سے جو (خدا کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔“

جو لوگوں کے دلوں میں دوسو سے ڈالتا ہے (خواہ وہ) جنات سے (ہو) یا انسانوں میں سے۔“

مدینہ کی ہجرت کرنے کے بعد حضورؐ کو سیاست سے سابقہ پڑا۔ پھر جنگوں سے واسطہ پڑا اور آخر میں انتظام مملکت اور ملت کے نظم و نسق سے مثال کے طور پر سورہ نسا میں ارشاد فرمایا گیا ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی۔

”یتیموں کا مال ان کے حوالے کر دو۔ ان کے پاکیزہ اور عمدہ مال کو اپنے ناقص اور سستے مال سے نہ بدلو۔ ان کا مال اپنے مال میں ملا کر مت کھاؤ۔ ایسا کرنا سخت گناہ ہے یتیموں کو بالغ ہونے تک کام کاج میں مصروف رکھو۔ جب ان میں عقل کی پختگی دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو۔ اس خوف سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے۔ اس کو فضول خرچی میں اور جلدی میں اڑانہ دینا۔ جو شخص آسودہ حال ہو اس کو پرہیز کرنا چاہیے جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔“

کہہ والے محمدؐ اور مدینہ والے محمدؐ کے درمیان جو امتیاز نظر آتا ہے وہ مذہب کے اہم مسائل پر بھی اثر انداز ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

ایک طرف ایک مبلغ یا پیغمبر کی تبلیغ اور پیغمبرانہ وعظ و نصائح۔ لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے جذبات کا سہارا، دعوؤں کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت کی فراہمی، تعلقات کو اس طرح سے پیش کرنا جو لوگوں کو اپیل کر سکے، ان کے دلوں کو اپنی طرف راعب کر سکے، خود سہرا پا زندگی بن کر دوسروں کو زندگی کے اسرار سے واقف کروانا تاکہ ان میں بھی زندہ رہنے کی امنگ رہے۔ یہ مکہ کی زندگی کا خاصہ تھیں۔

دوسری طرف اخلاق سدھار کے سخت ضابطے اور اصول، عبادات کے طریقے مذہبی نظام کا استحکام مدینہ کی زندگی کے لوازم ہیں۔

انسانی کمزوری کے پیش نظر ضابطہ اور اصول ضروری ہیں۔ جب تک پیغمبر اپنے ماننے والوں کے درمیان بقید حیات ہے اپنے حلقہ کے تمام لوگوں کو اپنی ذات سے مستفید کر سکتا ہے۔ اپنے مافی الضمیر سے روشناس کروا سکتا ہے۔ اپنی روحانی طاقت کا اظہار کر سکتا ہے۔ اپنی وجدانی کیفیت نمایاں کر سکتا ہے۔ جب پیغمبر اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اس کی زندگی بھر کی کوششوں کا اثر جو اس کی ایک خاص تبلیغ کی صورت میں منظر عام پر رہتا ہے آہستہ آہستہ زائل ہونے لگتا ہے۔ اس کو اسی صورت میں دوام مل سکتا ہے جب کہ اس کی تبلیغ کے اصول وضع کیے جائیں۔ اس کے پیغام کو ضابطوں کی صورت دی جائے۔ مذہبی عبادات کو ایک نظام کی صورت میں پیش کیا جائے۔

بعض اوقات اس طریقہ کار کو اختیار کرنے کی وجہ سے مذہب کی روح فنا ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ لوگ حکم کے منشاء اور مقصد کو بھول جاتے ہیں۔ صرف ظاہری باتوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

منشاء اور مقصد کو پیش نظر رکھنے کے لیے ایک ایسی مقدر تنظیم کی ضرورت ہے جس کے ارکان کا کام ہو کہ وقتاً فوقتاً کسی رسم یا روایت کے پس منظر میں جو روح کار فرما تھی اُسے عوام کے آگے پیش کرتے رہیں تاکہ عوام رسم و روایت کے ساتھ ساتھ اس کی غایت اور منشاء اور مقصد سے بھی واقف ہوتے رہیں۔

اگر آنحضرتؐ ان بے شمار قوانین اور ضوابط کو وضع نہ کرنے تو شاید آپ کی وفات کے بعد آپ کا پیغام اس صورت میں ہمارے آگے نہ ہوتا جیسے آج ہے۔

اسلام کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں ایک اور بات نے بھی آسانی پیدا کر دی۔ قریش کے ہاں پنڈتوں، واعظوں یا مذہبی لوگوں کی کوئی ایسی جماعت نہیں تھی جو متحد ہو کر اسلام کی مخالفت کرتی۔ ان کے ہاں کوئی ایسے قانونی یا عبادات کے طریقے نہیں تھے جن کا سہارا لے کر قریش یا مکہ کے لوگ حضورؐ کی تبلیغ کی مخالفت کرتے۔ عربوں کی

بت پرستی میں کسی بھی پنڈت یا مذہبی ٹھیکیدار کے لیے کوئی جگہ تھی، ہی نہیں۔ لات، العزری یا ہبل سے ان کی وابستگی ایسے ہی تھی جیسے انگریزوں کو اس زلزلے میں اٹار قدیمہ سے یا گواڈوں کے چھوٹے پرنس سے ہوتی ہے۔ پرانی چیزوں کو دیکھنے سے جو بات ذہن میں باقی ہے وہ یہی ناکرمانی کے لوگ یا مانسی کی چیزیں زمانہ حال کے لوگوں یا چیزوں سے کسی حد تک مختلف تھے۔

قریش کے سرداروں نے حضورؐ کی جو مخالفت کی اس کی بڑی وجہ سیاسی تھی۔ ایک ایسا آدمی جس کو براہ راست خدا سے حکم ملتا ہے اور شب و روز جس کو خدائی رہنمائی حاصل ہے اس قابل ہوتا ہے کہ وہ حکمران ہو۔ ان کو پہلے ہی دن سے جس بات کا خطرہ تھا حضورؐ کے مدینہ جانے کے بعد کے واقعات ان کے اس خطرے کو حق بجانب ٹھہرا رہے تھے۔ جب مدینہ میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا تو ضروریات زندگی کی ہر چیز کمیاب ہونے لگی۔ دولت، زمین، مکانات، اجالور، ہتھیار، غذا ان سب چیزوں کی کمی محسوس کی جانے لگی۔ ضروریات کی فراہمی حضورؐ کے ذمے تھی۔ ان ساری ضروریات زندگی کے لیے مسلمانوں کی نظریں حضورؐ کی طرف اٹھا کرتی تھیں۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے حضورؐ کو محلوں کے بہت ہی کم مواقع ملتے تھے۔ فرصت کے اوقات عنقا ہونے لگے۔ ہر وقت کسی نہ کسی گتھی کو سلجھانے میں آپ مصروف رہتے تھے۔ اگر آپ اپنے روزانہ کے فرائض سے غافل ہوتے تو ساری تحریک اسلامی کو نقصان پہنچنے کا خدشہ لگا رہتا تھا۔

روزمرہ کے واقعات اور ان میں تغیر و تبدیلی اسلام کے مستقبل پر اپنا دیرپا اثر چھوڑنے لگی۔ حضورؐ کی وفات کے بعد جانشین آپ کے قدم بہ قدم چلنا چاہتے تھے۔ حضورؐ اپنی ذات میں ایک ہی وقت میں پیغمبر بھی تھے، سیاست دان بھی تھے، قانون ساز بھی تھے، اور فوج کے کمانڈر بھی۔

ان ساری خصوصیات کا ایک ذات میں جمع ہو جانا اور اپنی ہر خصوصیت کو بروقت بروئے کار لانا دنیا کی ساری مسلم حکومتوں کے لیے ایک مثال اور نمونہ کا کام کر گیا۔

گزشتہ چودہ سو سال سے سارے مسلم ممالک میں شخص واحد کی حکمرانی رہتی آئی ہے نظریاتی طور پر ہر مسلم ملک کا حکمران یہی سمجھا ہے کہ اس کی ذات میں بھی وہی خصوصیات جمع ہیں جو قدرت نے ذاتِ اقدس میں جمع کر دی تھیں۔ اسی وجہ سے ہر مسلم حکمران اپنے آپ کو سیاست داں بھی سمجھتا ہے، قانون داں بھی، کمانڈر افواج بھی اور امام وقت بھی۔ ان سارے فرائض کو انجام دینا ہر مسلم حکمران اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔

اسلام میں یہ ضروری نہیں ہے کہ حکمران کسی بادشاہ کا بیٹا ہی ہو۔ سلطان ابن سلطان ہی ہو۔ بادشاہت کے اُمیدواروں میں جو سب سے زیادہ موزوں رہتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے بادشاہت کا وہی حق دار رہتا ہے۔ عظمت و شان کا وہ بھوکا نہیں رہتا۔ گو وہ پہلا شہری سمجھا جاتا ہے لیکن شہنشاہیت کے نشہ سے وہ پاک رہتا ہے۔ وہ اپنی تمام رعایا کے درمیان اس طرح سے رہتا ہے کہ اس کی رعیت جب چاہے اور رعیت کا جو فرد بھی چاہے اپنے حکمران تک رسائی حاصل کر لے۔

یادگار تارخیں

| | |
|-----------|----------------------------------|
| ۶۵۶۰ | حضور کی پیدائش |
| ۶۶۲۲ | مدینہ کو ہجرت |
| ۶۶۲۴ مارچ | جنگ بدر |
| ۶۶۲۵ | جنگ احد |
| ۶۶۲۵ مئی | الربیع کا واقعہ |
| ۶۶۲۵ جون | بیر معونہ پر مسلمانوں کا قتل عام |
| ۶۶۲۵ اگست | بنو نضیر کا محاصرہ اور اخراج |
| ۶۶۲۶ مارچ | بدر کو دوبارہ روانگی |
| ۶۶۲۶ جون | ذات الرقاع |
| ۶۶۲۶ اگست | رومتہ المہندل |

خندق

قبل اس کے کہ ہم واقعاتی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے چلیں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی ذاتی اور سماجی زندگی پر ایک نظر ڈال لیں اس لیے کہ یہ اس وقت سے لے کر آج تک بحث طلب رہی ہے۔

آپ کے عقد میں حفصہ بنت عمر بن خطاب آئیں۔ حضرت حفصہؓ کے شوہر جنگ بدر میں مارے گئے تھے۔ عمر ابن الخطاب نے اپنی صاحبزادی حفصہؓ کو حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا اور حضورؐ نے ان سے نکاح کیا۔ حضرت حفصہؓ اپنے والد کی طرح بہت ہی گرم مزاج جذباتی اور غصیلی طبیعت کی تھیں۔

حضرت حفصہؓ کی وجہ سے حضورؐ کو کافی پریشانی رہا کرتی تھی۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ حضورؐ کے دو بازو تھے۔ حضرت عائشہؓ پہلے ہی حضورؐ کے جا عقد میں آچکی تھیں۔ بی بی عائشہؓ حضرت ابو بکرؓ کی صاحبزادی تھیں۔ حفصہؓ بی بی کو نکاح میں لینے کا منشاء شاید حضورؐ کا یہی ہو کہ اپنے دونوں بازوؤں کو اپنے سے قریب تر رکھیں۔ بی بی حفصہؓ بیوہ ہونے کے باوجود نکاح کے وقت صرف سترہ سال کی تھیں۔

حضرت حفصہؓ سے شادی کے بعد حضورؐ نے زینب بنت خزيمة کو اپنے نکاح میں لیا۔ حضرت زینبؓ کے شوہر جنگ احد میں مارے گئے تھے۔ غریبوں سے سلوک اور خیر و خیرات

بی بی زینبؓ کی ختم و میات تھیں۔ اس نکاح کے کچھ ہی دنوں بعد غالباً جنوری ۶۲۶ء میں حضورؐ نے ام سلمہؓ سے شادی کی۔

جب مسلمانوں نے پہلی دفعہ حبشہ کو ہجرت کی تھی تو حضرت ام سلمہؓ بھی اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ گئی تھیں۔

زینب بنت جحشؓ حضورؐ کے رشتہ کی بہن تھیں۔ حضورؐ نے ان سے شادی کی۔ یہ شادی اس وقت بہت ہی تنازعہ فیہ مسئلہ بن گئی۔ یہ بات ہم پڑھ چکے ہیں کہ ایک غلام لڑکے زید بن حارثہؓ کو حضورؐ نے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ جب حضورؐ نے زید کو اپنا لیا تو وہ گھر کے ایک فرد کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اسی طرح جیسے علیؓ ابن ابی طالب۔ لوگ زید کو زید بن محمدؓ کے نام سے پکارتے تھے۔ زیدؓ چونکہ غلام رہ چکے تھے اس لیے آپ نے پہلے ایک ایسی عورت سے شادی کی تھی جو آزاد کر دیئے جانے سے پہلے خود بھی غلام تھی۔

بعد میں زیدؓ نے زینب بنت جحشؓ سے شادی کی۔ زیدؓ کو حضورؐ کا پورا پورا اعتماد حاصل تھا

اسم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک فوج جب قریش پر حملہ کرنے کی غرض سے نجد روانہ کی گئی تھی، زید کے سپرد فوج کی قیادت دی گئی تھی۔ غالباً اسی زمانے کی بات ہے کہ جنگ احمہ کے بعد ۶۲۶ء میں حضورؐ نے زینبؓ سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

زیدؓ کو اپنی بیوی زینبؓ سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا اس لیے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دینے پر رضامند ہو گئے۔ اس طلاق کے بعد زینبؓ کا نکاح حضورؐ سے ہوا۔

حضورؐ کے مخالفین اس شادی پر شد و مد سے اعتراض کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام سے قبل جن لڑکوں کو اپنا لیا جاتا تھا ان سے ویسا ہی سلوک ان کے منہ بولے ماں باپ کیا کرتے تھے جیسا وہ اپنے حقیقی اور اصل بیٹوں سے کرتے تھے۔ حضورؐ نے بعثت سے قبل زیدؓ کو مکہ میں کعبہ کے روبرو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔

اس سلسلے میں دوسری بات جو بیان کی جاتی ہے وہ یہ کہ اسلام سے قبل جب کوئی

اومی مر جاتا تھا تو اس کی تمام بیویاں اس کے بیٹے کی ملکیت بن جاتی تھیں۔ خود حضور نے اس رسم کو مٹایا اور ایسا کرنے سے منع فرمایا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ باپ کی بیویوں سے شادی کرنا ایک شرمناک بات ہے۔

اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ آنحضرت نے اپنے بنائے ہوئے قانون کو خود ہی

توڑا۔

اس واقعہ کا اثر اس وقت زائل ہوا جب کہ حضور پر وحی نازل ہوئی جس میں حقیقی اور معنوی اولاد میں فرق بتلایا گیا۔ مثنیٰ کے وہ حقوق نہیں رکھے گئے جس کے مستحق حقیقی بچے ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے کے طور پر اسلامی قانون نے رضاعت کو تسلیم نہیں کیا۔

خدا نے وحی کے ذریعہ اجازت دی کہ آپ زینب کو اپنے نکاح میں لاسکتے ہیں ساتھ ہی آپ اس سلسلے میں جس شش پنج میں تھے اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ پس پیش معنی لوگوں کی وجہ سے تھا۔

سورہ احزاب کی ۳۷ ویں آیت میں اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔ زینب کا نام خاص طور پر قرآن میں آیا ہے۔

”اور جب تم اس شخص سے جس پر خدا نے احسان کیا اور تم نے بھی احسان کیا یہ کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دے اور خدا سے ڈرا اور تم اپنے دل میں وہ بات پوشیدہ کرتے تھے۔ جس کو خدا ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ خدا اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو۔ پھر جب زینب نے اس سے حاجت متعلق نہ رکھی یعنی اس کو طلاق دے دی تو ہم نے تم سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ مومنوں کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے ساتھ نکاح کرنے کے بارے میں جب وہ ان سے اپنی حاجت متعلق نہ رکھیں یعنی طلاق دے دیں کچھ تنگی نہ رہے اور خدا کا حکم واقع ہو کر رہنے والا تھا۔“

ایک روایت میں ہے کہ زینب بذاتِ خود ایک نہایت ہی شریفانہ اور خدا ترس

طبیعت کی مالک تھیں۔ مشورے سے شادی کرنے میں آپ ہچکچا رہی تھیں۔ آپ کی ہچکچاہٹ اس وقت دور ہوئی جب کہ خدانے آپ کو شادی کی اجازت دے دی۔

(پروفیسر سید نواب علی رضوی نے اپنی کتاب سیرت رسول اللہ میں لکھا ہے
'ان سعد لکھتے ہیں کہ زینب بنت جحش آنحضرت کی پھوپھی زارہ بن تھیں۔ مکہ میں معہ
اپنے خاندان کے ابتدائے اسلام میں ایمان لائیں۔

ان کے بھائی عبد اللہ اور عبید اللہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی جہاں آخر الذکر نے دین
عیسوی اختیار کر کے انتقال کیا۔ مگر اس کی بیوی ام حبیبہ بنت ابوسفیان دین اسلام پر قائم
رہیں۔ بعد کو آنحضرت سے نکاح ہوا۔ اب عبد اللہ نے پھر مہینے میں معہ اپنے خاندان
کے ہجرت کی اور غزوہ احد میں شریک ہوئے جس کے بعد آنحضرت نے ان کی بہن زینب کا
نکاح زید بن حارثہ سے کرنا چاہا۔

زید الرحمہ شریف خاندان سے تھے مگر عہد جاہلیت میں جب ان کی ماں سعدی ان کو
لے کر کہیں جا رہی تھیں بدویوں نے حملہ کیا اور زید کو پکڑ کر عکاظ کے بازار میں حکیم بن حزام
کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ حکیم نے ان کو لے کر اپنی پھوپھی حضرت خدیجہ کی نذر کیا مہنوں نے آنحضرت
کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے زید کو آزادی بخشی۔ مگر وہ خدمت میں حاضر رہے۔ اتفاقاً زید
کے باپ اور چچا مکہ آئے۔ زید کو دیکھ کر پہچان لیا اور چاہا کہ زر خرید دے کر ہمراہ لے جائیں
آنحضرت نے فرمایا کہ خرید کی ضرورت نہیں ہے۔ زید کو اختیار ہے جہاں چاہے رہے
مگر زید نے پھر بھی آپ کی خدمت سے علیحدگی کو گوارا نہ کیا۔ اگرچہ باپ نے طعنہ بھی دیا کہ
آزادی کو کیوں قربان کرتا ہے اور اپنے خاندان سے منہ موڑتا ہے۔ آنحضرت نے یہ دیکھ کر
مزید شفقت سے فرمایا 'لوگو۔ گواہ رہنا۔ میں زید کو اپنی متبنی کرتا ہوں' تب حارثہ کو تسلی
ہوئی اور وہ بیٹے کو چھوڑ کر چلا گیا۔

آنحضرت نے پھر زید کا نکاح اپنی دایہ ام ایمن کے ساتھ کر دیا اس شادی کے سامنے

پیدا ہوتے۔ زید نے آنحضرت کے ساتھ ہجرت کی۔

بدروا احد میں شریک ہوتے۔ الغرض جب آنحضرت نے زید کی صلاحیت اور خوبیوں کے لحاظ سے اور اس وجہ سے بھی کہ غلاموں کو لوگ ذلیل نہ سمجھیں اپنی پھوپھی زاد بہن کا نکاح ان کے ساتھ کرنا چاہا تو زینب نے اپنے حسب و نسب کے خیال سے ایک ایسے شخص کے ساتھ نکاح گوارا نہ کیا جو اگرچہ رسول اللہ کا متبئی تھا لیکن غلامی کا دایع اٹھا چکا تھا تب یہ آیت نازل ہوئی۔

سورۃ احزاب میں ہے

”اور نہیں کسی مومن مرد اور مومن عورت کو اختیار ہے اپنے کاموں پر جب اللہ اور اس کا رسول ان کا کوئی امر طے کر دے“

اس آیت کے پیش نظر زینب نے اپنے قومی تفاخر اور عجب کو خدا اور رسول کی اطاعت پر قربان کر دیا۔ لیکن عقد کے بعد بمقتضائے بشریت میاں بیوی کے تعلقات خوشگوار ثابت نہ ہوئے۔ ادھر زینب کو یہ خیال کہ میں نے کتنی بڑی قربانی دی ہے کہ ایسی گر کر شادی کی۔ شوہر کو چاہیے کہ میرے اشاروں پر چلے اور غلام بن کر رہے۔ ادھر زید کو یہ تکلیف دہ تصور کہ میں بیوی کی نظروں میں ذلیل ہوں۔ آخر برداشت نہ ہوئی اور طلاق دینا چاہی اس وقت جو کیفیت آنحضرت کی تھی وہ قرآن مجید کے سورہ احزاب میں یوں مذکور ہے۔

”اور جب تو کہتا تھا اس شخص سے جس کو اللہ نے نعمت دی اور تو نے نعمت دی کہ روک رکھ اپنی عورت کو اپنے پاس اور اللہ سے ڈر اور تو چھپانا تھا اپنے دل میں جو اللہ کھولنے والا تھا اور تو آدمیوں سے ڈرتا تھا اور اللہ مستحق تر ہے کہ تو اس سے ڈرے“

مباح چیزوں میں طلاق سے زیادہ بڑی کوئی اور شے خدا کے نزدیک نہیں ہے آنحضرت نے زید کو سمجایا کہ خدا اور رسول کے اسان کو یاد کرے اور طلاق نہ دے لیکن زید

کے پیمانہ صبر و ضبط کو لبریز دیکھ کر یہ اندیشہ ہوا کہ اگر اس نے طلاق دے دی تو زینب کا حشر کیا ہوگا؟ زینب نے محض آپ کے فرمانے سے ایک غلام کے ساتھ نکاح کیا تھا اب دوسرا شخص ایک غلام کی مطلقہ کو سنت و وقار کے ساتھ کس طرح رکھتا۔ اس لیے آنحضرتؐ نے ان کی دلجوئی اور مرتبہ بلند کرنے کے لیے چاہا کہ خود ان کو اپنے عقد میں لے لیں۔ البتہ جتنی کن بیوی ہونے کے لحاظ سے رسم و رواج کے خلاف ورزی کرتے ہوئے آنحضرتؐ کو زبانِ خلق کا اندیشہ ہوا لیکن خاصانِ خدا اگر رسم و رواج کے بندے ہوتے تو دنیا میں کبھی اصلاح اور ترقی نہ ہوتی۔ تنبیہ کی رسم مٹائی گئی۔

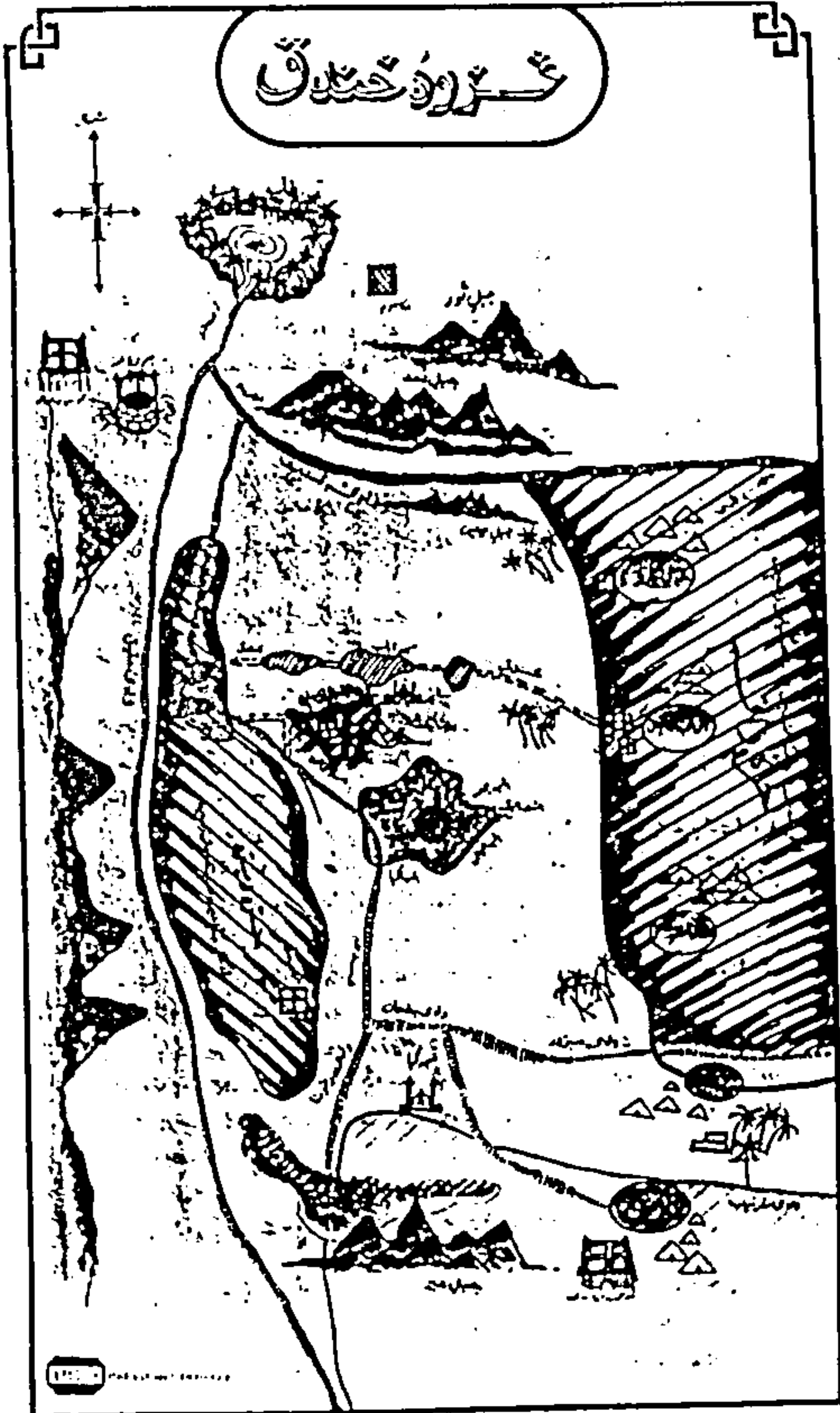
جب زینب نے طلاق دے دی تو اپنے وحی الہی کی تعمیل فرمائی۔
 پھر جب زینب نے پوری کر لی حاجت نکاح کر دیا ہم نے تیرا اس سے تاکہ نہ
 بے ایمان والوں پر تنگی۔ بی بیوں میں ان کے لیے پالکوں کی جیب کہ پوری
 کر کہیں ان سے حاجت اور ہے کام اللہ کا کیا گیا۔"

(جیب)

سورۃ نسا میں قرآن نے مسلمانوں کے لیے بیویوں کی حد مقرر کر دی ہے اور وہ
 حد چار ہے۔ جس وقت یہ حکم نازل ہوا، حضورؐ کی ازواجِ مطہرات کی تعداد چار سے
 زیادہ تھی۔

سورۃ احزاب میں فرمایا گیا ہے۔

"اے پیغمبر! ہم نے تمہارے لیے تمہاری بیویاں جن کو تم نے ان کو مہر دیے
 ہیں حلال کر دی ہیں اور تمہاری لونڈیاں جو خدا نے تم کو کفار سے بطور مالِ غنیمت
 دلوائی ہیں اور تمہارے چچا کی بیٹیاں اور تمہاری چھو پھیوں کی بیٹیاں اور
 تمہارے ماموں کی بیٹیاں اور تمہاری خالائوں کی بیٹیاں جو تمہارے
 ساتھ وطن چھوڑ کر آئی ہیں (سب حلال ہیں) اور کوئی مومن عورت اگر اپنے



تئیں پیغمبر کو بخش دے بشرطیکہ پیغمبر بھی ان سے نکاح کرنا چاہا میں یہ اجازت دے
 محمدؐ، خاص تم ہی کو ہے۔ سب مسلمانوں کو نہیں۔ ہم نے ان کی بیویوں اور لونڈیوں
 کے بارے میں جو مہر مقرر کر دیا ہے ہم کو معلوم ہے اس لیے کہ تم پر تنگی نہ رہے۔ خدا بخشنے
 والا اور مہربان ہے۔“

سورہ نسا کی ۵۳ ویں آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے :-
 ”اور تم کو یہ شایاں نہیں کہ پیغمبر خدا کو تکلیف دو اور نہ یہ کہ ان کی بیویوں سے کبھی
 ان کے بعد نکاح کرو۔ بے شک یہ خدا کے نزدیک بڑا گناہ ہے۔“
 جب ان آیات کا نزول ہوا جن میں زینبؓ سے حضورؐ کو شادی کرنے کا حکم ہوا
 تو حضرت عائشہ جو حضورؐ کی وہ واحد بیوی تھیں جن کی یہ جرات ہوتی تھی کہ حضورؐ سے
 گستاخانہ اور بے تکلفانہ گفتگو کریں، ان احکام کو سن کر حضورؐ سے کہنے لگیں :-
 ”آپ کا خدا آپ کی خواہشات کی تکمیل کے لیے یقیناً بے چین نظر آتا ہے!“
 حضورؐ کی یہ متعدد شادیاں بحث و مباحثہ کا موضوع رہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس
 بحث میں پڑیں۔

یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ حضورؐ کی ساری بیویوں میں بی بی عائشہؓ ہی وہ
 واحد بیوی تھیں جو شادی کے وقت باکرہ تھیں۔
 زینبؓ بنت جحش ایک مطلقہ تھیں۔ باقی تمام بیوہ تھیں۔ ان میں سے کئی ایک
 ایسی تھیں جو حرم سے عاری تھیں اور جاؤبِ نظر بالکل نہیں تھیں۔
 سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حضورؐ نے جب بی بی خدیجہ سے شادی کی تو اس
 وقت آپ کی عمر ۲۵ سال تھی۔ بی بی خدیجہؓ عمر میں آپ سے بڑی تھیں۔ بیوہ تھیں
 اس کے باوجود حضورؐ اپنی بیوی خدیجہؓ کے ہمیشہ غمگسار، وفادار اور مثالی شوہر رہے۔
 یہ ازدواجی تعلقات پورے بیس سال تک یعنی حضرت خدیجہؓ کی وفات تک رہے۔

دوسرے یہودیوں کے ساتھ ان دونوں نے شام کو ہجرت نہیں کی تھی خیبر جا کر دوبارہ آباد ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ یہودی سردار مکہ جا کر قریش سے ملے۔ اپنی مدد اور حمایت کی پیشکش کی۔ جب مکہ کے سرداروں نے ان کی مدد اور حمایت کو قبول کر لیا اور ان دونوں جماعتوں میں باقاعدہ اتحاد ہو گیا تو یہودیوں نے بدوی قبیلہ عطفان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ قریش اور یہودیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑیں۔

ان کی سرگرمیوں کا واحد منشا یہ تھا کہ مدینہ پر قابض ہو جائیں جو کام دو سال پہلے کرنا چاہتے تھے اس کام کو کرنے کی انہیں اب سوجھی، اگر قریش میں ذرا بھی بصیرت ہوتی اور واقعی وہ کار گزار ہوتے تو جنگِ احد کے فوراً بعد مدینہ کو اپنے قبضے میں لے لیتے۔ قریش نے اس ہم کے لیے دس ہزار آدمیوں کو جمع کیا۔ ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد تین ہزار تھی۔ مکہ کے چار ہزار آدمی تھے جن میں قریش، ان کے ساتھ اور ان کے پار مددگار تھے۔ بنی کنعانہ کے سوار الگ تھے۔ عطفان نے دو ہزار سے زیادہ آدمی فراہم کیے تھے۔ بنی سلیم اپنے ساتھ سات سو سواروں کو لے آئے۔ ان کے علاوہ بنی اسد کے لوگ تھے۔ سب مل کر تقریباً دس ہزار تھے۔

فوج کی تعداد قیاساً بیان کی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ بھی ہو۔ مدینہ میں جو لوگ مسلمان ہوئے تھے ان میں ایک بڑے جوشیلے آدمی تھے وہ ایک زبندار کے بیٹے تھے۔ لڑکپن میں ان کو عیسائی بنایا گیا۔ شام میں انہوں نے مذہبی تعلیم حاصل کی۔ مختلف عیسائی درسگاہوں سے استفادہ کیا۔ جب ان کے عیسائی استاد کا انتقال ہو گیا تو یہ سن کر کہ ایک نئے رسول کی آمد ہوئی ہے حجاز کا رخ کیا۔ دورانِ سفر ان کو لوگوں نے پکڑ کر ایک یہودی کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہودی کے پاس کام کاج کرتے ہوئے آپ نے کچھ رقم جمع کی۔ حضور نے بھی مالی مدد سے کر آپ کو غلامی سے نجات دلائی۔ اس کے بعد آپ اسلام کے سچے جانثاروں میں شامل ہو گئے۔ ان حضرت کا نام مسلمان ہے

جب مسلمانوں کو مکہ سے آنے والی فوج کا علم ہوا تو ان لوگوں نے آپس میں سوچ بچار شروع کر دی کہ مدافعت کس طرح کی جائے۔

جنگ اُحد سے قبل جو بات بحث و مباحثے کا عنوان بنی تھی پھر وہی زیر بحث آئی کہ ایرانی شہر سے باہر ہو یا شہر میں رہ کر ہو۔

ایران کے دارالسلطنت میں سلمانؓ نے پرورش پائی تھی۔ ثقافت اور تہذیب کے گہوارے میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کی زندگی کے کچھ سال شام میں بسر ہوئے۔ شامی اور شہریت کے لحاظ سے شام مانا ہوا شہر تھا۔ انہوں نے بیزنطینی اور ایرانی جنگوں کے تعلق سے بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان جنگوں کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا ہو۔

روایات کے مطابق سلمانؓ نے مشورہ دیا کہ شہر کے اطراف خندق کھود کر مدینہ کی حفاظت بہتر طریقے سے کی جاسکتی ہے۔ سلمانؓ کا مشورہ قبول کر لیا گیا۔ حضورؐ نے بذاتِ خود اس کام میں پہل کی۔ پہلے نشان ڈالا گیا۔ سل، پھاوڑا اور درانتی لیے ہوتے حضورؐ گڑھا کھودنے آگے بڑھے۔ مسلمان آپ کے اطراف جمع ہو گئے۔ چونکہ وقت بہت ہی کم رہ گیا تھا اس لیے سب کے سب دیوانہ وار اس کام میں لگے رہے۔ آپ لوگوں کی ہمت افزائی کرتے جاتے تھے۔

جس طریقے سے مسجد نبویؐ کی تعمیر کے وقت حضورؐ مسلمانوں سے باتیں بھی کرتے تھے اور کام بھی کرتے تھے اسی طریقے سے اس موقع پر بھی آپ کام کرتے ہوئے پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے۔ گرد و غبار میں اٹ جاتے تھے۔ خندق کی کھدائی میں مصروف رہتے تھے۔ آپ کام کرتے ہوئے رجز یہ اشعار میں آواز بھی ملاتے تھے۔

”اے اللہ ہم کو اس کا اجر جنت کی صورت میں دے۔ ہاجرین اور انصار

کی نظریں تجھ پر ہیں اور تیری مدد پر۔“

جب حضور ان اشعار کو پڑھتے جس کا مطلب اوپر لکھا گیا ہے تو مسلمان جواب میں دوسرا شعر پڑھتے جس کا مطلب ہے:-

’اے اللہ کے رسول۔ ہماری ساری وفاداریاں آپ کے لیے ہیں ہم آپ کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے ہیں۔ موت سے ہم ڈرنے والے نہیں۔‘
جو منافقین تھے محض دکھاوے کی خاطر تھوڑا بہت کام کرتے تھے حضور کی نظروں سے پھنکنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ سے اجازت لیے بغیر وہ ادھر ادھر ہو جاتے تھے اکثر بیت ان لوگوں کی تھی جو کہیں جانے سے قبل اجازت لے کر جایا کرتے تھے۔
ابن اسحاق کی روایت کے مطابق سورہ نور کی ۶۲ ویں آیت میں اس صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔

” صرف وہی لوگ مومن ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر یقین رکھتے ہیں جب وہ لوگ ان (محمد) کے ساتھ رہتے ہیں جب کہ وہ ایک اجتماعی کام میں مصروف ہیں، وہ اس وقت تک ان سے جدا نہیں ہوتے جب تک ان (محمد) کی اجازت نہ لے لیں۔ جو ان (محمد) کی اجازت لیتے ہیں، وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والوں میں ہیں۔“

خندق کی کھدائی ۳۱ مارچ ۶۲۷ء کو بمشکل ختم ہی ہوئی تھی کہ دشمن آنا شروع ہو گئے۔ قریش کے ساتھ ان کے تنخواہ دار محافظ تھے اور بنی کنعانہ کے لوگ تھے ان کے بعد عطفان کے لوگ آنا شروع ہوئے۔ اپنا ڈیرہ مدینہ کے شمال میں ڈالا یہ اُحد کی سمت تھا۔ حضور نے حکم دیا کہ عورتوں اور بچوں کو گھروں اور قلعوں میں منتقل کر دیا جائے۔

سارے مسلمان خندق کے اس پار جمع ہو کر اپنا مورچہ قائم کرنے لگے۔ غالباً یہ شہر کا شمالی حصہ تھا۔

کافروں نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ بنی نضیر کا یہودی سردار حئی ابن اخطب بنی قریظہ کی بستی میں گیا۔ مدینہ میں اب یہی ایک یہودی قبیلہ رہ گیا تھا۔ یہ لوگ مدینہ کے جنوب میں سب سے ٹھگ ٹھگ رہا کرتے تھے۔

بنی قریظہ کا سردار دوستی کا عہد کر چکا تھا۔ پہلے تو اس نے حئی ابن اخطب کی مدد کرنے سے انکار کر دیا مگر پھر حئی کے اصرار پر وہ مسلمانوں سے کیے ہوئے معاہدہ کو توڑنے پر آمادہ ہو گیا۔

جب حضور کو یہ اطلاع ملی کہ حئی ابن اخطب بنی قریظہ کے ہاں گیا ہے اور دونوں قبیلوں میں ساز باز ہو رہی ہے تو آپ نے بنی اوس کے سردار سعد ابن معاذ اور خزرج کے سربراہ سعد ابن عبادہ کو بنی قریظہ کے ہاں روانہ کیا۔ ابن اسحق کی روایت کے مطابق یہودیوں نے حضور کے نمائندوں کو جواب دیا۔

• کون ہیں خدا کے رسول؟ محمد سے تو ہمارا کوئی معاہدہ ہوا ہی نہیں تھا۔“

اس اثنا میں مدینہ کے مسلمانوں کے حوصلے پست ہو رہے تھے۔ منافقین گمراہ کن افراد میں پھیل رہے تھے۔ لوگوں کو یہ کہہ کر خائف کرتے تھے کہ محمد نے تو خدا کی مدد اترنے کی آس دلائی تھی۔ مسلمانوں کو کافروں پر فتح کی خوش خبری دی تھی۔ کہاں ہے وہ خدا کی مدد؟ تمہاری بنائیں اور تمہارے خاندان کے افراد اور تمہارے بال بچے سب خطرے میں ہیں۔ اس بات کا ذکر کئی بار ہو چکا ہے کہ عرب قبیلوں کے نزدیک لڑائیاں اور جنگیں ان کی فطرت کا اقتضا تھیں۔ انسانی زندگی کے معمولات میں سے ایک معمول تھا امن اور پائیدار امن ان کے ہاں ایک بے معنی بات تھی۔ پائیدار امن میں ان کے لیے کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ لڑائیوں اور جنگوں کی جہاں اور کئی وجوہ تھیں وہیں مالِ غنیمت کا حاصل کرنا بھی ایک بڑی وجہ رہتی تھی۔ دشمن کی غارتگری ایک ضمنی مقصد ہوتا تھا۔

یہ اتفاقیہ اور شوقیہ قسم کی لڑائیاں جو قبیلوں کے درمیان ہوا کرتی تھیں، جنگی فنون کے

ارتقاء اور ترقی میں ایک سد راہ بنی رہیں۔ جنگوں کا مقصد تو دشمن کو سر سے نیت و نابود کرنا ہوتا ہے۔ اپنی اور دشمن کی تباہی اور بربادی کو پیش نظر رکھتے ہوئے جنگوں کے اصول وضع کیے جاتے ہیں۔ مگر جہاں لڑائیوں کا مقصد ہی دشمن کو تباہ و برباد کرنا ہو تو پھر ایسی صورت میں کیسے اصول اور کہاں کے جنگی قوانین۔ اگر عرب قبیلے اپنے مقصد کے حصول کے لیے خفیہ اور رازدارانہ طریقے اختیار کرنے کی سوچتے تو یہ بات خود ان کی اپنی نظروں میں گری ہوئی معلوم ہونی تھی۔ وہ اُسے اپنے وقار اور عزت کے منافی سمجھتے تھے۔ بہانگ ذہل میدان میں آنا ان کا قومی شعار تھا۔ اسی طریقہ کو وہ جنگ کا مثالی طریقہ سمجھتے تھے۔ ایک خوشگوار تاریخی حقیقت کو ہمارے ذہنوں میں محفوظ رکھنا چاہیے کہ حضور کے انتقال کے سو سال کے اندر اندر ہی یہی عرب مصر کو فتح کر لیتے ہیں۔ شمالی افریقہ کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں، سارا اسپین ان کے قبضے میں آجاتا ہے۔ فرانس کے آدھے شمالی حصہ پر قابض ہو جاتے ہیں۔ بعد میں فرانس سے نکالے جانے پر آٹھ سو سال تک انہوں نے اسپین پر حکومت کی۔

ان ۸ سو برسوں میں ان عربوں نے اسپین، فرانس اور پھر انگلستان پر جنگ کا جو تاثر چھوڑا وہ اس صورت میں تھا کہ جنگ کا مقصد عزت کا حصول ہے۔ دشمن کی تباہی نہیں۔

ٹیکسپر نے ہنری پنجم کی زبان سے یہ الفاظ ادا کر دئے ہیں

”خدا کی قسم میں سونے چاندی یا ہیرے جو اہرات کا لالچی نہیں ہوں۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ میرے خرچ پر کتنے آدمی اپنا پیٹ پالتے ہیں مجھے اس کا خیال کبھی نہیں آتا کہ میرے پیسے سے کون اپنے بلبوسات تیار کر داتا ہے۔ اس قسم کی آئی جانی اور فانی چیزیں میری خواہشات اور میری آرزو کے احاطے سے باہر ہیں۔

میرے نزدیک اپنی عزت و ناموس پر کسی بھی قسم کی آنچ آنے دینا سخت گناہ ہے۔

جب ایسا ہوتے دیکھتا ہوں تو میری رگِ حیمت پھٹک اٹھتی ہے۔ میں سر پاجھلا اور بن جاتا ہوں۔“

ٹیکسٹر کی یہ ساری تقریر جو ہنری پنجم کے منہ سے ادا کر دالی گئی ہے بالکل بدوی عرب کے لب لہجے میں ہے۔ عربی ذہنیت اس میں پنہاں ہے۔

مغرب میں جنگ کا واحد مقصد دشمن کی تباہی رہتا ہے۔ ہر وہ طریقہ جو جنگ میں فتح و نصرت کا باعث بن سکتا ہے اپنالیا جاتا ہے، جائز طریقے اگر کارگر نہ ہوں تو ناجائز طریقوں کو استعمال کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں سمجھی جاتی۔ اس قسم کے بے لگام اور جاہلانہ طور طریق کی ابتداء تو بہت پہلے ہو چکی تھی لیکن آئے دن اس میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اگر رفتار ہی رہی تو عجب نہیں کہ ساری دنیا اور انسانیت فنا کی پیٹ میں آجائے۔

لوگ بہت کم اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس بات کی بہت کم کوشش کرتے ہیں کہ جن حالات میں وہ گھر سے ہوئے ہیں ان حالات کے پیدا ہونے کی اصل تک پہنچیں۔ نتیجہ کے طور پر سیکڑوں سال تک مغربی یورپ کی افواج پر عربوں کا چھوڑا ہوا اثر اس طریقے سے رہا کہ عزت کا حصول، شان و شوکت کا مظاہرہ اور بہادری کے جوہر دکھانا مغربی افواج کی لطافتوں کا مطلع نظر بن گیا۔ اس جذبے کے ساتھ ساتھ فتح کے حصول کی خواہش اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ کار کا اختیار کرنا ان کا مسلک بن گیا۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں جذبوں میں، یعنی عزت کا حصول اور اس کے لیے بہتر قیمت کی قید، بعد المشرقین کا فرق ہے۔

افواج کی عظمت و شان کا جو بچا کھچا جذبہ باقی رہ گیا تھا اس کے پیش نظر مغربی افواج نے ہماک ہمتیاری کی نشوونما اور فروغ کی ہمیشہ سے مخالفت کی۔ بہت سے ایسے سربراہان اور

آج بھی فوج میں مل جاتے ہیں جو تیر و کمان کے استعمال پر اب بھی زور دیتے ہیں آتش اسلحہ کے استعمال کی نہ صرف مخالفت کرتے ہیں بلکہ ان کے استعمال کو وہ اپنے لیے ذلت کا باعث سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں اس کا استعمال انسانی عظمت کے منافی ہے۔

فوج کے جنرل اب بھی ان دنوں کو یاد کرتے ہیں جن کی یاد سے ان کی اپنی بہادری اور شجاعت ان کے ذہنوں میں تازہ ہو جاتی ہے۔ ہاتھ میں تلوار، نمائندوں اور پیغام رسالوں کے ذریعہ اپنے دشمن کے کمانداروں سے رابطہ اور اسی قسم کے شجاعت سے بھرپور عمل غیر موثر سہی لیکن عربی شجاعت، دلیری، اوالعزمی اور جرأت کے عناصر سے بھرپور نظر آتے ہیں جو بعد میں چل کر مغربی دنیا کی تہذیب و شائستگی کو مالا مال کرتے رہے ہیں۔

مغربی مصنفین کو یہ حقیقت تسلیم کرنے میں وقت محسوس نہیں ہوتی جب وہ سنتے ہیں کہ مخالفین کو روکنے کے لیے مسلمانوں نے خندق تیار کی اور قریش کے لیے یہ خندق تعجب کا باعث بنی۔

شہر کے جو حصے کھلے تھے ان کے کناروں پر خندق کھودی گئی تھی۔ بقیہ حصوں کے لیے گھروں کی دیواریں فصیل کا کام دے رہی تھیں۔ گھروں پر حملہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قریش اس خیال سے آئے تھے کہ مسلمان شہر سے باہر میدان میں جنگ لڑیں گے جیسا کہ احد میں ہوا تھا۔ قریش نے مدینہ کے گھروں پر حملہ کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا۔

جن لوگوں کے پاس صرف برچھی بھالے، تلوار نیزے یا تیر و کمان ہوں ان کے حملوں کو گھروں کی دیواروں پر سے آسانی سے ناکام بنایا جاسکتا ہے۔ اگر وہ خندق پار بھی کر لیتے تو غارتوں پر حملہ کرنے سے روکا جاسکتا تھا۔ ذاتی طور پر مجھے یہ تجربہ ہوا ہے کہ ایک مسلح

جماعت کو لے کر جن کے ہاں بندوقتیں تھیں میں کسی کو حراست میں لینے گیا۔ مخالف جماعت کے لوگ بندگھروں میں تھے۔ ہمارے لیے یہ ناہمکن ہو گیا تھا کہ مخالفین کو زیر کر سکیں یا ان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر سکیں حالانکہ ہمارے پاس بندوقتیں تھیں اور ہم نے بندوقتوں کا استعمال بھی کیا تھا۔

مسلم مورخین منافقین کے سردار عبداللہ ابن ابی کو صاحب الرائے سمجھتے ہی نہیں۔ وہ یہ تسلیم کرنے میں قباحت محسوس کرتے ہیں کہ قریشی عمارتوں اور گھروں پر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ حملہ کریں بھی تو اس میں کامیابی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ ماننے میں انہیں مایہ لے قیادت ہے کہ یہ مشورہ عبداللہ ابن ابی نے آنحضرتؐ کو احد کی جنگ کے موقع پر دیا تھا۔ چونکہ مسلمانوں نے اس موقع پر عبداللہ ابن ابی کے سابقہ مشورہ پر عمل کیا تھا اس لیے وہ اس عمل کی کامیابی کا سہرا عبداللہ ابن ابی کے سر باندھنے کو تیار نہیں۔ وہ مسلسل یہی اصرار کیے جاتے ہیں کہ آپؐ نے جو خندق کھدوائی تھی، وہی خندق دشمنوں کے لیے شکست کا باعث بنی۔

قریش اور ان کے اتحادی آتے وقت اپنے ساتھ چھ سو گھڑ سواروں کو بھی لائے تھے۔ جنگِ احد میں قریش کی کامیابی محض ان کے گھڑ سواروں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس دفعہ اپنے ساتھ اتنے زیادہ سواروں کو رکھنے کی وجہ سے ان کو اپنی کامیابی کا صد فی صد یقین تھا۔ یہ یقین اس گمان پر تھا کہ مسلمان کھلے میدان میں جنگ کریں گے۔

ایک ہینہ گزر گیا۔ کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ درمیان میں خندق حائل رہی۔ کبھی کبھی ایک روٹیروں کا لین دین ہو جاتا تھا۔ حضورؐ کی ذات گرامی پر چونکہ سارے مسلمانوں کی ذمہ داری تھی اس لیے آپؐ متفکر ہو جاتے تھے۔ ایک مدبر اور سیاسی سمجھ بوجھ کے حامل کی حیثیت سے آپؐ کی یہ خواہش تھی کہ بغیر لڑائی بھگڑے کے یہ بلا ٹل جائے۔ اس خیال کے پیش نظر آپؐ نے ایک پیغامِ ارساں کو غطفان کے سرداروں کے ہاں روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ اگر وہ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضور کو مقررہ تعداد سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت قرآن نے دے دی تھی۔ سورہ احزاب کی پچاسویں آیت ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ استثنائاً صرف حضور کی ذات کے لیے تھا۔ مسلمانوں کے لیے نہیں۔

(ڈاکٹر جمیل اللہ نے اپنی کتاب رسول اکرم کی سیاسی زندگی میں لکھا ہے

” عربوں میں چونکہ قبیلہ واری نظام ہی عام طور پر رائج تھا اس لیے رشتہ داری سے سے زیادہ مؤثر کوئی اور وجہ دوستی و حلیفی نہیں ہو سکتی۔ چلے سے خود یہ بھی کتنی ہی کمزور چیز کیوں نہ ہو لیکن دیگر اسباب کے مقابلہ میں بہر حال زیادہ مستحکم و مستقل امر تھا۔

ہجرت نبوی کے بعد ایک اسلامی حکومت قائم ہو گئی جو ایک شہری مملکت سے آغاز پا کر دس سال ہی میں پورے جزیرہ نمائے عرب اور جنوبی عراق و فلسطین تک کے دس بارہ لاکھ مربع میل پر محیط ہو گئی تھی۔ اُس زمانے میں پیغمبر اسلام نے جو عقد فرمائے وہ جغرافیائی نقطہ نظر سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان میں جغرافیائی تقسیم اور ملک گیر وسعت نظر آتی ہے۔ قریب قریب ہر بڑے قبیلے کی اس میں نمائندگی ہے اور چونکہ یہ خواتین نہایت ہی شریف خاندان اور بڑے دستے کی ہوتی تھیں اس لیے اس کے اثرات بھی دور رس ہوتے تھے۔

اہل مکہ سے باہر بی بی زینب بنت خزیمہ اور بی بی میمونہ دونوں کا تعلق یمن کے زبردست قبیلہ عامر بن صعصعہ سے تھا۔ خاص کر بی بی میمونہ کی آٹھ زوجہ نہیں تھیں اور سب نہایت اچھے گھروں میں بیاہی گئی تھیں اور کتاب المسبح کے مستند مولف محمد بن حبیب (وفات ۲۴۵ھ) کو اپنی کلاسیکل کتاب میں تسلیم کرنا پڑا کہ

” پورے عرب میں کوئی اور ایسی عورت معلوم نہیں جس کے داماد اتنے سے زیادہ شریف

ہوں جتنے ہند بنت عوف کے جو بی بی میمونہ اور ان کی بہنوں کی ماں تھیں۔“

بی بی جویریہ بنتی المصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں۔ یہ ایک نہایت ہی طاقتور اور وسیع

قبیلہ تھا اور مکہ اور مدینہ کے مابین رہتا تھا۔ اس عقد کے ساتھ اسلامی مملکت کی سرحد مکہ

کی سمت کوئی سو میل آگے بڑھ گئی۔

کندہ جنوبی عرب میں ایک شاہی خاندان تھا۔ اسلام سے پہلے ان کی سلطنت جنوبی عراق تک عرب کے مشرقی حصے میں پھیل گئی تھی۔ یہی حال قبائل کلاب و کلب و بنی سلیم وغیرہ کا تھا۔

خود مکہ میں بی بی خدیجہؓ کا تعلق قبیلہ بنی اسد بن عبد العزیٰ سے تھا۔

بی بی سوڈہ کا بنی عامر بن لوی سے

بی بی عائشہ کا بنی تیم سے

بی بی حفصہ کا بنی عدی سے

بی بی آمنہؓ کا بنی مخزوم سے

بی بی آمنہؓ کا بنی امیہ سے

بی بی زینبؓ بن جحش کا قبیلہ بنی اسد بن خزیمہ سے

کے ہیں ان سے زیادہ بااثر کوئی اور خاندان نہیں تھے۔

بی بی ماریہؓ مسرک تھیں اور پہلے عیسائی رہ چکی تھیں۔

بی بی صفیہؓ کا تعلق خیبر کے یہودیوں سے تھا۔

اس مختصر بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کئے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ لکاحوں کے ذریعہ سے

مسلمانوں میں پرانی عصبیتوں کو دور کرنے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی وسیع کوشش

فرمائی اور نتائج بھی بتاتے ہیں کہ یہ کوششیں بے کار نہ رہیں۔“

(حبیب)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حضورؐ کی ازواج مطہرات کے نام دے دے دیے

جائیں۔

۱۔ بی بی خدیجہ بنت خویلد۔ حضورؐ سے بی بی خدیجہؓ کی شادی ۵۹۵ء میں ہوئی۔ آپ کے

متعلق کہا جاتا ہے کہ حضورؐ سے شادی کے وقت آپ کی عمر ۴۰ سال تھی۔ ۶۱۹ء میں آپ کی وفات ہوئی۔ بی بی خدیجہؓ کی زندگی میں حضورؐ نے کوئی اور شادی نہیں کی۔

۲۔ بی بی سوڈہ بنت زمعہ۔ آپ کا تعلق قریش تھا۔ شادی کے وقت آپ بیوہ تھیں آپ کی عمر ۴۰ سال تھی۔ ۶۱۹ء میں آپ کا نکاح حضورؐ سے ہوا۔

۳۔ بی بی عائشہؓ بنت ابوبکرؓ۔ ۶۱۳ء میں حضورؐ نے بی بی عائشہؓ سے نکاح کیا۔ حضورؐ کی تمام ازواج مطہرات میں یہ وہ واحد بی بی ہیں جو شادی کے وقت کنواری تھیں۔

۴۔ بی بی حفصہؓ بنت عمر بن خطاب۔ آپ ایک نوجوان بیوہ تھیں۔

۵۔ بی بی زینبؓ بنت خزیمہ۔ ان کا تعلق غطفان کے بنی امیر قبیلہ سے تھا۔ آپ دوبارہ بیوہ ہو چکی تھیں۔ حضورؐ سے آپ کا نکاح ۶۲۵ء میں ہوا۔ شادی کے کچھ مہینوں بعد ہی آپ کا انتقال ہو گیا۔

۶۔ بی بی ام سلمہؓ۔ آپ کا نام ہند تھا۔ قریش کے بنی مخزوم سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ ایک مسلمان کی بیوہ تھیں۔ شادی کے وقت آپ کی عمر ۲۹ یا ۳۰ سال ہو گی۔

۷۔ بی بی زینبؓ بنت جحش یہ حضورؐ کی چھوٹی زاد بہن تھیں۔ زید بن حارثہ کے طلاق دینے کے بعد حضورؐ نے آپ سے شادی کی۔

۸۔ بی بی ریحانہ بنت عمرو۔ آپ ایک یہودن تھیں۔ بنی قریظہ سے آپ کا تعلق تھا۔ ریحانہ بی بی کو اس وقت پکڑا گیا تھا جب کہ ۶۲۷ء میں قریظہ کے یہودیوں نے مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

۹۔ بی بی جویریہؓ۔ بنی مصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں۔ جنوری ۶۲۸ء میں جب مصطلق پر دھاوا بولا گیا تو آپ کو گرفتار کیا گیا تھا۔

۱۰۔ بی بی ام جلیبہؓ بنت ابوسفیان۔ آپ اپنے شوہر کے ہمراہ حبشہ ہجرت کر گئی تھیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد عرب واپس ہوئیں۔ حضورؐ جب خیبر کی لڑائی سے واپس

ہوئے قریش! میں بی بی ام مینہ کے ساتھ نکاح فرمایا۔

۱۱۔ بی بی صفیہ بنت حمز بن اخطب۔ خیبر کے یہودی سردار کنعانہ ابن ابی الحقیق کی بیوی تھیں۔ اس یہودی سردار کی موت مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئی۔ آپ کو یہودیت سے پھنسا کر مسلمان بنایا گیا پھر حضور سے نکاح ہوا۔

۱۲۔ بی بی میمونہ بنت حارث۔ یہ حضرت عباس کی سالی تھیں۔ ۶۱۹ء میں آپ کا نکاح حضور کے ساتھ ہوا جب کہ حضور حج کے لیے مکہ گئے ہوئے تھے۔

۱۳۔ بی بی ماریہ۔ یہ ایک مصری باندی تھیں۔ مصر کے فرمانروا کی طرف سے حضور کی خدمت میں تحفہ پیش کی گئی تھیں۔

ہم نہیں چاہتے کہ حضور کی ازواج مطہرات کے متعلق غیر ضروری بحث میں پڑیں ہاں چلتے چلتے چند باتوں کا یہاں ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ حضور کو عورتوں کی صحبت پسند تھی۔ آپ ان کی ہنسی سے محفوظ ہوتے تھے۔ آپ نے خود اس بات کا اقرار کیا ہے کہ

”میں تمام چیزوں سے زیادہ عورتوں کو اور خوشبو کو پسند کرتا ہوں، لیکن میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔“

عورتوں سے انس اور نماز کے درمیان آپ نے جو ربط قائم فرمایا ہے وہ اس بات کی شہادت ہے کہ آپ کے جذبات میں چاہے وہ عورتوں کے تعلق ہی سے کیوں نہ ہو ایک معصومیت اور پاکیزگی کا عنصر پایا جاتا تھا۔

آپ نے کبھی بھی جنسی بے راہ روی یا ہوس پرستی کی دکالت نہیں کی۔ زندگی بھر سوائے اپنی بیویوں کے کسی بھی عورت کے ساتھ آپ کے تعلقات نہیں رہے۔ اپنی بعثت سے قبل بھی جب کہ آپ نوجوانی اور جوانی کی منزلوں کو طے کر رہے تھے، ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کیا کرتے تھے کہا جاتا ہے کہ آپ نے کسی بھی عورت کو سوائے اپنے

محرمت کے کسی بھی بہانے چھڑا تک نہیں۔

آپ نے اس وقت اپنی ازدواج میں اضافہ کیا جب کہ آپ کی عمر ۵۵ سال کی تھی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سوائے بی بی عائشہ کے آپ کی تمام بیویاں بیوہ تھیں اور ان میں سے بھی کئی ایک ارمیٹر عمر کی اور حسن سے عاری تھیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور کو عمر رسیدہ اور سمجدار عورتوں کی صحبت پسند تھی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضور کو اولاد زریںہ کی خواہش تھی اس لیے آپ ایک کے بعد دوسری شادی کرتے رہے۔

اگر لوگوں کا یہ خیال صحیح تھا تو حضور بچے ارمیٹر عمر کی عورتوں سے شادی کرنے کے نوجوان لڑکیوں سے شادی کرتے تاکہ اولاد زریںہ کی خواہش کی تکمیل بہتر طریقے سے ہو سکے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضور نے یہ شادیاں سیاسی مصلحت کی بنا پر کیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ کا منشاء ان عورتوں اور بچوں کی سرپرستی کرنا تھا جو جنگوں میں مارے گئے تھے۔ جنگِ احد میں ستر مسلمان شہید ہوئے تھے۔ ان مسلمانوں کی شہادت نے عورتوں اور بچوں کو اہمیت کی ذمہ داری بنا دیا تھا۔ ان بیوہ عورتوں کی حضور نے اس طریقے سے سرپرستی کی۔

یہاں ایک اور بات قابلِ توجہ ہے۔ حضور جب جوان تھے بی بی خدیجہؓ کے بطن سے آپ کو چھ بچے ہوئے تھے۔ یہاں بارہ بیویوں سے ایک بچہ بھی نہیں ہوا۔ صرف مصری لڑکی ماریہؓ کے بطن سے ایک لڑکا تولد ہوا۔

حضور کی بیویوں میں سے اکثریت اگرچہ کہ جوان نہیں تھی پھر بھی بچے جننے کے قابل تھی۔ مدینہ میں حضور کو اتنا وقت ہی نہیں ملتا تھا کہ آپ زندگی کے اس پہلو پر زیادہ توجہ دیتے۔ یوں بھی جب آپ کی عمر بچپاس سے تجاوز کر گئی تھی، آپ ذہنی اور جسمانی طور پر اپنے آپ کو امت کے لیے وقف کر چکے تھے۔ جہاں انسان وقت کی اہم ترین

گھنٹیوں کو سلجھا رہا ہے اور مختلف قسم کے نازک ترین حالات میں گھرا ہوا ہو وہاں مکمل طریقے سے خسی خواہشات کی تکمیل جو بچوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جان بوجھ کر ادھوری چھوڑ دی جاتی ہے اور یہ امت کیلئے ایک قسم کی قربانی ہے۔

حضرت کا انتقال ۶۲ سال کی عمر میں ہوا۔ وفات کے وقت حضور کی گیارہ بیویاں تھیں۔ ان بیویوں کی تعداد کو ریچھ کر آپ پر نفس پرستی کا الزام لگانا سراسر نادانی ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کے بہترین ایام صرف ایک ہی بیوی کے ساتھ گزارے۔ زندگی کے ۵ سال تک آپ نے ایک ہی بیوی پر تناسل کی۔

مختلف مردوں اور عورتوں کی جسامتوں میں جس طرح فرق ہوتا ہے اسی طرح ان کے ذہن بھی مختلف ہوتے ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ آپ جیسے جیسے عمر رسیدہ ہوتے گئے دن بھر کے کاروبار سے فارغ ہو کر تھکے ماندے جب گھر واپس لوٹتے تھے تو اپنی ازواج کی ہم نشینی آپ کے ذہنی سکون کا باعث بنتی ہو۔

آپ اپنی بیویوں پر انتہائی مہربان رہتے تھے۔ ان کے نقاط نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ خدا نے اس پر رسے میں بھی آپ پر جو عنایتیں کی تھیں اس کے لیے آپ بارگاہ خداوندی میں سجدہ شکر بجالاتے تھے۔

اس بات کا پتہ چلانا مشکل ہے کہ اسلام سے قبل عورتوں کو اپنے ہونے والے شوہروں کو پسند کر کے ان سے شادی کرنے کا رواج تھا یا نہیں۔ مسلم ممالک میں آج بھی اس سلسلے میں کوئی یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ دوسرے مسلم ممالک کی بہ نسبت عرب میں عورتوں کو اپنی پسند کی شادی کرنے کی آسانیاں زیادہ ہیں۔ اپنی پسند کی شادیوں کے سلسلے میں چند ایک مثالیں جو پیش کی جاسکتی ہیں ان سے یہی نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ یہ اصول شخصیات پر منحصر رہا ہے۔ ایک باپ جس کا اثر اپنی بیٹی پر گہرا ہے اپنی بیٹی کو کہہ سکتا ہے کہ وہ باپ کی پسند کے لڑکے سے شادی کرے ایک لالہ بالی

باپ اپنی بیٹی کو آزادی دے دیتا ہے کہ وہ جس سے چاہے شادی کر لے۔
 عام طور سے عرب میں لڑکیوں کی شادی اس وقت کر دی جاتی ہے جب کہ ان کی
 عمر ۸ یا ۱۵ سال ہو کر تھی ہے۔ لڑکیوں کے شوہروں کا انتخاب ان کے باپ یا سرپرست
 کرتے ہیں۔ بیوہ، مطلقہ اور غیر پرسان حال عورتیں اپنی پسند سے شادیاں کر لیتی ہیں۔
 آنحضرتؐ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ لڑکی کو اپنے ہونے والے شوہروں کو رد کر
 دینے کا پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ شادی کے لیے لڑکی کی رضامندی ضروری ہے۔
 ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضورؐ کی ایک صاحبزادی سے شادی کرنے
 کی خواہش کا اظہار کیا۔ حضورؐ نے اپنی صاحبزادی کی رے مانگی۔ جب بیٹی نے نہ کہہ دیا تو
 آپ نے اس آدمی کے پیام کو رد کر دیا۔

ایک عورت کو اپنے ہونے والے شوہر کو پسند کرنے کا اتنا اختیار نہیں جتنا اسے
 رد کر دینے کا۔ عورت کو پورا پورا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جس آدمی کو بھی شادی کے لیے
 پسند نہ کرے اس کے پیام کو رد کر دے۔ اس کے اس حق کی پوری حفاظت کی گئی ہے۔
 عورت کو اس کی مرضی کے خلاف کسی کے بھی پلے نہیں باندھا جاسکتا یہی طریقہ آج بھی
 اکثر عرب قبیلوں میں رائج ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ بی بی خدیجہؓ نے خود حضورؐ سے شادی کی درخواست کی تھی۔ یہ صحیح
 ہے کہ ضمنی طور پر بی بی کو اپنے چچا سے شادی کی منظوری یعنی بڑی تھی لیکن بی بی خدیجہؓ کی
 یہ درخواست ان کے چچا رد نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ خواہش کا اظہار بی بی خدیجہؓ کی
 طرف سے ہوا تھا۔

مغربی مصنفین کا یہ کہنا تو بہت آسان ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے عرب ظالم
 تھے، جفا کار تھے اور وحشی خصوصیات کے حامل تھے۔ اپنی عورتوں کے ساتھ جانوروں
 جیسا سلوک کرتے تھے۔ اس قسم کا نتیجہ اخذ کرنا مصنف کو اپنے دل کا غبار نکال لینے میں

تو درد سے لگتا ہے لیکن یہ تعصب اور گمراہی کے دور ہے پر لاکھڑا کرتا ہے۔ اس پنج پر سوچنے والوں کو ان کے مطلب کی بھی چند مثالیں مل جاتی ہیں۔

جب ہم مختلف نقاط نظر کو سامنے رکھ کر اس وقت کے حالات کا تجزیہ کرتے ہیں تو عربوں پر یہ الزام کہ وہ اپنی عورتوں کو جانوروں جیسا سمجھتے تھے مبنی بر انصاف نظر نہیں آتا۔

ان کی بھمت کی بے شمار داستانیں اور حسن و عشق سے بھرپور نظمیں آج بھی ہم کو عربی ادب میں مل جاتی ہیں۔

صحرا میں عورتوں کا تین تہا سفر کرنا، عام مباحثوں میں حصہ لینا، شعر کی نظم خوانی میں شریک ہونا، شاعری کے مقابلوں میں حصہ لینا، لڑائیوں میں جا کر عملی طور پر شریک ہونا اس طرح کی سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔

ایسی بھی مثالیں ہیں جن میں عورتوں کا اپنے شوہروں کو راہ راست پر لانا، مردوں کے کسی عمل سے متفق نہ ہونا، رائے مشورہ دینا، اپنی بات کو منوانے کے لیے سخت سے سخت رویہ اختیار کرنا اور اسی طرح کی کئی باتوں کا ذکر ہے۔

میاں بیوی میں جب کوئی جھگڑا ہو جاتا اور وہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ عام طور سے عورتوں کی حمایت اور وکالت کرتے۔

جنگ اُحد کے دو سال بعد قریش کو پھر اس بات کا موقع ملا کہ وہ مسلمانوں کی سرگرمیوں کو ختم کرنے کے لیے ایک بڑی فوج کو لے کر میدان میں آئیں۔ مسلمانوں نے ان کے شہر کا اس طرح ناکہ بندی کر دی تھی کہ ان کی معیشت پر اس کا بڑا اثر پڑ رہا تھا۔

مسلمان مورخین کا کہنا ہے کہ یہودیوں کے درغلانے کی وجہ سے قریش نے محض دھاک بٹھانے اور پروپیگنڈہ کی خاطر یہ قدم اٹھایا تھا۔ قریش کی نظریں خاص طور پر سلام ابن ابی الحقیق اور حنی ابن اخطب پر اٹھتی تھیں جو یہودیوں کے بنی نصر کے سوار تھے۔

قریش سے قطع تعلق کر کے اپنے اپنے گھروں کا رُخ کریں تو ان کو مدینہ کے کھجوروں کی کاشت کا تیسرا حصہ بطور خوشنودی دیا جائے گا۔

دو قبیلوں کے سرداروں نے جو جنگ سے بیزار نظر آ رہے تھے اور وہ بھی ایسی جنگ جس سے نہ تو ان کو مالی منفعت کی امید تھی اور نہ ہی اس میں کوئی اور کشش تھی حضورؐ کی اس پیشکش کو قبول کر لیا۔

حضورؐ نے قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج کے سربراہوں یعنی سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ کو بلوا بھیجا اور اپنے منصوبے کا اظہار کیا اور ان دونوں سے مشورہ مانگا۔ انہوں نے پہلے یہ سوال کیا کہ کیا یہ خدا کا حکم ہے جس کی تعمیل ہم پر فرض ہے یا یہ آپ کا خیال ہے۔ جس پر آپ ہماری رائے طلب فرما رہے ہیں۔

آپؐ نے جواب دیا کہ میں تم سب کی خاطر ایسا کرنا چاہتا ہوں۔ موجودہ صورت حال نازک ہے۔ تم لوگ دشمنوں سے گھرے ہوتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ ان سب کو فخر کر دوں۔

سعد بن معاذ نے عرض کیا کہ جب ہم بھی ان ہی کی طرح بت پرست تھے ان کی مجال نہیں تھی کہ ہم سے ایک کھجور بھی ڈرا دھمکا کر حاصل کریں۔ اب اس وقت جب کہ خدا نے ہماری رہنمائی کی اور مشرف بہ اسلام کیا تو کیا ہم اپنی جائیداد ان کے حوالے ایسے ہی کر دیں گے؟ قطعاً نہیں۔

یہ سن کر فرمایا کہ اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو مجھے بھی منظور ہے۔ محاصرہ جاری رہا۔ یہ ان کئی مواقعوں میں سے ایک موقع ہے جس میں آنحضرتؐ بہ ذاتِ خود مصلحت اور مصالحت پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ لیکن اپنے پیروں کے رجحان کے پیش نظر لڑائی پر مجبور ہو جاتے ہیں یہ عین قرین قیاس ہے کہ قریش اس بات کو بھانپ گئے تھے کہ غطفان کے لوگ خفیہ طریقے سے مسلمانوں کے ساتھ ساز باز کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ لڑائی سے

چھٹکارا حاصل کر لیں۔ اس موقع پر غطفان کی گفت و شنید نے اسما دیوں میں شک و شبہات پیدا کر دیئے۔ ان شک و شبہات نے وہ زور پکڑا کہ ان لوگوں کے درمیان مسلمانوں کے خلاف لڑنے کا جو معاہدہ ہوا تھا وہ ٹوٹا نظر آیا۔

ایک دن قریش کے چار گھوڑوں نے خندق پار کر لی۔ مسلمانوں کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کا سردار عمرو ابن عبدود مسلمانوں کو مقابلے کے لیے لٹکارا مسلمانوں کا خون کھولانے کے لیے کہہ رہا تھا کہ کہاں ہے تمہاری جنت جس میں تمہیں داخل ہونا ہے۔ کیوں مجھ سے مقابلے کے لیے کتر رہے ہو۔

اس کی ان باتوں کو سن کر حضور نے حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو اشارہ کیا کہ اس کی دعوت مقابلہ قبول کر لیں۔ حضرت علیؓ عمرو کی طرف بڑھے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تم گھوڑے پر سوار ہو اور میں زمین پر کھڑا ہوں نیچے اترو تاکہ ہم دونوں میں برابر کا مقابلہ ہو سکے۔

عمرو گھوڑے سے نیچے اتر گیا۔ اب ان دونوں میں لڑائی شروع ہو گئی۔ ان کے پاؤں کی گردش کی وجہ سے گرد و غبار اٹنا اٹھا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا جب غبار چھٹا تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ عمرو زمین پر ہرا ہوا پڑا ہے اور حضرت علیؓ اپنی تلوار عمرو کے کپڑوں سے صاف کر رہے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر مسلمانوں نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے۔ عمرو کے تین ساتھیوں نے جب عمرو کا یہ حشر دیکھا تو وہاں سے اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے جدھر سے آئے تھے اُدھر واپس چلے گئے۔

اوس کے سردار سعد ابن مساذ نیزہ اٹھائے ہوئے تھے۔ ان کو ایک تیر لگا جس سے زخم آیا۔ یہ زخم جان لیوا ثابت ہوا۔

قبیلہ غطفان کے ایک فرد نعیم ابن مسعود مسلمان ہو کر مدینہ میں حضورؐ کی خدمت میں رہنے لگے تھے۔ قریش کے سرداروں نے بنی قریظہ کے یہودیوں کو کہا کہ وہ دوسرے

رخ سے مسلمانوں پر حملہ کریں۔ اسی بات چیت کے دوران قریش نے اپنے چند آدمیوں کو بنی قریظہ کے درمیان بھی چھوڑ دیا تاکہ بنی قریظہ کے یہودی یہ نہ سمجھیں کہ قریش ان کو مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود مکہ فرار ہو گئے ہیں۔

نعیم ابن مسعود کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ قریش کے پاس گئے۔ ان سے کہا کہ تم جن لوگوں کو یہودیوں کے پاس بطور ضمانت چھوڑ رہے ہو ان کی جان خطرے میں ہے اس لیے کہ یہودی تمہارے افراد کو رسول اللہ کے حوالے کر رہے ہیں تاکہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات بہتر ہو جائیں۔

اس کے بعد نعیم یہودیوں کے ہاں گئے اور ان سے کہا کہ جب تک تم قریش کے چند لوگوں کو بطور ضمانت اپنے پاس نہ رکھ لو قریش کی باتوں پر یا ان کے وعدہ و وعید پر بھروسہ نہ کرنا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قریش تم سے دھوکہ بازی کر رہے ہیں۔ وہ تم لوگوں کو مصیبت میں پھنسا کر خود مکہ رفوچکر ہونا چاہتے ہیں۔ نعیم کی اس شاطرانہ چال سے بنی قریظہ اور قریش ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے۔ بد اعتمادی کی فضا پیدا ہو گئی۔

ساتویں صدی کے عرب اپنے جانوروں کو دانہ چارہ خرید کر نہیں کھلایا کرتے تھے بلکہ چراگا ہوں میں چرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ قدرت کی فراہم کردہ گھاس ان جانوروں کا پیٹ بھر دیتی تھی۔ آج بھی بدوی قبائل اپنے جانوروں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں جانوروں کی بڑی تعداد ایک محدود رقبے میں تو اپنا پیٹ نہیں بھر سکتی۔ جدھر بھی وہ ہرا بھرا دیکھتے ہیں نکل جاتے ہیں۔ جو لوگ بدوی قبائل کے ساتھ اٹھے بیٹھے ہوں وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ بدویوں کے ذہن پر ہمیشہ چراگا ہی سوار رہتی ہیں۔

قریش اور ان کے ساتھ آئے ہوئے قبائل اب اس بات سے پریشان ہو رہے تھے کہ مدینہ کے باہر چو چراگا ہی ہیں۔ وہ ان کے جانوروں کے لیے ناکافی تھیں۔ جتنا بھی

بزرگ تھان کے جانوروں نے لکے ختم کر لیا تھا۔ چارہ کی قلت کی وجہ سے ان کے جانور مرنا شروع ہو گئے تھے۔

پروفیسر مارگولیش نے بڑی ہی حقارت کے ساتھ مدینہ میں محصور ہو جانے والوں کو بزدل کہا ہے اور ساتھ ہی ان کو نااہل بھی۔

اس قسم کی زبان استعمال کرنے سے پہلے کسی بھی صاحبِ علم و بصیرت کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ یہی وہ لوگ تھے جو صرف اس واقعہ کے سات سال بعد دنیا میں فتح و نصرت کا جھنڈا ایسا گاڑتے ہیں جس کی مثال دینے سے تاریخ قاصر ہے۔ ان کی فتوحات کا دائرہ ایک طرف فرانس کو اپنی طرف لیتا تھا تو دوسری طرف ان کے مدد و چین کی سہولت سے جاملتے تھے۔

اس بات کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں نے جب یہودیوں کے قبیلے قنیقاع اور بنو نضیر کے خلاف اعلان جنگ کیا تو انہوں نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ ان کے گھروں پر حملہ کیا جائے یا انہیں لوٹا جائے۔ اس وقت مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد یہودیوں سے دگنی تھی۔ مسلمانوں نے بھی صرف محاصرہ پر قناعت کی تھی۔

کافروں اور مسلمانوں کے درمیان لوگوں کو اگر کوئی فرق نظر آتا تھا تو ان کے جوش، جذبے اور حوصلے میں نظر آتا تھا۔ جہاں تک مادی اور جسمانی ہمت و قوت کا سوال تھا دونوں فریق برابر تھے۔ لیکن قریش ایک منفی جنگ لڑ رہے تھے۔ ان کی یہ لڑائی بغیر کسی مقصد کے تھی۔ وہ اپنی زندگی کی رسم و راہ میں کسی بھی قسم کی تبدیلی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے برخلاف مقصد کی موجودگی مسلمانوں کے دلوں کو گرما رہی تھی۔

مسلمانوں کے پیش نظر مثبت پہلو تھے۔ ان کو اس خیال سے تقویت ہوتی تھی کہ ساری دنیا کی نئے سرے سے تنظیم کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کی ہے خدا کے تعالیٰ کے سپرد کردہ فرض کی ادائیگی کا جذبہ ان کی رگوں میں اس طرح سرایت

کر گیا تھا کہ اب وہ ایک نئی منزل کی طرف گامزن تھے ان میں ایک نئی زندگی کا شعور پیدا ہو گیا تھا۔ یہی وہ شعور تھا جو مسلمانوں کے حوصلوں کو دن بہ دن بلند کر رہا تھا۔

کافروں کے ہاں ایسے کسی جذبے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہی وہ تفاوت تھا جو دونوں فریقوں کے درمیان ایک حدِ فاصل بنا ہوا تھا۔

جب کافروں نے دیکھا کہ مسلمان شہر سے باہر میدان میں جنگ نہیں کر رہے ہیں تو انہوں نے محاصرہ جاری رکھنا حماقت سمجھا۔

محاصرہ کو فوری ختم کر کے واپس جانے کا فیصلہ جس رات ہوا وہ رات بھی ایک عجیب و غریب رات تھی۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ زور دار ہوا چل رہی تھی۔ پانی خیموں کے اندر آگیا تھا۔ خیموں میں جو آگ جلائی جا رہی تھی اب وہ پریشانی کا باعث بن گئی تھی۔ پکانے کے برتن اور کھانے پینے کا سامان ہوا میں اڑ اڑ کر صحرا میں جا کر گرنے لگا تھا۔ بارش کے ساتھ بلا کی سردی بھی ہونے لگی تھی۔ جانور ٹھٹھ کر مر رہے تھے۔ چارہ کی قلت کی وجہ سے یہ پہلے ہی سے ادھ موتے تھے جیسے ہی اس آندھی اور طوفان میں کمی ہوئی البوسفیان نے اپنی مجلس مشاورت طلب کی۔ اس مجلس کے سامنے اُس نے اپنی واپسی کے ارادہ کا اعلان کیا۔ ایک مسلم جاسوس کے بیان کے مطابق جو اس وقت وہاں موجود تھا، البوسفیان اُنٹادہشت زدہ تھا اور واپس جانے کے لیے اُنٹا مضطرب کہ ابھی وہ اونٹ پر بیٹھنے کے لیے صرف ایک ہی پاؤں رکھا تھا کہ اونٹ کو اٹھا دیا اور اُسے دوڑنے لگا۔

قریش کے لیے محاصرہ چھوڑ کر واپس جانے کی دوسری وجہ یہ رہی کہ مکہ کے سالامیلے کے لیے صرف ایک مہینہ باقی رہ گیا تھا۔ حج سے ایک ماہ قبل ایک بازار لگایا جاتا تھا جس میں کافی خرید و فروخت ہوتی تھی اور مکہ والوں کو اس سے کافی فائدہ ہوتا تھا۔ قریش کے لوگ اب دہری قریبانی کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایک طرف تو ان کو مالی نقصان

کا اندیشہ تھا۔ دوسری طرف وہ محاصرہ بخاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ حج کے لیے جو لوگ کہ آتے تھے ان کے انتظامات بھی ان ہی کو کرنے تھے۔ ان کو خطرہ تھا کہ اگر محاصرہ کرتے وہ مدینہ میں رہ جائیں تو اس اعزاز سے بھی محروم رہیں گے۔

جیسے ہی قریش واپس جانا شروع ہوئے ان کے پارو مددگار بدوی قبیلے بھی صحرا میں روپوش ہونے لگے۔

مدینہ کا محاصرہ ختم ہو گیا۔ جو شخص مشرکین کی نفل و حرکت پر نگرانی کے لیے مقرر کیا گیا تھا، مشرکین کے چلے بانے کے بعد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صبح کا وقت تھا۔ سرد ہوا پل رہی تھی۔

حضورؐ ایک چادر اوڑھے ہوئے نماز ادا فرما رہے تھے۔ آپ نے حکم دیا کہ لوگ خندق سے باہر نکل آئیں۔ آپ اپنے مکان تشریف لے گئے۔ جنگ کے لیے جو لباس پہنا تھا وہ اتار دیا۔

اسی دن دوپہر میں حضورؐ نماز ظہر کے لیے مسجد جا رہے تھے۔ راستے میں جبریل سے ملاقات ہوئی۔ جبریل سر پر زریں عمامہ اوڑھے ہوئے تھے۔ پھر پر سوار تھے۔ پھر کی زین ریشم و کھنوا ب سے سجھی ہوئی تھی۔ جبریل نے حضورؐ سے سوال کیا کہ کیا لڑائی ختم ہو چکی ہے۔ حضورؐ نے اثبات میں جواب دیا۔ جبریل نے کہا کہ فرشتوں نے تو ابھی تک اپنے ہتھیار نہیں اتارے ہیں۔ خدا نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ بنی قریظہ کے ہاں جائیں۔ جبریل نے کہا کہ میں خود بھی وہیں جا رہا ہوں۔ یہ کہہ کر فرشتہ غائب ہو گیا۔ حضورؐ نے فوری اعلان فرمایا کہ کوئی شخص اس وقت تک نماز ظہر نہ پڑھے جب تک کہ وہ بنی قریظہ کی بستی میں نہ پہنچ جائے۔ خود جانے سے قبل چند مسلمانوں کو وہاں روانہ کر دیا تھا۔ آپ نے ان لوگوں سے دریافت کیا کہ آیا انہوں نے کسی اور کو وہاں سے گزرتے دیکھا ہے۔

لوگوں نے جواب دیا کہ ہم نے وحیہ ابن خلیفہ کو ایک سفید خچر پر جس کی زین ریشم
دکھنوا سے مزین تھی یہاں سے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔

حضور نے جواب دیا کہ وہ تو جبریل تھے۔ وہ اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ بنی قریظہ
کے قلعوں کی دیواریں ہلا دی جائیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حئی ابن اخطب یہودی قبیلہ بنی نضیر کا سردار تھا۔ اسی نے
قریش اور غطفان کو مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا تھا۔ بنی قریظہ کو مجبور کیا تھا کہ وہ
مسلمانوں کے خلاف قریش سے مل جائیں۔ جب قریش اور دیگر قبائل محاصرہ اٹھا کر اپنے
مقام کو چلے گئے تو یہ بنی قریظہ کی بستی پر پہنچا۔ اس نے ان کو منیٰ طب کر کے کہا اہل یہود
تم دیکھ چکے ہو کہ کیا کچھ ہو چکا ہے۔ میں تمہارے سامنے تین تجاویز رکھتا ہوں۔

پہلی یہ کہ ہم انھیں اپنا پیغمبر تسلیم کر لیں۔ پھر تو ہماری جانیں، ہماری عورتیں، ہمارے
بچے اور ہماری جائدادیں سب ہی محفوظ رہیں گے۔

بنی قریظہ نے جواب دیا کہ ہم کسی قیمت پر بھی اپنا مذہب ترک کرنے کے لیے
تیار نہیں ہیں۔

یہ سن کر حئی نے کہا کہ ایسی صورت میں ہمیں چاہیے کہ پہلے اپنے ہی ہاتھوں اپنی
عورتوں اور بچوں کا خاتمہ کر دیں اور اس کے بعد محمد سے مقابلہ کریں، اب تلوار ہی
فیصلہ کرے گی۔

بنی قریظہ نے کہا کہ کس طرح وہ اپنے بے گناہ بچوں اور عورتوں کو اپنے ہی ہاتھوں
ہلاک کر سکیں گے۔ ان کے بعد ہم کس کی خاطر جتیں گے۔ ایسی زندگی کا فائدہ ہی
کیا ہوگا۔

بنی قریظہ کی ان باتوں کو سن کر حئی نے اپنی تیسری تجویز رکھی، کہا کہ آج کی رات
ہماری مذہبی رات ہے۔ ہم کو چھپ چھپا کر مدینہ سے باہر نکل جانا چاہیے۔ اگر ہم ایسا

کر لیں تو محمدؐ اور مسلمانوں کو ہماری روپوشی پر بڑا تعجب ہو گا۔ انہیں معلوم ہے کہ ہم اپنے مذہبی دن کبھی کسی سے نہیں لڑتے اس لیے وہ ہم کو درگزر کریں گے۔ یہودیوں نے دہشت زدہ ہو کر سوال کیا کہ کیا ہم اپنے مذہبی دن کو گندہ اور نجس کر دیں۔

حجی نے غضب ناک ہو کر کہا کہ تم لوگ مسائل کو حل کرنے کے قابل نہیں رہے ہو۔ جو میں کہہ چکا ہوں بس اُسی پر عمل کرو۔

یہودیوں نے اپنے ایک نمائندہ کو حضورؐ کی خدمت میں روانہ کیا اور درخواست کی کہ بنی اوس کے ابولبابہ کو یہودیوں کے ہاں روانہ کیا جائے۔ بنی اوس کے تعلقات بنی قریظہ سے لچھے تھے۔ جب ابولبابہ یہودیوں کے ہاں گئے تو ان کی اس کسم پرسی کی حالت کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈباناے لگے۔ ساری عورتیں اور بچے گریہ و زاری کر رہے تھے۔ مرد ہیبت کے مارے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ یہودیوں نے کہا اے ابولبابہ کیا آپ کی رائے میں یہ مناسب ہے کہ ہم محمدؐ کے آگے اپنا سر خم کر دیں۔ ابولبابہ نے کہا ہاں "لیکن اسی لمحہ انہوں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی کو گلے کی طرف لے جا کر اشارہ سے بتلایا کہ ان سب کا گلا بھی کاٹ دیا جائے گا۔ ابولبابہ بعد میں کہتے ہیں کہ میں نے ڈرتے ڈرتے یہ حرکت کی تھی۔ پھر مجھے فوری یہ احساس ہوا کہ میں نے اللہ اور رسول کی غلط ترجمانی کی ہے۔

ابولبابہ دوڑتے ہوئے مسجد نبویؐ واپس ہوئے۔ حضورؐ سے نظریں بچاتے رہے مسجد میں پہنچ کر انہوں نے اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ لیا۔ حضورؐ نے ان کی اس حرکت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ابولبابہ اگر سیدھے میرے پاس آجاتے تو میں اپنے اللہ سے درخواست کرتا کہ وہ ابولبابہ کو معاف کر دے۔ چونکہ انہوں نے خود ہی ایسی حرکت کی ہے اس لیے میں ان کو ستون سے اس وقت تک آزاد کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ جب تک کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس لغزش کو درگزر نہ فرمادے

اُس رات حضورِ ام سلمہؓ کے گھر آرام فرما رہے تھے۔

حضور کے وصال کے بعد بی بی ام سلمہؓ اس واقعہ کو یاد کر کے فرماتی ہیں کہ صبح صبح یعنی فجر کے وقت میں نے رسول اللہؐ کو ہنستے ہوتے دیکھا۔ میرے سوال پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ خدا نے ابولبابہ کو معاف کر دیا ہے۔ بی بی ام سلمہؓ نے یہ خوش خبری ابولبابہ تک لیجانے کی اجازت مانگی، اور دوڑتے ہوئے اپنے دروازہ تک گئیں، زور زور سے کہنے لگیں:-
 "ابولبابہ تمہیں مبارک ہو۔ خدا نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔" یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ پردہ کے احکام ابھی نازل نہیں ہوئے تھے۔ بی بی ام سلمہؓ کی آواز سن کر کئی لوگ ابولبابہ کو ستون سے الگ کر کے آگے بڑھے ابولبابہ نے ان کو روک دیا اور کہا جب تک کہ خود رسول اللہؐ اپنے ہاتھوں سے مجھے رہا نہ کر دیں مجھے آزاد نہ کرو۔

دوسرے دن صبح بنی قریظہ کے یہودیوں نے مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈال دیتے۔ بنی قریظہ ۲۵ دن محصور رہے۔ جب بنی کنعانہ نے بھی اسی قسم کی حرکت کی تھی تو عبد اللہ ابن ابی نے حضورؐ سے درخواست کی تھی کہ ان لوگوں کو معافی دے دی جائے بنی کنعانہ بنی خزرج کے حلیف تھے اور عبد اللہ خزرج کا سردار تھا۔ جیسے ہی بنی قریظہ نے مسلمانوں کی بیادت کو تسلیم کر لیا بنی اوس نے حضورؐ سے درخواست کی کہ بنی قریظہ کے ساتھ بھی وہی سلوک ہو جو بنی کنعانہ کے ساتھ ہوا تھا۔ بنی قریظہ بنی اوس کے حلیف تھے۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ اے بنی اوس۔ تمہارے قبیلے ہی کا کوئی آدمی ان لوگوں کے متعلق اگر کوئی فیصلہ صادر کرے تو کیا تم مطمئن رہو گے۔ کیا اس کا فیصلہ تمہارے لیے قابل قبول ہو گا؟

قبیلہ اوس کے سردار سعد ابن معاذ کے بازو پر خندق میں ایک تیر لگنے سے زخم لگا تھا۔ ان کے زخم میں زہر پھیل گیا تھا۔ ان کی حالت دن بہ دن خراب ہو رہی تھی۔ وہ بستر مرگ پر تھے۔ چونکہ یہ بنی اوس کے سردار تھے اس لیے حضورؐ نے انہیں

بلوا بھیجا۔ وہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بنی ادس کے لوگوں نے اپنے سردار سے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ بنی قرظیہ کے ساتھ رحم و مہلت کے ساتھ پیش آو اس لیے کہ حضور نے ان کی قسموں کا فیصلہ کرنے کے لیے تمہیں جمع بنایا ہے بنی ادس کے کہنے پر حضور نے سعد کو حکم بنایا۔ سعد بن معاذ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ سارے آدمی مار ڈالے جائیں ان کی جائیداد تقسیم کر دی جائے۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو اپنے قبضے میں لے لیا جائے۔ سعد نے کہا یہ ہے میرا فیصلہ۔

ان کے فیصلے کو سن کر حضور نے فرمایا کہ تم نے خدائی فیصلہ دیا ہے۔ اس خدا کا فیصلہ جو ہفت آسمانوں سے بھی اوپر ہے۔

حضور نے سعد بن معاذ کے فیصلہ کو قبول فرمایا۔ راتوں رات مدینہ کے بڑے بازار کے قریب گڑھے کھودے گئے۔ صبح پھر یہودیوں کو آزادی دی گئی کہ چاہیں تو اب بھی وہ اسلام قبول کر لیں تاکہ ان کی جان محفوظ رہے۔ بہت ہی کم لوگوں نے مسلمانوں کی اس پیش کش کو قبول کیا۔ سعد بن معاذ نے فیصلہ سناتے وقت کہا تھا کہ سعد کے لیے وہ وقت آچکا ہے جب کہ اللہ کی راہ میں لوگوں کی رضامندی اور نارضامندی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ بنی ادس لے، مسلمانوں نے اور حضور نے سب نے مل کر یہ ہمد کیا تھا کہ سعد بن معاذ جو بھی فیصلہ کریں گے وہ ان سب کے لیے قابل قبول ہو گا۔ سات یا آٹھ سو کے قریب یہودیوں کو ٹھکانے لگا دیا گیا۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو نجد کے بازار میں بیچ دیا گیا۔ ان میں کی ایک عورت ریحانہ بنت عمر و حضور کے ازواج مطہرات میں شامل ہوئیں۔

قرآن کے سورۃ احزاب میں اس محاصرہ کا ذکر ہے۔ فرمایا گیا ہے:-

”مومنو۔ خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جو اس نے تم پر اس وقت کی جب فوجیں تم پر حملہ کرنے کو آئیں۔ ہم نے ان پر ہوا بھیجی۔ ایسے لشکر نازل

کیے جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔“

مدینہ کے محاصرہ کے اختتام کے بعد عورتوں کے لیے خاص احکام نازل ہوئے۔ حضورؐ کی بیویوں کے لیے احکام نازل ہوئے کہ وہ اپنے گھروں میں رہا کریں، اپنے زیورات کی نمائش عام لوگوں میں نہ کرتی پھریں۔ مرد اگر ان سے بات کرنا چاہیں تو وہ بات کر سکتے ہیں مگر پردہ کے پیچھے سے۔ جب وہ مجمع میں جائیں تو ان کے چہرے ڈھکے ہوئے ہوں اپنے لباس اور اپنے زیورات کی نمائش نہ کرتی پھریں بلکہ کسی کپڑے سے لباس اور زیورات کو ڈھانپے رکھیں۔ یہ احکام اصل میں حضورؐ کی ازواج مطہرات کے لیے نازل کیے گئے تھے لیکن بعد میں ان کا اطلاق تمام مسلمان عورتوں پر کیا جانے لگا۔

مگر ماگرم بحث کا موضوع یہ بھی رہا کرتا ہے کہ حضورؐ نے عورتوں کے مرتبہ کو گرایا ہے یا اونچا کیا ہے۔

مالی طور پر حضورؐ نے عورتوں کی مدد اس طرح سے کی کہ وہ میراث کے ایک مقررہ حصہ کی مالک ٹھہرائی گئیں۔ اپنے ماں باپ کی جائیداد کے وارثوں میں عورت کو شامل کیا گیا۔ اسلام سے قبل صرف بیٹے ماں باپ کی جائیداد کے وارث ہوتے تھے۔ حضورؐ نے نومولود لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی رسم کو بالکل ختم کر دیا۔ بیٹوں کو باپ کی بیویوں سے شادی کرنے سے منع فرمایا۔

قرآن کے سورۃ نسا، کی ۳۲ ویں آیت میں عورتوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنی محنت اور مزدوری سے جو کچھ کاتی ہیں اس پر ان کا حق ہے۔ اسی سورۃ کی ۳۵ ویں آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ ازواجی جھگڑے کی صورت میں ایک ثالث شوہر کی طرف سے ہوگا اور دوسرا ثالث بیوی کی طرف سے یہ دونوں مل کر مصالحت کی کوشش کریں گے۔

دوسری طرف حضورؐ نے سختی سے فرمایا کہ شوہر گھر کا بڑا ہوگا۔ اس کو حق حاصل

ہے کہ اپنی بیوی کی تنبیہ کرے اگر وہ نالائق اور نافرمان برادر ہو۔ اچھی عورت آپ کے نزدیک وہ ہے جو اپنے شوہر کی مطیع اور فرمانبردار ہو۔

عورتوں پر آپ نے جو پابندیاں عائد کی ہیں وہ محض اخلاقی نوعیت کی ہیں ان میں خیارِ سختی یا بے رحمی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ اس کے برخلاف آپ نے ہمیشہ عورتوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرنے کو کہا ہے۔ ان کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی وکالت کی ہے۔

آپ نے ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دی ہے۔ جنسی بے راہ روی کے آپ دشمن تھے۔ جنسی اختلاط اور عورتوں اور مردوں کے ایک ساتھ اٹھنے بیٹھنے یا میل ملاپ کو آپ قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں۔ آپ نے عورتوں سے شادیاں کیں اس کے باوجود جنس کے تعلق سے آپ کا ایک خاص نقطہ نظر تھا۔ ہوائے اپنی بیوی کے آپ نے زندگی بھر کسی عورت کو چھوا تک نہیں۔ آپ کا ایقان تھا کہ ایسا سماج جس میں افراد خاندان کے علاوہ مرد اور عورت جہاں بے تکلفانہ آپس میں ملتے جلتے ہوں اور عورتیں اپنے جسم کی نمائش کرتی پھرتی ہوں اور غیر مردوں کی نظروں میں چھنے کی کوشش کرتی ہوں بہت جلد جنسی بے راہ روی کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہی وہ سبب تھا جس کے پیش نظر عورتوں کے لباس اور ان کی آئنا دانہ بے لگام نقل و حرکت پر پابندی عائد کی تھی۔ دوسری طرف آپ نے ان کے حقوق کی حفاظت فرمائی۔ مردوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنی عورتوں کے ساتھ مہربانی کے ساتھ پیش آئیں۔

مسلمانوں کا عورتوں کو سختی سے پردہ کرانا اور ان کو گھروں میں بند رکھنا مغرب کے اکثر لوگ آپ کے احکام سے منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں رسمیں آپ کے انتقال کے دو سو سال بعد ایرانیوں نے اختراع کیں۔ ایرانی اثر سے متاثر ہو کر دنیا کے اور مسلمانوں نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

یادگار تاریخیں

۶۶۲۲

۶۶۲۵

اپریل ۶۶۲۷

مدینہ کو ہجرت

جنگِ احد

مدینہ کا محاصرہ

بنی قریظہ کی یزید کنی

حدیث

حضور کے حالات اور بزمک کے ہونے والے واقعات کو بتلانے میں ہم ایسے منہ وں سے کہ آپ کے جاری کردہ قوانین، امتناغات اور اصلاحات کا ذکر نہ کر سکے۔ یہ وہ قوانین اور اصلاحات ہیں جو حضور نے مدینہ میں ابتدائی قیام کے دوران مسلمانوں کے لیے نافذ فرمائے تھے۔ قانون یا حکم کے نفاذ کی قطعی تاریخ دینا بہت مشکل ہے۔ بن حالات میں یہ قانون وضع کیے گئے وہ قانون کے منشا، اور اس کی ملت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اسلام سے قبل عرب شراب کے عادی تھے۔ قبل اسلام شاعر شراب کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیتے تھے۔ بت پرست عرب مدہوشی کو برا سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک مدہوشی انسانی عظمت کے منافی تھی۔

شراب کا نشہ انسانی عظمت اور اس کی بزرگی اور بلندی کو قصر مذلت میں دھکیل دیتا ہے۔ نشہ کے عالم میں انسان کیسی کیسی گری ہوئی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ اسی لیے بعض لوگ شراب کے اثر کو کم کرنے کے لیے اس میں پانی ملا کر یا بعض شہد بلا کر پیتے تھے۔

شراب کی قطعی ممانعت کا اعلان حضور نے مدینہ میں فرمایا۔ جنگ اُحد سے پہلے یا اس کے فوری بعد شراب حرام قرار دی گئی۔ حضرت حمزہؓ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حالتِ نشہ میں اُحد میں جنگ کے لیے گئے تھے۔ شاید حمزہ کی شہادت ہی نے شراب کو قطعیت کے ساتھ حرام کرنے میں آسانی فراہم کر دی ہو۔

قرآن کے سورۃ المائدہ کی ۹۰ ویں آیت میں ارشاد ہوا ہے
 "اے ایمان والو۔ شراب اور جوا اور بت اور پانسے یہ سب ناپاک
 کام اہمال شیطان سے ہیں۔ ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ۔"
 پھر ارشاد ہوتا ہے

"شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوتے کے سبب تمہارے آپس میں
 دشمنی اور رنجش ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک
 دے تو تم کو ان کاموں سے باز رہنا چاہیے۔"

سورۃ بقرہ کی ۲۱۹ ویں آیت میں پھر ارشاد ہوتا ہے:-
 "اے پیغمبر لوگ تم سے شراب اور جوتے کا حکم دریافت کرتے ہیں۔ کہو
 کہ ان میں نقصان زیادہ ہیں۔ لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ مگر
 ان کے نقصان فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں۔"

شراب کی حرمت بڑی حد تک کامیاب رہی لیکن مکمل طریقے سے کبھی بھی نہیں
 ان رنگین محفلوں اور مجلسوں کا ذکر ہم اب بھی پڑھتے ہیں جس میں قرونِ اولیٰ کے فاتح
 اپنے وقت کو رنگین بناتے تھے اور شراب سے خوب شغل فرمایا کرتے تھے۔ دمشق میں
 اموی خلفاء کے درباروں میں باقاعدگی کے ساتھ شراب کا استعمال ہوا کرتا تھا۔

جو لوگ اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے مشہور تھے ان میں سے بعض انہی ظاہری
 پارسائی برقرار رکھنے کے لیے چرمی چھپے شراب پیا کرتے تھے۔ شراب کے سرور سے

وہ فائگی محفلوں میں لطف اندوز ہوتے تھے۔ آج بھی جب کہ کئی ایک مسلمان شراب پیتے ہیں اکثریت ان مسلمانوں کی ہے جنہوں نے زندگی بھر نہ تو شراب کو دیکھا ہے اور نہ ہی شراب کو چکھا ہے۔

مسلم ممالک میں عام اجتماعات اور تقریبات میں مہانوں کو شراب پیش نہیں کی جاتی۔

تیروں سے فال جس میں بہت سارے تیروں کو اکٹھا کر کے زمین پر گرایا جاتا تھا اور کامیابی کا انحصار تیر کے گرنے کے رخ اور اس کے انداز پر رہتا تھا قمار بازی کی ایک شکل تھی۔ اس کو بھی منع کیا گیا۔

کھانے پینے اور غذا کے متعلق کم و بیش وہی احکامات ہیں جن پر یہودی عمل کرتے ہیں۔ سور کے گوشت کی ممانعت کی گئی ہے۔ مراہوا جانور یا گلا گھونٹ کر مارا ہوا جانور کھانے سے منع کیا گیا ہے، جانوروں کا گلا کاٹ کر ان کے خون کو پوری طرح بہا دینے کا حکم دیا ہے۔ بتوں پر قربان کیا ہوا جانور بھی حرام ہے۔

سورۃ بقرہ کی ۸۷ و ۲۷ آیت میں سود کو حرام قرار دیا گیا ہے
 "مومنو۔ خد سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔"

پھر اس کے بعد کی آیت میں ارشاد ہوتا ہے :-
 "اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ کہ تم اللہ اور رسول سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہو اور اگر توبہ کرو گے اور اگر سود چھوڑ دو گے تو تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان اور نہ ہی تمہارا نقصان اور اگر قرض لینے والا نگہ بست ہو تو اسے کشائش کے حاصل ہونے تک مہلت دو اور اگر زر قرض بخش ہی دو تو تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے۔"

عرب ہمیشہ سے تجارت پیشہ لوگ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی تاجرانہ ذہنیت پوشیدہ رکھنے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی۔ اسلامی حکومت کے وجود میں آنے سے قبل ان کو کبھی بھی اپنی فوجوں پر ناز نہیں رہا۔

نور حضور بھی ایک تجارت پیشہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ کئی سال تک آپ خود بھی تجارت کرتے رہے۔ قرآن کی آیات میں بھی تاجرانہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ تمہارا سرمایہ تمہارے پاس ہی رہے گا۔ ہر نفس وہی خرچ کرے گا جو اس نے کمایا ہے وغیرہ۔

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مکہ کا ہر آدمی سالانہ اجتماع کے موقع پر وہاں کے کاروبار اور میلوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ تجارت میں اپنا سرمایہ لگاتا تھا۔ سالانہ تجارتی فائدے جو یمن اور شام جایا کرتے تھے ان میں بھی ان کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ سرمایہ کی مناسبت سے منافع بھی تقسیم ہوتا تھا۔

کاروبار میں سرمایہ لگانا اور حصہ دار کی حیثیت سے اس کاروبار سے نفع کا حاصل کرنا اسلام میں منع نہیں ہے۔ ناجائز اور ضرورت سے زیادہ سود کی اصطلاح ان لوگوں کے لیے وضع کی گئی جن کا پیشہ ساہوکاری یا مہاجنی تھا۔ ساہوکار یا مہاجن کبھی بھی تجارتی مہم میں حصہ نہیں لیتا۔ اس کے برخلاف لوگوں کو قرض دے کر زیادہ سے زیادہ سود حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، لوگوں کا استحصال کرتا ہے۔ جہاں شراب کی ممانعت بڑی حد تک کامیاب رہی وہیں سود کی حرمت کو لوگ بھولتے گئے۔

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں اس بات کو واضح کرنا بہتر رہے گا کہ مسلمان اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ حضور اکرم نے مسلمانوں کے لیے اخلاقِ حسنہ کے معیار مقرر فرمائے ہیں۔ ذاتِ اقدس خود ایک مثال کا کام دیتی ہے۔

ایک مسلمان مصنف ڈاکٹر حمید اللہ کہتے ہیں: آپ نے یہ نہیں کہا کہ اپنے دشمن

سے محبت کرو سب نے یہ کہا کہ اس کو ایسی طریقے کی ضرب پہنچاؤ جیسے اس نے تم کو پہنچائی ہے۔ اس بات کا خیال رہے کہ اس سے زیادہ نہیں۔ لیکن اگر تم اس کو معاف کر دو تو اللہ تعالیٰ تم کو اس کا اجر دے گا۔“

آپ نے لوگوں کو ان کی اپنی دولت سے دستبردار ہونے کو کبھی نہیں کہا۔ آپ نے مسلمانوں سے کہا کہ دنیا اور دین دونوں کو سنبھال رکھیں۔

قرآن کے سورہ بقرہ کی ۲۰۱ ویں آیت میں بیان فرمایا گیا ہے :-
 اور لعین ایسے ہیں کہ دعا کرتے ہیں کہ پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت سے سرفراز فرما۔ دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔“

حضور نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو دنیوی آلام و آسائشیں اور خوشحالی سے نوازے گا لیکن آپ نے سرمایہ داری کی کبھی بھی تائید نہیں کی اور نہ زندگی میں کبھی بھی آپ نے دولت جمع کی۔

آپ نے بڑی حد تک میانہ روی کی تعلیم دی اور یہ مسلک ہی اخلاقی ضابطوں کی بنیاد پر رہا۔ ہرزمانے کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت میں تضاد پایا جاتا ہے۔ اصولوں کا وضع کرنا اور ان کا ہرزمانے اور ہر وقت اور ہر قسم کے لوگوں پر اطلاق، اس کے لیے بڑے ہی عمیق و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔

مسلمانوں کا مسلح نظر کبھی بھی یہ نہیں رہا کہ اپنی ہستی کو عوام کے برابر سمجھیں! انکاری اور خاکساری میں حد سے تجاوز عیسائی راہبوں کا طریقہ رہا ہے۔ اسلام نے اس نظریہ کو کبھی قبول نہیں کیا کہ تکمیل ذات کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان زبردستی اپنے آپ کو مصیبتوں میں مبتلا کرے۔ اس کے باوجود حضور کی وفات کے بعد مسلمانوں میں ایک ایسے فرقہ کا وجود ٹھل میں آیا جن کا مقصد اپنی ذات کو فنا کے رعبے

تک لے جانا رہا ہے۔ ان لوگوں کے برخلاف حضور نے ہمیشہ گوشہ نشینی اور ترک دنیا کے رجحان کی مخالفت فرمائی۔

بحیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت ایمان والی ہے۔ اخلاقی نمائندوں کی پابند ہے۔ سیدھی سادی ہے۔ ایک عظیم قادر مطلق کی عبادت گزار ہے۔ ہم جہاں مسلمانوں کی ان اچھی صفات کا ذکر کر رہے ہیں وہیں اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ جن مقامات پر ان عمدہ صفات کے مسلمان رہتے ہیں وہ زرعی علاقے ہیں۔ لوگوں کا ذریعہ معاش زراعت ہے۔ زرعی ممالک میں رہنے والے لوگ عام طور سے مخلصی ہوتے ہیں۔ سیدھے سادے ہوتے ہیں۔

مغربی یورپ میں رہنے والوں اور مرکزی ایشیا میں بسنے والوں کے درمیان ان کے اخلاق و کردار میں جو نمایاں فرق نظر آتا ہے اس کا سبب مذہب نہیں ہے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مغربی دنیا میں چونکہ عیسائی رہتے ہیں اس لیے ان کے اخلاق و کردار گرسے ہوئے ہیں اور مرکزی ایشیا میں مسلمان بستے ہیں اس لیے ان کے صفات اعلیٰ ہیں۔ مغربی دنیا میں رہنے والے لوگوں میں جو اخلاقی انحطاط نظر آتا ہے وہ ان کی اپنی تن آسانی، دولت کی افراط، شہری زندگی، اقتدار اور طاقت کی حرص اور مختلف قسم کی آسائیوں کی وجہ سے ہے۔

عرب شہنشاہیت کے زریں عہد میں مسلمانوں نے بھی اپنے اخلاق و کردار کی پستی کا وہی نامک کھیلے تھے جیسے آج یورپی قومیں کھیل رہی ہیں۔ مدینہ پر قریش نے زور و شور سے حملہ تو کیا تھا لیکن اس میں انہیں جو ناکامی ہوئی اس کی وجہ سے ان کے حوصلے بہت ہی پست ہو گئے تھے۔ قسمت مسلمانوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ دن بدن ان کی ترقی و کامرانی کا ستارہ روشن سے روشن تر ہو رہا تھا۔ اب لوگوں نے آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیں کہ محمد تو

واقعی پیغمبر نکلے۔ پڑھتے سوزح کی پوجا کرنے والے اب تذبذب میں پڑ گئے تھے۔ کچھ لوگ آپ کی عظمت کے تو قائل ہو رہے تھے لیکن آپ کو خدا کا رسول ماننے میں عار محسوس کر رہے تھے۔ ابھی ان کو وقت دیا گیا تھا۔

مسلمانوں کا یہ اصول تھا کہ کسی بھی بدتمیزی کو معاف نہ کیا جائے اور ہر ایسی حرکت کا بروقت مزہ چکھایا جائے۔ سلام ابن ابی الحقیق کا قتل اس کی ایک واضح مثال ہے۔ بنی قرظیہ کی بیخ کنی کے چھ مہینے بعد اکتوبر ۶۲۶ء میں حضور نے فیصلہ کیا کہ بنی تمیمان کو ان کی شرانگیزی اور فساد کا مزہ چکھایا جائے۔

بدوینوں پر حملہ کرنے کے لیے سراع رسانی بہت ہی ضروری ہوتی تھی۔ بدوینوں کے خیمے منتشر اور بکھرے بکھرے رہتے ہیں اور ان کے مویشی صحرا میں ہر طرف ایسے پھرتے رہتے ہیں کہ یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کہاں اور کس حصے میں ہے۔ اس لیے صحرا میں جو بھی راستہ چلنے والا یا مسافر مل جاتا ہے اس سے مختلف قسم کے سوالات کر کے اپنے مطلب کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قریش کے لوگ اصل میں تاجر تھے۔ حملہ آور نہیں تھے۔

حملہ کرنے کے سلسلے میں مسلمانوں کی جو ابتدائی کوششیں رہیں ان میں سے کئی کامیاب رہیں اور کئی ناکام۔ اب حملوں کے تعلق سے ان کے تجربات میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف بدوی قبائل کے لوگ اسلام قبول کرتے جا رہے تھے۔ ان کے اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے مسلمانوں کو آسانی اور مدد اس طرح سے مل رہی تھی کہ یہ بدوی ریگستانی لڑائی اور حملوں کے سلسلے میں مشورہ دیا کرتے تھے۔ حملوں کے وقت پہیری اور راستوں کی نشاندہی کے فرائض انجام دینے لگے تھے۔

اپنے منصوبوں کو خفیہ رکھنے کی خاطر حضور نے مدینہ کو جب چھوڑا تو شمال کی طرف روانہ ہونے کا اعلان کیا جب کہ آپ کا ارادہ شام کی طرف روانہ ہونے کا تھا۔ مدینہ

سے بیس میل دور جانے کے بعد مسلمانوں کی جماعت نے اپنا رخ صحیح سمت میں کر لیا۔ کسی طرح اس کی اطلاع بنی لحيان اور عصفان کو ہو گئی۔ یہ لوگ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چلے گئے جہاں سے وہ اپنی مدافعت بہتر طریقے سے کر سکتے تھے۔ بغیر لڑائی کے مسلمان مدینہ واپس ہو گئے۔

مسلمانوں کی اس کوشش کے رائیگاں جانے کے کچھ ہی دنوں بعد غالباً نومبر ۶۲۷ء میں بنی غطفان کے کچھ لوگ حضورؐ کے اونٹوں کو بھگا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ حضورؐ کے یہ اونٹ چراگاہ میں چر رہے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جس وقت حضورؐ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تھی اس وقت آپ کے پاس ایک بھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اس وقت ماشاء اللہ اونٹوں کا ایک پورا گلہ آپ کی ملکیت میں تھا۔ آپ کی حاصل کردہ دولت آپ کے معیار زندگی کی کبھی بھی اونچانہ کر سکی۔ اس دولت کو آپ نے اپنے آرام اور آسائش کے لیے استعمال نہیں کیا۔ یہ ساری دولت اور روپیہ پیسہ آپ اُس تحریک کی بقا اور اس کے نشوونما پر خرچ کر رہے تھے جو آپ کو دل و جان سے زیادہ عزیز تھی اور وہ تحریک تھی اسلام۔

بنی غطفان کے حملہ آوروں نے حضورؐ کے اونٹوں کے گلہ بان کو قتل کر دیا۔ اس کی بیوی کو بھگا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مسلمانوں کو اس کی اطلاع ملی۔ چھ مسلمانوں کی ایک جماعت گھوڑے دوڑاتی ہوئی حملہ آوروں کے تعاقب میں مدینہ سے نکلی۔ حملہ آوروں سے ان کا سامنا ہوا۔ ایک مسلمان شہید ہوا۔ غطفان کے سردار کا بیٹا مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ بنی غطفان کے حملہ آور جن میں سے اکثر اونٹوں پر سوار تھے مسلمانوں کو دیکھ کر ایسے حواس باختہ ہوئے کہ اپنے اپنے اونٹوں پر سے کود کر مختلف سمتوں کو بھاگے تھے۔ حضورؐ بھی مسلمانوں کی ایک جماعت کو لے کر موقع واردات پر پہنچ گئے۔ دشمن کو دوڑتے دوڑتے کافی آگے نکل گئے تھے، اس

لیے حضور نے آگے بڑھنا بے سود سمجھا اور ایک چشمہ زوقرود کے پاس قیام فرمایا۔ اونٹوں کو ذبح کر کے گوشت کو دم دیا گیا۔ پرتکلف اور پرتکلف خذ سے مسلمانوں نے اپنے آپ کو محفوظ کیا۔ عربوں کی ریگستانی زندگی میں اس قسم کی دعوتیں اور حشبن یادگار بن جاتے ہیں اور لوگوں کے حافظوں میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ بعد میں چل کر یہ دن یومِ زوی قرار کے نام سے موسوم ہوا۔

مجھے خود بھی ۱۹۲۰ء میں اس قسم کی جھڑپوں سے سابقہ پڑ چکا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس زمانے میں لوگ برچی بجالے اور تیر و کان سے لڑتے تھے اور ۱۹۲۰ء میں ہم نے بند و قوں کا استعمال کیا تھا۔ حادثات جتنے تیر و کان کو استعمال میں لانے سے ہو سکتے ہیں وہی تناسب بند و قوں نے بھی برقرار رکھا۔

غطفان کے حملہ آور نفسا نفسی میں جب اپنی جان بچا کر بھاگ رہے تھے۔ حضور کے شہید گلہ بان کی بیوی موقع دیکھ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی اپنے ساتھ ایک اونٹ بھی لیتی آئی۔ اونٹ سے یہ چمٹ گئی تھی۔ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئی، واقعہ کی ساری تفصیلات بیان کی۔ بعد میں یہ بھی کہا کہ یہی وہ اونٹ ہے جو مجھے بحفاظت تمام یہاں تک لایا۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اگر یہ بحفاظت تمام مجھے فرار ہونے میں مدد دے تو میں اس کو اللہ کی راہ میں قربان کر دوں گی۔

حضور نے مسکرا کر فرمایا کہ اونٹ نے تو تمہاری جان بچائی اور تم اس کی جان لینا چاہتی ہو۔ یہ خوب احسان شناسی ہے۔ یہ تو اللہ کی مہربانی تھی کہ اونٹ کو تمہارے بحفاظت بچ نکلنے کا وسیلہ بنایا۔ بہر حال کسی ایسی چیز کو قربان کرنے کی قسم کھانا یا نیت کرنا جو تمہاری اپنی ملکیت نہیں ہے جائز نہیں ہے۔ اونٹ کو ذبح کرنے کا خیال چھوڑ دو۔ اللہ پاک تم پر مہربان رہے گا۔

یہ چھوٹا سا واقعہ پھر ایک بار اس زمانے کی عورتوں کی بہادری اور ان کے باہر

ہونے کی نشان دہی کرتا ہے۔

دسمبر، ۶۶۲ء یا جنوری، ۶۶۸ء میں حضور کو یہ اطلاع ملی کہ بنی قضاہ کی ایک شاخ بنی مطلق مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ ان کے حملہ کرنے سے پہلے ہی حضور نے مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کو المرسیع روانہ کیا تھا۔ یہ مقام سمندر کے کنارے تھا۔ تھوڑی سی جھڑپ کے بعد مسلمان فتح یاب ہو گئے۔ ان کی عورتیں، بچے اور جائیداد سب مسلمانوں کے ہاتھ لگے، بہت سے دشمن مارے گئے۔ مسلمانوں کا اس طرح وہاں پہنچ جانا ان کے لیے بہت ہی تعجب کا باعث بنا۔ مسلمان آرام لینے کی خاطر ایک کنوویں کے قریب رُکے۔ ان کے ساتھ گرفتار کی ہوئی عورتیں بھی تھیں غالباً حضور کی وفات کے چند ہی دن بعد مسلمانوں نے جنگی قیدیوں کو اپنے ساتھ لے جانے کا طریقہ متروک کر دیا تھا۔ جنگ کے دوران یا فتح کے بعد جو کافر عورتیں مسلمانوں کے قبضے میں آتی ہیں ان کو، داشتہ کے طور پر استعمال کرنے کی اسلام نے اجازت دی ہے۔ اس موقع پر مسلمانوں نے بنی مطلق کی عورتوں کے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کیا۔

اس قسم کی باتیں صرف جنگی قیدیوں کے ساتھ ہوتی تھیں۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی بھی یہ نہیں سنا کہ کسی بدوی عرب نے کوئی زنا کیا ہو۔

کنوویں پر جب کہ جانوروں کو پانی پلایا جا رہا تھا۔ حضرت عمرؓ کا ایک بدوی ملازم بنی خزرج کے کسی آدمی سے جھگڑ رہا تھا۔ تو تو، میں میں سے بات بڑھ کر ہاتھ پائی اور مکہ بازی پر آگئی۔ حضرت عمرؓ کا ملازم چلایا

”ہاجرو۔ میری مدد کرو۔“

بنی خزرج کا آدمی چلایا۔ ”انصار میری مدد کو آؤ۔“

چند لمحے ایسے گزرے جس میں مہاجرین اور انصار غصے سے آپس میں ایک

دوسرے کو گھور رہے تھے۔ ملازمین نے بات کو بہت آگے بڑھا دیا تھا۔
 حضورؐ کی مدینہ میں تشریف آوری سے قبل عبداللہ ابن ابی مدینہ کا سردار مانا جاتا تھا
 اس واقعہ سے اس کو بڑا طیش آیا۔ اس نے غنمہ میں آکر اپنے آدمیوں سے کہا "ہماری
 برتری اور فوقیت پر وہ جھگڑتے ہیں ہم کو ہمارے اپنے شہر میں انہوں نے اقلیت
 میں تبدیل کر دیا ہے۔ اب کسی چیز کو وہ ہمارے لیے موزوں نہیں سمجھتے۔ ایک
 پرانے مقولے کے مطابق یہ مہاجرین ایسے ہیں کہ جن کا کھاتے ہیں انہیں کے برتن
 میں چھید کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔" تبم خدا کی جب ہم مدینہ واپس جائیں گے تو
 ہم میں جو بھی طاقتور اور منسبوت ہوں گے کمزور کو مار کر وہاں سے نکال دیں گے۔"
 عبداللہ ابن ابی کی ان باتوں کو ایک لڑکا سن رہا تھا اس نے حضورؐ کی خدمت
 میں یہ اطلاع پہنچائی۔ حضرت عمرؓ حضورؐ کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔ حضورؐ سے
 عرض کیا کہ کسی کو بھجوا کر عبداللہ ابن ابی کا سر قلم کروا دیا جائے۔

آپ جلد باز نہیں تھے۔ لوگوں کی باتوں میں آسانی سے نہیں آجاتے تھے
 آپ نے جواب دیا: اس وقت کیا ہو گا جب لوگ کہیں گے کہ محمدؐ تو اپنے ساتھیوں
 کو قتل کر رہے ہیں۔"

بہت سے انصار وہاں جمع تھے انہوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ ہو سکتا ہے کہ لڑکے
 نے غلط بیانی سے کام لیا ہو۔ عبداللہ ابن ابی نے کچھ کہا، سو اور لڑکے نے غلط سلط سن کر
 حضورؐ کے آگے کچھ اور کہا ہو۔ اس وقت تک بھی بعض انصار کے دلوں میں عبداللہ
 ابن ابی کی عزت اور وقعت تھی اس لیے کہ وہ ان کا سردار رہ چکا تھا۔

حضورؐ نے اس قضیے کو رفع دفع کرنے کے لیے فوری کونج کا حکم دیا۔ حالانکہ اس
 وقت دوپہر تھی اور دھوپ اور گرمی ناقابل برداشت تھی۔ آپ نے سفر کو دن تمام
 جاری رکھا پھر رات میں بھی چلتے رہے۔ دوسرے دن ۱۲ بجے تک سفر جاری رکھا

قافلہ روکا گیا۔ لوگ اتنے تھکے ہوئے تھے کہ ان میں کا ہر آدمی مڈھال ہو کر سو گیا۔
بنی مصطلق کے جو قیدی گرفتار ہوئے تھے ان میں ایک خاتون بھی تھی جس کا نام
جویریہ تھا۔ یہ اس قبیلہ کے سردار کی بیٹی تھی۔ ابن اسحق کے بیان کے مطابق "جویریہ
بہت ہی حسین جمیل اور خوبصورت عورت تھی۔ جس کی بھی نظر اس عورت پر پڑ جاتی
تھی وہ اس کا فریفتہ ہو جاتا تھا۔"

جویریہ حضور کی خدمت میں پہنچی۔ اس نے کہا کہ اس کا باپ اس کی جان کا معاوضہ
مسلمانوں کو ادا کر دے گا اس لیے اُسے رہا کر دیا جائے۔

حضور نے فرمایا: "کیا تم اپنی آزادی سے بہتر بھی کوئی چیز پسند کرو گی؟" میں
تمہاری جان کا فدیہ دوں گا اور اگر تم رضامند ہو جاؤ تو میں تم سے شادی بھی
کر لوں گا۔"

حضور کی اس تجویز کو جویریہ نے قبول کر لیا۔ جیسے ہی مسلمانوں کے علم میں یہ بات
آئی کہ حضور نے بی بی جویریہ سے نکاح کر لیا اور اس نکاح کی وجہ سے بنی مصطلق کے
لوگ حضور کے رشتہ دار بن گئے ہیں تو انہوں نے اس رشتہ کا پاس دلچاظ کرتے
ہوئے سارے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس شادی کی وجہ سے تقریباً سو خاندانوں کی
رہائی عمل میں آئی۔

اگر ابن اسحق بی بی کے اس حسن و جمال کا ذکر نہ کرتے ہوتے تو ہم اسی نتیجے
پر پہنچتے کہ حضور کی یہ شادی سیاسی مصلحت کی بنیادوں پر ہوئی تھی۔ قبیلہ ابول
کو رہائی حاصل ہوئی تھی اس لیے سارے قبیلے نے اسلام قبول کر لیا۔ اس شادی
کی وجہ سے عتبی کا میابی ہوئی شاید جنگ کی وجہ سے اتنی نہ ہوتی۔

مسلمانوں کے ابتدائی حملوں کے دوران چند عورتیں ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ رہا
کرتی تھیں۔ کھانا پکانا اور زخمیوں کی مرہم پٹی وغیرہ کرنا ان کا کام ہوتا تھا۔ جب

کبھی حضور کسی مہم پر مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے حضور کی کوئی نہ کوئی بیوی آپ کی ہمسفر ہوتی تھیں۔

بنی منطلق پر حملہ کرنے کے لیے حضور جب مدینہ سے روانہ ہوتے تو اپنے ساتھ بی بی عائشہ کو لے کر چلے تھے۔ حضرت عائشہ حضرت ابو بکرؓ کی بیٹی تھیں جب مسلمانوں کی جماعت مدینہ واپس ہو رہی تھی رات کے ابتدائی حصے میں آرام لینے کے لیے سفر ملتوی کیا گیا۔ تمام مسافر ہو گئے۔ صبح صادق سے پہلے سفر دوبارہ شروع ہوا۔ اس وقت ابھی اندھیرا تھا۔ اپنے محل میں سوار ہونے سے قبل بی بی عائشہ رفع حاجت کے لیے کچھ دور گئیں۔ ضروریات سے فارغ ہو کر واپس ہوئیں تاکہ اونٹ پر سوار ہو جائیں۔ اس موقع پر ان کو معلوم ہوا کہ ان کے محلے میں مالا نہیں ہے اور وہ کہیں گر گئی ہے۔ اس خیال سے کہ جہاں ابھی وہ ہو آئی ہیں شاید اسی جگہ مالا گر گئی ہو۔ اندھیرے ہی میں مالا کی تلاش میں نکلیں۔

جب سفر پہلے پہل شروع ہوا تھا بی بی عائشہ اونٹ پر سوار تھیں۔ محل میں بیٹھی ہوتی تھیں۔ محل کے اطراف پردہ لگا ہوا تھا۔ اونٹ کی لگام کسی اور آدمی کے ہاتھ میں تھی۔ آدمی لگام تھامے آگے آگے چل رہا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے اونٹ۔ آرام کے بعد جب سفر دوبارہ شروع ہوا تو اس آدمی نے جس کے ہاتھ میں بی بی عائشہ کے اونٹ کی لگام تھی اس خیال سے کہ بی بی عائشہ محل میں بیٹھی ہوئی ہیں اپنے سفر کو جاری رکھا۔

بی بی عائشہ مالا ڈھونڈنے میں رہ گئیں اور ان کا اونٹ منزل کی طرف رواں ہو گیا۔ بی بی عائشہ کو ان کی مالا مل جاتی ہے۔ سواری نظر نہیں آتی۔ اب بی بی عائشہ وہاں پر تنہا تھیں۔

حضرت عائشہ کے الفاظ میں کہ محل میں ان کی غیر موجودگی کا مسلمانوں کو بہت

جلد علم ہو جاتے گا اور کوئی نہ کوئی ان کو لینے کے لیے وہاں آجاتے گا وہ ایک چادر بچھا کر وہیں پر لیٹ جاتی ہیں۔

مسلمانوں کی جماعت جو بنی مصطلق پر حملہ کرنے کی غرض سے گئی تھی اس میں ایک نوجوان آدمی بھی تھا۔ اس کا نام صفواں تھا۔ کسی وجہ سے وہ اپنی جماعت سے پیچھے رہ گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اپنا راستہ ناپتا جا رہا تھا۔ اسی راستے سے وہ واپس ہو رہا تھا جدھر سے مسلمان واپس ہوئے تھے۔ اونٹوں کے پاؤں کے نشان اس کی رہبری کر رہے تھے۔

صفواں اپنی دُھن میں جب اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہی جب اُس نے اُم المؤمنین کو تنہا پایا۔ اپنے اونٹ کو بٹھا دیا۔ بی بی سے درخواست کی کہ آپ اونٹ پر سوار ہو جائیں۔ جب حضرت عائشہ اونٹ پر سوار ہو رہی تھیں اور سوار ہونے کے بعد اپنے کپڑوں کو درست کر رہی تھیں، صفواں اپنا دُرخ دوسری طرف کیے ہوئے کھڑا تھا تاکہ بی بی عائشہ کا اونٹ پر سوار ہونا نہ دیکھ سکے۔

جب بی بی عائشہ اونٹ پر بیٹھ گئیں تو صفواں اونٹ کی نیکیل لیے آگے آگے پھل چل رہا تھا اور اونٹ اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ دن کی روشنی میں حضرت عائشہ نے اپنے اونٹ اور اونٹ کی نیکیل تھلمے ہوئے آدمی کے بقیہ قافلے میں شریک ہو گئیں۔

حضور کی نوجوان بیوی کو ایک نوجوان آدمی کے ساتھ آتے دیکھ کر لوگوں کو بڑا تعجب ہوا۔ اس غیر متوقع واقعہ نے مدینہ کے درو دیوار ہلا دیتے۔

منافقوں نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ ان کی بن آئی۔ وہ آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے بی بی عائشہ سے جلنے والی عورتوں نے آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیں۔ یہ بات

اس زور و شور سے آگے بڑھنے لگی کہ خود حضور کو بھی حضرت عائشہ پر شک ہونے لگا۔ حتیٰ کہ حضور نے حضرت عائشہ کو ان کے باپ حضرت ابو بکرؓ کے گھر روانہ کر دیا۔ اپنے گھر کے دونوں جانوروں سے اس سلسلے میں حضور نے مشورہ کیا۔ ایک تو حضرت علیؓ تھے اور دوسرے زید بن حارثہ۔

زید نے بی بی عائشہ کی طرف داری کی۔ عائشہ کی نیک نامی کا حوالہ دیتے ہوئے زید نے ان کو با آبرو اور با عظمت عورت ثابت کیا۔ زید نے کہا کہ ساری افواہیں سرے سے جھوٹ اور سراسر بے بنیاد ہیں۔ لیکن حضرت علیؓ نے کہا کہ عورتوں کی کوئی کمی نہیں۔ حضرت عائشہ کا نعم البدل مل سکتا ہے۔ ان کی خاطر حضور پریشان نہ ہوں۔

صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت علیؓ نے کہا کہ حضور بی بی عائشہ کی خادمہ سے ان کا چال چلن دریافت کر لیں وہ سب کچھ سچ سچ بتلا دے گی۔

جب خادمہ سامنے لال گئی تو حضرت علیؓ نے اس کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ حضور کے سامنے ہر بات سچ سچ بیان کر دے۔

خادمہ نے بڑے ہی معصومانہ انداز میں جواب دیا کہ میں تو عائشہ کی خوبیاں ہی کو جانتی ہوں۔ مجھے تو ان میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ ان کی صرف ایک ہی غلطی کو میں جانتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ جب میں آٹا گوندھنے کے لیے جھکی تو حضرت عائشہ سے کہا تھوڑی دیر کے لیے آٹے کا خیال رکھنا۔ انہوں نے آٹے کا خیال نہیں رکھا اور سو گئیں اور بکری سارا آٹا کھا گئی۔

حضور نے حضرت ابو بکرؓ کو طلب کیا۔ یہ منظر بڑا ہی دلسوز تھا کہ ایک طرف بی بی عائشہ تھیں۔ دوسری طرف بی بی عائشہ کے ماں باپ یعنی حضرت ابو بکرؓ اور ان کی بیوی ایک طرف خود حضور۔

سب اس معاملے کی تحقیقات کر رہے تھے۔

حضور نے بی بی عائشہ سے کہا کہ تم سے اگر واقعی کوئی غلطی سرزد ہو بھی گئی ہو تو میرے سامنے اس کا اعتراف کر دو۔ اس لیے کہ اللہ گناہوں کو بخشنے کا وعدہ فرما چکا ہے۔

بی بی عائشہ زار و قطار رونے لگیں۔ حضور سے عرض کیا کہ میں نے کوئی حرکت ایسی کی ہی نہیں ہے جس کا مجھے اعتراف کرنا چاہیے۔ یہ کہہ کر وہ بستر پر گر گئیں۔ اس لمحہ حضور پر وحی کا نزول ہوا۔ حضور زمین پر لیٹ گئے۔ اپنے اوپر چادر اوڑھ لی۔ چہرے کا تکیہ سر ہانے رکھ لیا۔ اس دوران حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ انتہائی تشویش اور پریشانی کے عالم میں تھے۔ ان کے پیروں تلے زمین نکل جا رہی تھی۔ اس ڈر سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے کہ کہیں وحی بی بی عائشہ کو مورد الزام نہ ٹھہرائے۔

حضور اٹھ بیٹھے۔ پینہ مسلسل بہا جا رہا تھا۔ آپ پسینے کو پونچھتے جا رہے تھے اور بار بار چہرہ اقدس کو صاف کیے جا رہے تھے۔ نظریں اٹھائیں، فرمایا: عائشہ۔ اچھی خبر ہے اللہ تعالیٰ نے تم کو بے گناہ قرار دیا ہے۔“

اس کے بعد آپ نے ان تین آدمیوں کو جنہوں نے انواہ کو پھیلایا تھا اسی اسی دسے لگانے کا حکم دیا۔ ان دسے کھانے والوں میں دربار نبوت کے شاعر حسان بن ثابت بھی شامل ہیں۔

قرآن کے سورہ نور کی گیارہویں آیت اور اس کے بعد کی آیتوں میں جن باتوں کا ذکر ہے وہ اسی بار سے میں ہیں۔

ان آیتوں کے نزول کے بعد بی بی عائشہ اپنے میکے سے حضور کے گھر خوشی خوشی لوٹ آئیں۔ اسی واقعے کے بعد سے زنا کے الزام کو ثابت کرنے کے لیے چار عینی گواہوں کی شہادت ضروری قرار دی گئی۔

پروفیسر سید نواب علی رضوی نے اپنی کتاب سیرت رسول اللہ میں لکھا ہے کہ:-

• اُدھر آنحضرت انتظار میں ایک ایسے مقام پر ٹھہر چکے تھے جہاں پانی نہ تھا۔
دھوکے لیے سخت دقت ہوئی۔ تب آیت یتیم نازل ہوئی۔

کیا عجیب بات ہے کہ ایک ہی گلوبند کے سلسلے میں دو قسم کے مختلف خیالات ظاہر ہوئے۔ ایک حلیل القدر صحابی حضرت اُسید بن حضیر کہنے لگے کہ یہ یتیم کی اجازت حضرت عائشہ کی برکت ہے مگر منافقین نے گلوبند کے باعث جو تاخیر ہوئی اس کو حضرت عائشہ کی عصمت پر زبان کھولنے کا ذریعہ بنایا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ آیت یتیم کی شان نزول اور انکب حضرت عائشہ دونوں ایک ہی غزوہ مریح میں واقع ہوئے جیسا کہ ابن سعد نے بالتصریح ذکر حضرت عائشہ میں نقل کیا ہے۔“

۶۲۸ء میں اوائل میں حضورؐ نے خواب دیکھا کہ آپ بغیر کسی روک ٹوک اور مداخلت کے مکے کی زیارت اور عمرہ ادا فرما رہے ہیں۔ آپ نے عمرے کے ارادہ کا اعلان فرمایا۔ مسلمانوں کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔

آج کی طرح اس وقت بھی حج و زیارت کے دو طریقے تھے۔ سال کے کسی مخصوص دن ہی حج کی ادائیگی ہوتی ہے۔ عمرہ کسی وقت بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔ اس دفعہ حضورؐ نے عمرہ ہی کا ارادہ فرمایا تھا۔ یہ ذمی تعدہ کا مہینہ تھا۔ حج کے مہینے سے پہلے کا مہینہ ان مہینوں میں کشت و خون منع تھا۔ روایات کے پیش نظر قریش مسلمانوں کی مزاحمت نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کا تشدد استعمال کرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

بہت سے مہاجرین اور انصاریاں ہوا گئے۔ کئی ایک بدوسی جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا حضورؐ کے ساتھ جانے سے ہچکچا رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اب مزید کسی لڑائی میں حصہ لیں۔

مکہ کے لوگوں کو اپنی نیک نیتی کا یقین دلانے کے لیے حضورؐ نے احرام بھی باندھ

لیا تھا۔ قربانی کے لیے ستر اونٹ بھی اپنے ساتھ رکھ لیے تھے مسلمانوں کے پاس سوائے
 تلواروں کے کوئی اور ہتھیار نہیں تھے۔ ان سب باتوں سے یہ ظاہر کرنا تھا کہ مسلمان صرف
 عمرہ کی ادائیگی کے لیے مکہ آرہے ہیں۔ ذلگنا سار کرنے کے لیے نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس
 موقع پر سات سو مسلمان حضور کے ساتھ تھے۔ دوسری روایت کے مطابق چودہ سو۔ یہ تعداد
 کہ کے مخالفین کے مقابلے میں عشر عشر بھی نہیں تھی۔

بعض مغربی مستشرقین کا یہ کہنا ہے کہ آپ کا ارادہ اسی موقع پر مکہ کو اپنے تفسیے میں
 لے لینے کا تھا۔ جب مغربی مستشرقین ایسا کہتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہ بات پھر تازہ
 ہو جاتی ہے کہ مکہ کے لوگوں کے لیے یہ دشوار ترین امر ہو گیا تھا کہ دینیہ کی عمارت پر
 حملہ کر کے ان پر قابض ہو جائیں۔

یہودیوں کی چھوٹی چھوٹی بستیوں پر مسلمانوں نے جو حملے کئے تھے ان میں بھی مسلمانوں
 کو ناکامیاں ہوتی رہی تھیں۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ یہودی قلعہ نما مضبوط گھروں میں
 رہا کرتے تھے۔ مسلمانوں کے تعلق سے بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہی مشکل ان کو بھی پیش آتی
 اگر وہ مکہ کے لوگوں سے لڑائی کرنا چاہتے اور قریش اپنے آپ کو گھروں میں بند
 کر لیتے۔

ہم مسلسل یہ دیکھ رہے ہیں کہ سرکارِ دو عالم میں ظلم، زیادتی، بے رحمی اور سفاکی کے
 جذبات کبھی کبھی بھی ظاہر نہیں ہوئے۔ اپنی فتح کے لیے انسانی جانوں کی من مانی قربانی
 کبھی بھی آپ کا شیوہ نہیں رہا۔ جس امید کا بیان کے سینے میں جل رہا تھا وہ یہی تھی
 کہ کسی طرح قریش آپ کے ہم نوا ہو جائیں۔ ان کی ہمنوائی ہی وہ واحد بات تھی
 جو حضور کے لیے فتح و شادمانی کا سارا سامان فراہم کر سکتی تھی۔

عمارات اور گھروں پر اچانک حملہ کرنا مسلمانوں کے شایان شان تھا بھی نہیں اس
 لیے کہ گھروں میں عورتیں اور بچے بھی رہتے تھے۔ اس وقت کے عربی بشار کے پیش نظر

اس قسم کی گری ہوئی حرکت ناقابل تصور تھی۔

جب مسلمان اصفان پہنچے تو ان کو خبر ملی کہ قریش مسلمانوں سے ملنے کے لیے مکہ سے باہر نکل چکے ہیں اور وہ اس ارادے سے نکلے ہیں کہ وہ نہ تو حضور کو اور نہ ہی مسلمانوں کو کہ میں داخل ہونے دیں گے۔

اصفان سے ۸ میل دور قریش نے اپنے گھوڑ سواروں کو صف در صف مسلمانوں کو روکنے کے لیے کھڑا کر دیا۔

حضور نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ مسلمان اس وقت اس حیثیت میں نہیں ہیں کہ قریش سے مقابلہ کر سکیں اور ساتھ ہی ساتھ حضور اس آسانی سے مدینہ واپس بھی نہیں ہونا چاہتے تھے اس لیے آپ کسی ایسے آدمی کی تلاش میں تھے جو حضور کو اس مقام پر لے چلے جہاں قریش مسلمانوں کو روکنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔

ایک مقامی بدوی اس کام کے لیے تیار ہو گیا۔ پہاڑی علاقوں کی پگڈنڈیوں سے ہوتے مسلمان مکہ کے شمال مغربی حصے میں پہنچے۔ یہ ایک کھلا میدان تھا۔ اس مقام کا نام حدیبیہ تھا۔ حضور نے مسلمانوں کو یہاں رک جانے کا حکم دیا۔ یہاں پر اونٹوں کو پانی پلایا گیا۔

نبی خزامہ کا سردار بدیل ابن ورقہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے دریافت کیا کہ حضور کے ارادے کیا ہیں۔ کس نیت سے حضور یہاں تشریف لائے ہیں۔ اُسے جواب دیا گیا کہ مسلمان لڑنے لڑانے کے لیے یہاں نہیں آئے ہیں۔ مسلمانوں کی آمد کا واحد مقصد کعبہ کی زیارت اور عمرہ کی ادائیگی ہے۔

اس قبیلے کے اکثر لوگوں سے حضور کے دوستانہ مراسم تھے۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو ابھی میت پرست تھے۔ بدیل اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور بیدھے مکہ گئے۔ جو کچھ حضور نے فرمایا تھا قریش کے سامنے اُسے دہرا دیا۔

قریش نے جواب دیا: محمد لڑنا چاہتے ہوں یا نہ چاہتے ہوں، ہماری مرضی اور

اجازت کے بغیر وہ مکہ میں قدم نہیں رکھ سکتے :-

قریش نے اپنے ایک آدمی حلیس کو صورت حال کے مشاہدہ کے لیے مسلمانوں کے ہاں روانہ کیا۔ حلیس نے دیکھا کہ مسلمان تو بہت ہی پرامن طریقے سے یہ ستر اونٹ قربانی کے لیے تیار ہیں، احرام باندھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر حلیس بیدھے مکہ واپس ہوئے۔ قریش سے کہا کہ مسلمان واقعی عمرہ کی ادائیگی کے لیے آئے ہیں اور ان کے ارادے سچ سچ نیک معلوم ہوتے ہیں۔

یہ بات سن کر قریش نے حلیس سے کہا :- بیٹھ جاؤ حلیس۔ تم تو سچ پچ بدی نکلے۔ نہ سے جاہل اور بدو ہو۔ کچھ بھی نہیں سمجھتے۔" قریش کا یہ طنز حلیس کو ناگوار گزرا۔ قریش اپنے تجارتی کاررواں لے کر جب مکہ سے باہر نکلتے تھے تو ان کارروانوں کی حفاظت اور نگرانی کے لیے بولوگ مہمور کیے جاتے تھے ان لوگوں کی رہنمائی اور سرکردگی حلیس کیا کرتے تھے۔

حلیس نے بگڑ کر جواب دیا :- ہم بنی کنعانہ کے لوگوں نے کیا آج ہی کے دن کے لیے تم لوگوں سے دوستی کا معاہدہ کیا تھا کہ ہم تمہارے اس طنز کو سنیں، حلیس نے اپنا غصہ جاری رکھا اور کہا کہ "جو آدمی خدا کے گھر کی عظمت کے پیش نظر اس کی تعظیم و تکریم کیلئے یہاں آیا ہو کیا تم اس کو ایسا کرنے سے باز رکھو گے؟"

قریش نے کہا: بکو اس بند کرو، ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ کچھ وقت لیں تاکہ گفت و شنید کر کے ایسی شرائط پیش کریں جس کو مسلمان قبول کریں۔"

نبیہ ثقیف کے ایک آدمی کو قریش نے پھر حضور کی خدمت میں روانہ کیا، یہ زمین پر بیٹھا ہوا حضور کی طرف مخاطب ہوا اور کہا۔

"اے محمد۔ آپ بھانت بھانت کے لوگوں کو جمع کر کے یہاں اس لیے لاتے ہیں کہ اپنے ہی شہر پر تملہ کریں۔ اپنے ہی لوگوں کو نیست و نابود کریں؟" قریش نے عہد کر رکھا ہے کہ

وہ آپ سے لڑیں گے۔ انہوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ کسی قیمت پر بھی آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔“

اگر آپ واقعی لڑائی پر ہی آمادہ ہیں تو میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ اپنے ساتھ لاتے ہوتے اس مختصر سے مجمع کو کہیں کا نہ رکھیں گے۔“

اس کی اس تقریر کو سن کر حضرت ابو بکرؓ نے کہا، ہم کبھی محمدؐ کو اپنے سے جدا نہیں کریں گے۔ ان پر کسی قسم کی آہنج نہ آنے دیں گے۔“

اس چھوٹے سے مکالمہ میں ہم کو پھر وہی گونج سنائی دیتی ہے جو حضورؐ کی کوششوں کا رد عمل تھی۔ حضورؐ جس انقلاب کو لانے کی کوشش کر رہے تھے اسی کوشش کی بازگشت اس مکالمہ کا حاصل ہے۔

قبیلہ ثقیف کے آدمی کے نزدیک افراد کی قبائل سے وفاداری فتح و شکست کا باعث تھی۔ بہ حیثیت مجموعی قبیلوں کی بقا، اور افراد قبیلہ کی انفرادی بقا کی بنیاد خاندانی وفاداری تھی۔ حضورؐ کی جماعت مختلف قبیلوں کے افراد پر مشتمل تھی۔ قبیلہ ثقیف کا آدمی جس بیچ پر سوچ رہا تھا اس کے نقطہ نظر سے مسلمانوں کی جماعت جو مختلف قبائل کے افراد پر مشتمل تھی۔ وفاداری کے عنصر سے عاری تھی۔ ان کی وفاداری کا کوئی مرکز اور بلحا نہیں تھا۔ اس کے نقطہ نظر سے مسلمانوں کی جماعت کے افراد میں فکری ہم آہنگی نہیں تھی۔ اس کے خیال میں مسلمانوں کے انداز فکر میں انتشار تھا۔ اس لیے کہ سارے مسلمان ایک ہی قبیلے یا ایک ہی خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کا کسی ایک قبیلے سے تعلق نہ رکھنا ہی جماعت کی تباہی و بربادی کا باعث بنے گا۔

حضورؐ نے جواب دیا کہ مسلمان لڑائی کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ کعبہ کی تعظیم و تکریم کے لیے آئے ہیں۔ خدا کے گھر کی عظمت کا تصور انہیں یہاں لے آیا ہے۔ یہ جواب سن کر قریش کا قاصد مکہ واپس ہوا۔ قریش کے سربراہوں کے سامنے ملاقات کی روداد بیان کرتے

ہوئے کہہ رہا تھا "میں شہنشاہ ایران خسرو کے دربار میں جا چکا ہوں مجھے روم کے شہنشاہ قبصر کے دربار میں حاضر ہونے کا اتفاق بھی ہو چکا ہے۔ جیشہ کے شہنشاہ نجاشی کی بارگاہ میں بھی بارباب ہو چکا ہوں۔ کسی جگہ میں نے محبت و عقیدت کا ایسا جذبہ نہیں دیکھا جو میں نے تمہارے ماننے والوں میں دیکھا ہے۔ میرا یہ یقین ہے کہ یہ لوگ تمہارے کبھی بھی روگرداں نہیں ہوں گے۔ چاہے کوئی سبب کیوں نہ ہو۔ حالات کیسے ہی خراب کیوں نہ ہوں مسلمان محمدؐ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ اب تمہاری مرضی ہے۔ جو چاہے فیصلہ کرو۔ فیصلہ کرنے سے پہلے میں نے جو کچھ کہا ہے اس کو پیش نظر رکھو۔"

تاریخ لکھنے والوں کو بڑی دقت اس وقت پیش آتی ہے جب کہ وہ بڑے لوگوں کی محبوبیت اور غیر معمولی خداداد صلاحیتوں کا احاطہ کرنا چاہتے ہیں۔

مہجراۓ صلاحیتیں اور مقناطیسی کشش گوشت پوست کی دنیا سے خارج ہیں۔ سکندراعظم، چنگیزخان اور نپولین کی فتوحات کا تجزیہ سیاسی، معاشی اور فوجی نقاط نظر سے تو کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی اس صفت یا خصوصیت کی نشاندہی کرنی مشکل ہو جاتی ہے جس کے سہارے ان کی انگلی کے ہلکے سے اشارے سے ہزاروں آدمی اپنی جان بچاؤ کر دیتے تھے۔ بہت سے اس بات کے ہی مشتاق رہتے تھے کہ ادھر سے اشارہ ہو اور ادھر سے وہ اپنی جان نذر کریں۔

تقیف کے آدمی نے مکہ والوں کے سامنے جو کچھ بھی بیان کیا اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں تھا۔ اگرچہ کہ آپ نے اس بات پر بار بار زور دیا کہ میں بھی آدمیوں کی طرح ایک آدمی ہوں۔ اللہ کے بندوں میں سے ہوں۔ اس کے باوجود آپ کے ماننے والوں نے اور آپ کی امت کے افراد نے آپ کی عزت و تکریم میں وہ غلو کیا کہ بندگی کے مقام سے لے جا کر آپ کو الوہیت کے مقام پر بٹھا دیا۔

جب کبھی آپ اپنے سر کے بال کاٹتے، لوگ ہاتھ بڑھا کر زمین پر گرتے ہوئے

بانوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتے اور اسے بطور تبرک یا نذہبی یادگار اپنے ساتھ محفوظ رکھتے تھے۔ انہوں نے اسی طریقے سے عزت و تکریم کے ساتھ بطور آثار مبارک محفوظ رکھنے کے جس طریقے سے عیسائی اپنے مقدس پادریوں کی ہڈیوں کو اپنے کلیسا میں محفوظ رکھتے تھے۔

حضور کے انتقال کے بعد بہت سے مسلمانوں نے جنہوں نے حضور کے بال اپنے ہاں محفوظ کر رکھے تھے اپنے جانشینوں کو وصیت کی تھی کہ ان کے انتقال پر ان کی میت کے ساتھ حضور کے بال بھی دفن کیے جائیں تاکہ یہ ان کی بخشش کا سہارا ہوں۔ جب آپ نہاتے تھے تو بہت سے جانثاروں میں اس بات کے لیے کشمکش ہوتی تھی کہ اس پانی کو حاصل کر کے پیاجائے۔

ابن اسحاق کی روایت کے مطابق یہاں تک ہوتا تھا کہ حضور جب کبھی تھکتے تھے تو چند اشفتگان عشق محمدی اُسے بھی محفوظ کر لیتے تھے۔

مسلمانوں سے ہمیشہ درخواست کی جاتی تھی کہ مجمع عام میں حضور کے بالکل قریب رہیں جگہ چھوڑ کر اس طریقے سے کھڑے رہیں کہ حضور آسانی سے سانس لے سکیں۔ ان ساری عظمتوں کے باوجود حضور کبھی بھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہوئے کہ آپ ریشمی کپڑے پہنیں۔ ریشمی یا زریں بجا اور ٹھیں۔ ہیرے جواہرات یا سونے چاندی سے مزین پٹروں کا استعمال کریں۔ آپ کی بیویوں نے جب شکایت کی کہ اب تو روپے پیسے کی فراوانی ہے۔ آرام و آسائش میں تھوڑا سا اضافہ ہو سکتا ہے تو حضور نے انہیں سختی سے جھڑک دیا۔

ثقیف کے سردار روانہ ہو جانے کے بعد حضور نے حضرت عثمان بن عفان کو قریش سے گفت و شنید کے لیے مکہ روانہ کیا۔ حضرت عثمان اس کام کے لیے ہی موزوں قرار دیے گئے۔ ان کا تعلق بنی امیہ سے تھا۔ ابوسفیان کے بہت ہی قریبی رشتہ دار

تھے۔ مکہ میں خاندانی بنیادوں پر وفاداری کا جو مظاہرہ ہوا کرتا تھا اس کے پیش نظر حضرت عثمانؓ بہت ہی محفوظ سمجھے گئے۔ قریش نے وہ سب کچھ سنا جو حضرت عثمانؓ نے کہا۔ جواب میں قریش نے کہا کہ اگر حضرت عثمانؓ چاہیں تو کعبہ کا طواف کر سکتے ہیں۔ قریش نے فیصلہ کیا کہ حضرت عثمانؓ کو مکہ میں اس وقت تک روکا رکھا جائے جب تک قریش اپنے آئندہ لائحہ عمل پر غور نہ کر لیں۔

مسلمان مکہ سے صرف ۸ میل دور پٹھڑے ہوئے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے متعلق امید تو یہی تھی کہ وہ چند گھنٹوں میں گفت و شنید کر کے حدیبیہ واپس ہو جائیں گے۔ جب ان کے آنے میں دیر ہونے لگی اور نہ آنے کی وجہ بھی نہیں بتلائی جا رہی تھی تو مسلمانوں کو تشویش ہونے لگی۔ یہ افواہ اڑ گئی کہ حضرت عثمانؓ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ مسلمان یہ سوچنے لگے کہ ابوسفیان کی گہری قرابت کے باوجود حضرت عثمانؓ اگر واقعی قتل کر دیئے گئے ہیں تو ان لوگوں کے ارادے نیک نہیں معلوم ہوتے اور لڑائی سے گریز ناممکن ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مکہ والوں کے لیے یہ آخری موقع ایسا آیا تھا کہ اگر وہ چاہتے تو حضورؐ کو اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتے۔ حضورؐ نے عمرہ کا ارادہ کیا تھا بہت ہی تھوڑے مسلمانوں کے ساتھ حضورؐ مکہ سے صرف چند میل دور پٹھڑے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے پاس سوائے تلواروں کے کوئی اور ہتھیار نہیں تھے۔ اگر قریش کی قیادت کوئی ایسا آدمی کرتا ہوتا جو اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا تو وہ آسانی سے اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھاتا۔ چند گھنٹوں کے اندر ہی اس ساری جدوجہد کا اختتام کر دیتا۔ اُحد کے موقع پر بھی قریش نے اپنی نااہلیت اور قیادت کے فقدان کا ثبوت دیا تھا۔ فوری قدم اٹھانے کی توان میں صلاحیت ہی نہیں تھی۔

حدیبیہ میں اب مسلمانوں کے جذبات بھڑک رہے تھے۔ ان کی تشویش
اضطراب کی صورت اختیار کر گئی تھی۔

حضور مسلمانوں کے کمزور موقف کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی جنگ کو ناگزیر
سمجھ رہے تھے۔ آپ نے سارے مسلمانوں کو اکٹھا۔ آپ ہر ایک سے دوبارہ
بیعت لینا چاہتے تھے۔ ایک بول کے درخت کو ٹیک لگا کر آپ کھڑے ہو گئے۔
ہر آدمی کو دعوت دی کہ وہ آگے بڑھے۔ حضور کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائے مسلمان
ایک قطار کی صورت میں کھڑے ہو گئے۔ ہر آدمی آگے آتا اور حضور کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ
کر عہد کرتا۔ یہ اسی طریقے کی بیعت تھی جیسی ہجرت سے سات سال قبل مدینہ
کے لوگوں نے مکہ میں آپ کے ہاتھ پر کی تھی۔

صورتِ حال بڑی نازک تھی۔ ہر مسلمان اپنی جان کی قربانی کے لیے بے چین
نظر آ رہا تھا۔ ابن اسحق کے بیان کے مطابق ان تمام مسلمانوں میں ایک آدمی ایسا نکلا
جو بیعت سے بچنے کے لیے ایک اونٹ کے پیچھے چھپ گیا۔ اس بیعت میں
لفظ بہ لفظ کیا بیان کیا گیا اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ جو بیان ہم تک پہنچا
ہے اسکی صحت مشتبہ ہے۔

یہ اپنی جگہ واقعہ ہے کہ اس موقع پر حضور کا ارادہ جنگ لگنے کا تو بالکل تھا ہی نہیں۔
حضور نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ اگر کچھ مرانا تو دینی بھی پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔
حضور کے جاننا جنگ کے لیے بے قرار تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مصالحت پسندی
اور امن پسندی میں آپ تمام مسلمانوں سے آگے تھے۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو ہو سکتا
ہے کہ آپ نے مسلمانوں سے جس بات کی بیعت لی وہ یہی تھی کہ مسلمان آپ کی مرضی
کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ بہر حکم من و عن بجالائیں گے۔

حدیبیہ میں مسلمان جس فکر و تشویش کا شکار ہو گئے تھے اس کا اثر ان کے ذہنوں

پر برسوں رہا۔ اس وقت جب کہ مسلمان ایک غلیم سلطنت کے مالک تھے جنگ بدر میں لڑنے والوں اور عید بقیہ میں بیعت کرنے والوں کا ذکر بہت ہی عزت و احترام سے کیا کرتے تھے۔ چونکہ اسلام کی بنا اور عروج کے لیے یہ دونوں واقعات سنگ میل کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔

مسلمانوں نے دیکھا کہ مکہ کی طرف سے ایک آدمی اونٹ پر بیٹھا ہوا مسلمانوں کی طرف آرہا ہے۔ آنے والا سہیل بن عمرو تھا۔ سہیل مرنجاں مرنج قسم کے آدمی تھے۔ لوگوں سے شائستگی اور اخلاق سے پیش آتے تھے۔ حضور نے جب ان کو آنے دیکھا تو فرماتے تھے کہ مکہ والے امن چاہتے ہیں، جی تو سہیل کو یہاں روانہ کیا ہے۔

ایسی سوچری بحث کے بعد امن کے شرائط پر آمادگی ہوئی۔ طے پایا کہ ان ساری شرائط کو تحریر میں لاکر باقاعدہ ایک دستاویز کی صورت دی جائے۔ حضرت عمرؓ نے جو بڑی تیز طبیعت کے مالک تھے، حضرت ابو بکرؓ کو ایک طرف بلا کر غصہ سے کہا۔

”کیا محمد خدا کے رسول نہیں ہیں؟ کیوں ہم تحقیر آمیز مصالحت کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے حکمانہ لہجے میں حضرت عمرؓ سے کہا: جو حضورؐ کہتے ہیں وہی کرو۔ پوں چرا کی ضرورت نہیں۔“

حضرت ابو بکرؓ میں تسلیم و رضا کی خوبہت زیادہ تھی۔ ہر حکم کے آگے وہ اپنا سر خم کر دیتے تھے۔ اس موقع پر بھی حضرت ابو بکرؓ نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے پیغمبر اور رسول ہیں۔“

حضرت عمرؓ کو حضرت ابو بکرؓ کے اس جواب سے تشفی نہیں ہوئی۔ اب وہ حضورؐ کی خدمت میں گئے۔ وہی سوال دہرائے۔ آپ نے نرمی سے فرمایا کہ: میں خدا کا بندہ اور اس کا پیغمبر ہوں۔ میں اس کے حکم کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ وہ مجھے اس کی اجازت کبھی نہیں دے گا کہ میرا شمار خسارہ اٹھانے والوں میں ہو۔“

حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو حکم دیا گیا کہ معاہدہ کو تحریری صورت دی جائے
 فرمایا کہ "محمد رسول اللہ اور سہیل ابن عمرو کے درمیان یہ طے پایا" تو سہیل نے فوری مدافعت
 کی اور کہا کہ اگر تم نے آپ کو اللہ کا رسول مان لیا ہوتا تو پھر جھگڑا ہی کس بات کا تھا
 اگر میں مسلمان ہو گیا ہوتا اور آپ کو خدا کا رسول تسلیم کر لیتا تو آپ سے لڑائی کا سوال
 ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ صرف اپنا اور اپنے والد کا نام معاہدہ میں لکھو آئیں۔
 حضورؐ بڑے ہی صبر و سکون کے ساتھ حضرت علیؓ کی طرف پلٹے اور فرمایا لکھو
 "محمد ابن عبد اللہ اور سہیل ابن عمرو کے درمیان طے پایا"

⑤ معاہدہ کی شرائط میں ایک شرط یہ تھی کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان دس سال
 تک جنگ نہ ہوگی۔ اس صلح کی مدت میں فریقین کے لوگ آزادانہ طور پر بلا کسی مزاحمت
 کے حمل و نقل جاری رکھ سکیں گے۔

⑥ دوسری شرط یہ تھی کہ مکہ سے اگر کوئی شخص مدینہ چلا جائے تو مسلمان اس کو مکہ واپس
 کر دیں گے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی مسلمان محمدؐ سے خفا ہو کر مکہ کا رخ کرے تو اس
 کو مدینہ واپس ہونے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

⑦ تیسری شرط یہ تھی کہ جو قبیلے مسلمانوں کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرنا چاہتے تھے
 انہیں اس بات کی آزادی دی جائے گی جو قریش سے معاہدہ کرنا چاہتے تھے انہیں
 اس کی آزادی دی جائے گی۔ ایسی صورت میں ان قبائل پر بھی معاہدہ کی پہلی شرط کا
 اطلاق کیا گیا۔

⑧ چوتھی شرط یہ تھی کہ اس سال مسلمان مدینہ واپس ہو جائیں اگر وہ عمرہ کرنا چاہیں تو آئندہ
 سال ان کو اس کی آزادی ہوگی۔ مسلمان کعبہ کی زیارت کیلئے صرف تین دن تک
 مکہ میں رہیں گے۔ اس کے بعد واپس ہو جائیں گے۔ سوائے تلواریوں کے کوئی اور
 ہتھیار اپنے ساتھ نہیں رکھیں گے۔

یہ ساری شرائط مسلمانوں کو ناگوار گزر رہی تھیں۔ مایوسی اور تنویطیت ان پر طاری ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کو اس سال عمرہ کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ ان کو اپنے ارادہ میں بری طرح سے ناکامی ہوئی تھی۔ جب مسلمانوں نے اپنے ارادوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا تو اس شکست آرزو کو اللہ کی مرضی سے تعبیر کیا اور صبر کا دامن تھلمے رکھا۔

دس سالہ امن کے معاہدے نے مکہ والوں کو یہ موقع دیا کہ وہ اپنی تجارت کو اور خاص کر کھروان کی روانگی کو باقاعدگی کے ساتھ بلا روک ٹوک جاری رکھیں۔ اپنی معاشی خوش حالی میں اضافہ کریں۔ حضور کی عمر ۵۸ سال کی تھی۔ قریش یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ مزید دس سال تک نہیں جئیں گے۔ خاص طور پر وہ شرط جس میں مکہ سے مدینہ بھاگ کر آنے والوں کو مکہ واپس کر دیا جائے گا اور مدینہ سے مکہ جانے والوں کو واپسی کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکے گا۔ مسلمانوں کے لیے بہت ہی کوفت کاٹن رہی تھی۔ وہ اس شرط میں اپنی ذلت محسوس کر رہے تھے۔ ان ساری شرائط کو مسلمان خود ہی قریش کی فتح کا نام دے رہے تھے۔

مسلمانوں کے زخم پر نمک اس طریقے سے چھڑکا گیا کہ جب دستاویز پر طنین کے دستخط ہو رہے تھے، سہیل ابن عمرو کا نوجوان لڑکا ابو جندل پاؤں میں بیڑیاں پہنے لنگڑا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس نوجوان لڑکے کی بڑی خواہش تھی کہ مسلمان ہو جائے لیکن اس کے خاندان والوں نے اس کے پیروں میں بیڑیاں پہنا دی تھیں تاکہ وہ مدینہ فرار نہ ہو سکے۔ جب سہیل نے اپنے بیٹے جندل کو وہاں آتے دیکھا تو غصہ میں اُٹھ کر اسے طمانچے مارنے شروع کر دیئے۔

سہیل نے چلا کر حضور سے کہا کہ ہم نے معاہدے پر رضامندی کا اظہار اس لڑکے کے آنے سے قبل کر دیا تھا۔ گو ہم نے دستخط نہیں کیے ہیں مگر شرائط پر رضامندی کا

اظہار کر چکے ہیں۔ اس لیے ابو جندل کو مکہ واپس کر دیا جائے۔
 حضور نے سہیل سے اتفاق کیا۔ سہیل ابو جندل کو گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے کر
 چلنے لگے۔ ابو جندل نے مسلمانوں سے کہا کہ مسلمانو! کیا مجھے ان بت پرستوں کے درمیان
 پھر سے واپس کیا جا رہا ہے جو مجھے بت پرست رہنے پر مجبور کر رہے ہیں؟
 مسلمانوں کی نظریں نیچی ہو گئیں۔ محض اسلام قبول کر لینے کی پاداش میں ابو جندل پڑا قابل
 برداشت سختیاں کی جا رہی تھیں۔

ابو جندل کی چیخ و پکار اور مسلمانوں کی خاموشی کے درمیان حضور نے ابو جندل سے کہا۔
 ”ابو جندل۔ صبر کرو! اللہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی دے گا۔“

جب ابو جندل کو مکہ واپس لے جایا جا رہا تھا حضرت عمرؓ ابو جندل کے ساتھ ساتھ تھوڑی
 دور تک چلتے رہے۔ ابو جندل کے کان میں آہستہ سے کہا، یاد رکھو یہ بت پرست ہیں۔
 ان بت پرستوں میں سے ہر ایک کا خون میرے نزدیک کتے کے خون کے برابر ہے۔“
 حضرت عمرؓ نے اپنی تلوار کا قبضہ ابو جندل کی طرف ایسے کر رکھا تھا کہ اگر ابو جندل
 چاہتے تو آسانی سے عمر کی تلوار لے کر اپنے باپ کا سر قلم کر دیتے۔
 بعد میں حضرت عمرؓ کہتے تھے کہ میں اپنی تلوار کے قبضے کو ابو جندل کے قریب رکھ کر
 اسے جوش دلانے والی باتیں کر رہا تھا تاکہ وہ جوش میں آ کر میری تلوار سے اپنے باپ
 کا خاتمہ کر دے۔

آگے ہم دیکھیں گے کہ کس طرح ابو جندل اس قید و بند سے نجات پاتے ہیں اور کس
 طرح ان کیلئے آزادی کا راستہ نکل آتا ہے۔

یادگار تاریخیں

مارش۔ اپریل ۶۲۷ء

اپریل ۶۲۷ء

اکتوبر ۶۲۷ء

اکتوبر یا نومبر ۶۲۷ء

دسمبر ۶۲۷ء یا جنوری ۶۲۸ء

مارش ۶۲۸ء

مدینہ کا محاصرہ

بنی قریظہ کی بیخ کنی

بنی لہیان پر حملہ

بنی عطفان کا معزور کے اونٹوں کو چرانا

بنی معطلق پر حملہ

صلح حدیبیہ

خبر اور موت

جیسے ہی سہیل ابن عمر واپس اپنے بیٹے ابو جندل کو اس کی مرضی کے خلاف مار پیٹ کر واپس لے گئے، حضور نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے ساتھ قربانی کے لیے لائے ہوئے اونٹوں کو ذبح کریں اور اپنے سر منڈھوا ڈالیں۔ اونٹوں کی قربانی اور سروں کو منڈھوانا عمرہ یا حج کے رسومات میں شامل ہیں جو صرف مکہ میں ادا ہونے چاہئیں۔ چونکہ مکہ مسلمانوں کی پہنچ سے اب باہر تھا اس لیے حدیبیہ ہی میں انہوں نے ان رسومات کی تکمیل کر ڈالی۔

اب مسلمانوں کی جماعت مع اپنے مال و اسباب کے انتہائی مایوسی کے عالم میں مدینہ واپس ہوئی۔ ابھی مدینہ کے لیے آدھا سفر باقی تھا کہ حضور پر سورہ فتح نازل ہوئی آغاز ہی خلاف توقع اعلان سے ہوتا ہے۔

”ہم نے یقیناً آپ کو فتح عظیم عنایت کی“

اس سورہ کی پہلی آیت میں خدائے تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

”اے محمد، ہم نے تم کو فتح دی۔ فتح بھی صاف و صریح۔“

دسویں آیت میں حدیبیہ میں حضور نے درخت کے نیچے جو بیعت کی تھی اس کا

ذکر ہے۔

جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں۔ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ پھر جو عہد کو توڑے تو عہد توڑنے کا نقصان اسی کو ہے اور جو اس بات کو جس کا اس نے خدا سے عہد کیا ہے پورا کرے تو اسے عنقریب اجر عظیم دے گا۔

گیا رہیں آیت میں ان قبیلوں کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے اس موقع پر حضور کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

جو گنوار پیچھے رہ گئے کہ ہم کو ہمارے مال اور ہمارے اہل و عیال نے روک رکھا ہے، آپ ہمارے لئے خدا سے بخشش مانگیں یہ لوگ اپنی زبان سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے۔

بارہویں آیت میں حضور کے ساتھ قبیلوں کی پوشیدہ دشمنی اور مخالفت کا ذکر ہے۔

بات یہ ہے کہ تم لوگ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ پیغمبر اور مسلمان اپنے اہل و عیال میں کبھی لوٹ کر آنے کے نہیں اور یہی بات تمہارے دلوں کو اچھی معلوم ہوئی اور اسی وجہ سے تم نے برے برے خیال کئے اور آخر کار تم ہلاکت میں پڑ گئے۔

اٹھارویں آیت میں بیعت کا ذکر ہے۔

اے پیغمبر۔ جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا۔ جو صدق و خلوص ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو ان پر تسلی نازل ہوئی اور انہیں جلد فتح عنایت کی۔

بعد میں بہت سے مفسرین اور شارحین نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ صلح حدیبیہ نے مسلمانوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچایا۔ اگر جنگی فتح ہو

بھی جاتی تو مسلمانوں کو اتنا فائدہ نہیں پہنچتا تھا جتنا صلح حدیبیہ سے پہنچا۔
 صلح حدیبیہ کے وقت امام مسلمان پست ہمتی اور مایوسی کا شکار اتنے
 زیادہ ہو گئے تھے کہ اس کے روشن پہلوؤں کی طرف ان کا دھیال جا ہی نہیں
 رہا تھا۔

ایک دوسرے کے جان و مال کی حفاظت کے عہد و پیمان نے مسلمانوں
 اور مشرکین کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ آزادانہ طور پر ایک دوسرے سے مل سکیں۔
 تبادلہ خیال کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اور بت پرست ایک دوسرے
 سے کافی بحث و مباحثہ کرنے لگے۔ مسلمانوں کو اپنے عقیدے کے پرچار کا موقع
 ملنے لگا۔

آیا حضور بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے یا نہیں اس کے تعلق سے کچھ
 کہنا بہت مشکل ہے۔ قرین قیاس یہی ہے کہ حضور کے آگے صلح حدیبیہ
 کا روشن پہلو ضرور تھا ہوگا۔

بار بار ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضور کو لڑائیاں قطعاً پسند نہیں تھیں۔ اپنے تجربات
 کی بناء پر آپ یہ ضرور محسوس کرتے تھے کہ آپ کو اللہ نے لوگوں کے مذہبی
 خیالات کے رُخ کو پلٹانے کا خاص ملکہ دیا تھا۔ اس فن میں آپ کو کمال حاصل
 تھا۔ آپ کی اسی خصوصیت کی بناء پر آپ کو یقین تھا کہ آپ اپنی صلاحیت بہ حسن
 کمال استعمال میں لا کر لوگوں کے ذہنوں میں اپنی بات بٹھا سکتے ہیں تبلیغ جس
 بہتر طریقے سے امن کے زمانے میں کی جاسکتی ہے جنگ کے دوران
 نہیں ہو سکتی شاید اسی لئے آپ نے اس موقع پر صلح کو ترجیح دی۔

جب یہ بات سچی تو ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور نے قریش
 کے خلاف جنگ کیوں کی؟ ان کے کاروائیوں پر حملے کیوں کئے۔ کیا یہ مسلمانوں

کی غلطی نہیں تھی؟ اسلام کا پیغام بہت پرستوں کے ذہنوں پر اتنا گہرا اثر چھوڑ رہا تھا کہ محض تبلیغ ہی کو اشاعت اسلام کا ذریعہ بنایا جاتا تو اسلام اور آسانی سے پھیلتا جاتا۔ اہل قبیلہ کی قبیلے سے وفاداریوں نے اسلام کی اشاعت میں بڑی رکاوٹیں پیدا کیں۔ لڑائیوں کی وجہ سے لوگوں میں بدلہ لینے کی خواہشات جنم لینے لگیں۔

حضرت جب مدینہ آچکے تو ایک نوجوان ابو بصیر حضور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مسلمان ہونے کے ارادے سے وہ مکہ سے فرار ہو کر یہاں آیا تھا۔ اس کے نقاب میں مکہ کے دو آدمی نکلے۔ آتے ہوئے اپنے ساتھ ایک خط لے کر آئے۔ خط میں لکھا تھا کہ معاہدہ حدیبیہ کی رو سے ابو بصیر کو مکہ واپس بھجوا دیا جائے۔ حضور نے معاہدہ کے پیش نظر ابو بصیر کو ان دونوں آدمیوں کے حوالے کر دیا۔ مدینہ سے سات میل دور جبکہ وہ جنوب کی سمت میں تھے ابو بصیر نے ان دو آدمیوں میں سے ایک کو قتل کر دیا۔ دوسرا اپنی جان بچا کر فرار ہو گیا۔ ابو بصیر پھر مدینہ واپس پہنچ گیا۔ جیسے ہی حضور نے اسے دیکھا فرمایا "عجیب آدمی ہے۔ اگر ابو بصیر کے ساتھ چند اور اس کے ساتھی ہوتے تو وہ جنگ بھی شروع کر دیتا"

ابو بصیر مدینہ کے مغربی رخ وادی العیس چلے گئے۔ حضور کے اس ارشاد کا مطلب مکہ کے باغی اور معتوب نوجوان یہ نکالنے لگے کہ حضور کا منشاء شاید یہ ہو کر ابو بصیر کے ساتھ کچھ اور نوجوان ہوتے تو بہتر تھا۔ اسلام قبول کرنے کے شائقین نوجوان ایک ایک کر کے مکہ سے بھگتے لگے اور وادی العیس جا کر ابو بصیر کے ساتھ رہنے لگے یہ سارے نوجوان مل کر قریش کے کاروانوں کو روکنے لگے مکہ کے لوگوں نے حضور کی توجہ ابو بصیر کے اس

اقدام پر منعطف کرائی۔ ساتھ ہی ساتھ حضور سے درخواست کی گئی کہ آپ ابو بھیر اور ان کے سانجھوں کو مدینہ واپس بلوائیں تاکہ ان کی شرارتوں سے قریش کے کاروان محفوظ رہیں۔ بہت ساری عورتیں بھی مکہ سے فرار ہو کر مدینہ پہنچ گئیں۔ جب ان کے رشتہ داروں نے صلح حدیبیہ کا حوالہ دیتے ہوئے ان عورتوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تو حضور پر وحی آئی۔

”مومنو جب تمہارے پاس مومن عورتیں وطن چھوڑ کر آئیں تو ان کی آزمائش کرو۔ خدا تو ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ سو اگر تم کو معلوم ہو کہ مومن ہیں تو ان کو کفار کے پاس نہ بھیجو کہ نہ یہ ان کے لئے حلال ہیں اور نہ وہ ان کو جائز اور جو کچھ انہوں نے ان پر خرچ کیا ہے وہ ان کو دے دو اور تم پر گناہ نہیں کہ ان عورتوں کو دے کر ان سے نکاح کر لو اور کافر عورتوں کی ناموس کو قبضے میں نہ رکھو یعنی کفار کو واپس دے دو اور جو کچھ تم نے ان پر خرچ کیا ہے تم ان سے طلب کر لو۔ اور جو کچھ انہوں نے اپنی عورتوں پر خرچ کیا ہے وہ تم سے طلب کر لیں۔ یہ خدا کا حکم ہے جو تم میں فیصلہ کئے دیتا ہے اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے“ سورہ الممتحنہ آیت نمبر ۱

ان آیتوں کے اترنے کے بعد حضور نے مکہ والوں کو مطلع کیا کہ معاہدہ حدیبیہ کا اطلاق عورتوں پر نہیں ہوا کرے گا۔

حدیبیہ سے واپسی کے بعد صرف دس ہفتے حضور کا قیام مدینہ میں رہا۔ ستمبر ۶۲۸ء میں حضور نے خیبر پر حملہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ خیبر ایک شاداب مقام تھا مدینہ کے شمال میں ۵۰ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ یہاں یہودی رہا کرتے تھے۔ خیبر کے یہودی بھی مدینہ کے یہودیوں کی طرح ہر طرح سے عربیت کو اپنائے ہوئے تھے۔ ان کے نام عربوں جیسے

تھے۔ ان کے رسم و رواج عربوں کے سے تھے۔ ان کی زبان عربی تھی۔ شاید یہ لوگ بھی اصل میں عرب ہی تھے جو کئی صدیوں پہلے مستزپوں کی آمد اور ان کی تبلیغ کی وجہ سے یہودیت قبول کر لیے ہوں۔

اس بہم میں مال غنیمت کی فراوانی کا تصور کرتے ہوئے بہت سے لوگ حضور کی آواز پر لبیک کہنے لگے۔ آپ نے فرمایا میرے ساتھ اس بہم پر وہی چلے جو حدیبیہ کے موقع پر ساتھ تھا۔

واقعی کے بیان کے مطابق سارے مدینہ میں یہ منادی کروادی تھی کہ وہ لوگ جن کا مقصد مدعا صرف لوٹ کھسوٹ ہے اس جنگ میں قلعی ساتھ نہیں رہیں گے۔ جس طریقے سے بھی لوگوں کو اس بہم کے لیے چنا گیا اس سے قطع نظر یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ خیبر پر حملہ کرنا حدیبیہ کی مایوسیوں کا بدلہ لینا تھا۔ چلتے چلتے یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مدینہ میں اس وقت بھی کئی یہودی مقیم تھے۔ واقعی کے بیان کے مطابق مدینہ کے یہودیوں کی ہمدردیاں خیبر کے یہودیوں کے ساتھ تھیں۔

مسلمانوں کی جماعت پہاڑیوں پر سے ہوتے ہوئے جب آگے بڑھ رہی تھی تو بلندی پر سے ان کو سرسبز و شاداب باغات اور ہرے بھرے کھجور کے درخت نظر آنے لگے۔ حضور نے اپنی جماعت کو یہاں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ آپ نے اپنی آواز سے دُعا فرمائی۔

”اے اللہ۔ ہم تجھ سے اس مقام پر اس مقام کے رہنے والوں کی بھلائی چاہتے ہیں۔ جو چیزیں بظاہر ہماری نظر سے مستور ہیں ان کی بھی بھلائی چاہتے ہیں۔ جو برائیاں یہاں بھری پڑی ہیں ان سے تیری پناہ میں آتے ہیں“ اس کے بعد آپ نے حکم دیا ”اللہ کی رحمتوں اور عنایتوں کے ساتھ آگے بڑھو“

خیبر کے لوگوں کا ذریعہ معاش مدینہ کے باسیوں کی طرح زراعت تھا۔ کھجوروں کے درخت پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ وہ اس وقت سارے حجاز میں بہترین مہربن و شاداب نخلستان تھا۔ مدینہ والوں کی طرح ہر قبیلے کی اپنی علیحدہ بستی تھی ان کا اپنا قلعہ ہوا کرتا تھا۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو موقع فراہم کیا کہ ایک قلعہ کے بعد دوسرے قلعہ پر حملہ کرتے چلے جائیں۔ ان کی قلعہ بندیاں راتوں راتے اکا دکا حملوں کو نوروک سکتی تھیں لیکن ایک باقاعدہ اور مسلسل حملے کا جواب دینا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

واقعی کی روایت کے مطابق بہت سے یہودی مسلمانوں سے مل بھی گئے تھے۔ ان ہی ساز باز کرنے والے یہودیوں میں سے ایک یہودی نے مخبری کی کہ ایک خاص قلعہ میں ایک ایسی کارآمد چیز موجود ہے جس کو استعمال کر کے قلعہ کی دیواریں گرائی جاسکتی ہیں۔ اس وقت کے نایاب ہتھیاروں میں سے یہ ایک ہتھیار تھا جس کو خم کر کے اس پر پتھر رکھ دیا جاتا تھا اور جب اس کے جھکاؤ کو تناؤ کی صورت دی جاتی تھی تو وہ پتھر اس زور و شور سے قلعہ کی دیوار پر پھینکتا کہ قلعہ کی دیواروں میں شکاف پڑ جاتے تھے۔

خیبر کے یہودی عام طور پر قبیلہ وارانہ جھگڑوں میں حصہ نہیں لیا کرتے تھے۔ یہ کسی کی بھی طرف داری نہیں کرتے تھے۔ غیر جانب دار رہتے تھے۔ ان کی حفاظت ان کے دوست اور حلیف قبائل کیا کرتے تھے۔ جن قبائلیوں سے ان کے دوستانہ تعلقات زیادہ تھے ان کے سردار بنی عطفان تھے۔ واضح رہے کہ یہی وہ یہودی تھے جنہوں نے عطفان کو اکسا کر قریش کے ساتھ ملوا کر مدینہ کا محاصرہ کروایا تھا۔

اس موقع پر عطفان کا ایک سردار بعینہ ابن حسن یہودیوں کی پکار پر

اپنے چند لوگوں کو یہودیوں کے قلعوں پر روانہ کیا۔ چند دن بعد یہ معلوم کر کے کہ خود ان کے اپنے گھر خطرے میں ہیں یہ لوگ خیر چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔ واقدی کے بیان کے مطابق ان تباہیوں نے خطرے کی گھنٹی یا تو غیب سے سُنی تھی یا زمین نے ان کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ خیر کے یہودیوں نے جم کر مقابلہ کیا۔ مدینہ کے یہودیوں سے زیادہ مزاحمت ان یہودیوں نے کی۔ بہت سے یہودی اپنے اپنے قلعوں سے باہر نکل آئے۔ مسلمانوں کو فرداً فرداً لڑنے کی دعوت دی۔ یہی وہ واحد موقع تھا جبکہ یہودیوں نے مسلمانوں کو لٹکارا تھا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ مسلمانوں کو کھانے پینے کے سامان کی قلت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک دن مسلمانوں نے بیس گدھوں کو کہیں سے پکڑ لیا۔ انھیں ذبح کیا۔ خوشی خوشی اس گوشت کو دم دینے لگے۔ حضورؐ کا اُدھر سے گزر ہوا۔ دریافت فرمایا کہ کیا ہو رہا ہے۔ مسلمانوں نے کہا کہ گدھے کا گوشت پک رہا ہے۔ حضورؐ نے فوراً حضرت بلال کو بلوایا۔ اُن سے اعلان کروایا گیا کہ گدھے کا گوشت حرام ہے۔ یہ سنتا تھا کہ مسلمانوں نے اپنے سارے برتن خالی کر دیے۔ گوشت کو پھینک دیا۔ بھوکے پیاسے سو گئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ گھوڑے ذبح کئے جائیں۔ اس زمانے میں گھوڑے کم یا ابھی تھے اور گراں بھی۔ خصوصاً حالت جنگ میں گھوڑوں کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ اسی لئے بہت ہی کم لوگ اس بات کے لیے تیار ہوئے کہ اپنے گھوڑوں کو ذبح کریں بہت جلد ایک ایسا قلعہ مسلمانوں کے قبضے میں آیا جس میں ایک بڑی مقدار میں اجناس خوردنی محفوظ کئے گئے تھے۔ ہر مسلمان کے لیے جو کچھ اور تیل اور

شہد کے راشن مقرر کئے گئے۔

بغیر لڑائی کے کوئی بھی قلعہ مسلمانوں کے قبضے میں نہیں آیا۔ ہر قلعہ پر حملہ کرنے اور اُسے اپنے قبضے میں لینے کے لیے اوسطاً تین دن کی مدت درکار ہوتی تھی۔ ایک بڑی مصیبت یہودیوں کے لیے یہ تھی کہ ہر قبیلہ اپنے قلعے میں بند تھا۔ وہ صرف اپنی ہی مدافعت کر سکتا تھا۔ دوسرے قلعے میں رہنے والوں کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ مسلمانوں کی ساری جماعت بہ یک وقت ایک قلعے پر حملہ کرتی تھی۔ اس کو اپنے قبضے میں لینے کے بعد دوسرے قلعے پر حملہ کیا جاتا تھا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے قلعے فتح ہوتے گئے۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ قلعہ کے برج پر سے ایک تیر پھینکا گیا۔ حضور کے کپڑوں کو چھوتے ہوئے یہ نکل گیا۔ جسم مبارک پر کوئی زخم وغیرہ نہیں لگا۔ آخر کار اب نین قلعے باقی رہ گئے تھے۔

یہ بہت ہی مضبوط قلعے تھے۔ جب چودہ دن تک ان کا محاصرہ کیا گیا تو قلعہ میں رہنے والوں نے ہتھیار ڈالنے کے شرائط ملتے۔ کنانہ ابن ابی الحقیق یہودی سردار تھا۔ یہ سلام ابن الحقیق کا پوتا تھا۔ سلام مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔

جب کنانہ کو جان کی سلامتی دے دی گئی تو وہ قلعہ سے باہر آیا۔ عرض کیا کہ یہودی اپنی جانوں کی سلامتی کے عوض سارا مال و اسباب مسلمانوں کے حوالے کرنے تیار ہیں۔ حضور نے اس کی بات مان لی۔

ہتھیار اکپڑے اور اشیائے خورد و نوش بڑی مقدار میں مسلمانوں کے حوالے کئے گئے۔

کنانہ نے کہا کہ اس کے پاس روپیہ پیسہ، سونا چاندی کچھ بھی نہیں

ہے۔ اس کے ایک رشتے کے بھائی نے مجبوری کر دی کہ اس جگہ خزانے دفن کئے گئے ہیں۔ مجبوری سے خبر دی تھی۔ واقعہ خزانے ہاتھ آئے۔ کنانہ نے حضور کے آگے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ اس جھوٹ کی پاداش میں حکم دیا گیا کہ کنانہ کے ساتھ سختی کی جائے۔ لوگوں نے سختی ایسی کی کہ اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس مقام پر جن عورتوں کو گرفتار کیا گیا تھا ان میں سے ایک صفیہ تھیں۔ یہ جی ابن الخطاب کی بیٹی تھیں۔ جی کو بنی قریظہ نے مار ڈالا تھا۔ صفیہ کی شادی کنانہ سے ہوئی تھی۔ صفیہ کا باپ ابھائی اور ان کا شوہر یہ سب مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ صفیہ حضور کی خدمت میں لائی گئیں۔ ان کے ساتھ ایک اور عورت بھی تھی صفیہ نے اسلام قبول کر لیا۔ اسی مقام پر ایک شامیہ نے میں حضور کا ان سے نکاح ہوا۔ کچھ دنوں بعد حضور نے بی بی صفیہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ وجہ دریافت کی۔ صفیہ نے کہا کہ حضور کی دیگر ازواج مطہرات ان کا مذاق اڑاتی ہیں۔ ان کو یہودن کہا کرتی ہیں۔ یہ سن کر آپ کو بہت ہی غصہ آیا۔ آپ نے صفیہ سے فرمایا اگر وہ آئندہ تمہارے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئیں تو مجھ سے کہنا آپ نے پھر کہا کہ ان سے کہو کہ ہارون میرے باپ تھے اور موسیٰ میرے چچا۔ اس موقع پر بھی آپ نے ابراہیمی مذہب کی نہ صرف لاج رکھی بلکہ عزت و تکریم سے اس مذہب کا ذکر فرمایا۔

جب لڑائی ختم ہو گئی تو ایک زینب نامی یہودن نے حضور کی دعوت کی۔ کھانے میں زہر ملا دیا۔ گوشت کا زہر آلود ٹکڑا جیسے ہی آپ نے منہ میں لیا اُسے فوراً تھوک دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس میں زہر ہے۔ زینب کو طلب کیا گیا۔ اُس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ اُس نے کہا کہ جو کچھ آپ نے میسرے لوگوں کے ساتھ کیا ہے وہ آپ جانتے ہیں۔ میں نے اپنے

دل میں خیال کیا کہ اگر آپ کی حیثیت محض ایک حکمران یا سردار جیسی ہے تو ہم کو آپ سے جتنا جلدی ہو سکے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہتے۔ لیکن اگر آپ ایک پیغمبر ہیں تو آپ کو غیب سے معلوم ہی ہو جائے گا کہ میں آپ کے ساتھ کیا کرنے والی ہوں۔ ابن اسحق کی روایت کے مطابق اُس عورت کی حاضر و معانی کے پیش نظر حضور نے اُسے معاف کر دیا۔

مدینہ کا ایک اور آدمی جو حضور کے ساتھ اس دعوت میں شریک تھا گوشت کا ایک ٹکڑا اعلیٰ سے نیچے اتارتے ہی اصل کھنکھتا ہوا۔ تین سال بعد جب حضور کا انتقال ہوا تو اُس سے قبل طبیعت کی خرابی کو آپ نے اسی دعوت کے اثر کا نتیجہ قرار دیا۔ آپ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ جو مسلمان غیر مسلموں کے ہاتھ سے شہید ہوتا ہے شہادت کے منصب جلیلہ پر فائز ہوتا ہے۔

جب حالات معمول پر آگئے تو یہودی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا کہ وہ اپنی کاشت کاری اور زراعت کو جاری رکھنا چاہتے ہیں جو بھی فصل ہوگی اس کا اُدھان حصہ مسلمانوں کو پیش کریں گے۔ آپ نے ان کی اس درخواست کو منظور کر لیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ مسلمانوں کو یہ حق حاصل رہے گا کہ کسی وقت بھی یہودیوں کو بے دخل کر سکیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس وقت حضور کے ہاں اتنے مسلمان نہیں تھے جن کو وہ خیبر میں بسنے کے لیے چھوڑ جاتے۔

اسی دوران مذک کے یہودیوں نے اپنے نمائندے کو حضور کی خدمت میں روانہ کیا۔ آپ نے ان کے لیے بھی وہی شرائط منظور فرمائے جن کو خیبر کے یہودی منظور کر چکے تھے۔ مذک کا معاہدہ حضور کی مرضی اور مسلمانوں کے مفاد کے عین مطابق تھا۔ چونکہ مذک کے سلسلے میں کوئی لڑائی و غیرہ نہیں ہوئی تھی اس لیے

فدک کی آمدنی میں کسی کا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ساری آمدنی بیت المال کا حق ہوتی تھی۔ بیت المال پر حضور کی نگرانی تھی اور جس طریقے سے آپ بہتر سمجھتے تھے بیت المال کی رقم مسلمانوں پر خرچ کرتے تھے۔

خیبر کی جنگ کے دوران بہت سے احکامات صادر ہوئے جو بعد میں چل کر مسلم قانون کی اساس بن گئے۔

جنگ میں مارے ہوئے مشرک لوگوں کی عورتوں کو حاصل کر کے ان کو لونڈیوں کی حیثیت سے رکھنا یا پھر ان سے شادی کر لینا ان باتوں کی اجازت تو پہلے ہی دے دی گئی تھی۔

خیبر کے موقع پر یہ حکم دیا گیا کہ دشمن کی کوئی عورت اگر حاملہ ہو تو اس کو اس وقت تک لونڈی نہیں بنایا جاسکتا جب تک کہ وہ زچگی سے فارغ نہ ہو جائے۔ ایک اور مسئلہ آپڑا تھا جس پر توجہ کی سخت ضرورت تھی۔ جنگ کے موقع پر مسلمانوں کو جو چیز جس کے ہاتھ آجاتی تھی وہ اُسے مالِ غنیمت سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ سامان لے جا کر کسی مرکزی مقام پر جمع کروادے اور بعد میں سارے مسلمان اس سے مستفید ہوں۔ خیبر کے موقع پر مسلمانوں کو اس طرز عمل سے روکا گیا۔ شروع شروع میں چند لوگوں کو یہ بات ناگوار گزری۔ بعض لوگ جب کسی تلکڑے جانور کو پکڑ لیتے تو اس پر خوب سواری کرتے اور جب جانور تھک کر مرنے کے قریب ہو جاتا تو اسے لے جا کر بیت المال میں دے دیتے تھے۔ جس دن کپڑوں ان کے قبضے میں آتے تو خوب پسینے اور جب وہ بوسیدہ ہو کر کھٹنے لگتے تو لے جا کر بیت المال کی نذر کر دیتے۔ خیبر سے مسلمانوں کو اتنا زر کثیر ملا کہ اس سے پہلے مسلمانوں کی آنکھوں نے کبھی بھی اتنی بڑی دولت کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ محض خدا کا فضل و کرم تھا۔ اس کے علاوہ خیبر والے اپنی کاشت کا ادھا حصہ مسلمانوں کو دینے بھی تیار ہو گئے تھے۔ کاشت کا حصول

مسلمانوں کی مستقل آمدنی کا ذریعہ بن گیا۔ مسلمانوں کے قبضے میں پڑے، ہتھیار اونٹ اور سب ہی رکھ آیا۔ خیبر میں جو کچھ بھی مسلمانوں کے ہاتھ لگا تھا وہ سب ان لوگوں میں تقسیم کیا گیا جو حدیبیہ میں حضور کے ساتھ تھے۔ خیبر میں صرف ایک مسلمان ایسا تھا جو حدیبیہ کے موقع پر نہیں تھا۔

خیبر کے مال غنیمت کو صرف حدیبیہ کے لوگوں میں تقسیم کرنے کا منشا شاید یہی تھا کہ مسلمانوں کو اس موقع پر جو خفت اور شرمندگی اٹھانی پڑی تھی اس کا ازالہ کیا جائے۔ مال غنیمت کے ۱۸ سو حصے کئے گئے۔ ان اٹھارہ سو حصوں کو ہم اسو مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا۔ ان چودہ سو میں سے دو سو گھڑ سوار تھے۔ ہر سوار کو تین حصے دیئے گئے۔ ایک ان کا اپنا حصہ تھا اور دو حصے گھوڑے کے تھے۔ خیبر میں مسلمانوں کے ہمراہ دو سو سواروں کا رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ کس طرح سے مسلمانوں نے اپنے وسائل میں اضافہ کر لیا تھا۔ اُحد کے میدان میں مسلمانوں کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا۔

خیبر کی جنگ میں ۱۶ مسلمانوں کو شہادت کے جام پینے پڑے۔ خیبر کے بعد حضور نے وادی القریٰ کا رخ کیا۔ اس کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ بھی یہودیوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔

۴۱۵ھ میں مکہ کے بہت سے مسلمانوں نے حبشہ کو ہجرت کی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو شروع شروع میں مسلمان ہوئے تھے۔ ان مسلمانوں نے حبشہ میں بود و باش اختیار کر لی تھی تاکہ کافروں کے ظلم و ستم سے محفوظ رہ سکیں۔ حضور نے اپنے ایک نمائندہ کو حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے دربار میں روانہ کیا اور بادشاہ سے درخواست کی کہ جو مسلمان میرے واپس ہونا چاہتے ہوں ان کی واپس کے لیے سہولتیں فراہم کی جائیں۔ حضور کے اس بلاوے کو ۱۶ مسلمانوں کی ایک جماعت نے قبول کر لیا۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ حبشہ کے دو جہازوں میں یہ لوگ بحر احمرا پار کر کے حضور کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جبکہ

آپ خیر کا نمائندہ کئے ہوئے تھے۔ مہاجرین حبشہ میں تیرہ سال رہ چکے تھے، مسلمان حبشہ میں انتقال کر گئے۔ مزید ۲۲ مسلمان بعد میں عرب کو واپس ہوئے۔ بہت سوں کے ساتھ ان کے بچے بھی تھے جو حبشہ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ سارے بچے عرب ماؤں کے لطن سے تھے۔ تاریخی مواد کوئی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ظاہر ہو کہ ان مسلمانوں نے حبشی عورتوں سے شادیاں کی ہوں۔ جو لوگ حبشہ سے اس موقع پر واپس ہوئے ان میں قابل ذکر حضرت علیؑ کے بھائی جعفر ابن ابی طالبؓ ہیں۔ اس موقع پر ابوسفیان کی بیٹی بھی واپس ہوئی۔ وہی ابوسفیان جو اشد ترین کافر تھا۔ ابوسفیان کی بیٹی اُمّ حبیبیہ کے شوہر کا حبشہ میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اب یہ وہ تھیں۔ واپس آنے پر حضور نے ان سے نکاح کر لیا۔

صلح حدیبیہ کے پورے ایک سال بعد نسوری ۶۲۹ء میں حضور نے معاہدہ کے مطابق عمرہ کا قصد کیا۔ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ آپ کے ساتھ مسلمانوں کی تعداد ایک روایت کے مطابق بارہ سو اور دوسری روایت کے مطابق دو ہزار بھی۔ لگ بھگ وہی تعداد تھی جو حدیبیہ کے موقع پر حضور کے ساتھ تھی۔ بدوی قبیلے اور وہ لوگ جو ابھی ابھی مسلمان ہوئے تھے اس موقع پر شریک نہیں کئے گئے تاکہ اگر قریش کے ساتھ جنگ ہو تو کمزور عناصر مسلمانوں کے ساتھ نہ رہیں۔

حدیبیہ کے معاہدہ کے مطابق مکہ کے لوگ مکہ خالی کر کے شہر سے باہر نکل گئے۔ اطراف کی پہاڑیوں پر اپنے اپنے خیمے ڈالوئے تاکہ مسلمان آدای کے ساتھ عمرہ کے مراسم ادا کر سکیں۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر سے وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ مسلمان کس وقت کیا کر رہے ہیں۔ اشتعال انگیزی اور خوں ریزی کے امکان کو کم کرنے کے لیے شاید شہر خالی کر دیا گیا ہو۔

صبح قریش اپنی پہاڑیوں پر اپنے خیموں میں بیٹھے ہوئے کیا دیکھتے ہیں کہ

مکہ کے شمال کی طرف جدھر سے مدینہ کا راستہ آتا ہے سارا راستہ گردوغبار سے اُٹا ہوا ہے۔ گردوغبار میں جب ذرا کمی ہوئی تو قریش نے دیکھا کہ مسلمانوں کا قافلہ ان کے سامنے ہے۔ حضورؐ خود رہبری فرما رہے ہیں۔ آپ اونٹ پر سوار تھے۔ آپ کے چاروں طرف آپ کے جانشین تھے۔ ابو بکرؓ، عمر بن خطابؓ، علیؓ ابن ابی طالبؓ ساتھ ساتھ تھے۔ قربانی کے اونٹ بھی تھے جن کے گلوں میں ہار پڑے ہوئے تھے۔ حضورؐ کے پیچھے مقربان خاص تھے اور ان کے پیچھے مسلمان قطار در قطار چلے آ رہے تھے۔

سات سال پہلے حضورؐ نے مکہ چھوڑ کر مدینہ کو ہجرت کی تھی۔ اس سارے عرصہ میں آپ کے چچا عباسؓ مکہ ہی میں مقیم رہے۔ جنگ بدر میں آپ کافروں کی طرف سے لڑ بھی چکے تھے۔ آپ کو مسلمانوں نے گرفتار بھی کر لیا تھا۔ حضورؐ نے ان کی جان بخشی کی رقم خود اپنے پاس سے ادا کر کے ان کو آزادی دلائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ اُحد سے قبل عباسؓ نے ایک حفیہ پیغام حضورؐ کی خدمت میں روانہ کیا تھا اور حضورؐ کو مخالفین کے عزائم سے آگاہ کر دیا تھا۔ عباسؓ ایک تیر سے دو شکار کھیل رہے تھے۔ بعض روایات کے مطابق عباسؓ مسلمان ہو چکے تھے اور مکہ میں محض اس لیے ٹھہرے تھے کہ اپنے بیٹے کے مفاد کا تحفظ کر سکیں۔ عباسؓ کے انتقال کے ۱۲۰ برس بعد ان کی نسل کے لوگ اسلامی شہنشاہیت کے مہتمم یا نشان علم بردار بنے اور اس طریقے سے شہنشاہیت کی کہ عرب سلطنت نے ایک طرف اسپین اور مراکش پر حکمرانی کی تو دوسری طرف چین کی سرحدوں تک اسلامی جھنڈا لہرانے لگا۔ شروع شروع کے مسلمان مورخین جن کی کتابیں آج بھی ہمارے تاریخی علم کا ماخذ بنی ہوئی ہیں انہی عباسی شہنشاہوں کے دور حکومت میں اپنی زندگی گزارتے رہے ہیں۔ عباسی حکومت کے زیر سایہ اور عباسی حکمرانوں کے نمک خوار ہو کر عباسی شہنشاہوں کے جد امجد عباس کے خلاف کچھ لکھنا ان لوگوں کے لیے جان جو کھوں میں ڈالنے والی بات تھی۔

قرین قیاس یہی ہے کہ عباس بت پرست تھے۔ اس موقع پر انہوں نے محسوس کر لیا کہ حضور کو فتح ہونے والی ہے۔ مکہ کے دوسرے عمائدین کی طرح اس موقع پر آپ نے مکہ چھوڑ کر پہاڑوں کا رخ نہیں کیا۔ مکہ میں اپنے گھر میں ٹھہرے رہے۔ آپ کا استقبال کیا۔ انہوں نے حضور کے لیے ایک نئی دلہن کا انتخاب کر رکھا تھا۔ میمونہ بیوہ تھیں اور عباس کی سالی ہوتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس موقع پر عباس نے اسلام قبول کر لیا ہو۔ یہیں سے آپ نے شاید خفیہ پیغامات وغیرہ روانہ کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہو۔

شہر میں داخل ہو کر حضور سیدھے خانہ کعبہ تشریف لے گئے۔ حجر اسود کو بوسہ دیا۔ کعبہ کے سات ٹوائف کئے۔ آپ مکہ میں تین دن تک ٹھہرے رہے۔ تیسرے دن کے اختتام پر قریش نے کہلا بھجوا یا کہ از روے معاہدہ تیسرے دن واپس ہو جانی چاہیے۔ حضور نے بڑی ہی نرمی سے جواب روانہ کیا کہ کیا مضائقہ ہے اگر تم مجھے میمونہ سے نکاح ہو جاتے تک اپنے شہر میں رک جانے کی اجازت دے دو۔ بہتر تو یہ ہے کہ تم سب اس نکاح کی تقریب میں شریک ہو۔

اس نرم ردی اور تملطف آمیز دعوت کے جواب میں قریش کے سربراہوں نے یہی ہودہ قسم کا جواب روانہ کیا۔ کہا کہ ہم کو آپ کا کمانا وغیرہ کچھ بھی نہیں چاہیے۔ فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ۔

معاہدہ حدیبیہ میں صریحاً مسلمانوں کو صرف تین دن کے لیے ٹھہرنے کا لکھا ہوا تھا۔ حضور نے معاہدہ کے پیش نظر مکہ سے رخصت ہونے کا اعلان فرمایا سارے مسلمان مکہ سے مدینہ کی طرف کوچ کر گئے۔

ایک سال پہلے صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمان نخت محسوس کر رہے تھے۔ اپنی پار اور ہزیمت سے بری طرح متاثر تھے۔ اب وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ مکہ

جا کر کعبے کی زیارت کرنے کا جو منصوبہ تیار کیا گیا تھا وہ عقل و دانش اور فہم و بصیرت کا ایک شاہکار تھا۔

شاہد حدیبیہ کا واقعہ کچھ قبل از وقت ہو گیا تھا۔ اسی واسطے مسلمانوں نے فوجی لحاظ سے اپنے آپ کو کمزور پا کر اُس سے کسی طریقے سے نمٹ لیا۔ ان کے برخلاف مکہ کے سربراہوں کے پاس نہ تو اتحاد و اتفاق تھا اور نہ ہی کوئی منضبط اور مضبوط اقتدار اور نہ ہی کسی قسم کا عزم۔ ان کو مواقع تو بہت ملتے رہے لیکن ہر موقعہ کو اُن لوگوں نے اپنے انتشار اور پراگندگی کے نذر کر دیا۔

۶۲۹ء میں مسلمانوں کا عمرہ ادا کرنا ان کی آنے والی کامیابیوں اور کامیابیوں کی طرف لاشعوری طور پر پہلا قدم تھا۔

مکہ کے لوگوں کو یہ خیال سنانے لگا کہ حضور نے ایک نئے مذہب کی ابتدا کی ہے۔ اُس نئے مذہب کے ماننے والے اگر کعبہ کی زیارت کریں تو اس سے کعبہ کی تہین ہوگی۔ قریش کعبے کو اپنا سمجھتے تھے۔ کعبہ ان کی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ وہ اپنی آمدنی کو خطرے میں پڑتا دیکھ رہے تھے۔

جیسے ہی حضور خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تھے فوراً حجر اسود کو بوسہ دیا تھا۔ اس کے سات طواف کئے تھے۔ آپ کا یہ عمل مکہ کے لوگوں پر یہ واضح کرنے کے لیے تھا کہ آپ کے نزدیک کعبے کی مذہبی عظمت میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں ہوئی ہے۔ کعبے کی عظمت اور اس کا تقدس بہر حال اپنی جگہ قائم ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مکہ کو پھر سے رونق بخشنے کا خیال تو حضور کے ذہن میں اسی وقت اچکا تھا جب آپ نے یہودیوں سے تعلقاً منقطع کر کے یروشلم کی بجائے مکہ کو اپنا قبیلہ قرار دیا تھا۔ اس تبدیلی قبیلہ کا جو ازیہ دیا گیا تھا کہ کعبہ کی تعمیر ابراہیم نے کی تھی۔ کعبے کے حدود میں ایک چشمہ ہے جو زمزم کہلاتا ہے۔ اس چشمے کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ جبریل نے اسے وجود میں لایا تھا۔ ہاجرہ کے پیاسے

پچھے اسمعیل کی پیاس بجھانے کے لیے ریگستان کے عین بچوں بیچ یہ چشمہ نمودار کیا گیا تھا۔ کعبہ کی تعمیر کے وقت حضرت اسمعیلؑ نے اپنے والد محترم حضرت ابراہیمؑ کی مدد کی تھی۔

مکہ کے تعلق سے حضورؐ کے طرز عمل میں تبدیلی جہاں یہودیوں کے لیے اسلام نہ قبول کرنے کا باعث ہوئی وہیں مکہ کے لوگوں کے لیے تائیف قلوب کا باعث بنی۔ اسلامی تحریک کی اہمیت کو گھٹانے کی اور اسلامی انقلاب کو روکنے کی بار بار کوشش کی گئی۔ بدر، احد اور مدینہ کا محاصرہ اپنی کوششوں کے عملی مظاہر تھے۔ جب ایک دفعہ مدینہ میں صلح ہو گئی تو مسلمانوں اور کافروں کے درمیان تعلقات میں ایک اور باپ کا اضافہ ہوا۔ ۶۲۹ء میں حضورؐ نے جب عمرہ کرتے ہوئے کعبہ کی توجیر و تعظیم کی تو آپ کے اس عمل سے قریش کے لوگوں پر کافی گہرا اور اچھا اثر پڑا۔ آہستہ آہستہ مکہ کے لوگوں اور مسلمانوں کے تعلقات استوار ہونے لگے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں نے اپنے دل میں حضورؐ کو جگہ دی ہوئی تھی۔ دل و جان سے وہ آپ پر فدا تھے۔ مسلمانوں کی دولت اور اثر و سرخ میں دن رات اضافہ ہو رہا تھا۔ نہ صرف مدینہ اب مسلمانوں کے قبضے میں تھا بلکہ خیبر، اودی، القریٰ اور فدک بھی مسلمانوں کے قبضے میں آچکے تھے۔ ان سارے مقامات کی دولت مسلمانوں کے ہاتھ لگی تھی۔ جتنے گھڑسواروں کو قریش جمع کر سکتے تھے اتنی ہی تعداد پر مشتمل گھڑسوار اب آپ کے ساتھ تھے۔ اس وقت بھی تھے جبکہ حضورؐ عمرہ کی غرض سے مکہ تشریف لے گئے تھے۔ اگر حضورؐ کو ایک بااقتدار اور مطلق العنان بادشاہ بنا ہی تھا تو کیا قریش کے واسطے یہ بات بہتر نہ ہوتی کہ حضورؐ کو مکہ آنے کی دعوت دیتے اور غرض کرتے کہ آپ اپنا دارالسلطنت مکہ بنا لیں، اثر و اقتدار قریش میں تقسیم کر دیں اور رشتہ داروں کی مدد سے حکومت کریں۔

قریش نے جن مصالحتوں کے تحت بھی اعتدال پسندی کے عنصر کو اپنایا تھا ان کو صرف مالی اور سیاسی بنیادوں پر ہی نہیں دیکھا جاسکتا۔ ہو سکتا ہے کہ قریش کے

ذہن میں مالی اور سیاسی پہلو رہے ہوں لیکن عام لوگ ماویٰ قائدے کی اصطلاح میں بہت کم سوچا کرتے تھے۔ حضور جس مذہب کی تبلیغ فرما رہے تھے وہ مذہب عربوں کے توہماتی مذہبوں کے مقابلے میں بہت ہی ارفع و اعلیٰ تھا۔

عرب کسی کی سبادت کو بہ مشکل تسلیم کرتے تھے۔ جب کسی میں عظمت و بلندی کے جوہر دیکھتے تو دل و جان سے اس پر فدا ہونے لگتے اور اس میں وہ غلو اختیار کرتے کہ عزت کے ڈانڈے عبادت سے مل جا یا کرتے تھے۔ جب انہوں نے ذات قدسیٰ کو دیکھا جو عزت و عظمت کے ہر طریقے سے مستحی تھے تو کافی غور و فکر کرنے کے بعد یہی نتیجہ نکالا کہ ذات اقدس واقعہ عزت و احترام کی مستحی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طریقے سے لوگوں کے دلوں کو موہ لینے کا حضور کو ملکہ حاصل تھا۔ کس طریقے سے رائے عامہ تبدیل ہو رہی تھی اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اسی زمانے میں خالد ابن ولیدؓ، عمرو بن العاصؓ، عثمان ابن طلحہؓ مدینہ آ کر مسلمان ہوئے۔ قریش کو جنگ اُحد میں جو فتح حاصل ہوئی تھی اس فتح کا باعث خالد ابن ولید اور عمرو بن العاص تھے۔ خالد حضور کی نبی بیوی میمونہ کے رشتے کے بھائی بھی تھے۔ میمونہ نہ تو جوان تھیں اور نہ ہی حسین اس کے باوجود حضور کا میمونہ سے نکاح کرنا روٹھے ہوئے لوگوں کو منانے کا ایک سبب بن گیا۔ خالد ابن ولید اور عمرو بن العاص آگے چل کر مسلمانوں کے عظیم الشان فاتح بنے۔

عثمان ابن طلحہ میں وہ خوبیاں تو نہیں تھیں جو خالد اور عمر ابن العاص میں تھیں مگر ان کی اہمیت اس لیے تھی کہ ان کے پاس خانہ کعبہ کی کنجیاں رہا کرتی تھیں وہ کعبہ کے کلید بردار تھے۔ ان تینوں عظیم رہنماؤں کا اسلام قبول کر لینا مکہ والوں کو اسلام کے تعلق سے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔

ستمبر ۶۲۹ء میں جبکہ حضور کو عمرہ کئے ہوئے چھ ماہ گزر چکے تھے بیرونی دنیا سے

پہلی بار مسلمانوں کا آمنہ سامنا ہوا اور تھکڑے کی ابتدا ہوئی حضورؐ نے بنی غسان کے ایک شہزادے کے نام اپنا خطر روانہ کیا تھا۔ یہ شہزادہ شام میں بصرہ کا گورنر تھا۔ یہ واضح نہیں ہے کہ اس گورنر کو حضورؐ کا خط ملا بھی تھا یا نہیں۔ اگر جواب دیا بھی تھا تو اس جواب کا متن کیا تھا۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کا نمائندہ جب راستہ میں تھا تو اس کو مقامی قبائلیوں نے قتل کر دیا ہو یا بعض روایتوں کے مطابق بنی غسان کے لوگوں نے ہی اسے ختم کر دیا ہو۔

بنی غسان کی بادشاہت ختم ہو جاتے کے بعد اس خاندان کے مختلف شہزادوں کو مختلف مقامات پر گورنری اور سرداری کے فرائض سونپے گئے تھے۔ حضورؐ کے نمائندے کا قتل غالباً اسی مقام پر ہوا ہوگا جو جگہ اب اردن کے نام سے موسوم ہے۔

ایک سفیر یا پیغام رساں کا قتل جو صرف ایک خط لے ہوئے تھا ایک مکروہ اور قابل مذمت فعل سمجھا گیا۔ اسی کو اس جرم کا مزہ چکھانا ضروری سمجھا گیا تین ہزار آدمیوں پر مشتمل ایک فوج تیار کی۔ یہ یمن مکن ہے کہ حضورؐ نے ان قبائلیوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے یہ فوج تیار کی ہو اور روانہ کرنے کا ارادہ کیا ہو جنہوں نے حضورؐ کے نمائندے کو قتل کرنے کی جسارت کی تھی۔ فوج کی یہ تعداد قبائلیوں کے انتباہ کے لیے بالکل کافی تھی۔ حضورؐ کے منہ بولے بیٹے زید ابن عارثہؓ اس فوج کے کمانڈر بنائے گئے۔ جعفرؓ ابن ابی طالب کو زید کا نائب بنایا گیا۔ جعفرؓ کو ہدایت کی گئی کہ زیدؓ کے شہید ہونے کی صورت میں فوج کی قیادت اپنے ہاتھ میں لیں۔ ایک انصاری عبد اللہ ابن رواحہؓ کو جعفرؓ کا نائب بنایا گیا۔ یہ فوج مدینہ سے روانہ ہوئی۔ پہلے دن کے سفر میں حضرت خود بھی فوج کے ہمراہ رہے۔ پھر اس جماعت کو خدا حافظ کہا۔ بعض روایات کے مطابق اس موقع پر جذبات کی شدت کی وجہ سے سب کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ عرب میں یہ بات قطعی ناممکن ہے کہ تین ہزار آدمیوں پر مشتمل ایک فوج رواں

دواں ہو اور فوج کی نقل و حرکت کو راز میں رکھا جاسکے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عرب کی سادہ معاشرت میں نہ تو کوئی باقاعدہ فوج ہوتی تھی اور نہ ہی ان کی فوجی لحاظ سے تقسیم۔ ہر عرب اپنی حفاظت آپ کر لیا کرتا تھا۔ جب حضور نے اس حملے کا حکم دیا تو ظاہر ہے کہ یہ حکم ہر مسلمان تک پہنچا ہوگا۔ ہر آدمی جو جنگ پر جانے کے لیے تیار ہوا ہوگا اپنی سواری کا بندوبست آپ ہی کر لیا ہوگا۔ خورد و نوش کا انتظام بھی خود ہی کر لیا ہوگا۔ کوئی ایسی تنظیم نہیں تھی جو فوج کے لیے نقل و حمل کا انتظام کرتی۔ راشن وغیرہ مہیا کرتی۔ ہر آدمی کو پانی کے لیے اپنی مشک آپ اٹھانی پڑتی تھی۔ کھانے پینے اور لباس وغیرہ کے علاوہ اپنے ہتھیار کا بھی آپ ہی انتظام کر لینا پڑتا تھا۔

ان ساری تیاریوں کے لیے کم از کم دو تین ہفتے تو ضرور لگے ہوں گے۔ اس عرصے میں ساری امت جنگ کی تیاریوں میں مصروف رہی ہوگی۔ اسی دوران جنگ کے نعتیے مرتب کئے ہوں گے۔ مختلف قیاسات سے کام لیا ہوگا۔ مختلف افواہیں جنم لی ہوں گی۔ ان دو تین ہفتوں کا زمانہ ایسا گزرا ہوگا جس میں مختلف مسافروں، تجارت پیشہ لوگوں اور بدوی قبیلوں کے ذریعہ مسلمانوں کے اس حملے کی تیاریوں کا علم یقیناً شام کے بنی عسار اور ان کے حکمرانوں کو ہو گیا ہوگا۔

یہ ممکن ہے کہ بنی عسار کے لوگوں نے مقامی قبائلیوں کی مدد اور تعاون سے اس حملے کو روکنے کی سخت کوشش بھی کی ہو۔ یہ سارا اجتماع اور جگمگاہٹ ہمسا یہ شہر کرک یعنی موجودہ ماب میں ہوا۔

اس مہم کا نتیجہ مسلمانوں کی سخت ترین شکست کی صورت میں نمودار ہوا۔ ابن اسحق کے بیان کے مطابق اس جنگ میں دشمن کے دو لاکھ آدمیوں نے حصہ لیا۔ ایک لاکھ تریونانی سپاہی تھے اور بقیہ ایک لاکھ کی فوج منغالی باشندوں پر مشتمل تھی۔

دشمنوں کی فوج کی یہ تعداد بڑی مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے۔ ایسی جگہ جہاں پانی

کی قدامت ہو چند آدمیوں کا ایک جگہ جمع ہو جانا ایک مصیبت کا باعث ہو جاتا ہے چہ چائیکہ
 دو لاکھ آدمی وہاں جمع ہوں جہاں پانی کے علاوہ ضروریات زندگی کا بھی فقدان ہو۔
 ہو سکتا ہے کہ اس موقع پر صرف چار یا پانچ ہزار افراد نے مقامی قبائلیوں کی مدد سے
 مسلمانوں کا مقابلہ کیا ہو۔

جب مسلمان معان پہنچے تو ان کے علم میں یہ بات آئی کہ مخالف فوجیں ان کے
 استقبال کے لیے کرک میں ان کا انتظار کر رہی ہیں۔ مسلمانوں نے دو دن کے لیے
 اپنا سفر ملتوی کر دیا۔ آئندہ لایکھ عمل پر غور کرنے لگے۔ مسلمانوں کی اکثریت اس بات
 پر مائل تھی کہ معان کے مقام پر سفر کو قطعی طور پر روک دیا جائے۔ کسی نمائندے کو
 حضور کی خدمت میں روانہ کر کے ساری تفصیلات سے آگاہ کیا جائے۔ ان تفصیلات
 کی روشنی میں جو بھی حکم صادر ہو اس پر عمل کیا جائے۔ جواب آنے تک مزید کوئی قدم
 نہ اٹھایا جائے۔

یہاں سے مدینہ کا راستہ چھ سو میل کے لگ بھگ تھا۔ کسی بھی اونٹ سوار کا
 یہاں سے مدینہ جانا اور پھر واپس آنا۔ اس آمد و رفت کے لیے کم از کم ایک مہینے سے
 کچھ زیادہ کا عرصہ درکار تھا۔ مسلمان کئی ہفتوں تک معان کے قریب و جوار ہی میں رہے۔
 اگر وہ معان اور تیمہ کے درمیان رہنے والے قافلوں کو ہی اپنے اثر میں لے لیتے اور
 اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد ان سے لے لیتے تو دشمنوں کے حملے کو آسانی سے
 روک سکتے تھے۔ جس علاقہ میں مسلمان اس وقت تھے نیز نظمینی فوجوں کے بس
 کی بات نہیں تھی کہ وہاں کے ریگستانی حصوں میں داخل ہونے کی جرأت کر سکیں۔
 معان کے جنوبی حصے میں اگر یہ جنگ ہو جاتی تو مسلمانوں کو یقیناً فتح حاصل ہو سکتی
 تھی۔

ایک انصاری عبد اللہ ابن رواحہ وہ واحد آدمی تھے جنہوں نے رائے عامہ سے

انحران کیا اور آگے بڑھنے کی عالی بھری۔ یہ بہت ہی جلد باز اور جذباتی قسم کے آدمی تھے۔ حضور کے فدائیوں میں سے ایک تھے۔ انھوں نے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تم اب اس بات سے گھبرار رہے ہو جس کی تلاش میں یہاں تک آئے ہو۔ تمہارے جذبہ شہادت نے تمہیں اس مقام پر لایا ہے۔ ہم دشمنوں سے مقابلہ اپنی طاقت یا اپنی تعداد کے بل بوتے پر نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارے سامنے صرف دو ہی باتیں ہیں۔ فتح عظیم یا شہادت کبریٰ۔ یہ دونوں عمل عظمت و تقدس میں ہم پلہ ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر سے جذبات کو بھڑکا دیا کہ تمام مسلمان دشمن سے مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے دشمنوں سے مسلمانوں کا پہلا سابقہ ماب کی مشرقی پہاڑیوں کے ڈھلوان پر ہوا۔ دشمن کے اچانک حملے کی وجہ سے مسلمان چند میل پیچھے ہٹ گئے۔ موتہ میں پڑاؤ ڈالا۔ ماب کا علاقہ پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ زمین ناہموار تھی۔ آدمیوں کے چلنے پھرنے میں تکلیف ہو رہی تھی اس لئے مسلمان موتہ میں منتقل ہو گئے۔ یہ ایک گھلا میدان تھا۔ اس گھلے میدان میں مسلمانوں کی اتنی بڑی فوج کو گھومنے پھرنے کے لئے کافی آسانی تھی۔

اس زمانے میں عربوں کی لڑائیوں میں طریقہ تھا کہ بہادرانہ طریقے سے دوسری انفرادی طور پر ایک دوسرے کو مقابلے کی دعوت دیتے تھے اور دونوں اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے تھے۔

کمانڈر کا سب سے بڑا اور اہم فرض ہوتا تھا کہ جنگ میں سب سے نمایاں حصہ لے۔ خود لڑنے کے لئے آگے بڑھے یا کسی اور کو آگے بڑھنے کا حکم دے۔ جنگ کا علم تھامے رکھے۔ اپنے آپ کو ساری فوج کے لئے ایک مثال بنائے۔ فکر و نظر اور علم و عمل کے ایسے جوہر دکھائے جو ساری فوج کے لئے اتباع کا باعث ہو۔ ان ہی اصولوں کے پیش نظر زید ابن حارثہ حضور کے عطا کردہ علم کو اپنے ہاتھ میں

لئے ہوئے دشمنوں کی صفوں کے مقابل ہو گئے آخر دشمنوں کے نیزوں کا شکار ہو کر زمین پر گر پڑے۔ جعفر ابن ابی طالب نے زمین پر گرے ہوئے سفید علم کو فوراً اٹھایا۔ اُسے اُدنجا کرتے ہوئے کہا "جنت اے مسلمانو جنت" جعفرؓ بہت ہی بہادری اور جوش سے لڑتے رہے۔ دشمن ان کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ روایات میں ہے کہ جب جعفرؓ کے دونوں ہاتھ کٹ گئے تو آپ نے علم کو اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اُسے گرنے نہ دیا۔ آپ زخموں سے پوز چور ہوئے گئے تھے کہ ایک سیر نطنزی نے آخر کار آپ کو شہید کر ڈالا۔ اب عبد اللہ ابن ردا اور انصاری کی باری آئی۔ ایک روایت کے مطابق ایک لمحے کے لیے عبد اللہ آگے بڑھنے سے ہچکچائے۔ ابن اسحق نے ان کے چند اشعار نقل کئے ہیں۔

کہتے تھے "اے میری روح اس مقابلہ کا سامنا کر۔ جنگ کر اور عزت کی جگہ حاصل کر" انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں میں ایک انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اپنے گھوڑے سے نیچے اترے۔ اُن کے ایک عزیز نے ان کو کھانے کے لئے کچھ دیا اور کہا کہ اپنی توانائی برقرار رکھنے کے لیے آپ کچھ کھالیں۔ انہوں نے تموڑا سا کھایا اور بقیہ بھینک ڈالا۔ اپنے آپ سے سوال کیا "عبد اللہ کیا ابھی تم زندہ ہو" یہ کہہ کر دشمنوں کی صفوں میں گھس گئے۔ زخموں سے ندمال ہو کر گر پڑے۔

اب مسلمانوں میں افراتفری مچ گئی۔ پیچھے ہٹنے لگے۔ نئے نئے مسلمان ہونے والے خالد ابن ولید دشمنوں سے بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ایمانی اعتبار سے خالد زید ابن عارضہ یا جعفر ابن ابی طالب سے کم ہوں لیکن جنگی اعتبار سے ان کا تجزیہ سب سے بڑھا ہوا عقدا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ میدان مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے انہوں نے بقیہ مسلمانوں کو میدان چھوڑ دینے کے لئے کہا۔

موتہ کی جنگ کا یہ حشر ہوا۔ دلچسپ بات جو ابن اسحق نے بیان کی ہے وہ یہ

کہ ساری جنگ میں صرف آٹھ مسلمان شہید ہوئے۔ بعض مورخین کے بیان کے مطابق زیادہ سے زیادہ چودہ مسلمانوں کی شہادت ہوں۔ تین ہزار آدمیوں میں سے کم سے کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ چودہ مسلمانوں کی شہادت قابلِ تعجب ہے۔

کیا سارے کے سارے مسلمان بیزنطینی فوجوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے؟ کیا مورخین نے واقعات کے بیان میں ملمع سازی اس لئے کی کہ مسلمانوں کی شکست پر پردہ ڈالا جائے اور صرف تین بہادروں کی شہادت کو عوام میں داستانوں کی صورت میں پیش کیا جائے۔

یہاں یہ نکتہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ اس لیے کہ چند سال بعد مسلمانوں نے ایک بار نہیں دو بار نہیں بلکہ کئی بار اور بار بار بیزنطینی فوجوں کو شکست پر شکست دی۔ وہی بیزنطینی فوجیں جن کا فوجی نظم و نسق اپنی مثال آپ ہوا کرتا تھا۔

مسلمانوں کو موتہ میں جو ہزیمت اور ذلت اٹھانی پڑی اس کا ثبوت اس واقعے سے بھی ملتا ہے کہ جب مسلمانوں کی یہ شکست خوردہ فوج مدینہ واپس ہوئی تو مدینہ کے لوگوں نے ان پر دھول جھونکی شروع کی۔ ان پر مٹی پھینکی گئی۔ ان کو بھگڑوں سے خطاب کیا گیا لوگ کہہ رہے تھے "خدا کی راہ سے تم لوٹ آئے۔ بھگڑے کہیں کے" اگر موتہ واقعی بہادری اور شجاعت کی داستانوں سے رنگین ہوتا تو مدینہ واپس آنے پر ان کا استقبال دھول اور طحیوں سے نہ ہوا ہوتا۔

حضور نے اپنی فوجوں کی لاج رکھنے کے لئے مسلمانوں سے کہا کہ "نہیں یہ مفور نہیں ہیں۔ اللہ چاہے تو یہ کرا شہادت ہوں گے"

حضور کے ان کرمیانه الفاظ نے مسلمانوں کے دلوں کو فتح کر لیا۔

حضور جعفر ابن ابی طالبؓ کے مکان تشریف لے گئے۔ جعفر کے بچوں کو اپنی گود میں

اٹھالیا۔ پر نرم آنکھوں سے انھیں چوما۔ پھر آپ اپنے منہ بولے بیٹے زیدؓ کے مکان گئے۔

زید کی بیٹی روتی ہوئی آکر حضور سے پٹ گئی۔ حضور خود بھی رونے لگے۔

پُر سہ دینے کے دوسرے دن اعلان فرمایا کہ آپ نے موت کے شہیدوں کو جنت کے باغات میں لطف اندوز ہوتے دیکھا ہے۔ آپ نے خاص طور پر جعفر ابن ابی طالبؓ کا ذکر کیا۔ فرمایا کہ وہ حضور کی خدمت میں ایک فرشتہ کا روپ دھارے مانع ہوئے تھے۔ جعفر کے دونوں بازو جو پُروں کی صورت میں تھے شہادت کے خون میں رنگے ہوئے تھے۔ اس کے بعد سے مسلمانوں نے جعفر کو جعفرؓ کہا۔ تاکہ یاد کرنا شروع کیا۔ حضور یہ فرماتے تھے کہ آپ ابراہیمی مذہب کی احیاء کے لئے اس دنیا میں تشریف لائے ہیں۔ مذہب ابراہیمی کو اس کے اصلی رنگ و روپ میں پیش کر رہے ہیں۔ آپ نے یہودیوں سے توقعات وابستہ کر رکھی تھیں کہ وہ آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔ اسی لئے آپ نے یہودیوں ہی کے قبلہ کو اپنا قبلہ قرار دیا تھا۔ آپ نے توریت کے کئی نقص سے استفادہ کیا۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ کو اپنایا۔ یہ تینوں عبادات یہودیت میں تھیں۔ آپ پر جو الہامات اور وحی نازل ہوا کرتی تھی اس کا طرز و ہی ہو کر تھا جو توریت کے ابواب کا تھا۔ آپ نے غذا کے معاملے میں جو اصول وضع کئے تھے وہ کم و بیش وہی تھے جو یہودیوں کے تھے۔ مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد حضور نے اپنے قواعد و ضوابط میں تبدیلیاں کیں۔ قبیلے کو تبدیل کر دیا۔ ہفتہ کی بجائے جمعہ کو مسلمانوں کا اہم دن قرار دیا۔ مسلمانوں اور یہودیوں میں جو خلیج پیدا ہوئی تھی وہ دین یا مذہب کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی۔ یہودیوں نے حضورؐ کو سجا ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے سوا بقیہ اکثر باتوں میں دونوں مذاہب میں مماثلت تھی۔

خلیج پیدا ہونے کی بڑی وجہ مدینہ کے یہودیوں کا حضورؐ سے تمسخر اور اسلام اور صاحب اسلام کا مذاق اور ان کی تعلیمات کو لغویات کا نام دینا۔ اور اس

سے بڑی وجہ ہو بھی کیا ہو سکتی تھی۔

حضور نے مدینہ کے یہودیوں کا پوری طریقے سے خاتمہ کر دیا۔ ان یہودیوں کی وجہ سے تبلیغ خطرے میں گھری ہوئی تھی۔

جب حجاز پر اقتدار اور نصرت حاصل ہو گیا تو پھر آپ نے کبھی بھی یہودیوں سے باز پرس نہیں کی۔ وہ بڑے آرام و اطمینان سے وہاں رہنے لگے۔ اس وقت تک حجاز میں بلا کھٹکے رہے جب تک کہ حضرت عمرؓ نے حضور کے انتقال کے بعد انھیں وہاں سے باہر نہیں نکالا دیا۔

یہاں یہ بات دلچسپ ترین ہے کہ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ یہودی اسلام کی بقا کے لئے کوئی خطرہ نہیں رہے تو ان میں اور یہودیوں میں نصرا نیت کے خیال گٹھ جوڑ پھر سے ہو گیا۔ یہ ارتباط اس وقت تک رہا جب تک کہ بیسویں صدی میں یہودیت اپنے عروج پر نہ آگئی۔

ان دونوں مذاہب کے درمیان اتنے لمبے عرصے تک جو دوستی چلی آئی وہ سیاسی اسباب کا نتیجہ تھی یا ان دونوں مذاہب کے درمیان مشترکہ عقائد کا نتیجہ تھی اس کے تعلق سے صرف قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے۔

ابتدائی زمانے میں اسلام اور مسیحیت کے درمیان جو نارشتہ رہا وہ اس رشتے کے بالکل برعکس تھا جو اسلام اور یہودیت کے درمیان تھا۔ حجاز میں کوئی ایسی قابل ذکر عیسائی آبادی نہیں تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوتی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ شام سفر کے دوران حضور عیسائی پادریوں سے مل چکے تھے۔ ان ملاقاتوں کا خوشگوار اثر پڑا تھا۔ آخر زمانے میں مدینہ میں جو وحی نازل ہوئی تھی اس میں فرمایا گیا ہے "یقیناً مسلمانوں کے بدترین دشمن بت پرست اور یہود ہیں۔ جو لوگ ایمان والوں کے سب سے زیادہ قریب ہیں وہ وہی ہیں جو کہا

کرتے ہیں ہم عیسائی ہیں۔ اس لیے کہ ان میں اہل علم و بصیرت بھی ہیں۔ وہ منکر اور مغرور نہیں ہیں“

حضور کی زندگی میں اسلام اور عیسائیت کے درمیان کبھی بھی کوئی رقابت پیدا نہیں ہوئی۔ موزہ کا واقعہ اس کے مستثنیٰ ہے۔ حضور نے عیسائیت پر جو اعتراض کئے ہیں ان کی بنیاد عقائد پر تھی نہ کہ سیاست پر عقائد پر جو اعتراضات تھے وہ غلط نہیں کی بناء پر تھے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں شام جو عیسائیت کا گوارہ تھا رقابتوں اور سازشوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ من گھڑت قصے اور کہانیوں کی ابتدا اسی مقام سے ہوئی تھی۔ فرقہ بندیوں کا یہ گڑھ تھا۔ فتنہ طرازیوں کا ادہ تھا۔

یازنطینیوں کا سرکاری اور درباری مذہب یونانی چرچ تھا۔ یہ لوگ بال کی کھاں نکالنے میں استاد تھے۔ لا حاصل بحث و مباحثے میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتے تھے۔ ان کی ان خرافات کی وجہ سے ان کے علما و مشائخ کے ذہنی تعیش کا تو سامان ہو جاتا تھا۔ لیکن عام لوگوں میں سخت پھوٹ پڑ جاتی تھی نئے نئے فرقے پیدا ہو جاتے تھے۔ نئی نئی بدعتیں جنم لیتی تھیں۔ شہروں کی آبادی یونانیوں پر مشتمل تھی۔ سمندر کے ساحلوں پر بھی ان ہی کی اکثریت تھی۔

ثقافت، تہذیب اور نسلی اعتبار سے یونانی اس موقف میں تھے کہ دوسروں پر اپنا اثر ڈال سکیں۔

دیہی آبادی سادہ لوحوں پر مشتمل تھی۔ مذہبی عقائد کے لحاظ سے یہ لوگ صرف بنیادی اصولوں پر یقین رکھتے تھے۔ مذہب کی موٹی موٹی باتیں ان کے ذہن میں رہتی تھیں۔ مذہب کے معاملے میں یونانیوں کی حد سے زیادہ باریکیاں اور

باز نبطینی عقائد ان سادہ لوحوں کی سمجھ سے باہر تھے۔ اسی لئے یونانی لوگوں کی مذہبی باتوں پر دیہاتی لوگ توجہ دیتے ہی نہیں تھے۔ اور نہ ان کی باتوں کو اہمیت دیتے تھے۔ اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ ان کے لئے کوئی خاص پہاڑی وعظ کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔

شام کے دیہات اور قبیلوں کی آبادی کی عیسائیت میں رنگین کہانیاں من گھڑت قصے، توہمات، جادوگری، سب کچھ خلط ملط ہو گئے تھے۔

قرآن میں کئی جگہ جہاں عیسائیوں کی توہم پرستی کا ذکر آیا ہے وہ شاید شام کے عیسائی بدعینیوں کی طرف اشارہ ہے۔ ان عیسائی بدعینیوں کی دماغی ساخت اور ان کا ذہنی پس منظر وہی تھا جو اس وقت کے عرب بت پرستوں کا تھا۔ یونانیوں کی علمیت کا ان پر سایہ تک نہیں پڑا تھا۔ شام اور مصر کے بدعینی عیسائیوں نے بہت سی مذہبی کتابوں کی اختراع کی۔ بہت سے افسانوں اور داستانوں کو وضع کیا۔ ان تمام قصوں اور کہانیوں کی بنیاد توہمات اور جادوگری پر رکھی۔ قرآن میں کئی جگہ ان وضع کردہ مذہبی کتابوں کے قصص کی طرف اشارہ ہے۔ شاید حضور کی معلومات کا ذریعہ عیسائیت کے تعلق سے یہی موعوع کتابیں رہی ہوں اس سلسلے میں جو سب سے واضح مثال ہے وہ یہ بیان کہ یرد شلم کے ایک گرجا گھر یا عبادت خانہ میں مریم بڑی ہوئیں اور فرشتے ان کی خورد و نوش کا انتظام کرتے رہے اور ان کو اپنے ہاتھوں سے کھلاتے رہے۔ یہ روایت ایک انتہائی مشکوک، غیر معتبر اور غیر مذہبی نام نہاد الہامی کتاب میں پائی جاتی ہے۔ ان اناجیل میں بھی یہ موجود ہے جو مصر میں تیار کی گئی تھیں۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے عہد طفولیت میں گہوارہ میں بات کی۔

جھوٹے میں پڑے ہوئے عیسیٰ کا بات کرنا ایک نام نہاد غیر معتبر انجیل میں پایا جاتا

ہے۔ ایک اور مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ وہ یہ کہ عیسیٰ نے مٹی کی چڑیاں اور پرند بنائے۔

ان میں سانس پھونکی۔ چڑیوں میں روح آگئی۔ وہ اصلی چڑیوں میں تبدیل ہو کر وہاں سے اڑ گئیں

یہ واقعہ بھی ایک من گھڑت بیسائی مذہبی کتاب میں پایا جاتا ہے۔ ان سارے اختراعی کتابوں کو بتلاؤ لوگ انجیل سے موسوم کرتے تھے۔

قرآن نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ عیسیٰ کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی بلکہ آپ کی جگہ آپ سے مشابہ کوئی اور شخص صلیب پر چڑھا جایا۔ یہ بات عیسائیوں کی بہت سی پرانی گمراہی بدعت اور سلاطنت کا نتیجہ تھی اور اس بات کو خود گمراہ عیسائیوں نے اختراع کیا تھا۔

۶۱۲۰ میں ایک پادری جس کا نام تھا اس بات کی تائید کرنے

لگا کہ جس آدمی کو صلیب پر چڑھا جایا وہ عیسیٰ نہیں تھے بلکہ

تھا۔ بعد میں پل کر عیسائیوں میں ایک ایسا فرقہ نکل آیا جس کا عقیدہ وہی تھا جو یسے سل لائیڈز کا تھا۔ عیسائیوں میں ایک فرقہ ایسا بھی ہے جو عیسیٰ کے منسوب ہونے سے انکار کرتا ہے۔

ان ساری غلط فہمیوں میں جو بات شد و مد سے بحث و مباحثے کا مرکز بنی وہ تثلیث کا مسئلہ تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے عیسائیوں کی تثلیث سے مراد مریم، عیسیٰ اور خدا کو لیا ہے۔ ایک

بارہم پھر یہ دیکھتے ہیں کہ عیسائیوں میں ایک فرقہ ایسا بھی رہا ہے جو مریم کی عظمت اور تقدس

میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ مریم کی عبادت کرنا شروع کر دینا ہے۔ باہر والوں کو اس

تقدس اور تقدیس کے پردے میں شاید کچھ کا کچھ نظر آئے۔

اسی طریقے سے ہم دیکھتے ہیں کہ حضور نے خدا کے بیٹے کی ترکیب پر اعتراض فرمایا ہے۔

آپ نے پوچھا ہے کہ خدا کس طریقے سے بچہ جن سکتا ہے؟

خدا اور بیٹے کی ترکیب یا ان الفاظ کا استعمال معنوی اعتبار سے نہیں بلکہ فنی اعتبار سے

ہے۔ یہ اظہار کا مخصوص طریقہ ہے۔ یہاں اس امر کو ثابت کرنا تھا کہ عیسیٰ ایک پاکیزہ روح

کے حامل تھے۔ سرِ پاپا عظمت و تقدس ان کی روح بن گئی تھی۔

قرآن کے سورہ نساء کی ۱۱۱ ویں آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

”اے اہل کتاب اپنے دین کی بات میں حد سے نہ بڑھو۔ خدا کے بارے میں حق

کے سوا کچھ نہ کہو۔ مسیح یعنی مریم کے بیٹے عیسیٰ نہ خدا تھے نہ خدا کے بیٹے بلکہ خدا کے رسول اور اس کا کامل بشارت تھے جو اس نے مریم کی طرف بھیجا تھا اور اس کی طرف سے ایک روح خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ یہ نہ کہو کہ خدائیں ہیں۔ اس اعتقاد سے باز آؤ کہ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ خدا ہی موجود واحد ہے۔ اس سے پاک ہے کہ اس کے اولاد ہو۔

پھر اس کے بعد کی آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

”مسیح اس بات سے غار نہیں رکھتے کہ خدا کے بندے ہوں“

حضور عیسیٰ کو بن باپ کے مانتے ہیں اور مریم کو دو شیرہ تصور کرتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ اس وقت کے عیسائی فرقہ بندیوں، وقتی اصطلاحوں، رنگین داستانوں اور جعلی انجیلوں کی اختراعات سے حضور عیسا ئیت کو اس کے اپنے اصلی رنگ و روپ میں نہیں دیکھ سکے۔ چونکہ حضور کو شام ہی میں عیسا ئیت سے سابقہ پڑا تھا اس لیے ساتویں صدی عیسوی میں عیسا ئیت کا وہاں جو حشر ہو رہا تھا صرف وہی حضور کے پیش نظر تھا۔

جیسا کہ ہمیشہ سے ہونا آیا ہے ہر شور و غوغا میں ایسے لوگ بھی نکل آتے ہیں جو اپنے عقائد اور اصولوں کی صحیح طریقے سے پیروی کرتے رہتے ہیں۔ شارع کی شریعت پر خاموشی سے پابند رہتے ہیں۔ متنازعہ فہم مسائل میں حصہ لئے بغیر فتنہ گری اور فرقہ پرستی سے بچے رہتے ہیں۔ شاید یہی وہ لوگ ہوں اور اسی قسم کے وہ مسیحی علماء و راہب ہوں جن سے ملنے کے بعد حضور نے عیسا ئیت کے تعلق سے اچھا اثر لیا ہو۔ اسی اچھے تاثر کا شاید یہ اثر ہو کہ آپ نے ان کو اچھے الفاظ سے یاد کیا اور ان کی تعریف کی۔ آپ نے یہاں تک کہ دیا کہ محبت و ہمدردی میں عیسائی مسلمانوں سے زیادہ قریب ہیں اس لئے کہ وہ متکبر، مغرور اور خود پسند نہیں ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ پہلے پہل جس وقت مکہ سے مسلمان ہمیشہ کو ہجرت کر رہے تھے ہمیشہ کا بادشاہ عیسائی تھا۔ اس کی حکومت عیسائی تھی۔ حضور نے

ہجرت کرنے والوں کو نامن طور پر یہ فرمایا کہ حبشہ کی حکومت عیسائی حکومت ہے جو انصاف
 رساں اور عدل پسند ہے۔ جب حبشہ کے شہنشاہ کے دربار میں مسلمانوں کو طلب کیا گیا
 اور مسلمانوں نے اسلام کے خط و خال اس کے آگے پیش کئے تو اس نے اسلام کو بھی
 مسیحیت سے تعبیر کیا۔

کتنی افسوس ناک بات ہے کہ استیاء میں تو عیسائی اور مسلمان ایک دوسرے
 کے اتنے قریب رہے لیکن گزشتہ کئی صدیوں سے ایک دوسرے کے رقیب بنے
 ہوئے ہیں۔

یادگار تاریخیں

| | |
|-------------------|-----------------|
| ۶۴۲۲ | مدینہ کو ہجرت |
| ۶۴۲۴ | جنگ بدر |
| ۶۴۲۵ مارچ ۱۲ | جنگ احد |
| ۶۴۲۶ مارچ ۱ اپریل | مدینہ کا محاصرہ |
| ۶۴۲۸ مارچ | صلح حدیبیہ |
| ۶۴۲۸ ستمبر | فتح خیبر |
| ۶۴۲۹ جنوری | عمرہ کی ادائیگی |
| ۶۴۲۹ ستمبر | جنگ موتہ |

مکہ پر قبضہ

بہت سے مورخین کا اس روایت سے اتفاق ہے کہ حدیبیہ سے واپسی کے بعد مارچ ۶۲۸ء میں حضور نے اپنے نمائندوں کو مختلف بادشاہوں اور شہزادوں کے دربار میں روانہ کیا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ جن بادشاہوں کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی ان میں بیزنطینی شہنشاہ، ایران کا بادشاہ، مصر کا حکمران حبشہ کا شہنشاہ اور کئی دوسرے شہزادے جو عرب کے قریبی علاقوں پر حکمرانی کرتے تھے شامل تھے۔

اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ بیزنطینی سلطنت ۶۰۲ء سے ۶۲۸ء عیسوی تک ایرانیوں سے برسوں کا ریرا رہی۔ ۶۱۰ء میں ایرانیوں نے انطاکیہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۶۱۴ء میں یروشلم ان کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔ ۶۱۶ء میں مصر اور ترکی پر یہ قابض ہو چکے تھے۔ شام کا پورا ملک، فلسطین، مصر اور ترکی ۶۲۸ء تک ایرانیوں کے قبضے میں رہے۔ فروری ۶۲۸ء میں خسرو پرویز کا قتل ہوا۔ اس کے قتل کے بعد ایرانی شہنشاہیت کو زوال آیا۔

ابن سعد نے طبقات کبیر میں لکھا ہے کہ مئی ۶۲۸ء میں خیبر کی مہم سے پہلے اور حدیبیہ کی صلح کے فوری بعد حضور نے اپنے نمائندوں کو مختلف بادشاہوں کے

دباروں میں روانہ کیا تھا۔ اگر یہ صحیح ہے تو خسرو پرویز کے قتل کے فوری تین ماہ بعد ہی ان وفد کی روانگی عمل میں آئی تھی۔ اس وقت ساری ایرانی سلطنت میں ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ایک روایت کے مطابق باز نطنزی شہنشاہ کو حضور کا خط بردشلم میں ملا۔ باز نطنزی شہنشاہ ہرقل بردشلم میں تھا۔ وہ صلیب کو اپنی صحیح جگہ نصب کرنے کے لیے مارچ ۶۳۰ء میں وہاں گیا تھا۔ ہرقل کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ اس نے ابوسفیان کو جو اس وقت شام میں تھا اپنے دربار میں طلب کیا تاکہ اسلام کے تعلق سے معلومات حاصل کرے اور ساتھ ہی ذات اقدس کے تعلق سے واقفیت حاصل کرے۔ اس روایت میں صداقت کا شائبہ ہے اس لیے کہ ۶۳۰ء میں ابوسفیان مکہ میں تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضور ایک طریقے سے اپنی سرگرمیوں کے حدود کو آہستہ آہستہ وسیع کرتے جا رہے تھے آپ نے ابتداءً تو مدینہ کی مخالفتوں کو دبانے سے کی۔ پھر مقامی قبیلوں جیسے جہینہ اور خزاعہ سے دوستانہ تعلقات قائم کیے۔ پھر تیمہ ابلہ اور دومہ سے دوستی کی۔ مدبرانہ چابکدستی کو استعمال کرتے ہوئے فوجی طاقت اور قوت کا بھی مظاہرہ کیا۔ آپ نے ہتھیار سے زیادہ ماہیت قلب کے لیے حسن گفتار اور حسن کردار کے حسین حربے استعمال کیے اور انہی کو پسند بھی فرمایا۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ۶۵۸ء میں بنی عثمان اپنی بادشاہت کھو بیٹھے۔ یہ خاندان نیز نطنزی سلطنت کے تخت و تاج کا مالک ہوا کرتا تھا۔ بادشاہت کھو دینے کے بعد ان کے قبیلوں کے سرداروں کو مشرقی اور جنوبی شام کے مختلف علاقوں پر بہ حیثیت گورنر حکومت کرنے کے مواقع ملے۔ یہ عین ممکن ہے کہ دومہ قبیلے کو اپنی طرف کرنے کے بعد حضور نے ان ہی کی وساطت سے شام کے بنی

غسان کے گورنروں کو اسلام کی دعوت دی ہو۔

نشر و نشر میں حضور نے عسائی حکمرانوں کو اپنی طرف کرنے کے لیے صرف سیاسی اتحاد ہی پر زور دیا تھا۔ ان کو اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے بنی غسان کے ایک سے زیادہ گورنروں کے نام اپنے دعوت نامے روانہ فرمائے تھے۔ ان ہی گورنروں میں سے کسی ایک گورنر کے پاس گئے ہرے قاصد کا قتل موزنہ کی جنگ کا باعث ہوا۔

اس بات کا قوی امکان ہے کہ حضور نے حبشہ کے بنی نضیر سے کسی بارخط و کتابت کی۔ مدینہ کے فروری بعد آپ نے بنی نضیر کو خط لکھا تھا کہ حبشہ میں رہنے والے مسلمانوں کو مدینہ واپس کر دیا جائے اور ان ہی کے ساتھ ام حبیبہ کو بھی روانہ کیا جائے جن سے حضور نکاح کے خواہاں تھے۔

ابن سعد نے طبقات کبیر میں جس خط و کتابت کا ذکر کیا ہے شاید وہ اسی خط کی طرف اشارہ ہو۔ یہ بات بعد از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ حضور نے بنی نضیر کو اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور کیا ہو۔ اس بادشاہ سے اس قسم کا منطابقہ جو مسلمانوں کے ساتھ انتہائی دوستانہ سلوک کر چکا تھا اور جو اسلام کو غیساہیت کی ایک شاخ سمجھ بیٹھا تھا، خلاف توقع معلوم ہوتی ہے۔

شاہ ایران کے پاس بھی قاصد روانہ کیے جانے کی روایت مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ یہ ہم کو معلوم ہے کہ حضور نے عین کے ایرانی گورنر کے نام خط روانہ کیا تھا اور زحر بن کے ایرانی گورنر کے پاس بھی خط بھیجا تھا۔ ان گورنروں کے نام جو خطوط روانہ کیے گئے تھے ان خطوط کو یار لوگوں نے غلطی سے شاہ ایران کے نام منسوب کر دیا۔ مشکل سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں اس بات کا ذکر ہے کہ حضور نے مصر کے حاکم کے ہاں اپنا قاصد روانہ فرمایا تھا۔ اس حاکم نے اپنے جواب کے ساتھ سواری کے لیے ایک سفید نچر اور دو باندیوں کو حضور کی

خدمت میں تحفہ روانہ کیا ان ہی دو لونڈیوں میں سے ایک لونڈی مارثیہ کو حضور نے اپنے نکاح میں لے لیا۔ ان بی بی کے بطن سے ابراہیم پیدا ہوئے حضور نے دوسری لونڈی اپنے دربار کے شاعر حسان ابن ثابت رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دی حسان ایک بھونڈے آدمی تھے ان کی شاعری ہزل سے عبارت ہوا کرتی تھی۔ بی بی عائشہ پر تہمت باندھنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ حضور کے غصے اور غضب کا نشانہ بھی بن چکے تھے کچھ عرصے بعد حضور نے شاید انہیں معاف کر دیا ہو تحفہ کے طور پر مصری لونڈی انہیں عطا کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں لونڈیوں کی آمد جنوری یا فروری ۶۲۶ء میں ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ایرانی مصر پر قابض تھے۔ عرب اس مصری حاکم کو المقوقس کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ شاید یہ کسی یونانی لفظ کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ بہر حال اس واقعہ کا اقرار یا انکار دونوں آسان نہیں۔

صحابان علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ حضور نے کوئی پیشین گوئی ایسی کی تھی جس میں یہ کہا گیا ہو کہ عرب بہت سے ملکوں کو فتح کریں گے۔ اپنی شہنشاہیت کو وسیع کریں گے وغیرہ یا آپ کے ذہن کی دور بین میں یہ نظر آیا ہو کہ سارا عرب اسلام قبول کر چکا ہے اس سوال کا جواب قرآن میں تو کہیں نہیں ہے۔ اگر کہیں ہے بھی تو اس کے معنی اور مفہوم واضح نہیں ہیں۔

سورہ النحل کی ۸۴ ویں آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

”اور جس دن ہم ہر امت میں سے گواہ یعنی پیغمبر کھڑا کریں گے تو نہ تو کفار کو بولنے کی اجازت ملے گی اور نہ ان کے عذر قبول کیے جائیں گے۔“

حد بیبہ کے معاہدہ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ فریقین کو اس بات کا اختیار ہوگا کہ مقامی قبائل میں سے جس سے چاہیں دوستی کا معاہدہ کر لیں۔

ان میں سے ہر شخص کسی کا طرف دار ہونا چاہئے اس کی آزادی ہوگی۔ معاہدہ کی اس دفعہ پر بھی دس سال کی شرط لگائی۔ معاہدہ کی اس شرط کو سامنے رکھ کر قریش نے بنی کنانہ سے دوستی کا معاہدہ کیا اور حضور نے بنی خزاعہ سے کچھ اس طریقے کی بات ہوئی کہ موذنہ سے شکست خوردہ فوج مدینہ آنے سے قبل خزاعہ کے چند لوگ مکہ کے باہر الوطیر کے مقام پر اپنے ڈبرے ڈالے ہوئے تھے۔ بنی کنانہ کی ایک جماعت جو بنی بکر کے نام سے موسوم تھی مرنج پاکر بنی خزاعہ کے لوگوں پر حملہ آور ہوئی۔ کسی پرانی دشمنی کے بدلے میں ایک آدمی کو جان سے بھی مار ڈالا۔ یہ جھگڑا اور آگے بڑھا ابن اسحق کے بیان کے مطابق قریش کے چند لوگوں نے بنی کنانہ کی خنیبہ مدد کی۔ ابن اسحق کا یہ بیان بڑا ہی مشکوک ہے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حدیبیہ کے معاہدہ کو توڑنے کی پہلی قریش نے کی۔

خزاعہ کے سردار بدیل ابن ورقہ جو حدیبیہ کے موقع پر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے بنی کنانہ اور قریش کی اس ملی بھگت کو دیکھ کر فوراً حضور کے پاس گئے۔ حضور کی توجہ معاہدہ حدیبیہ کی اس دفعہ پر مبذول کرائی جس میں دس سال تک امن و امان کا ذکر تھا۔ نہ صرف قریش اور مسلمانوں کے درمیان بلکہ بنی کنانہ اور بنی خزاعہ کے درمیان بھی۔ بدیل نے قریش کو معاہدہ توڑنے کا ذمہ دار قرار دیا۔ معاہدہ حدیبیہ نے اور مسلمانوں کے عمرے نے مکہ کی رائے عامہ کو حضور کی مرضی کے مطابق کافی جوار کر دیا تھا۔ مکہ کے لوگ ذہنی طور پر آپ کی طرف کھینچ رہے تھے یہ عین ممکن ہے کہ حضور نے خود بھی دس سال تک انتظار کرنا لاماصل سمجھا۔ مکہ کی طرف دس سال کے بعد کوچ کرنا کونسی عقلی تھی جبکہ مکہ ایک پکے ہوئے پھل کی طرح آپ کی آنکوش میں مگر نے کے لیے بے چین تھا۔ حضور نے موقع سے ناٹھ اٹھانا مناسب سمجھا۔ بنی کنانہ نے جو صورت حال پیدا کر دی تھی اس سے استفادہ

کرتے ہوئے معاہدہ حدیبیہ کی تینخ کو ضروری سمجھا۔ اپنی شکایت کو حضور کے گوش گزار کر کے بدیل اپنے گھر مکہ واپس ہو رہے تھے۔

مصفان کے مقام پر بدیل کی ملاقات ابوسفیان سے ہوئی۔ بدیل نے ابوسفیان کے کان کھول دیے انہوں نے کہا کہ مسلمان اب ہر مخالفت کا سختی سے جواب دیں گے۔ ابوسفیان بڑا گھبرایا۔

دوڑا دوڑا مدینہ گیا تاکہ حضور سے معاہدہ کی بحالی کی درخواست کرے۔ ابوسفیان کا سر سببگی کی حالت میں مدینہ جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ مکہ والے اس واقعہ سے کتنے پریشان ہو گئے تھے۔

جنگ بدر سے مدینہ کے محاصرہ تک ہر جگہ ابوسفیان مسلمانوں کے خلاف کافروں کی رہنمائی اور سرکردگی کرتا رہا۔ اس کے باوجود اس کا نام مسلمانوں کے ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹا رہا۔ معاہدہ حدیبیہ کی گفت و شنید کے موقع پر کمرہ ابوسفیان کا ذکر کہیں نہیں آیا ہے عبدالسمش اور بنی مخزوم کے انتہا پسندوں نے صرف اول میں جگہ لینی شروع کر دی تھی۔

ابوسفیان کی بیٹی حضرت ام حبیبہ اب حضور کی بیوی تھیں رشتہ میں ابوسفیان حضور کا خسر ہوتا تھا۔

ابوسفیان نے اس نے خیال سے سمجھ واری کا تقاضہ یہی ہے کہ سب سے پہلے اپنی بیٹی ام حبیبہ سے ربط قائم کیا جائے اور ام حبیبہ کو اس بات پر راضی کیا جائے کہ وہ اپنے شوہر اور اپنے باپ کے درمیان مصالحت کی فضا سازگار کریں۔

ابوسفیان کو بی بی ام حبیبہ سے جو توقعات وابستہ تھیں ان پر پانی پھرتا نظر آیا۔ جیسے ہی ابوسفیان اپنی بیٹی ام حبیبہ کے کمرے میں داخل ہوا چاہتا تھا کہ وہاں پر بچھے ہوئے قالین پر بیٹھ جائے بی بی ام حبیبہ نے فوراً قالین کو اٹھا لیا اور لپیٹ کر اسے

ایک کونے میں رکھ دیا۔

باپ نے بیٹی سے کہا: میری بچی، میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تمہارا یہ قالین میرے شایان شان نہیں ہے یا میں تمہارے قالین کے شایان شان نہیں ہوں۔ بیٹی نے اپنے باپ کو ترشی سے جواب دیا: بابا، یہ وہ قالین ہے جس پر رسول اللہ تشریف فرما ہوتے ہیں۔ تم اس قالین پر نہیں بیٹھ سکتے اس لیے کہ تم بے دین ہو اور بے دین ناپاک برتا ہے۔

باپ نے اپنی بیٹی سے کہا کہ بیٹی مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔ خدا کی قسم میرا گھر چھوڑ دینے کے بعد تم میں اخلاق کی کمی ہو گئی ہے۔
یہ کہہ کر ابرسفیان اپنی بیٹی کے گھر سے نکل گیا۔

یہ واقعہ ہمارے ذہن پر عجیب و غریب اثر کرتا ہے کہا یہ جانتا ہے کہ حضورؐ نے مختلف خاندانوں کی لڑکیوں سے شادیاں معض اس لیے کیں کہ ان خاندان والوں سے حضورؐ کے تعلقات استوار ہوں۔ آپ نے خاص طور سے حبشہ کے شہنشاہ کو لکھا کہ ام حبیبیہؓ کو مدینہ بلا لیا۔ اگر آپ کا مقصد صرف ایک ثورت کا حصول ہی تھا تو ایک سے بڑھ کر ایک حسین و جمیل اور خوبصورت سے خوبصورت تر لڑکی عرب ہی میں آپ کو مل سکتی تھی سینکڑوں خوبصورت لڑکیاں وہیں موجود تھیں۔ ان ساری پری ہیکروں کو چھوڑ کر خاص طور سے ام حبیبیہؓ کو جو بیوہ بھی تھیں حبشہ سے بلا کر حضورؐ کا شادی کرنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حضورؐ شاید ام حبیبیہؓ کے توسط سے ابرسفیان سے اپنے تعلقات بہتر بنانا چاہتے تھے۔ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح ابرسفیان کے رویہ میں آہستہ آہستہ تبدیلی آ رہی تھی۔

حضورؐ بہت جلد ابرسفیان کو استعمال کرنے والے ہیں۔ کیا اس وقت حضورؐ نے یہ مناسب سمجھا کہ ابرسفیان کو پہلے دو ایک کچھ کے دیے جائیں تاکہ اس کے

ہوش ٹھکانے آئیں؟ کیا حضور کی ہدایت پر ام حبیبہ اپنے باپ کے ساتھ تلخ روی سے پیش آئیں؟

ام حبیبہ کے رویے کو دیکھ کر ابوسفیان نے فیصلہ کیا کہ حضور کی خدمت میں خود کیوں نہ پہنچ جائے، راستہ میں کھڑے ہو کر اس نے حضور کو سلام کیا۔ حضور نے ابوسفیان کو نظر انداز کر دیا۔ بغیر بات کیے آپ کے بڑھ گئے ابوسفیان نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی منّت سماعت کی کہ وہ اس کے اور حضور کے تعلقات کو بہتر بنا لیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صاف طور پر انکار کر دیا۔ عمر رضی اللہ عنہ ابن الخطاب سے بھی ابوسفیان نے یہی درخواست کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسے دھتکارا۔ اب ابوسفیان حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ المدد کے نعرے لگائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں اپنی بیوی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تھے، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا حضور کی صاحبزادی ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے کم سن صاحبزادہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرش پر رینگ رہے تھے۔

ابوسفیان نے بڑی ہی رقت کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ آپ اس کی سفارش حضور سے کریں۔ کسی بھی طریقہ سے صرف ایک بار حضور سے ملا دیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ حضور جب ایک بار کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر کوئی بھی سفارش اور کسی کی بھی سفارش کارگر نہیں ہوتی۔

ابوسفیان کو جب اپنی ہر کوشش میں ناکامی ہوئی تو قریش کا یہ مغرور سرغنہ اپنے اونٹ پر سوار ہو کر ملول دل کے ساتھ ہاتھ ملتے ہوئے مکہ کی طرف چل پڑا۔

تمام راویوں نے متفقہ طور پر اس واقعہ کا ہونا تسلیم کیا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ابوسفیان کا مدینہ آنا اس بات کے لیے ہو کہ حضور سے کسی قسم کا کوئی خفیہ معاہدہ کیا جائے۔ مکہ کے گلی کوچوں میں خون کی ہولی کھیلنے جانے کا اسے اندیشہ تھا اس لیے وہ دور نہا ہوا مکہ روانہ ہو گیا تاکہ اپنے بھائی بندوں سے کہہ دے کہ

مسلمانوں کی مزاحمت کرنا بے کار ہے خاموشی سے اپنا شہران کے حوالے کر دو۔
یہ قیاس اس لیے بھی جڑ پکڑتا ہے کہ ابوسفیان کے روانہ ہو جانے کے فوری
بعد حضورؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ مکہ پر چڑھائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ دس ہزار مسلمانوں نے
حضورؐ کی اس آواز پر لبیک کہا۔ دو سال پہلے حدیبیہ کے موقع پر فخر ایک ہزار چار سو مسلمان
حضورؐ کے ساتھ تھے اور اس موقع پر دس ہزار۔

اسلامی انقلاب کے حدود کی وسعت اور لوگوں کا بے اختیار حضورؐ کے پیغام کو
قبول کرنا اسلامی تاریخ کے پر بڑھنے والے گورجھا اور آفریں کہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔
یکم جنوری ۶۲۰ء کو مسلمان مدینہ سے روانہ ہوئے، رمضان کا مہینہ تھا۔
روزوں کا زمانہ تھا مسلم فوج کا ہر فرد روزہ رکھا ہوا تھا، صبح صادق سے غروب آفتاب
تک نہ کھانا نہ پانی۔ روزہ کی حالت میں مسلم فوج رواں دواں تھی۔

واقعہ تو یہ ہے کہ جو لوگ جہاد میں حصہ لیتے ہیں ان کے لیے رمضان کے
روزے معاف ہیں، رمضان کے روزوں کی تلافی بعد میں روزہ رکھ کر کی جاسکتی
ہے جب مسلمانوں کی جماعت مکہ سے ۵ میل دور پہنچ گئی تو حضورؐ نے اور تمام مسلمانوں نے
معافی روزہ کی اجازت سے استفادہ کیا۔ مدینہ سے مسلمانوں کے روانہ ہو جانے کے
بعد بنی سلیم کے سات سو لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ وہ قبیلہ تھا جو ابھی تک مسلمانوں
کے خلاف مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔

حضورؐ کے چچا عباسؓ مکہ میں بت پرستوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ مکہ کے
تعلق سے وقتاً فوقتاً حضورؐ کو مختلف قسم کی معلومات فراہم کرتے تھے۔ عباسؓ نے یہ
حماس کرتے ہوئے کہ مقابلے کی نوبت اب آئے گی نہیں اپنے افراد خاندان کو لے
کر حضورؐ کے استقبال کے لیے پہل کی اور مکہ سے باہر نکل گئے۔

مکہ کے شمال میں جحفہ کے مقام پر عباس نے مسلمانوں کو خوش آمدید کہا۔ یہ مقام

مکہ سے ستر میل کے فاصلے پر تھا۔

عباسؑ کے اپنے بیان کے مطابق وہ بڑے ہی پریشان تھے کہ اگر مسلمانوں نے قوت و طاقت کے بل بوتے پر مکہ کو اپنے قبضے میں لے لیا تو قریش کی کیا گت بنے گی۔ اسی ڈر سے انہوں نے اپنی جان کی سلامتی اسی میں سمجھی کہ آگے جا کر مسلمانوں کا استقبال کیا جائے استقبال کرنے کے بعد یہ مسلمانوں کے آگے آگے اسی امید میں چل رہے تھے کہ کوئی ایسا پیامی انہیں مل جائے جو مکہ جا کر قریش کو سمجھائے کہ مسلمانوں کی مزاحمت نہ کریں مسلمانوں سے امن کے خواستگار ہوں۔ جیسے ہی اندھیرا ہوا عباس کی مدد بھڑا بوسفیان سے ہو گئی۔ مسلم مورخین کے بیان کے مطابق عباس نے بوسفیان سے کہا کہ مسلمانوں کا ایک عظیم لشکر مکہ کی طرف اپنی پوری قوت و طاقت کے ساتھ آ رہا ہے۔ اگر تم حضورؐ کے ہاتھ آگے تو تمہارا سر زمین سے جدا کر دیا جائے گا۔ تمہارے لیے بہتری اسی میں ہے کہ چپکے سے میرے چہرہ پر میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں تم کو حضورؐ کی خدمت میں لے چلوں گا۔ تمہاری جان کی امان کی درخواست کروں گا۔

بوسفیان کے تعلق سے مورخین نے پھر وی معاندانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ بوسفیان نے پہلے ہی سے حضورؐ سے اگر کوئی معاہدہ کر لیا تھا تو یہ بھی تو ممکن ہے کہ خود بوسفیان ہی نے عباس کو حضورؐ کے استقبال کے لیے مکہ سے باہر روانہ کیا ہو۔ تاریخی واقعات اور حقائق کو مسخ کرنا، ان میں تو سب جڑ کرنا، ممکنات اور ناممکنات کی تشریح و تاویل کرنا بعید بھی تو نہیں ہو سکتا۔

حضورؐ کے انتقال کے ۲۹ سال بعد بوسفیان کی اولاد خلافت پر متمکن ہوئی۔ ۸۹ سال تک اس خاندان نے فرمانروئی کی۔ اتنے عرصہ تک حکومت کرنے کے بعد عباسیوں نے خلافت ان سے چھین لی۔ عباسیوں کے عہد ہی میں بہت ساری اسلامی تاریخیں لکھی گئیں۔ شاید یہی وجہ ہو کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں عظمت کو نمایاں

کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ ابوسفیان کو گرانے کے لیے اور لوگوں کی نظر میں اسے ذلیل کرنے کے لیے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ہر اچھی بات کو عباس سے منسوب کر دیا ہو۔ اگر ابوسفیان کی کوششوں سے مکہ حضور کے قریب آیا بھی ہو تو اس کو بھی عباس سے منسوب کر دیا گیا ہو۔

ان ہی معتبر روایات کے پیش نظر ہم کو یہ بتایا جاتا ہے کہ ابوسفیان خچر پر عباس کے پیچھے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ خچر سفید رنگ کا تھا اور حضور کی ملکیت تھا۔ عباس اور ابوسفیان دونوں مسلمانوں کے خیموں میں جاتے ہیں مسلمان ان کو دیکھ کر لڑنے کی دعوت دیتے ہیں جن لوگوں نے حضور کے خچر کو سچا لیا تھا اور عباس کو دیکھ چکے تھے یہ جانتے کی فکر میں نہیں تھے کہ ان کے پیچھے بیٹھا ہوا ہے۔

اپنے پرانے دشمن کے تنزل اور بھرت انگیز زوال کو دیکھتے ہوئے حضور نے عباس سے فرمایا، اب تو انہیں یہاں سے لے جاؤ۔ کل علی الصبح لے آنا۔ دوسرے دن ابوسفیان پھر سے حضور کی خدمت میں لائے گئے۔

حضور نے ابوسفیان سے فرمایا، کیا اب بھی تمہارے لیے وقت نہیں آیا کہ تم خدا کی واحدیت کا اقرار کر لو۔

بڑھے نے جواب دیا، اگر کوئی اور خدا ہوتا تو کیا وہ میری مدد کے لیے نہیں آتا؟ حضور نے ابوسفیان سے فرمایا، کیا اب بھی تم کو میری رسالت پر شبہ ہے؟

ابوسفیان نے جواب دیا، شک تو اس بارے میں مجھے اب بھی ہے۔

بعد میں چل کر عباس کہتے ہیں کہ اس موقع پر میں نے مداخلت کی اور ابوسفیان سے کہا کہ کلمہ پڑھ لو۔ نہیں تو تم مارے جاؤ گے۔

بعض روایات میں یہ جملے عباس سے نہیں بلکہ حضرت عمرؓ سے منسوب ہیں۔

بحث تو ایسی چھڑی مٹھی جس کا کوہِ عباس ہی نہیں تھا۔ چاہے عباس نے ڈانٹ پلائی ہو یا عمرؓ نے بہر حال ابوسفیان کو کلمہ پڑھتے ہی۔ اس کے سوا ابوسفیان کے ہاں

کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

واقعات کی ترتیب میں پھر ایک بار ایسی تنظیم پیدا کی جا رہی ہے جس کے پیش نظر عباس کی رفعت میں اور اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بنی اُمیہ کے ابوسفیان کو گھٹیا قرار دیا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ عباس ہی کی اولاد نے بنی اُمیہ سے خلافت چھین لی تھی ابوسفیان کے کلمہ پڑھ لینے کے بعد مکہ پر قبضہ کرنے کے طریقہ کار پر غور کیا گیا۔ یہ طے پایا کہ مسلمانوں کی فوج کے آگے ابوسفیان رہے، ہتھیار ڈالنے کے شرائط مکہ والوں کے سامنے پیش کرے۔ اگر مسلمانوں کی مزاحمت نہ کی جائے تو حضورؐ نے اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ جو شخص بھی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اس امان ملے گی۔

جو لوگ اپنے اپنے گھروں میں رہ کر اپنے گھروں کے دروازوں کو مقفل کر لیں ان کو بھی امان رہے گی۔

ان سب کو جو خانہ کعبہ میں جمع ہو جائیں امان رہے گی۔

ابوسفیان کی اجازت دی گئی کہ وہ مکہ واپس جائے اور عوام کے سامنے شرائط کا اعلان کرے۔ جب وہ مکہ واپس ہونے کے لیے کھڑا ہوا تو حضورؐ نے عباس سے اہستہ سے کہا کہ ابوسفیان کو باتوں باتوں میں اس پہاڑی کے اوپر لے جاؤ جہاں سے وہ مسلمانوں کی فوجوں کی تعداد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے تاکہ اس کی آنکھیں کھلیں۔ پہاڑی کے نیچے مسلمانوں کی فوجیں قطار در قطار گزرنے والی تھیں۔ جب ابوسفیان پہاڑی پر چلا گیا تو مسلم فوجیں اپنے علم کو لیے ہوئے ابوسفیان کے سامنے سے گزرنے لگیں۔ سامنے مختلف قبیلے تھے۔ پیچھے حضورؐ تھے۔ آپ کے چاروں طرف مہاجرین اور انصار تھے۔ حضورؐ کے قریب رہنے والے زرہ بکتر اور تیر و کمان سے مسلح تھے۔

اس منظر کو دیکھ کر ابوسفیان نے عباس سے کہا "خدا کی قسم تمہارا بھتیجہ تو اب صاحب

اقتدار بن گیا ہے۔ قوت و طاقت کا سرِ حشمہ ہے۔"

ابوسفیان مسلمانوں کی فوج کے آگے تما مکہ میں سب سے پہلے یہی داخل ہوا۔
لوگوں کو جمع کرتے ہوئے بلند آواز سے کہہ رہا تھا "اسے قریش نے محمدؐ تو بڑی ہی قوت اور طاقت
کے ساتھ یہاں آئے ہیں اب ان کا مقابلہ کرنا تمہارے بس کی بات نہیں :-
ابوسفیان کی بیوی بنت عتبہ ابن ربیعہ کی بیٹی تھی۔ اس نے احد میں حمزہؓ کا کھیرہ
چسایا تھا۔ ابوسفیان کے اس اعلان کو سن کر بھرے مجمع میں اس عورت نے چیختے چلاتے
اور غم سے کانپتے ہوئے کہنا شروع کر دیا کہ اس موٹے اور بڈھے فرقت کی باتوں
میں آپ لوگ نہ آئیں۔ آپ لوگوں کو بچانے کا اس نے خوب ڈھنگ اختیار
کیا ہے۔

ابوسفیان کو دنیا بھر کی تفکرات تر تھیں ہی۔ اس کی بیوی بھی اب اس کی،
زندگی کو اتیرن بنانے پر تلی ہوئی تھی۔

ابوسفیان نے لوگوں سے کہا "اس عورت کے مکر و فریب میں آپ لوگ نہ
آئیں۔ وہ قوت و طاقت یہاں تک آپہنچی ہے جس کی مزاحمت کا تصور بھی نہیں
کیا جاسکتا۔ جو بھی میرے گھر میں آجائے گا اسے امان ملے گی۔ جو اپنے گھروں کے
دروازوں کو بند کر لے گا اسے امان رہے گی۔ جو خانہ کعبہ میں چلا جائے گا۔ اس کو
بھی امان رہے گی" اب لوگ منتشر ہونے لگے۔ کچھ لوگ خانہ کعبہ میں چلے گئے۔ کچھ
اپنے گھروں میں چلے گئے۔

مکہ کے باہر ذوطویٰ پر جب حضورؐ پہنچے تو اپنے ادنیٰ کی لگام کو ایک طرف کر کے سجدے
میں گر پڑے اور خدائے لاشریک کا شکر ادا کرنے لگے کہ اس نے آپؐ کو مخالف پر فتح عطا
فرمائی۔ آپؐ نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ زبیر بن العوام کو بائیں بازو کی فوج
کی قیادت دی اس جماعت کو شمالی مشرقی رخ سے مکہ میں داخل ہونا تھا۔
سعد بن عبادہ کے تعویض ایک جماعت کی گئی جیسے ہی یہ اپنی سواری پر سوار ہوئے

رجز یہ اشعار پڑھنے لگے جس کا مطلب تھا کہ یہ دن جنگ کا دن ہے آج کوئی نرمی نہیں برتی جائے گی۔ حضرت عمرؓ نے جیسے ہی یہ اشعار سنے حضورؐ کی خدمت میں اس کی اطلاع کر دی حضورؐ نے فوراً قیادت سعدؓ سے لے کر حضرت علیؓ کے حوالے کر دی۔ حضورؐ مہاجرین اور انصار کو ساتھ لے کر مکہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چوتھی جماعت کی قیادت خالد بن ولیدؓ کے تفویض کی گئی۔ آپ کو جنوب مغرب کی طرف سے مکہ میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا اس جماعت کو چند انتہا پسندوں سے سامنا کرنا پڑا۔ ابو جہل کا بیٹا عکرمہ چند ساتھیوں کے ساتھ مزاحمت پر اتر آیا۔ اس مخالفت پر آسانی سے قابو پا لیا گیا۔ ۱۲ کے قریب لوگ اس مزاحمت میں کام آئے۔

حضورؐ نے سختی سے یہ حکم دے رکھا تھا کہ سوائے مدافعت کے کسی اور مقصد کے لیے طاقت کا استعمال نہ کیا جائے۔

ایک مختصر سی فہرست بھی تیار کی گئی تھی جس میں ان لوگوں کے نام تھے جو واجب القتل قرار دیے گئے تھے ان میں وہ دو آدمی بھی تھے جو مدینہ جا کر مسلمان ہو گئے تھے۔ اور بعد میں مکہ واپس ہو کر مرتد ہو گئے۔ واجب القتل لوگوں میں عبداللہ ابن ابی سرح کا بھی نام تھا مدینہ میں رہ کر وہ قریش کے بے جا سوسے کرتا تھا۔ حضورؐ کی وحی کو لکھ لیتا تھا جب مکہ واپس ہوا تو ان آیات کا مضحکہ اڑایا۔

حضورؐ یوں بھی اسلام سے منحرف اور برگشتہ ہونے والوں کے لیے سخت سے سخت سزا تجویز فرماتے تھے، مزدوروں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی جاتی تھی۔ اس مقررہ اصول کے باوجود رحمت عالم نے عبداللہ ابن ابی سرح کو معاف فرما دیا جب اس نے اپنے آپ کو حضورؐ کے حوالے کر دیا۔ اس فہرست میں دو پیشہ در لڑکیاں بھی تھیں جو طنزر اور مذاق کے ساتھ اسلام اور شارع اسلام کا ذکر لوگوں میں کرتی تھیں۔ حضورؐ کی طبیعت پر طنزر گرا ہوا مذاق اور چھپورا پن ہمیشہ گراں گزرتا تھا۔

ایک اور آدمی جس کو امان کی فہرست سے خارج کر دیا گیا تھا وہ تھا جو اسلام کے ابتدائی دنوں میں حضور کے ساتھ بے ہودگی و بدتمیزی سے پیش آتا تھا اس کا نام عارث تھا اس نے حضور کی صاحبزادی بی بی زینبؓ پر سختی کی تھی۔

سہیل ابن عمرؓ بھی امان پانے والوں میں نہ تھا۔ یہی وہ شخص تھا جو صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور کے نام کے ساتھ رسول اللہ کے الفاظ کو دیکھنا گوارا نہ کیا تھا۔

ابو جہل کے بیٹے عکرمہ کو ذرا قتل کر دینے کا حکم نافذ ہوا تھا۔ اسلام کی مخالفت میں یہ اپنے باپ کے نقش قدم پر تھا۔ ابو جہل جنگ بدر میں مارا گیا تھا۔ مکے کے شمال مغربی حصے میں حضور کا خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ یہاں سے آپ صاف طور پر اپنی فوجوں کی نقل و حرکت ملاحظہ کر سکتے تھے۔

سورج ابھی سوائیزرے پر بھی نہیں گیا تھا کہ پورے مکہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ خارشہ کی فضا میں حضور اونٹ پر سوار ہوئے۔ شہر میں تشریف لے گئے۔ خانہ کعبہ پر ماضی دی۔ اپنے اونٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی کعبہ کے سات طواف کیے۔ طواف کے دوران جب بھی آپ حجر اسود کے سامنے سے گزرتے تھے اپنی چھڑی سے حجر اسود کو چھوڑ کر لے لے کر دیتے تھے۔ حرم میں آپ نے نماز ظہر ادا فرمائی۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے۔ حضور نے حکم دیا۔ کہ ان سارے بتوں کو گرا کر اٹھیں۔ پاش پاش کر دیا جائے۔ آپ نے عثمان ابن طلحہ کو بلوایا۔ یہ بنی عبدالدار سے تعلق رکھتے تھے۔ خانہ کعبہ کی کنجی انہیں کے پاس رہا کرتی تھی۔ یہ خاندانی کلید بردار تھے۔ عثمان ابن طلحہ، خالد ابن ولید اور ابن العاص تینوں ایک ہی وقت مسلمان ہوئے تھے۔

عثمان ابن طلحہ کعبہ کی کنجی لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کعبے کا دروازہ کھولا۔ حضور چوکھنڈی میں داخل ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ کعبے کے اندر کنی دیواروں

پر مختلف تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ ان رنگ برنگ تصویروں میں حضرت عیسیٰ اور بی بی مریم کی بھی تصاویر تھیں۔ ایک قدیم روایت کے مطابق حضور نے حکم دیا کہ سوائے حضرت عیسیٰ اور بی بی مریم کی تصویروں کے باقی تمام تصاویر کو مٹا دیا جائے۔

حضورؐ باہر تشریف لائے، مجمع کو خطاب کیا۔ ابن اسحق کی روایت کے مطابق آپ نے فرمایا۔

”کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنے وعدوں کو پورا کیا۔ اپنے بندے کی مدد کی۔ ان لوگوں کو نیچا کیا جو مخالفت میں پیش پیش تھے۔ آپ نے خون اور نسل کی بنیاد پر تفوق اور امتیاز کو ختم فرمایا۔ کعبہ کی تولیت اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمات جن خاندانوں میں چلی آ رہی تھیں۔ ان ہی خاندانوں کو ان خدمات کے لیے بحال رکھا، اسے قریش۔ حضورؐ نے فرمایا۔ خدا نے بے دنیوں کے غرور اور تکبر کو خاک میں ملا دیا۔ آدمی آدم کی اولاد ہے۔ آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا تھا۔“

اس کے بعد آپ نے سورہ الحجرات کی ۱۳ ویں آیت کی تلاوت فرمائی۔

”اے لوگوں! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ تمہاری قوم اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک خدا سب کچھ جاننے والا ہے۔“

اس کے بعد آپ نے لوگوں کی طرف دیکھا۔ فرمایا کہ اے قریش۔ کہو اب تمہارا کیا خیال ہے کہ اب میں تمہارے ساتھ کیا کرنے والا ہوں؟

ان میں سے بعض نے کہا کہ آپ ہمارے نیک سیرت اور نیک فطرت بھائی ہیں حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ جاؤ اب تم سب آزاد ہو۔

مکہ کے سارے لوگ حضورؐ کی وفاداری اور اطاعت کی قسم کھانے کے لیے جمع

ہوئے لوگ ایک قطار میں کھڑے ہو گئے ایک ایک کر کے ہر ایک حضور کے سامنے آتا اور شہد کرتا کہ وہ خدائی قانون کی اطاعت کرے گا آپ کے ہر حکم کو بجالائے گا۔

جب تمام مرد حلف اٹھا چکے تو پورے لوگوں کی باری آئی، عقبہ کی بیٹی ہند یعنی ابوسفیان کی بیوی اپنے چہرہ پر نقاب ڈالے ہوئے اس کو شش میں لگی رہی کہ وہ نہ پہچانی جائے حضور نے پورے لوگوں سے خطاب فرمایا۔ آپ نے خاص طور پر پورے لوگوں سے کہا کہ وہ وعدہ کریں کہ آئندہ سے وہ خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کریں گی۔ (اسلام نے خاص طور پر واحدیت کا درس دیا ہے اور خدا کے واحد اور لا شریک ہونے پر مسلسل زور دیا ہے۔ مکہ کے بے دین بدنام اس لیے نہیں تھے کہ وہ بت پرست تھے بلکہ اس لیے تھے کہ وہ خدا کی ذات سے کسی اور کو بھی وابستہ کر دیتے تھے۔ ان کے ہاں ایک بہت بڑے خدا کا تصور تو تھا ہی بہت سے چھوٹے موٹے خداؤں کو بھی اپنے بڑے خدا کا شریک اور مددگار بنا دیا کرتے تھے۔)

ہند نے مجمع میں سے پکارا کہ آپ نے مردوں کو ایسا عہد نہیں لیا تھا یہ بدتماش عورت جس کی زندگی واقعی اب خطرے میں تھی اس موقع پر بھی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی۔ بحث کے دوران حضور نے ہند کی آواز پہچان لی۔ سوال فرمایا، کیا تو عقبہ کی بیٹی ہند ہے، اس نے کہا، جی ہاں میں ہند ہوں۔ میری التجا ہے کہ آپ میرے ماہنی کو بھول جائیں میری خطاؤں کو معاف فرمادیں۔“

رحمت عالم نے فرمایا، ”آج کا دن تو وہ دن ہے جس میں ماہنی کو بھولنا ہی پڑے گا،“ پھر آپ نے فرمایا، ”جا۔ خدا نے تجھے معاف کر دیا۔“ حضور نے اپنے خطاب کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ پورے لوگوں کو اپنے کم سن بچوں کی جان نہیں لینی چاہیے۔ کم سن بچوں کو زندہ دفن کر دینے کی جو رسم تھی۔ غالباً یہ اشارہ اسی طرف ہے۔

”ہم نے اپنے بچوں کو پائل پوس کر چھوٹے سے بڑا کیا۔ جب وہ بڑے ہو گئے تو

آپ نے بدر میں نہیں جان سے مار ڈالا، ان نے پھر ان الفاظ سے حضور کے بیان میں مداخلت کی۔

حضور نے ٹوٹوں سے فرمایا کہ اس بات کا ٹھہد کریں کہ وہ آپ کے احکام کی تعمیل کریں گی۔ آپ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اپنا ہاتھ بڑھا کر اس بات کا ٹھہد لیں۔ آپ نے کسی بھی بیعت میں یا کسی بھی عہد کے وقت کسی بھی ٹوٹ کے ہاتھ کو چھوا نہیں۔ صرف آپ کی ارواح اور آپ کی صاحبزادیاں اس شرف سے مشرف رہیں۔

ہند کا گستاخانہ طرز زندگی اور طرز گفتگو اور اسی قسم کے کئی واقعات یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی کی عربی معاشرت میں ٹوٹیں کتنا بھرپور حصہ لیتی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ حضور نے ٹوٹوں کی بے لگام آداری پر چند بندشیں ضرور عاید کیں ہیں۔

کئی ایک مسلم روایات ایسی ہیں جن میں ٹوٹوں کا مردوں سے آزادانہ اختلاط بیان کیا گیا ہے بلا کسی شرم و حیا کے ٹوٹیں مردوں کی محفلوں میں لطف اندوز ہوتی تھیں۔ جہاں کہیں ٹوٹوں کی بے لگام آزادی اور بے راہروی کا ذکر آیا ہے وہیں صاف طور پر بتلادیا گیا ہے کہ یہ واقعات اس وقت کے ہیں جبکہ ٹوٹوں کے لیے پردہ کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے ان سب باتوں کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ حضور نے ٹوٹوں پر جو پابندیاں عاید فرمائیں ان کی نوعیت سخت نہیں ہے بلکہ ان پابندیوں میں ٹوٹوں کے لیے آسانیاں فراہم کی گئی ہیں کم و بیش یہ پابندیاں اس نوعیت کی ہیں جیسی ملکہ و کٹوریہ کے زمانے میں انگلستان کی ٹوٹوں پر تھیں۔

مثال کے طور پر حضور کے انتقال کے بعد حضور کی چھٹی بیوی بی بی عائشہؓ نے ایک جنگ میں حصہ لیا تھا۔ میدان جنگ میں اپنے اونٹ پر سوار تھیں۔

ایک نکتہ ایسا ہے جو تجسس کا باعث بننے کے باوجود مسترضین کے لیے زیادہ قابل

توجہ نہیں رہا کہ وہ حضورؐ کا جنت کے متعلق بیان ہے

آپ نے فرمایا کہ ہر مسلمان جب وہ دائمی اور سدا بہار گلشن میں قدم رکھیگا تو اس کا استقبال کائے آنکھوں والی دونو جوان اور خوبصورت حین و جمیل لڑکیاں کریں گی۔ اگر مسلمان سب کے سب جنت میں داخل ہو جائیں تو ان کی بے چاری بیویوں کا کیا حشر ہوگا جب کہ ان عورتوں سے بھی جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی صراحت کہیں نہیں ملتی۔ عورتوں کے تعلق سے اسلام نے جو رویہ اختیار کیا اور جو رویہ مغربی دنیا نے اختیار کر رکھا ہے اس میں بنیادی طور پر عورتوں اور مردوں کو مجلس کی بنیادوں پر اتنا تقسیم نہیں کیا گیا ہے جتنا ان دونوں کے درمیان بنیادی اختلافات وجہ تفریق بنے

مرد اور عورت بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہی بنیادی اختلاف ہے۔ ان دونوں کو اس بات کی طرف راغب کرنا ہے کہ وہ ایک جوڑے کی صورت میں زندگی کی تشکیل کریں۔ یقیناً یہ بات مفہمہ خیز ہوگی اگر کہا جائے کہ عورت مرد کے برابر نہیں محض اس لیے کہ پارلیمنٹ میں عورتوں کی تعداد کم ہے یا فوج میں بڑے پیمانوں پر عورتیں کم فائز کی جاتی ہیں یا مردوں کو محض اس وجہ سے عورتوں کے برابر نہ قرار دیا جائے کہ وہ بچوں کی دیکھ بھال بہتر طریقے سے نہیں کر سکتے یا ان کو کپڑے سینا برابر نہیں آتا۔

قصہ مختصر یہ کہ اسلام نے زندگی کی تشکیل میں مردوں اور عورتوں کے درمیان نظر پائی حد فاصل کھینچی ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام نے ان دونوں کے درمیان ایک فرق محسوس کیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ عورتیں اپنی جسمانی اور طبی کمزوریوں کے باعث ہمیشہ مردوں کا آرا کار بنی رہیں۔ مرد نے عورت کا استحصال خوب کیا ہے۔ مغربی دنیا نے مسلم معاشرت میں عورت کے مقام کو سمجھنے میں غلطی کی ہے اور اس کے مقام کو توڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ پر امن طریقے سے مکہ کا حصول حضورؐ کی فاتحانہ روشن کی مزاج تھی اس پر عظمت فتح

نے ہمارے لیے یہ موقع فراہم کیا کہ ہم حضور کے لائوٹھ عمل اور طریقہ کار کا مختصر طور پر جائزہ لیں
سب سے پہلی بات یہ ہے کہ حضور کو ہر مقام پر صرف کامیابیوں ہی سے سابقہ نہیں
پڑا بلکہ آپ کی ناکامیاں ہمیشہ آپ کی کامیابیوں کے ہم رکاب رہیں۔

احد کی شکست نے بدر کی کامیابی کی جگہ لی۔ حدیبیہ کی صلح جو بلا ہرا ایک نوجی شکست
معلوم ہوتی ہے تیسرے فتح کا باعث بنی۔ موتہ کی جنگ شکست کا عنوان بنی۔ اس کے
برعکس حضور کی وفات کے بعد مسلمانوں نے یکے بعد دیگرے
فتوحات کا ریح اپنی طرف موڑ لیا۔ صرف قریش یا بنی عطفان پر مای فتح نہ پائی بلکہ نیز لیلیٰ
اور ایرانی فوجوں کے مقابلے میں کامیاب ہوئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضور کی بالآخر فتح آپ کی فوجی کامیابیوں کی رہن
منت نہیں تھی بلکہ اس فتح میں آپ کی عظیم شخصیت پنہاں تھی۔ اس زمانے میں قیادت کے
لیے ہم مرد آہن کو تلاش کرتے ہیں، مرد آہن اور قیادت لازم و ملزوم سمجھے جاتے ہیں۔
حضور فطری طور پر بہت ہی نرم مزاج تھے۔ آپ کو جو نعمت خدا داد ملی تھی۔ وہ یہ
تھی کہ آپ لوگوں کے دلوں کو موہ لیتے تھے۔ عقیدت و محبت سے لوگوں کے دل حضور
کی طرف جھک جاتے تھے۔

ہم نے شاید ہی یہ پڑھا ہو کہ حضور نے کبھی بھی جابرانہ اور حاکمانہ طریقہ اختیار کر کے
کسی کو کچھ کرنے کا حکم دیا ہو۔ اپنا حکم نہ ماننے پر کسی کو کبھی کوئی سزا دی ہو۔
اکثر و بیشتر آپ اپنے اصحاب سے مشورہ کو سنتے تھے۔ اگر کسی مسئلہ میں وحی کا
نزدل نہ ہوتا تو آپ اپنے قریبی اصحاب کے مشورہ کو قبول فرماتے تھے۔ یہی وہ واحد طریقہ
تھا جس کے ذریعہ سے عربوں کی وفاداریوں کو مستقبل اور پائندہ طریقے سے حاصل کیا جاسکتا
تھا۔ عرب کے عمر رسیدہ اور تجربہ کار لوگ جابرانہ حکم ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے
تھے۔ ہاں اگر ان سے مدد کی درخواست کی جاتی تو وہ ہر قسم کی مدد دینے میں خوشی
محسوس کرنے لگتے تھے۔ یہ خصوصیت جو آج بھی مرکزی عرب کے لوگوں کا خاصہ ہے۔

شام اور سراتی کے لوگوں پہنچی اثر انداز ہوئی۔ اگر ان سے بغدادی بلور پر کسی قسم کی درخواست کی جائے تو آج بھی یہ لوگ اس درخواست پر غور کرنے اور اس کا عملی بلور پر غور مقدم کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

گولڈ ڈی اہرنے شراب کے استماع کا ذکر کرتے ہوئے عربوں کی بعض شناسی کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ عربوں نے شراب کی لذت سے اس لیے گریز نہیں کیا کہ انہیں اس کی وجہ سے قید و بند کا ڈر تھا۔ انہوں نے شراب نہ پینے میں اپنی بہتری سمجھی۔ رضا کارانہ طور پر شراب سے اجتناب کیا۔ جب کبھی ان کو سزا کا ڈر یا خوف دلا یا گیا۔ انہوں نے اس کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ دوسری اہم بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ مسلم مورخین نے حضورؐ کے انتقال کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد حضورؐ کے حالات قلمند کیے جس زمانے میں ان لوگوں نے یہ حالات لکھے وہ زمانہ عیش و عشرت اور خوش حالی کا زمانہ تھا۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جو عربی نسل نہیں تھے۔ عربوں کی اولاد نہیں تھے جن لوگوں کی ناز و بغیں ہم تک پہنچی ہیں ان میں اکثر یا زورانی تھے یا یونانی، مصری تھے یا اسپین کے۔ ان کا مادری تعلق تو اپنی جائے پیدائش سے تھا لیکن تعلیم اور معاشرت میں وہ ضرور عربی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اس وقت جبکہ یہ ”عرب“ مورخین علم و فضل کے دریا بہا رہے تھے، عرب قبیلے جو اسلام کی جان تھے جو اسلام کی اصل تھے جو اسلام کے لیے ایک خام پیداوار کی حیثیت رکھتے تھے۔ بغداد کی مسلم شہنشاہیت کے عتاب کا شکار تھے۔ چور اور ڈاکوؤں کا لقب انہیں دیا جا چکا تھا۔ ہر ایک طرف سے یہ دھتکارے جا رہے تھے۔ بعد میں مغربی مصنفین اور مؤرخین نے جو کچھ بھی اخذ کیا اور اپنی کتابوں میں پیش کیا۔ وہ وہی تھا جو ”عرب“ مورخین کے قلم سے نکل چکا تھا۔ اب اگر کوئی مغربی مورخ کو نشانہ ملامت بنائے تو اس کی اپنی مرضی۔

اس کتاب کی ترتیب کے پیچھے جو جذبہ کار فرما رہا وہ یہ تھا کہ میں اپنے ذاتی تجربات کا پتھر آپ کے سامنے پیش کروں۔ میں برہا برس ان لوگوں کے ساتھ رہ

چکا ہوں ہوشکستہ حال ہیں، بوسیدہ اور مچھٹے ہوئے خیموں میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے جس بات کا میں نے پتہ چلایا وہ یہ کہ باوجود پریشان حالی کے ان پر روحانی اور مذہبی پیغام جلد اثر کرتا ہے۔ جب میں پڑھتا ہوں کہ حضورؐ کی مخاطبت اور تبلیغ کے وقت قبیلوں کے لوگ اتنا ردیا کرتے تھے کہ ان کی داڑھیاں نر ہو جاتی تھیں تو اس میں نہ مجھے مباغز آرائی نظر آتی ہے اور نہ ہی شاعرانہ تعلی۔

میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں کہ یہ لوگ کس طریقہ سے دوسروں کے دیکھے اور کہے سے متاثر ہوتے ہیں اور آپؐ بیٹی تو دور کی بات ہے پر بیٹی پر ان کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

جب ایک بار ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ قبیلوں کے لوگ مذہب کے معاملے میں بڑے ہی جذباتی اور حساس واقع ہوئے ہیں تو یہ بات خود بہ خود سمجھ میں آنے لگتی ہے کہ حضورؐ کی فتح مندیاں اور کامیابیاں آپؐ کی اسی تبلیغ کا نتیجہ تھیں۔ جن میں روحانیت سے اپیل کی گئی تھی جس میں دوسروں کے واقعات کو سن کر آئینہ طریقے سے پیش کیا گیا تھا۔

یہ کامیابیاں اس وجہ سے نہیں تھیں کہ حضورؐ لوگوں کو لالچ دے کر یا ڈرا دھمکا کر اسلام کی طرف راغب کرتے تھے۔ اس قسم کا الزام لگانے والے کہتے ہیں کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ساتویں صدی کے عرب قاتل تھے، اخلاقی اقدار کو پامال کرتے تھے لاقانونیت کا شکار تھے تو اس بات کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کی وفاداری اور شرافت کو حاصل کرنے کے لیے حضورؐ نے یا لور شوت ستانی کا بازار گرم کیا ہوگا یا عوام الناس کا بے بہا خون بہایا ہوگا۔ اس قسم کی خرافات کا بکنا ہرزہ سرائی نہیں اور پھر کیا ہے۔

”عرب“ مورخین نے اپنے پیغمبر کے تعلق سے جو شگوفے چھوڑے ہیں ان میں اس ذاتِ اقدس کو اڈٹوں کی چوری کے الزام میں تک ملوث کیا ہے۔ انہیں

سے استغادہ کرتے ہوئے پروفیسر مارگولیت نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ میری نظر میں اس قسم کی باتیں سراسر بکواس ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضور کی تعلیمات میں دنیا اور دین دونوں شامل ہیں۔ دین کی نعمتوں کے ساتھ جنت کی مسرت اور شادمانی بھی رکھی گئی۔ شاید اسی کو پیش نظر رکھ کر اسلام کے موجودہ محافظ یہ کہتے ہیں کہ عملی طور پر دین اور دنیا کا امتزاج بہتر ہے بہ نسبت انجیل کی تعلیم کے جو خودی کی فنا پر مشتمل ہے۔

کیا یہ سوچنا غلط ہو گا کہ حضور نے بعض اوقات اپنے مذہب کے قبول کرنے والوں کے جذبہ قربانی کا صحیح اندازہ نہیں رکھا۔

آپ نے ترک دنیا اور رہبانیت کی مخالفت کی۔ اعتدال پسندی کا مشورہ دیا اس کے باوجود اس وقت سے لے کر آج تک بے شمار اور ان گنت مسلمانوں نے اپنی خوشی سے دنیا کی ہر لذت کی ٹھکراتے ہوئے غربت اور فلاکت کی زندگی کو ترجیح دی۔ حضور کے روحانی پیغام کے تعلق سے جو بھی انداز فکر اختیار کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضور نے سیاست، حکمت عملی اور معاملہ نہیں کے عناصر کو اپنے روحانی پیغام سے وابستہ کیے رکھا۔

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ حضور جنگوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ آخری حربے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ مخالفین سے گفت و شنید کے خواہاں رہتے تھے۔ بحث و مباحثہ اور بات چیت کے ذریعہ لوگوں کو اپنے پیغام سے واقف کرواتے تھے۔

یہ آپ کے سیاسی تدبیر ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے مکہ لوگوں کو اپنی طرف لانے کے لیے عمرے کا ارادہ کیا۔ یہ نفس نفیس خود مکہ تشریف لے گئے۔

حضور کی بہت سی خصوصیات جن میں سمانت، شائستگی، بہادری اور قول و فعل کا تطابقت شامل ہیں۔ صرف آپ ہی کی ذات سے وابستہ نہیں تھیں۔ بلکہ یہ خصوصیات

عرب معاشرے کا جزو تھیں، عربوں کی یہ قومی صفات تھیں۔ انہیں مشترکہ اقدار کی حامل حضور کی ذات گرامی بھی تھی۔

زید بن عارثہ کی بیٹی کا روتے ہوئے آکر حضور کی گود میں بیٹھ جانا، اپنے باپ کی موت پر آنسو بہانا، حضور کا اس کے علم میں شریک ہونا، خود حضور کی آنکھوں میں آنسو آ جانا ایک واقعہ ہی لیکن اس بات کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ سارے عرب بچوں سے بے انتہا پیار کرتے ہیں۔ بچوں سے محبت اور پیار ان کی قومی خصوصیت ہے۔

حضور میں بلا کی کشش اور جاذبیت تھی۔ آپ کی بذلہ بنی، آپ کی شگفتہ منزاجی آپ کا شائستہ مذاق، افراد خاندان سے محبت، اپنے اصحاب سے حسن اخلاق، صحابہ کی باتوں سے لطف اندوزی، ہر ایک سے برا دراندہ اور مساویانہ سلوک، لطف و محبت سے اپنے قریبی لوگوں کو اپنے دیے ہوئے نام سے پکارنا، مخلصین سے مشورہ۔ حضور کے اوصاف حسنہ تھے۔ ساتھ ہی اسی قسم کی خصوصیات مرکزی علاقوں میں رہنے والے عربوں کی زندگی کا خاصہ تھیں۔

عربوں کا روایاتی سماجی ڈھانچہ کچھ اس طریقے سے ڈھالا گیا تھا کہ اس میں بزرگ خاندان کی بڑی ہی عزت و توقیر ہوا کرتی تھیں۔ اس نظام میں سب سے پیاری بات یہ تھی کہ بزرگ خاندان کسی امیر مالدار یا دینے گھرانے سے نہیں چنا جاتا تھا۔ صرف خونی رشتہ ہی اس کی عظمت اور بزرگی کے لیے کافی ہو جاتا تھا۔ اس روایت نے ایک ایسے نظام کو جنم دیا تھا۔ جس میں عزت اور اقتدار اور سماجی مساوات کا آپس میں گٹھ جوڑ ہو گیا تھا۔ یہ طریقہ انسانیت کو نکھارنا تھا۔ اور انسانی عظمت کو اجاگر کرنا تھا۔ اس شخصی عنوان حکومت میں قبیلے کے افراد شطرنج کے مہرے بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور قدم قدم پر سردہری کا مظاہرہ کرتے ہیں، انسانی مساوات اور اس کی تشکیل لاکھ درجے بہتر تھی۔

سراپا لطف و کرم ہونے کے باوجود حضور کو غیض غضب سے بھر پور بھی دیکھتے ہیں۔

بنی قریظہ کے سات سو آدمیوں کا صفحہ ہستی سے مٹ جانا اس کی ایک مثال ہے۔ عرب ہنزدوں کی داستانوں میں شاید اس قسم کی مثال مل جائے لیکن قبیلہ وارانہ جنگوں میں اتنے سارے لوگوں کا ایک ساتھ ختم کیا جانا اپنی مثال آپ ہے۔

ڈاکٹر مشگزی واٹ کے اس بیان سے مجھے اختلاف ہے کہ قبیلہ وارانہ جنگوں میں جائز و ناجائز کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ قبیلہ وارانہ جنگوں میں قتل عام نہیں ہوا کرتے تھے وارداتیں ہوا تو کرتی تھیں لیکن ان کی نوعیت جداگانہ ہوا کرتی تھی۔ لوگ مرتے بھی تھے۔ اور مارے بھی جاتے تھے تعداد کے لحاظ سے ایسے واقعات اگر ہوئے بھی ہوں تو ایک محدود پیمانے پر۔ چونکہ قبیلوں کی جنگیں ہمیشہ ہوا ہی کرتی تھیں۔ اس لیے قتل کرنے والے کو اس وقت تک بخشا نہیں جاتا تھا جب تک کہ مقتول کا بدلہ نہ لے لیا جائے۔

میں مدنی مدنیوں کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ قبیلہ وارانہ جنگیں بھی اصول پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔ ایک قبیلے والوں کا دوسرے قبیلے والوں کو سر سے نیرت و نابود کر دینے کا طریقہ تو ان کے پاس تھا ہی نہیں۔ اسلام کے ظہور سے صدیوں سال قبل سے لے کر آج ہمارے اپنے زمانے تک جو قتل عام ہوئے ہیں اگر ان کی بنیادی وجہ تلاش کی جائے تو یہی اسی اقدار کا حصول اس کا پس منظر ہو گا یا پھر مذہب کے نام پر انسانیت کا خون بہتا نظر آئے گا۔ قبیلہ واری جنگوں میں قتل عام کی کوئی سبک نہیں تھی۔

بنی قریظہ کے قتل عام کا جواز بظاہر تو کوئی نظر نہیں آتا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ ٹرال کی بہ نسبت بدر کو اہمیت دیتے تھے۔ آپ نے مکہ کی فتح کے وقت جس رحم و کرم اور فیاضی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ تاریخ کا نہری باب ہے اور اپنی مثال آپ ہے۔ اپنے کٹر سے کٹر دشمن کو بھی آپ ہمیشہ معاف کرتے رہے۔ اس وقت بھی آپ نے معاف کیا جبکہ دشمن نہ آپ کے زرنے میں تھا بلکہ آپ کے بس میں تھا۔ دشمن کی دشمنی کو نظر انداز کر دینا اس سے معاف کر دینا ہمیشہ سے آپ کا شیوہ رہا۔ حضورؐ کے طریقہ کار کو مختصر طور پر

یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے کوشش کی کہ تمام لوگوں کو تمام چیزیں دی جائیں۔ جو جس کا اہل ہے اس سے ویسا ہی سلوک ہو۔ جو لوگ آپ کے روحانی پیغام کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کو اسلام کی نعمت سے نوازا۔ جن کو دنیا عزیز نہ تھی۔ ان کو انعامات و اکرامات سے خوش کیا۔ اس پر بھی وہ صحیح راستے پر نہ آئے تو ڈرا دھمکا کر انہیں اپنے راستے پر لائے۔ جو بائیں اور غدار تھے ان کے ساتھ سختی کی گئی۔ مگر عام طور سے یوں ہوا کہ بائیںوں اور غداروں کو بھی صاف کر دیا۔

یادگار تاریخیں

| | |
|------|-----------------|
| ۶۵۷۰ | حضور کی پیدائش |
| ۶۱۰ | بعثت |
| ۶۲۲ | مدینہ کو ہجرت |
| ۶۲۴ | جنگ بدر |
| ۶۲۵ | جنگ احد |
| ۶۲۷ | جنگ خندق |
| ۶۲۸ | صلح حدیبیہ |
| ۶۹۹ | عمرہ کی ادائیگی |
| ۶۳۰ | مکہ پر قبضہ |

یوم حنین

مکہ پر قبضہ کرنے سے بہت ہی پہلے اگرچہ ایک ایسی فہرست تیار کر لی جا چکی تھی۔ جس میں ان لوگوں کے نام تھے جو قتل کیے جانے کے قابل تھے لیکن رحمت عالم نے سوائے چار کے باقی سب کو معاف کر دیا۔

عکرمہ ابو جہل کا بیٹا تھا حضور سے دشمنی اسے درٹے میں ملی تھی فتح کے بعد مین بھاگ گیا عکرمہ کی بیوی نے درخواست کی کہ اس کے شوہر کو معاف کر دیا جائے۔ حضور نے عکرمہ کو بھی معاف فرما دیا۔ عکرمہ کی یہ بہادر عورت اپنے شوہر کو اپنے ساتھ مکہ واپس لائی۔ تین سال بعد اسی عکرمہ نے مسلم فوجوں کی قیادت کی۔

اُمیہ ابن خلف بدر کی جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اسی کا بیٹا صفوان مکہ سے فرار ہو گیا جدہ میں روپوشی اختیار کی۔ موقع کی تلاش میں تھا کہ اسے کوئی جہاز مل جائے اور وہ سمندر پار کسی جگہ چلے جائے۔ اس کا ایک جگری دوست حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور صفوان کے لیے سفارش کی۔ حضور نے اسے بھی معاف کر دیا۔ صفوان جہاز میں سوار ہونے ہی والا تھا کہ اس کے دوست نے اس کی جان کی سلامتی کی خوش خبری سنائی کہ مکہ کی فتح کے بعد حضور کے اس لطف و کرم نے مکہ کے تمام لوگوں کو آپ کا گرویدہ بنا دیا۔ اب عزت و احترام کے ساتھ لوگوں کی نظریں حضور کی طرف اٹھنے لگیں۔ مکہ جیسے ہی فتح ہوا بتوں کی خرابی آئی۔ ہر طرف بت شکنی ہونے لگی۔

جہاں بھی کوئی بت نظر آتا توڑ دیا جاتا تھا۔ مکہ کے بہت سے خاندان ایسے تھے جن کے اپنے منسوس خدا ہوتے تھے۔ ان خداؤں کے بارے میں ان کے اپنے مخصوص عقیدے اور نظریات ہوا کرتے تھے۔ ان کے اپنے ذاتی خدا ان کے گھروں کی زینت تھے۔ گھر کی آرائش و زیبائش میں مختلف بت استعمال ہوتے تھے۔

ان تمام بتوں کو پاش پاش کرنے کا حکم دیا گیا تو اس کی بڑی حد تک تعمیل ہوئی۔ مسلمانوں کے خون و ڈر کی وجہ سے بہت سے بت توڑ دیے گئے۔ ان کے توڑے جانے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ٹٹلی طور پر اپنے بتوں کو بالکل بے کار اور ناکارہ پایا۔ ان پر اتنی بڑی مسیبت آئی۔ سارا مکہ مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کے باوجود ان کے پتھر کے منتم اپنی جگہ بیٹھے خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ دوسروں کو پہچانا تو کیا اپنی آپ بھی حفاظت نہ کر سکے۔ بتوں کی یہ بے حسی اور عمل کے فقدان نے مکہ والوں کو اور زیادہ بتوں کا دشمن بنا دیا اور وہ اپنے ہاتھوں سے بتوں کو توڑنے لگے۔

اس پاس کے قبیلوں میں بھی مسلمان مبلغ بھجوائے گئے۔ تاکہ ان لوگوں کو بھی ترغیب دی جائے کہ وہ بتوں سے باز آجائیں۔ اپنے بت خانوں کو ٹھکانے لگادیں۔ ان ہی روانہ کردہ جماعتوں میں سے ایک جماعت کی قیادت خالد ابن ولیدؓ نے کی، خالد ایک کامیاب جنرل تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ سخت مزاج، آتش دہند اور دشمنوں کے خون کے پیاسے تھے۔ ان کو مکہ کے جنوب مغرب میں بنی کہنانہ کی ایک شاخ، بنی خزیمہ کو راہ راست پر لانے کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔

اس واقعہ سے بہت برسوں پہلے کی بات ہے کہ بنی خزیمہ کے کچھ لوگوں نے خالد کے چچا کو قتل کر دیا تھا جبکہ وہ تجارت کے سلسلے میں یمن سے واپس ہو رہے تھے۔ غالباً حضورؐ اس سانحے سے لاعلم تھے۔ اس بات سے بھی حضورؐ ناواقف تھے کہ خالد کے دل میں اپنے چچا کے قتل کا بدلہ لینے کی آگ سلگی ہوئی تھی۔ خالد صرف موقع کی تلاش میں

تھے۔ وہ وقت کا انتظار کر رہے تھے کہ کب موقع ملے اور کب وہ اپنی آتش انتقام کو ٹھنڈا کریں۔ حضور نے روانگی سے قبل خالد کو یہ تاکید کر دی تھی کہ جہاں تک ہو سکے خون خرابے سے احتراز کیا جائے۔

جب خالد بنی خزیمہ کے ہاں پہنچے تو انہوں نے قبیلے سے درخواست کی کہ اب حضور کی مخالفت کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ ہر ایک نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم لوگ بھی ہتھیار ڈال دو۔ مقابلے کی جرات نہ کرو۔ جب انہوں نے خالد کے حکم کی تعمیل کر دی اور اپنے اپنے ہتھیار ڈال دیے تو خالد نے ان میں سے چند آدمیوں کو پکڑ کر ان کے ہاتھوں کو ان کے گلے کے پیچھے باندھ دیے۔ دوسروں کو حکم دیا کہ وہ ان بندھے ہوئے لوگوں کا سر قلم کر دیں۔ اس طریقے سے خالد نے اپنے چچا کے قتل کا بدلہ لے کر اپنی تسلی اور تشفی کا سامان کر لیا۔

حضور کو جب خالد کی ان حرکتوں کی اطلاع ملی تو آپ کو سخت ناگوار گزرا۔ حرم کعبہ میں کھڑے ہو کر حضور نے اپنے دونوں ہاتھ اونچے کیے۔ اپنے سر کو بلند کر کے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا اللہ میرے اللہ میں بے گناہ ہوں۔ خالد نے جو کچھ بھی کیا ہے اس کی ذمہ دار مجھ پر نہیں۔ حضرت علیؓ کو ایک بھاری رقم دے کر فوراً بنی خزیمہ کے پاس روانہ کیا گیا تاکہ مقتولین کے ورثاء کو قصاص کی رقم دی جائے۔ جن کے قرابت دار مارے گئے تھے یا جن کی املاک کو نقصان پہنچایا گیا تھا ان میں سے ہر ایک فرد کو مقتول کا معاوضہ دیا گیا۔ نخلہ کے مقام پر العزری بت کا عبادت خانہ تھا۔ اس کو مسمار کرنے کے فرائض بھی خالد کے ذمے کے گئے۔ بنی سلیم کو اطلاع ملی کہ مسلمان بت خانے کی تباہی کے لیے آرہے تھے تو ان مجاہدوں نے اپنے بت العزری کے گلے میں ایک تلوار لگا دی اور بت سے کہا کہ اپنی حفاظت آپ کر لے۔ ساتھ ساتھ بت خانے کی مدافعت کرے اور خالد کا خاتمہ کر دے۔ بت کے ذمے یہ فرائض سونپ کر سارے مجاہدان کرام اور بنی پہاڑی پر چلے

گئے تاکہ اپنے بت اور خالد کی لڑائی کا نظارہ کر سکیں۔

العزازی بت ہی تو تھا۔ بتوں نے کس کا مقابلہ کیا ہے جو خالد کا کرتے۔ خالد آتے ہیں اور العزازی بت کو پاش پاش کر دیتے ہیں۔

جب ہوازن نے یہ سنا کہ مسلمانوں نے مکہ کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے تو ان میں سے کچھ لوگوں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں سے لڑنا چاہیے۔ بنی نصر کا سردار مالک ابن عوف مسلمانوں کی مزاحمت کی تحریک میں بہت آگے آگے تھے۔ نقیف کے لوگوں نے جن میں بہت سے طائف کے لوگ شریک تھے۔ مسلمانوں کے خلاف لڑنے پر رضامندی ظاہر کی۔ جو لوگ اس مقصد کے لیے اکٹھے ہوئے ان میں ایک درید بن صمہ بھی شامل تھا۔ جب یہ توجوان تھا مسلمانوں کے خلاف ایک لڑائی میں حصہ لیا تھا۔

ہوازن کے سردار مالک ابن عوف نے تجویز پیش کی۔ کہ سارے قبیلے جب جنگ کے لیے تیار ہوں۔ تو ان کو چاہیے کہ اپنے بیوی بچوں اور مولیوں کو اپنے ساتھ رکھیں اس کا منشا یہ تھا کہ چونکہ عورتیں مردوں کو بہادری سے لڑنے کے لیے اکساتی ہیں اور جوش دلاتی ہیں اس لیے عورتوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مردوں کو ہمتیں بلند رہیں گی۔ عرب خانہ بدوشوں سے لے کر اس صدی کی ابتداء تک اہم مواقعوں پر اسی عمل پر عمل ہوتا رہا ہے۔ اگر سپاہیوں کو یہ احساس رہے کہ ان کی شکست کی وجہ سے ان کے بیوی بچے، مال جائیداد اور سارا اثاثہ دشمن کی نذر ہو جائے گا۔ تو وہ میدان جنگ میں دل کھول کر اپنی بہادری کے جوہر دکھانے میں۔

درید بن صمہ اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ اسے گھاس پھوس کے بستر پر لٹا کر مجلس مشاورت میں لایا جاتا ہے۔ مالک ابن عوف کی پیش کردہ تجویز کی وہ مخالفت کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہوازن کے قبیلوں کے لوگوں کی تعداد مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت ہی کم اور نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر گھسان کی لڑائی ہونے کا امکان ہے تو بہتر یہ ہے کہ مسلمانوں

سے مقابلہ گھوڑوں پر بیٹھ کر کیا جائے۔ یہ لڑائی اس صورت میں بہتر طریقے سے لڑی جائے گی جبکہ غورتوں اور بچوں کو کسی پہاڑی مقام پر بھجوا دیا جائے۔ جہاں وہ محفوظ حالت میں رہ سکیں۔ مالک ابن عوف ایک نوجوان آدمی تھا۔ پھر کہتا ہے: بڑھاپے سے تمہاری عقل سٹھا گئی ہے۔ تم بنو سہلہ کو اس معلوم ہوتے ہو۔ میں تمہاری بات مانتے والا نہیں۔“ ہوازن کے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میرا اتباع کرو، ورنہ میں خودکشی کر لوں گا۔ مسلمان سرخ رساں کو ان لوگوں کے درمیان بھجوا دیتے ہیں۔ وہ کئی دن تک ان کے ساتھ رہتا ہے۔ تمام حالات سے حضور کو آگاہ کرتا رہتا ہے۔ مکہ سے آئی ہوئی مسلمانوں کی ایک عظیم فوج حضور کے ساتھ تھی۔ آپ نے خیال کیا کہ کیوں نہ ان قبیلوں کو بھی ان کی سرکشی کا مزہ چکھایا جائے۔

اگر مالک ابن عوف میں تھوڑی بہت بھی عقل ہوتی تو اس نے حضور کے مدینہ واپس جانے کا انتظار کیا ہوتا۔ مدینہ جانے کے بعد ساری فوج بکھر گئی ہوتی۔ آپ کے لیے یہ مشکل ہو جاتا کہ پھر سے اتنی بڑی فوج کو جنگ کے لیے فوراً تیار کریں۔

ان حالات میں حضور نے ہوازن سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ غالباً جنوری کے اواخر یا جنوری یا فروری ۶۳۰ء کے اوائل میں مسلمان مکہ کو چھوڑ کر مشرق کی طرف روانہ ہوئے۔ مکہ میں مسلمانوں کا قیام تقریباً دو ہفتے رہا کہا جاتا ہے کہ اس وقت حضور کے ساتھ دس ہزار مسلمان تو وہ تھے جو مدینہ سے مکہ آئے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ دو ہزار مسلمان وہ تھے جو مکہ کی فتح کے بعد مسلمان ہوئے تھے ان بارہ ہزار مسلمانوں کے مقابلے میں ہوازن کے صرف چار ہزار آدمی میدان میں آئے۔

دوسرے یا تیسرے دن صبح صبح مسلمانوں کی فوجیں اس مقام پر پہنچیں جو حنین کے نام سے موسوم تھی۔ اس وادی کے اطراف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ ان پہاڑیوں کی دوسری طرف گہرے غار تھے یا پھر چند ایک چھوٹی چھوٹی وادیاں۔

ہواذن کے لوگ رات میں اس مقام پر جا کر قریب کی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گئے
مسلمانوں کی فوجیں جب وادی میں پہنچ رہی تھیں چھپے ہوئے دشمنوں نے ان پر
حملہ کرنا شروع کر دیا۔ مسلمان اس بات سے لاعلم تھے کہ دشمن پہاڑیوں کے پیچھے چھپے
بیٹھے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ تو علم تھا کہ دشمن ان کے قریب ہے لیکن انہوں نے یہ زحمت

گوارا نہیں کی تھی کہ کسی بدوی باسوس کو اطران میں روانہ کر کے دشمن کے صحیح محل
وقوع کا پتہ چلاتے۔ مسلمانوں نے کسی ہمیش رود سننے کو بھی وہاں نہیں بھجوایا تھا۔ جو

فوجیں سامنے تھیں اس اچانک حملے سے ان میں ابتری پھیل گئی۔ وہ وادی کے
اسی راستے پر جان بچانے کے لیے بھاگتی رہیں۔ جدھر سے ہو کر وہ ابھی آئی تھیں۔

جو فوجیں ان کے پیچھے آ رہی تھیں۔ وہ بھی سراسیمہ ہو گئیں۔ حضور اور حضور کے
مغربین خاص زینح راستے میں پھنس گئے۔ ایک طرف سے مسلسل فوجیں آ رہی تھیں

دوسری طرف سے فوجیں دہشت زدہ ہو کر سراسیمگی کی حالت میں واپس دڑ رہی

تھیں۔ حضور کسی طرح وادی کے دھلوان حصے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

اوپرے مقام پر آپ کھڑے ہو گئے جہاں سے فوجوں کی نقل و حرکت کو ملاحظہ کر سکیں

آپ کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ اور حضرت زید

ابن حارثہ کے بیٹے اسامہ تھے۔ حضور نے فوجوں کو منالہ کر کے فرمایا "لوگو۔ تم کہاں

جا رہے ہو۔ میرے اطراف جمع ہو جاؤ۔ اسے مدینہ کے لوگو۔ خدا کا پیغمبر تو یہاں

کھڑا ہوا ہے۔ اسے انصار۔ اسے بیعت رضوان میں حصہ لینے والو"

بڑھا ابوسفیان جو حضور کی مصاحبت میں تھا۔ حضور کی اس پریشانی کو دیکھ کر

دل ہی دل میں خوش ہوا جا رہا تھا۔ اُسے سرگوشی کرتے ہوئے اپنے ایک ہم مشرب

سے کہا "مسلمانوں کے فرار کو سوائے سمند کے اب کوئی اور نہیں روک سکتا"

ہواذن کا پلہ بھاری تھا۔ مسلمانوں میں سبکدوشی مچ گئی تھی۔ مسلمان بے تحاشہ

اپنی جان بچانے کے لیے چوہدرت بھاگ رہے تھے۔ ایک آدمی اونٹ پر بیٹھا ہوا کالے
 جینڈے کو اپنے ایک ہاتھ میں تھامے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں نیزہ اٹھائے ہوئے
 مسلمانوں میں خوف و ہراس پھیلا رہا تھا۔ حضرت علیؓ ابن ابی طالب نے جب یہ دیکھا تو فوراً
 اس کا تعاقب کیا۔ اس کے اونٹ کو لنگڑا کر دیا۔ جیسے ہی لنگڑا اونٹ گر اساتھ ہی سوار زمین
 پر گر پڑا۔ قبل اس کے کہ وہ زمین پر سے اٹھے مدینہ کے کسی مسلمان نے جھپٹ کر اسے
 قتل کر دیا۔ مسلمانوں کی آدھی فوج کے قدم متزلزل ہو گئے۔ ہوا کا رخ دیکھ کر وہ اپنی
 وفاداریوں کو فاتح جماعت سے وابستہ کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ مکہ کے دو ہزار
 مسلمان حضورؐ کے ساتھ تھے۔ ان کے شہر پر صرف دو ہفتے قبل ہی
 مسلمانوں کا قبضہ ہوا تھا۔ ان کے دل کے زخم ابھی ہرے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں
 دہشت اور پریشانی پھیلانے میں کافی حصہ لیا۔

ایک آدمی جس کا باپ احد کی جنگ میں مارا گیا تھا۔ اس موقع کی تلاش میں تھا کہ جب
 بھی اسے حضورؐ مل جائیں وہ قتل کر دے۔ اُسے اُردھام میں آگے بڑھنے کی کافی۔

کوشش کی مگر اپنے مقصد میں ناکام رہا۔
 حضورؐ فوجی لباس میں اپنے سفید خمپر پر سوار تھے۔ حضورؐ کے چچا عباسؓ خندان
 کے اپنے بیان کے مطابق حضورؐ کے بازو کھڑے ہوئے تھے۔ حضورؐ نے عباسؓ سے فرمایا کہ
 ادبچی آواز سے پکارو، "اے انصار" اے بیعت رضوان کے شریک، "عباسؓ نے
 لکارنا شروع کر دیا۔ ان کا آواز دینا کام آیا۔ آوازیں آنے لگیں وہم یہاں ہیں ہم یہاں
 ہیں۔" ہر طرف سے یہی آواز آرہی تھی۔ افراتفری ایسی مچی رہی کہ کئی اونٹ اور کئی
 گھوڑے اپنے سواروں کو لیے سرپٹ دوڑ رہے تھے اس لیے کہ اب وہ اپنے سواروں کے
 بس میں نہ تھے۔ آہستہ آہستہ لوگ حضورؐ کے اطراف جمع ہونے لگے۔ حضورؐ ان کو دیکھ کر فرمانے
 جارہے تھے "تم میرے لیے جمع ہو اے انصار۔ تم میرے لیے جمع ہو اے بنی خزرج"
 شاید آپ نے خیال کیا ہو کہ خزرج کا نام لینے سے لوگوں کے جذبات میں تلاطم

پیدا ہو اور وہ آپ کے اور زیادہ وفادار ہو جائیں۔

جو لوگ حضور کے اطراف جمع ہو گئے تھے لڑتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ بدویوں کے ابنوہ کثیر کو حیرتے پھاڑتے وہ آگے ہی بڑھ رہے تھے۔ مسلمان بدوی جو اپنی جانوں کو بچانے کے لیے آہستہ آہستہ پیچھے پیچھے چل رہے تھے ان کو جوش اور غیرت دلائی جائے رہی تھی کہ وہ اپنی آپ مدافعت کریں اور لڑیں۔

جہاں تک ہو سکتا تھا۔ حضور لڑائیوں سے گریز کرنا چاہتے تھے۔ آپ نازک سے نازک موقع پر بھی ٹھنڈے طریقے سے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ اپنے سفید خچر پر سوار ہو گئے۔ صورت حال کا جائزہ لیا۔ آپ نے فرمایا: "صورت حال تو نازک ہے" حضور کو آپ کے جاننا گھبرے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے ایک عورت ام سلیم بیٹی ہوئی تھی۔ اپنے شوہر کے اونٹ کی نکیل کو تھامے ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھرا بھی تھا۔ شوہر نے اپنی بیوی سے دریافت کیا کہ اس چھرے سے تم کیا کرنے والی ہو۔ بیوی نے جواب دیا اگر کوئی مشرک اور کافر میرے قریب آئے تو میں کی انٹریاں باہر نکال دوں گی۔ یہ غریب معاملہ بھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس عورت کے شوہر طلحہ نے اس دن بیس کافروں کو قتل کیا تھا۔ شوہر کو خوب بیوی ملی تھی اور بیوی کو خوب شوہر ملا تھا۔

افرائقی اور انصار پر اب قابو پایا گیا تھا۔ پریشان اور دہشت زدہ مسلمان اب حضور کے قریب آ رہے تھے۔ مسلمانوں کی عددی برتری اب رنگ لا رہی تھی۔ کافروں کے مقابلے میں مسلمان ٹگنے تھے۔ پہلے تو ہوازن نے مقابلہ کرنا ختم کر دیا۔ ان کو دھکیل کر مسلمانوں نے پیچھے کر دیا پھر ان پر ایسے ٹوٹ پڑے کہ سارے کے سارے کافر منتشر ہو کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

ایک تو عددی اعتبار سے مسلمان اکثریت میں تھے۔ دوسرے ہتھیار اور لڑنے

کامامان ان کے پاس زیادہ تھا۔ ان دونوں باتوں میں امتیاز رکھنے کے باوجود ثقیف اور ہوازن نے مسلمانوں کو کافی پریشان کیا۔ ثقیف کے سزاوردی مارے گئے۔ یہ سارے کے سارے اپنے علم کی حفاظت کے لیے اس کے اردگرد کھڑے ہوئے تھے۔ ان ہی میں ان سردار عثمان ابن عبداللہ بھی تھا۔ یہ بھی مارا گیا۔

ایک موقع جو وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا وہ تھا جبکہ بنی سلیم کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ مار مار کر ہوازن کو میدان سے بھگا دیں۔ صرف تین ہفتے قبل بنی سلیم نے اسلام قبول کیا تھا جبکہ حضور مکہ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ بنی سلیم والوں نے اسلام کو دل سے قبول کیا تھا یا نہیں اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ تو ایک حقیقت تھی کہ قبیلہ دارانہ لڑائیوں میں یہ بہت ہی آزمودہ اور تجربہ کار تھے۔

قرآن کے سورہ توبہ کی ۲۵ ویں آیت میں حنین کے دن کا ذکر ہے۔ فرمایا گیا ہے: "وعدناہ بہت سے موقعوں پر تم کو مدد دی ہے اور حنین کے دن جبکہ تم کو اپنی جماعت کی کثرت پر غرہ تھا تو وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی۔ زمین باوجود اتنی فراخی کے نم پیرنگ ہو گئی۔ پھر تم پیٹھ پھیر کر پھر گئے" ۲۶ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

"پھر خدا نے اپنے پیغمبر پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی۔ تمہاری مدد کو فرشتوں کے لشکر جو تمہیں نظر نہیں آتے تھے آسمان سے اتارے۔ کافروں کو عذاب دیا اور کفر کرنے والوں کی بھی سزا ہے"

یاد ہو گا کہ حضور نے اپنی شہسواروں کا زمانہ علیمہ دائی کے ہاں گزارا تھا۔ یہ بنی سعد سے تعلق رکھتی تھیں۔ بنی سعد ہوازن کی ایک شاخ تھی۔ مسلمانوں کی جماعت نے بنی سعد کے کچھ لوگوں کو گرفتار کیا۔ ان گرفتار ہونے والوں میں ایک بوڑھی عورت بھی تھی۔ جس کا نام شیمما تھا۔ یہ حضور کی دودھ شریک بہن تھی۔ اس عورت نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ حضور کی رضاعی بہن ہے۔ مسلمانوں نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ اس

کا مذاق اڑاتے ہوئے اس کو حضورؐ کی خدمت میں لائے۔ اس نے حضورؐ سے بھی یہی بات کہی۔ حضورؐ نے ثبوت مانگا۔ بوڑھی نے جھٹ سے اپنے کندھے کی چادر مٹھا کر ایک چھوٹے سے زخم کا نشان دکھایا، حضورؐ سے کہا کہ جب آپ چھوٹے تھے وہ آپ کو اپنے کندھے پر اٹھائے کہیں لے جا رہی تھی۔ حضورؐ نے اس کے کندھے پر اپنی دانتوں کے نشان چھوڑ دیے جو کمر بھر رہا۔

حضورؐ اخلاق کریمانہ کے منہر تھے۔ اخلاق حسنہ کے پیکر تھے۔ یہ سنتے ہی چادر زمین پر بچھا دی۔ عورت سے فرمایا کہ چادر پر تشریف رکھے۔ آپ نے اپنی رضاعی بہن سے خواہش کی کہ وہ آپ کے بچپن کے واقعات سنائے۔ آپ نے اس کو دل جوئی کی۔ انعام اکرام سے نوازا۔ اس کو ایک آرام دہ گھر عطا فرمایا۔ ریگستان کے نیچے میں رہنے والی بدوی عہدت کو شہر کی زندگی کیا پسند آسکتی ہے۔ اس نے اس گھر پر اپنے نیچے کو تزحیح دی جہاں اس کی زندگی کے باقی دن اس کے اپنے لوگوں میں اس کی مرضی کے مطابق گزر سکتے تھے حضورؐ نے اس کی خواہش کا احترام کیا۔ جانے سے قبل اسے مزید عطیات اور تحفوں سے نوازا۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق آپ نے اس عورت کو ایک غلام اور ایک لڑکی سے بھی سرفراز کیا تھا۔ ان دونوں نے آپس میں شادی کر لی اور ان کی اولاد ابن اسحاق کے زمانہ میں بھی پائی جاتی تھی۔

ثقیف کے چند لوگ حنین سے طائف واپس ہوئے تھے۔ طائف سے ان کو ایک خاص نسبت تھی۔ یہ لوگ جرأت و بہتدہ پلندہ جو ملگی اور استقلال کی صفات خاص سے مشہور تھے۔ ان کے سربراہ اس موقع پر یمن گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے وہ تھکے اور جنگ کا دیگر سامان خرید کر واپس ہونے والے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہاں پر ان جنگی ہتھیاروں کے استعمال کی ترمیم بھی وہ حاصل کر رہے تھے۔ یمن پر ایرانیوں کا قبضہ ۵۷۱ء سے رہا تھا۔ وہاں پر ان کی باقاعدہ فوج متعین تھی۔ ہتھیاروں کا

ذخیرہ وہاں رہتا تھا۔ یمن سے ایرانی اثر و اقتدار کا خاتمہ ۶۰۲ء سے ۶۲۸ء کے دوران ہوا جبکہ بیزنطینیوں سے ان کی لڑائیاں ہوئیں۔ اس اقتدار کے چھین جانے کے باوجود بھی کافی مقدار میں ان کے ہتھیار وہاں تھے۔ ثقیف کے سربراہوں کا منشا شاید یہ رہا ہو کہ ایرانیوں کے چھوڑے ہوئے ہتھیاروں کے ذخیروں کو خرید کر اپنی مداخلت کے کام میں لایا جائے۔

۶۱۹ء میں حضور طائف تشریف لے گئے تھے۔ آپ کو امید تھی کہ وہاں کے لوگ آپ کا خیر مقدم کریں گے۔ آپ امن و امان سے طائف میں رہ سکیں گے۔ طائف کے لوگوں نے خیر مقدم تو کیا انتہائی بدسلوکی کی۔ اس سلوک سے دل برداشتہ ہونے کے بعد آپ کو مدینہ ہجرت کا خیال آیا۔

طائف کے لوگوں نے حنین میں ہوازن کا ساتھ دیا تھا اس لیے حضور نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ آپ طائف والوں کی خبر لیں گے۔ آپ طائف کی طرف روانہ ہوئے شہر کا محاصرہ کیا۔ آپ نے دیکھا کہ شہر کے دروازے اور دیواریں بڑی مضبوط ہیں مسلم فوج کے پاس صرف تیر و کمان، تلواریں اور نیزے ہیں۔ ان ہتھیاروں سے شہر کو فتح نہیں کیا جاسکتا۔

چونکہ طائف پر قبضہ کرنے کے علاوہ بھی آپ کی اور بہت سے کام کرتے تھے اس لیے پندرہ یا بیس دن تک محاصرہ جاری رکھنے کے بعد آپ نے محاصرہ اٹھوا دیا۔ طائف اصل میں باغات اور کشیدگی شراب کے لیے بہت مشہور تھا۔ پہاڑوں کے درمیان ہونے کی وجہ سے گرما میں کافی ٹھنڈک رہتی تھی۔ اس آب و ہوا کے باعث وہاں پر پھلوں کی کاشت کی جاتی تھی۔

محاصرہ اٹھانے سے قبل حضور نے حکم دیا کہ سارے باغات تباہ کر دیے جائیں بارہ مسلمانوں کی اس موقع پر شہادت ہوئی۔ طائف کی اونچی دیواروں پر سے تیر

پھینک پھینک کر مسلمان کو شہید کیا گیا۔ اتنے مختصر سے آدمیوں کی شہادت کو بیش نظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ یہاں پر نژاتی زیادہ نہیں ہوئی۔

حائف سے اپنی فوجیں ہٹالینے کے بعد حضورؐ نے جبرائیلؑ پر فوجوں کو رکوا دیا۔ یہ مقام وہ تھا جہاں سے مکہ کو راستہ جانا تھا۔ یہاں پر ہوازن کا جمع کیا ہوا ایک بہت بڑا خزانہ مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ حنین کی شکست کے نتیجے میں مسلمانوں نے دشمنوں کی عورتوں اور بچوں کو ان کے جانوروں اور دیگر مال و اسباب کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ جبرائیلؑ میں عورتوں اور بچوں کو نظر بند کر دیا گیا۔

ہوازن کی طرف سے علیہ دالیؑ کے خاندان والے یعنی بنی سعد نے مسلمانوں سے گفت و شنید کرنے میں پہل کی۔ یہ لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اے اللہ کے رسول۔ جس خاندان کی عورت نے آپ کے ایامِ شہرِ خوارمی میں آپ کو دودھ پلایا تھا اور چھوٹے سے بڑا کیا تھا، اسی خاندان کی عورتوں کو آپ نے آج بند کر رکھا ہے۔ آج ہم کو ان نظر بندوں پر رحم آرہا ہے۔ ان کی حالت پر افسوس ہو رہا ہے۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ ”تم کو زیادہ عزیز کون ہیں؟ تمہارے بیوی بچے یا تمہارے مویشی اور تمہارا مال و اسباب؟ ان لوگوں نے جواب دیا۔

”ہم کو، تمہارے بیوی بچے زیادہ عزیز ہیں۔“

حضورؐ نے فرمایا کہ جہاں تک آپ کا اپنا اور آپ کے قریب ترین رشتہ داروں کا تعلق ہے عورتوں اور بچوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ آپ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ نماز ظہر تک انتظار کریں تاکہ عام مسلمانوں کی منظوری بھی حاصل کی جاسکے۔ آپ نے فرمایا کہ جب مسلمان جمع ہو جائیں تو یہ لوگ اٹھ کر کھڑے ہو جائیں اور مجھ سے کہیں کہ آپ مسلمانوں سے ان کی عورتوں اور بچوں کی رہائی کے لیے سفارش کریں۔ ہوازن کے نمائندوں نے بڑی ہی ہوشیاری سے حضورؐ کی ہدایت پر عمل کیا۔ ہاجرین اور انصار

نے ان لوگوں کی اپیل پر فوراً کہا کہ وہ اپنے اپنے مال غنیمت اور عورتوں اور بچوں کے حق کو حضور کی مرضی پر چھوڑتے ہیں۔ وہ قبیلے جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور اسلام کی روح کو ابھی سمجھ نہیں پائے تھے ہاجرین اور انصار کی اس پیش کش کو قبول کرنے میں اور ان کا ساتھ دینے میں تامل کر رہے تھے۔ فزارہ اور بنی نضیم نے صاف طور پر انکار کر دیا۔ بنی سلیم کے سردار نے بھی اپنے حق سے دستبرداری سے انکار کر دیا۔ اس کے قبیلے والوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور کہا کہ جو کچھ ہمارا حصہ ہے وہ اصل میں رسول اللہ کا حق ہے۔ اس مرحلے پر حضور نے مداخلت فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص بھی اس بات پر مصر ہے کہ قیدیوں پر اس کا حق ہے وہ اپنے حصے کے قیدی کو آزاد کر دے اس کا۔ معاوضہ اس کوئی قیدی چھ اونٹوں کی صورت میں دیا جائے گا۔ آئندہ سال غنیمت میں سے یہ حصہ ادا ہوگا۔ حضور کے اس وعدہ کے پیش نظر تمام لوگوں نے عورتوں اور بچوں کی رہائی پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

یہ واقعہ بتلاتا ہے کہ حضور کس مدبرانہ طریقے سے جمہوریت کو کام میں لانے میں ہوئے مسائل کو حل کرتے تھے۔ ایک طرف آپ نے نمائندوں سے فرمایا کہ وہ تمام مسلمانوں سے عورتوں اور بچوں کی رہائی کی درخواست کریں۔ دوسری طرف اعتدال پسندی اور انسانی ہمدردی کو کام میں لانے ہوئے آپ نے مسلمانوں پر اپنا اثر ڈالا۔ گو آپ مسلمانوں کے نزدیک فوق البشر تھے اور آپ کا حکم مسلمانوں کے لیے واجب التعمیل ہوا کرتا تھا اس کے باوجود آپ نے مسلمانوں کو اس بارے میں حکم نہیں دیا۔ اپنی مرضی کو ان پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔

حضور نے ہوازن کے نمائندوں کے ذریعہ ان کے سردار مالک ابن عوف کے نام ایک پیغام روانہ فرمایا۔ سینین میں شکست پانے کے بعد اس نے طائف جا کر تکیف کے لوگوں کے درمیان پناہ لی تھی۔ حضور نے اپنے پیغام میں فرمایا کہ اگر وہ حضور کی

خدمت میں واپس ہو جائے اور اسلام قبول کر لے تو اسے سواونٹ بطور انعام دیے جائیں گے۔ جیسے ہی مالک ابن عوف کو یہ پیغام ملا وہ دوڑتا ہوا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور مسلمان ہو گیا۔ جن کے ہاں پناہ لی تھی، ان کو کہا تک نہیں کہ وہ حضورؐ کی خدمت میں جا رہے۔ بہر حال مسلمان ہو جانے کے بعد وہ اپنی شکست کے ایک بیٹے کے اندر ہی کافی مالدار ہو گیا۔

حضورؐ نے اس لطف و کرم اور عنایت کا اعلیٰ طور پر شکر گزار ہونے کے لیے اسے ہوازن کے چند قبیلوں کو جمع کیا۔ یہ قبیلے مسلمان ہو گئے تھے۔ ان سب کی مدد سے اس نے بنی ثقیف کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ وہی بنی ثقیف جن کے ہاں اس نے پناہ لے رکھی تھی۔

حضورؐ نے ہوازن کے بچوں اور عورتوں کو رہا کرنے کے مسائل میں مصروف رہے دوسری طرف عام مسلمان سال غنیمت کی تقسیم کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ حضورؐ جب اپنے کام سے فارغ ہو کر مسلمانوں کے درمیان تشریف لے گئے تو لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ حضورؐ۔ مویشیوں کو آپ ہمارے درمیان تقسیم فرمادیں۔ ان لوگوں نے حضورؐ کو اپنے درمیان اس طرح سے لے لیا تھا کہ ہجوم کے باعث حضورؐ کی شال، کندھے سے نیچے گر کر آپ کے پیروں میں آنے کی وجہ سے پھٹ گئی۔ آپ ایک درخت کو سہارا دے کر کھڑے ہو گئے۔ فرمایا کہ میری شال میرے حوالے کر دو۔

آپ رونے بھی جا رہے تھے اور ہنستے بھی جا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ”خدا کی قسم اگر میرے پاس اتنی بھیڑیں اور بکریاں بھی جمع ہو جائیں، جتنے ساحل کے کنارے درخت ہو کرتے ہیں تو بھی میں ان سب کو تمہارے درمیان تقسیم کر دوں۔“

عجیب اتفاق ہے کہ ۱۹۲۹ء میں دو مواقع میرے لیے بھی ایسے آئے جبکہ پکڑے ہوئے بھیڑوں اور بکریوں کے گلوں کو بدویوں کے درمیان مجھے تقسیم کرنا تھا۔ ابن اسحق

نے چودہ سو سال قبل ہونے والے واقعہ کی جو تصویر کھینچی ہے۔ وہی تصویر میرے ذہن کے پردہ پر پھر سے ابھرائی۔ جس حقیقت بیانی کے ساتھ انہوں نے اس واقعہ کی جو تصویر کھینچی ہے وہ میرے لیے ایک جواہر پارہ ثابت ہوئی۔ مرکزی عرب کے لوگوں کی یہ خصوصیت ہے کہ مولیٰ ثیوں یا مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت حریص اور لالچی بن جاتے ہیں، مال کی تقسیم کرنے والے کا وہی حشر کرتے ہیں جیسے آج سے چودہ سو سال قبل حضور کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ایک طرف تو وہ ان موقعوں پر نیم باطنی سے ہو جاتے اور عجیب ہڑبونگ مچاتے ہیں اور دوسری طرف اپنے محبوب قائد کی عظمت و عزت کا ہر طریقے سے خیال رکھتے ہیں۔

جب حضور نے اونٹوں کی تقسیم شروع کی تو سب سے زیادہ حصہ ان لوگوں کو دیا جو حضور کے سخت ترین دشمن رہ چکے تھے۔ ابوسفیان کو سو اونٹ دیے گئے۔ اس کے بیٹے معاویہ کو سو اونٹ دیے گئے۔ سہیل ابن عمرو اور صفوان ابن اُمیہ جیسے واجب القتل کو بھی سو اونٹ عطا کیے گئے۔ یہ سب اب مسلمان ہو چکے تھے۔

بنی عطفان اور بنی تمیم کے سردار جن کا اسلام ابھی مشکوک تھا۔ ان کو بھی سو سو اونٹ دیے گئے۔ بنی سلیم کے سردار عباس ابن مرداس کو دس اونٹ دیے گئے۔ بنی سلیم نے حنین میں بہادری کے کافی جوہر دکھائے تھے۔ عباس ابن مرداس ایک شاعر تھا۔ دوسروں کے سو اونٹ اور اس کو دس اونٹ دیے جانے پر اس نے اپنی سبکی محسوس کی، جل بھن کر چید طنز یہ اشعار لکھے۔ جس میں مالِ غنیمت کی تقسیم کا مذاق اڑایا۔

جب حضور کے علم میں یہ اشعار لائے گئے تو آپ نے فرمایا کہ کچھ اور تحفے تحائف دے کر اس آدمی کا منہ بند کیا جائے۔ عباس ابن مرداس کو طلب کیا گیا۔ اسے اتنے اونٹوں سے نوازا گیا کہ وہ چلا اٹھا کہ اب بس۔

ان تفصیلات سے مرکزی عرب کے رہنے والوں کی ذہنی خصوصیات کا پتہ

چلتا ہے۔ عباس ابن مرداس کو حرم و ہوانے اتنا غضب ناک نہیں کیا تھا جتنا سعد نے۔ دوسرے قبائل کو زیادہ اونٹ دے گئے اور اس کے قبیلے کو کم۔ اس میں اس نے اپنی اور اپنے قبیلے کی ذلت عموس کی، اس کی مرضی کے مطابق اونٹ دیے گئے تاکہ اس کا سر اونچا رہ سکے۔ حضورؐ اپنی فتح مندلیوں اور کامرائیوں کے عروج پر تھے۔ عباس ابن مرداس کے رویے سے نہ ہی غضبناک ہوئے اور نہ ہی کسی جاہراہ رویہ کو اختیار کیا۔ آپ نے ہر ایک کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ جب بھی کسی شخص نے حضورؐ کی سخاوت اور نیامنی پر اعتراض کیا تو آپ نے کبھی غصہ کا اظہار کیا۔ اور نہ اس سے بدلہ ہونے۔ اگر کوئی شخص آپ کی نیامنی اور سخاوت کو کھل کر دل سے قبول نہ کرتا تو آپ اس کو اتنا توڑنے کے لئے والے کو تنگی داماں کی شکایت رہ جاتی۔

جس طریقے سے مال غنیمت کو تقسیم کیا گیا ظاہر ہے کہ ہر شخص تو اس سے خوش نہیں ہو سکتا تھا۔ مدینہ کے انصار ان لوگوں میں سے تھے جن کو اس موقع پر سموت نا امید ہوئی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ حنین میں انہی لوگوں نے حضورؐ کے اطراف جمع ہونے میں پیش قدمی کی تھی اس کی وجہ سے حنین میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ اب جبکہ مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آیا تو ان کے حصے میں کچھ بھی نہیں آیا۔ سارے اونٹ حضورؐ کے دشمنوں کی ہمدردیاں اور وفاداریاں حاصل کرنے میں تقسیم کر دیے گئے۔

بنی خزرج کے سردار سعد ابن عبادہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے انصار نے جن جذبات و خیالات کا اظہار کیا تھا ان کی ترجمانی کی، حضورؐ نے سعد سے سوال کیا کہ "اس مسئلہ پر تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟" سعد نے روکھے پن سے جواب دیا "میں کبھی وہی محسوس کرتا ہوں جو میرے لوگ محسوس کر رہے ہیں۔"

حضورؐ نے سعد سے فرمایا کہ سارے انصار کو اکٹھا کیا جائے۔ جب سعد نے ابن عبادہ نے سارے انصار کو جمع کیا تو ان سے مخاطب ہوئے اور فرمایا "اے انصار

آج تمہارے متعلق میں کیا سن رہا ہوں؟ کیا تمہارے دلوں میں میرے تعلق سے میل آگیا ہے۔ کیا میں تمہارے پاس اس وقت نہیں آیا جبکہ تم غلطیوں پر غلطیاں کر رہے تھے کیا خدا تم کو راہ راست پر نہیں لایا؟ تم غریب تھے۔ خدا نے تم کو امیر کیا۔ تمہارے دل سخت تھے۔ خدا نے انہیں نرم کیا۔ کیوں جواب نہیں دیتے اے انصار؟

انصار نے جواب دیا کہ ہم کیسے آپ کو جواب دے سکتے ہیں؟ رحم و کرم اور سخاوت فیاضی تو صرف خدا اور اس کے رسول ہی کا حق ہے؛ حضور نے فرمایا کہ تم یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ آپ ہمارے پاس اس وقت آئے جبکہ لوگ آپ کو جھٹلا رہے تھے اور آپ کی باتوں پر ہم نے یقین کیا۔ لوگوں نے آپ کو تباہ کیا۔ ہم نے آپ کی مدد کی۔ آپ پریشان حال تھے۔ ہم نے آپ کو اپنے دلوں میں جگہ دی۔ آپ غریب اور نادار تھے۔ ہم نے آپ کے آرام و آسائش کا خیال رکھا۔ اگر تم نے یہ سب کچھ بھی کہا ہوتا تو اس میں مبالغہ آرائی نہیں بلکہ حقیقت بیانی ہوتی۔

کہا تمہارے ذہن اس بات سے پراگندہ ہیں کہ میں نے زندگی کی چند اچھی چیزیں ان لوگوں میں تقسیم کر دی ہیں جو ابھی ابھی مسلمان ہوئے ہیں تاکہ ان کی تالیف قلب ہو۔ ساتھ ہی ساتھ تم کو اس بات کے لیے چھوڑ رہا ہوں کہ تم اپنی نظریں اپنے اللہ پر لگائے رکھو۔ کیا تم اس بات پر مطمئن نہیں ہو۔ کہ دوسرے لوگ یہاں سے جاتے وقت اپنے ساتھ بھٹیر بکریاں لے جائیں اور تم یہاں سے جاتے وقت اللہ کے رسول کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔

اگر تمام لوگ ایک سمت کا رخ اختیار کریں اور انصار دوسری سمت پر چلیں تو میں انصار کے ساتھ چلوں گا۔ انصار پر خدا کی رحمتیں اور مہربانیاں ہوں۔ ان کے بچوں پر بچوں کے بچوں پر اور ان کے بچوں پر اللہ مہربان رہے۔ حضور کی اس جادو بیانی سے مدینہ کے لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اتنا روئے اتنا روئے کہ ان کی

دارُ حیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔

حضرت خیرازہ سے مکہ تشریف لے گئے۔ عمرہ ادا فرمایا۔ پھر آپ مدینہ واپس ہوئے۔
مدینہ اب حضورؐ کا گھر بن چکا تھا۔ آپ نے اپنے ایک نمائندہ کو مکہ کا گورنر مقرر کیا۔ اس
کے فرائض میں تھا کہ لوگوں کو اسلام سکھائے، قرآن پڑھائے۔

جو سال غنیمت تقسیم نہیں کیا گیا تھا۔ مدینہ لے جایا گیا۔ فاتحانہ شان سے آپ ۱۶
مارچ ۶۳۰ء کو مدینہ میں تشریف لائے۔

یادگار تاریخیں

| | |
|-------------------|---------------------------|
| مارچ ۶۲۸ ؍ | صلح حدیبیہ ؍ |
| فروری ۶۲۹ ؍ | مسلمانوں کا لکڑہاٹھ ؍ |
| ستمبر ۶۲۹ ؍ | موتہ کی جنگ ؍ |
| جنوری ۶۳۰ ؍ | مکہ پر قبضہ ؍ |
| یکم فروری ۶۳۰ ؍ | حنین کی جنگ ؍ |
| فروری، مارچ ۶۳۰ ؍ | طائف کا محاصرہ ؍ |
| ۱۶ مارچ ۶۳۰ ؍ | حضورؐ کی مدینہ کو واپسی ؍ |

ہجرتِ مدینہ

قارئین کو یاد ہو گا کہ معسر کے حاکم نے ایک عیسائی غلام لڑکی کو حضور کی خدمت میں بطور
نمختہ روانہ کیا تھا۔ اس لڑکی کا نام ماریہ تھا۔ حضور نے ماریہ سے نکاح کر لیا تھا، ماریہ کے
بطن سے ایک لڑکا تولد ہوا جس کا نام ابراہیم رکھا گیا اس لڑکے کا نام حضرت ابراہیم علیہ السلام
کے نام پر تھا حضور کے نزدیک ابراہیم علیہ السلام کا دین اسلام کے لیے ایک نمونہ تھا۔ تاریخ ۶۱۳ء
میں حبیبہ مدینہ واپس ہوئے ابراہیم نے ایک سال کی عمر میں وفات پائی۔ حضور اپنے صاحبزادہ
ابراہیم سے بہت پیار کرتے تھے۔ ابراہیم کی وفات سے حضور کو سخت صدمہ ہوا۔

حضرت ابراہیم کی وفات نے حضور اور بی بی ماریہ کو پہلے سے اور بھی زیادہ قریب
کر دیا حضور کی اس چاہت نے آپ کی تنگ مزاج بیوی حضرت حفصہؓ کو رقابت کی آگ
میں جھونک دیا۔ بی بی حفصہؓ عمر ابن الخطاب کی بیٹی تھیں۔ بی بی عائشہؓ بھی بی بی حفصہؓ
کو اکساری تھیں اور بی بی حفصہؓ کے جذبہ رقابت کی آگ پر اور تیل چھڑک رہی تھیں۔ ان
رقابتوں کی وجہ سے حضور کی گھر بٹو زندگی ابیرن بن گئی تھی۔ بہر حال ان گھر بٹو جھگڑوں پر
بہت جلد قابو پایا گیا۔

مکہ سے واپسی کے بعد حضور سات ہینے تک مدینہ میں رہے۔ ستمبر یا اکتوبر ۶۲۰ء
میں حضور نے مسلمانوں کو باز نطین سرحدوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ جاز کا موسم ان دنوں بہت
ہی گرم تھا۔ پانی اور چارے کی کمی تھی۔ اتنی بڑی فوج کی نقل و حرکت بھی دشوار معلوم ہو رہی

تھی۔ شاید موتہ کی شکست بھی بیزنطینی سرحدوں پر جانے سے مسلمانوں کو روک رہی تھی۔ یہ واضح نہیں ہے کہ ان ناموافق حالات اور غیر موزوں موسم میں حضورؐ اس مہم کی روانگی پر کیوں اصرار فرما رہے تھے جبکہ اگر دو مہینے اور انتظار کر لیا جاتا تو حالات مسلمانوں کے لیے اور سازگار ہو جاتے۔ یہ صحیح ہے کہ شمال کی طرف سے آئے ہوئے ایک تاجر نے حضورؐ کو یہ اطلاع دی کہ بزنطینی فوجیں ایک بڑی تعداد میں تبوک کے مقام پر جمع ہوئی ہیں۔ صرف اسی اطلاع کو کافی سمجھ کر فوجوں کا روانہ کرنا کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں معلوم ہوتی۔ تبوک کا جغرافیہ محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ بزنطینی فوجی مراکز سے دو سو میل دور تھا اور بزنطینی فوجوں کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ گرما کے موسم میں تبوک تک پہنچیں۔ گرما تو گرما تھا سادہ دنوں میں بھی ان کارگیستانی علاقوں کو پار کر کے یہاں تک آنا بہت ہی مشکل تھا اگر وہ گرما میں تبوک تک آنے کا ارادہ کرتے بھی تو ان کے لیے ان ہی مشکلات کا سامنا ہوتا جو اس موسم میں مسلمانوں کے سامنے تھیں یعنی پانی اور چارہ کی قلت وغیرہ۔

اس تکلیف وہ موسم میں عام عربوں کا اس مہم پر روانہ ہونے سے کتنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ ان کو تکالیف اور مصائب گوارا نہیں تھے بلکہ اس لیے کہ ان کو اپنے جانور بہت زیادہ عزیز تھے اونٹ اور گھوڑے ان کا بیش بہا سرمایہ ہوا کرتے تھے۔ اگر اس موسم میں وہ اپنے جانوروں کو ساتھ لے کر جنگ کے لیے روانہ ہوتے تو ان کو خطرہ تھا کہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے ان کے مویشی راستوں ہی میں ختم ہو جائیں گے۔

مدینہ کے باشندوں کی گزر بسر اکثر و بیشتر کھجوروں کی کاشت پر ہوا کرتی تھی۔ اکتوبر کا مہینا یوں بھی ان کے لیے پسی ہوئی فصل کو اکٹھا کرنے کا ہوتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضورؐ اور حضورؐ کے قریبی صحابہ چونکہ تجارت پیشہ تاجرانوں سے تعلق رکھتے تھے اس لیے مدینہ کے باشندوں کی زرعی مصروفیات کا احاطہ نہ کر سکے تعجب کی بات یہ ہے کہ حضورؐ اس موقع پر مصر رہے کہ مہم پر بہر حال روانہ ہونا چاہئے۔ اس تجویز پر اکثر لوگوں نے احتجاج کیا۔

حضور کے تعلقاً مسلمانوں سے ایسے تھے کہ جو بھی حضور کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا اسے کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ ہمیشہ آپ نے جمہوری طریقہ اختیار کیا۔ آپ ہر ایک کے مشورے کو غور سے سنا کرتے تھے۔

اس موقع پر بہت سے لوگوں نے بہانہ کیا کہ ان کی سواری کے اونٹ سفر کے قابل نہیں ہیں حضور نے مالدار مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ان لوگوں کو اونٹ فراہم کریں جن کے ہاں سواری کے اونٹ نہیں ہیں اگر اونٹ نہ دے سکتے ہوں تو رومی امداد دیں۔ حضرت عثمان ابن عفان نے اس اپیل کا بڑی ہی دریا دلی سے جواب دیا۔ ابن ہشام کے بیان کے مطابق حضور نے حضرت عثمان کی فیاضی کو دیکھ کر فرمایا "اے خدا میں عثمان سے خوش ہوں۔ تو بھی خوش ہو یہ کہا جاتا ہے کہ عبد اللہ ابن ابی نے اس موقع پر بھی ان لوگوں کے ساتھ ہمدردی بتانی شروع کر دی جو موسم کی ناموافقیت کو بہانہ بنا کر حضور کی ہم شریک ہونے سے تامل کر رہے تھے

حضور نے حکم دیا کہ فوجوں کو وداع کرنے کے لیے مدینہ کے شمال میں بانا عہدہ ایک نٹامیانہ ڈالا جائے۔ عام طور سے شام جانے والے قافلے روانگی سے قبل اسی مقام پر جمع ہوا کرتے تھے۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق عبد اللہ ابن ابی نے اپنا خیمہ حضور کے خیمے کے قریب ایک پہاڑی کے نشیب میں ڈالا۔ ایسا کرنے سے اس کا مقصد کیا تھا۔ واضح نہیں ہے لوگوں نے دیکھا کہ عبد اللہ ابن ابی کا خیمہ حضور کے خیمے سے بڑا تھا۔ ادھر حضور مہم کے لیے روانہ ہوئے ادھر عبد اللہ ابن ابی مدینہ واپس لوٹ گیا۔

اس مہم کی روانگی میں جن مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا ذکر قرآن کے سورہ توبہ میں ہے۔ ۳۸ ویں آیت اس طرح شروع ہوتی ہے کہ "مومنو۔ تمہیں کیا ہوا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو تم کاہلی کے سبب سے زمین پر گئے جاتے ہو۔ گھروں سے نکلنا نہیں چاہتے۔ کیا تم آخرت کی نعمتوں کو چھوڑ کر

دنیا کی زندگی پر خوش ہو بیٹھے ہو۔ دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابلے میں بہت ہی کم ہیں۔ اس کے بعد کی آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

”اگر تم نہ لکھو گے تو خدا تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا اور تمہاری جگہ اور لوگ پیدا کر دے گا اور تم اس کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکو گے۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔“

لوگ مہم پر روانہ ہو گئے۔ راستہ میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ حضرت علیؓ ابن ابی طالب حضورؐ کے ساتھ چلنے پر مصر تھے۔ حضورؐ نے انہیں اپنے ساتھ چلنے سے منع کر دیا۔ حضرت علیؓ کو مدینہ ہی میں ٹھہرا دیا گیا۔ حضرت علیؓ چونکہ مسلمانوں کے مانے ہوئے بہادر اور شجاع تھے اس لیے ان کا اس جنگ میں شریک نہ ہونا مسلمانوں کے لیے تعجب کا باعث بنا۔

مدینہ کے شمال میں ۸۰ میل دور الحجر کے قدیم اور افتادہ آثار پر سے مسلمانوں کا نذر ہوا۔ پٹر کی طرح یہاں بھی قدیم زمانے میں لوگ دریا و غاروں میں رہتے تھے۔ نئے گھروں کی نوعیت کچھ سی تھی گویا میں یہ نذر سے ٹھنڈے رہتے تھے اور سرما میں خشک اور گرم اس نوعیت کی یاد گاریں پٹر اور الحجر میں آج بھی نظر آتی ہیں کئی ایک کہانیاں اسلام سے قبل بیان کی جاتی تھیں جن میں الحجر کے پہاڑوں، غاروں، دروں اور گھروں کا ذکر تھا۔ ان میں ثمود قبیلے کے لوگ رہتے تھے۔ یقیناً ان کہانیوں میں صداقت ہوگی۔ ۱۵ قبل مسیح میں ایسریا کے بادشاہ کے فرمانوں میں اس قبیلے کا ذکر ملتا ہے قرآن کے بیان کے مطابق خدا نے اپنے ایک پیغمبر حضرت صالح کو ثمود کی ہدایت کے لیے روانہ کیا تھا۔ ثمود کے کمزور اور غریب لوگوں نے صالح کی بات مان لی۔ خدا کی طرف رجوع ہو گئے۔ لیکن قبیلہ کے امیر اور مغرور لوگوں نے صالح کا مذاق اڑایا۔ خدا کے پیغمبر کو دق کرنے لگے۔ ایذا رسانی سے پیش آتے رہے۔ صالح نے ان کو خدا کے عذاب سے ڈرایا۔ اس کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بالآخر زلزلے، کڑک اور بجلی نے ان لوگوں کو سطح زمین سے ہمیشہ کے لیے مفقود کر دیا۔

واقعہ تو یہ ہے کہ الجحر کے آثار آتش فشاں کے لاوے کے اندر دبے پڑے ہیں۔
عزلوں کا یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ بستی کی بستی آتش فشاں لاوے کے نیچے دب کر تباہ و
برباد ہو گئی۔

حضرت ابنی تبلیخ کے ابتدائی زمانے میں صالح پیغمبر کا ذکر سن چکے تھے۔ آپ اس
حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ کس طرح خدا کے اس پیغمبر کو اس قبیلے کے ہاتھوں تمسخر، مذاق
اور اذیت کی منزلوں سے گزرنا پڑا تھا۔ صالح پیغمبر پر تو کچھ بھی زنتی تھی۔ انہی منزلوں سے
حضرت کو بھی قریش کے سالدار اور امیر ترین لوگوں کے ہاتھوں گزرنا پڑا تھا۔ مکہ میں قرآن
کی جن آیتوں کا نزول ہوا۔ ان میں کئی مقامات پر اس واقعہ کو دہرایا گیا ہے۔ حضور
جب اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے اور قوت و طاقت کا مظہر بن گئے تو آپ نے صالح
پیغمبر سے تعابلی کا خیال اپنے ذہن سے نکال دیا۔

قرآن کے سورہ (ح) کی ۲۲ ویں آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔

”اور یاد کرو کہ جب اس نے تم کو قوم عاد کے بعد سردار بنایا اور زمین پر آباد کیا کہ
نرم نرم زمین سے محل تعمیر کرتے رہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر گھر بناتے رہو۔ پس
خدا کی نعمتوں کو یاد کرو۔ زمین میں فساد نہ کرتے پھرو۔“

اس کے بعد کی آیت میں ہے۔

”ان کی قوم میں سردار لوگ جو غرور رکھتے تھے، عزیز لوگوں سے جو ان میں سے
ایمان لے آئے تھے کہنے لگے مہلا تم یقین کرتے ہو کہ صالح اپنے پروردگار کی طرف
سے بھیجے گئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہاں جو چیز وہ دے کر بھیجے گئے ہیں۔ ہم اس پر
بلاشبہ ایمان رکھتے ہیں۔ منور سردار کہنے لگے کہ جس چیز پر تم ایمان لائے ہو
ہم تو اس کو نہیں مانتے۔“

وہی الفاظ صالح پیغمبر سے منسوب کئے گئے ہیں جو الفاظ حضور خود ادا کر

فرمایا کرتے تھے۔ حضورؐ تبوک کی مہم کے دوران خاص طور پر ثمود کے آثار کو دیکھ کر بہت سی متاثر ہوئے اس لیے کہ ان لوگوں کا ذکر اور ان کا حشر حضورؐ اکثر و بیشتر لوگوں کے سامنے بیان فرمایا کرتے تھے۔

اس مقام پر لوگ جب کنویں سے پانی نکالنے لگے تو اس پانی کو پینے سے مسلمانوں کو منع فرمایا۔ نہ صرف پینے سے بلکہ اس پانی سے وضو اور طہارت کی بھی ممانعت کر دی۔ آپ کو یقین تھا کہ وہاں بدروحیں گھومتی پھرتی ہیں اس لیے آپ نے لوگوں کو ہدایت کر دی تھی کہ اپنے خیموں سے باہر اکیلے نہ نکلا کریں۔ دوسرے دن صبح میں لوگوں نے شکایت کی کہ ان کے پاس پانی نہیں ہے۔ پانی نہ ہونے کے باوجود بھی مسلمانوں کو کنویں سے پانی نہ نکالنے کا حکم دیا گیا۔ مسلمانوں کی اس بے چینی کے پیش نظر حضورؐ نے دعا فرمائی اتنا پانی آسمان سے برساکہ لوگوں کی ساری ضروریات کی تکمیل ہوگئی۔

قرآن نے ہود کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہود قبیلہ عاد کی ہدایت و رہبری کے لیے روانہ کئے گئے تھے۔ ان کے اصل محل وقوع کی بابت قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لوگ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ وہ جنوبی عرب میں رہا کرتے تھے۔

حضورؐ سے قبل جن موحدین کا ذکر آیا ہے ان میں ایک پیغمبر شعیب بھی ہیں۔ ان کی تبلیغ کا مرکز مدائن تھا۔ یہ مجاز کے شمال اور اردن کے جنوب میں تھا۔ عمان کی ایک مغربی وادی میں اب بھی لوگ شعیب کا مقبرہ دکھلاتے ہیں۔

اور بھی کئی ایک موحدین کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ سوڈوم کے لوگوں کی ہدایت اور رہبری کے لیے خدا کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ لوگوں نے ان کا انکار کیا تعلیم دینے والوں کو اپنی بستی سے باہر نکال پھینکا۔ رسولوں کے انکار اور ان کی توہین کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر خدا کا عذاب نازل ہوا۔ زلزلے اور آسمانی بلاؤں نے ان کو صفحہ ہستی سے مٹا کر دیا۔ ان کا بھی وہی حشر ہوا جو ثمود کا ہوا تھا۔

ان پیاروں پیغمبروں کے پیغام کو اگر کسی نے قبول کیا تو وہ غریبوں نارادوں اور
سکینوں ہاں نے قبول کیا۔ انکار کیا تو سرمایہ داروں اور امیروں نے کیا۔ بالکل یہی رویہ
قریش کا حضور کے ساتھ بھی رہا۔ زمانہ قدیم کے عرب پیغمبروں کی تعلیم جن پر قدامت کی
بہر چھالی ہوئی تھی و حدانیت پر ہی مبنی تھی۔

سفر کی اس منزل پر حضور کی سواری کا اونٹ گھاس چرتے چرتے بہت آگے
نکل گیا۔ اس کی تلاش میں کافی وقت منانے ہوا۔ کسی نے طنزاً کہا کہ ”محمدؐ تو یہ دعویٰ
کرتے ہیں کہ آپؐ پیغمبر ہیں۔ آپؐ پر وہی نازل ہوتی ہے۔ کیا آپؐ یہ نہیں جانتے کہ
آپؐ کا اونٹ کدھر اور کس رخ گیا۔“

حضورؐ اپنے اعتماد کے آدمیوں کو مختلف خیموں میں روانہ کر دیتے تھے۔ وہ
عام لوگوں کے خیالات اور آپس کی گفتگو کی تفصیلات حضورؐ کے گوش گزار کریں۔ لوگوں
نے اس مہم پر جانے سے پہلے پوشش و پینج کا رویہ اختیار کیا تھا وہ دورانِ سفر بھی جاری
رہا۔ ان سب باتوں کے باوجود عام مسلمانوں کو حضورؐ سے جو محبت تھی آپس میں کسی قسم کی کوئی
کسی واقع نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ حضورؐ کی وہ مسلسل کامیابیاں تھیں جن سے آپؐ
دوچار ہوئے جا رہے تھے۔ اسلام کی ترقی، کامیابی اور عروج کا منبع آپؐ کی ذات گرامی
تھی۔ جب تک مسلمانوں کی تعداد بہ حیثیت مجبوشی دو ہزار سے کم تھی اس وقت تک
مکہ کا آدمی ہو یا مدینہ کا شہری ہو یا دیہاتی، چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب ہر ایک
کی حضورؐ سے آشنائی تھی۔ ہر ایک حضورؐ کے ذاتی اثر میں تھا۔

جب مسلمانوں کی تعداد دس ہزار سے تجاوز کر گئی تو ذاتی اور شخصی تعلقات کی
نوعیت میں تبدیلی آئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے لوگوں نے اسلام
محض اس لیے قبول کر لیا تھا کہ ان کے نزدیک اسلام کا قبول کرنا دنیا کی آسان ترین
بات تھی۔ ماحول ایسا بن چکا تھا جس میں بت پرست رہنا ان کے لیے خطرناک ترین

بات تھی۔ اس پاس کے سارے قبیلے مسلمان ہو چکے تھے اور رٹنے کی چوٹ اپنی قبولیتِ اسلام کا اعلان کرتے رہتے تھے۔

بدوی قبیلوں کی معاشرتی زندگی کا خاصہ یہ رہا ہے کہ ان میں آپس میں اتحاد و اتفاق پایا جاتا تھا۔ ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب رہا کرتے تھے۔ ان کا لڑائی زندگی رہن سہن، ان کا انداز فکر مسائل سے نمٹنے کا طریقہ۔ ان سب میں اشتراک پایا جاتا تھا۔ جب ان قبیلوں میں سے ایک قبیلے کا سردار حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اپنے آپ کو مطمئن کر کے اسلام قبول کر لیتا تو اس کی وجہ سے نہ صرف اس کا سارا قبیلہ اسلام قبول کر لیتا بلکہ اس کے قبیلے سے دوستی رکھنے والے قبیلے بھی مسلمان ہو جایا کرتے تھے۔

اب جو لوگ مسلمان ہو رہے تھے ان کی بنیاد سیاست پر تھی نہ کہ ایمان اور عقیدے پر۔ جو قبیلے ایک کے بعد ایک مسلمان ہوتے جا رہے تھے ان میں سے بہت سے ایسے تھے جنہوں نے اس وقت تک نہ کبھی حضورؐ کو دیکھا تھا اور نہ ہی آپؐ کی تعلیمات اور ایمان اور عقیدے کا۔ ان کے ذہنوں میں واضح خاکہ تھا۔ بتوک کے مقام پر مسلمان رک گئے ایبہ کے گورنر یوحنا بن ربیع نے بتوک آ کر عزت و احترام سے حضورؐ کا استقبال کیا۔ ایک معاہدے کی تشکیل عمل میں آئی۔ ایبہ کے باشندے عیسائی تھے۔ ان کا گورنر بھی ان ہی میں سے کوئی ایک رہا ہوگا۔ وہ کوئی بازنطینی افسر نہیں تھا گورنر نے اس شرط پر مسلمانوں کو جزیہ ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی کہ مسلمان ایبہ کے لوگوں کی حفاظت کا ذمہ لیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایبہ کے لوگ زیادہ تر تجارت پیشہ تھے۔ حضورؐ نے ان سے وعدہ فرمایا کہ مسلمان ان کے جہازوں اور تجارتی کاروانوں کی حفاظت اپنے ذمے لے لیں گے۔

یہ معاہدہ آگے چل کر مسلمانوں کے لیے ایک نمونہ بن گیا۔ جہاں بھی مسلمان گئے اور جس ملک کو بھی انہوں نے فتح کیا غیر مسلموں سے اسی قسم کا معاہدہ کیا۔ یہودیوں اور عیسائیوں پر کوئی دباؤ اس قسم کا نہیں ڈالا گیا کہ جبراً وہ اپنے مذہب کو ترک کر کے اسلام

قبول کر لیں۔ جب تک وہ حیرت ادا کرتے رہیں۔ ان کے جان و مال کے حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں کے سر باندھی تھی۔ ایدہ کے مشرقی حصوں میں رہنے والے مسلمانوں نے بھی اپنی غایت کجی کہ مسلمانوں کو جزیرہ ادا کر کے اپنی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں کو سونپ دیں۔ جبراً اور اذرح جو ایدہ سے اسی میل دور تھے ان ہی علاقوں میں شامل تھے۔

اذرح کسی زمانے میں رومی فوج کا ایک مرکز بھی رہ چکا تھا۔ یہاں پر جو فوجی چھاؤنیوں تھیں ان کے آثار باقی بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس علاقے پر باز نغینوں کی بالادستی تھی۔ حضورؐ کے خالد ابن ولید کو طلب فرمایا۔ فوج کے ایک دستے کے ساتھ دوستہ البندل روانہ کیا۔ دوسرے حکمران ایک عیسائی عرب تھا۔ اس کا نام اکیدرا بن عبد الملک تھا۔ کنذانی قدیم خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ یہ حکمران اپنے بھائی کے ساتھ شکار پر گیا ہوا تھا۔ خالد نے حکمران کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بھائی کو قتل کر دیا۔

خالد ابن ولید کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ انہوں نے کسی بھی مشن کو اس وقت تک پورا نہیں کیا۔ جب تک کہ بہم کے دوران کسی نہ کسی کا قتل نہ کر دیا۔ حکمران کو گرفتار کر لیا جا چکا تھا۔ وہ رشیم و دکزاب کا ایک قیمتی جیہہ پہنے ہوا تھا۔ اس کے جیہہ پر اصلی سونے کا کام کیا ہوا تھا۔ خالد نے حکمران کے جیہے کو پھلے سے ایسا کھینچا کہ وہ پھٹ کر تارہ تار ہو گیا۔ خالد نے اپنی واپسی سے قبل ہی اس جیہے کو حضورؐ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ سیدھے سادے عسکریوں کے لیے ایسا مزاح جیہہ انتہائی تعجب اور حیرت کا باعث بنا۔ ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ لوگ حیرت سے اسے بار بار چھوتے تھے اور حیرت سے تکتے تھے۔ ان کے اس تاثر کو دیکھ کر حضورؐ نے ان سے سوال کیا: ”کیا تم کو یہ کپڑا پسند ہے؟ پھر فرمایا: ”اس خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے جنت میں سعد ابن معاذ جو کپڑا۔ اپنی ناک اور منہ صاف کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں وہ اس

کپڑے سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔ واضح رہے کہ مدینہ کے محاصرہ کے وقت سعد ابن معاذ کو گہرا زخم لگا تھا جس کے اثر سے بعد میں وہ انتقال کر گئے تھے۔

اکیدر کو بطور جنگی قیدی حضورؐ کی خدمت میں لایا گیا۔ حضورؐ نے اکیدر سے بات چیت کی۔ فریقین کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ مسلمانوں کو وہ معمول ادا کرنے پر رضامند ہو گیا۔ اپنی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں کو سونپ دی۔ حضورؐ نے اس کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا۔ نہ اس پر کوئی دباؤ ڈالا گیا اور نہ ہی اس پر سختی کی گئی۔ اکیدر کا درباری لباس اور اس کا یہی مذہب اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ شاید قسطنطنیہ گیا ہوا تھا۔ بیزنطینی اتنے کمزور تھے اور اتنی دور رہتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف اس حکمران کی نہ حمایت کر سکتے تھے اور نہ ہی اس کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر سکتے تھے۔ خالد اپنے قیدیوں کے ساتھ نرمی برتنا تو جانتے ہی نہیں تھے۔ حضورؐ کے انتقال کے بعد خالد دوم گئے، اکیدر کو قتل کر ڈالا۔ وہاں کے حکمرانوں کو معزول کیا۔ انہیں وہاں سے مار بھگایا۔

تبوک میں مسلمان صرف دس دن رہے۔ یہاں سے پھر وہ مدینہ واپس ہوئے؛ مدینہ میں ابتدائی قیام کے دوران مسلمان بہت ہی اتحاد و اتفاق سے رہا کرتے تھے۔ ان کے معاملات میں حضورؐ بذات خود دل چسپی لیتے تھے۔ سربراہوں سے مل کر ان کے آپس کے تنازعات کو حل کر دیتے تھے۔ اسی طریقہ کار کی مثال ہم کو تبوک میں بھی ملتی ہے اگرچہ کہ یہ اختلاف ایک مختلف نوعیت کا تھا اور بڑے پیمانہ پر تھا۔

حضورؐ کے مختلف ہمات پر جو دشنے رہا کرتے تھے ان کی حیثیت نہ صرف حضورؐ کے محافظین کی ہوتی تھی۔ بلکہ ان کے ذریعہ حضورؐ کی اہمیت اور حضورؐ کا مقام بھی دوسروں کو بتلانا مقصود ہوتا۔ عظمت و شان کا یہ مظاہرہ مقامی سرداروں اور قبیلوں کے رہنماؤں پر اثر ڈالنے کے لیے کافی سے زیادہ تھا۔ جب وہ حضورؐ کو جھڑپ میں دیکھتے

تو قریب آنے کی کوشش کرتے تھے اور حضورؐ کے ارشادات کو غور سے سنا چاہتے تھے۔ حضورؐ کی قربت اور ارشادات وہ موثر ترین حربے تھے جن کی بدولت لوگ اسلامی عقاید کو تیزی سے قبول کرنے لگے تھے۔ اسی طرح حضورؐ کی ذات گرامی علوم میں مقبول سے مقبول تر ہوتی گئی۔

تمام فوجی ہموں کے لیے اسلام میں بدعز وہ "یا سریرہ" کی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ جس جنگ میں حضورؐ نے بذات خود شرکت فرمائی اسے عزوہ کا نام دیا گیا۔ جس جنگ میں آپؐ نے شرکت نہیں کی اسے سریرہ کہا جاتا ہے۔

۱۹۲۰ء میں اسی قسم کی صورت حال سے مجھے بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔ میں اس بات کا شاہد ہوں کہ اس قسم کے حملے عرب میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ اس قسم کے حملے عرب میں بہت عام ہیں۔ خود ابن سعود اپنی رہنمائی میں مختلف قبیلوں سے ہزاروں افراد کو جمع کر کے وقتاً فوقتاً حملے کیا کرتے تھے۔ بدوی علوماً چھوٹے پیمانے پر حملہ کرنے کو ترجیح دیتے تھے تاکہ اگر کامیابی ہو تو فریق مقابل کا سارا مال صرف ان ہی کے قبیلے کے ہاتھ آئے۔ یہ قبیلے بڑی ہی بے رخی بے دلی کے ساتھ ابن سعود کی مہمات میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اس لیے کہ ابن سعود کی مہمات سیاست پر مبنی تھیں اور سیاسی لڑائیوں میں مالِ غنیمت ایک ضمنی بات ہو کر رہ جاتی ہے۔ قبیلے کے لوگوں کو سیاست سے دل چسپی نہیں تھی۔ وہ صرف لوٹ مار کی خاطر ان مہمات میں حصہ لینا چاہتے تھے۔ چونکہ انفرادی طور پر قبیلے کے لوگوں کو ابن سعود کی مہمات میں حصہ لینے سے کم فائدے کی امید رہا کرتی تھی۔ اس لیے وہ بادل نخواستہ ابن سعود کا ساتھ دیا کرتے تھے۔

تبوک کے موقع پر ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ کے ساتھ کچھ ایسے بھی مسلمان تھے جنہوں نے خلوص دل سے نہ اسلام قبول کیا تھا اور نہ ہی ان کے ایمان پر بھروسہ

کیا جاسکتا تھا۔ یہ لوگ محض مالِ عنیمت کی خاطر حضور کے ساتھ ہو گئے تھے۔ منافقین اس موقع پر حضور کی ہمراہی سے جو کترارہے تھے وہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ ان کے خیال میں حضور کی موجودگی سے ان کو دھاندلی کرنے کا موقع نہیں ملے گا اور مالِ عنیمت ان کے ہاتھ بہت ہی کم آئے گا۔

حضور کے تبرک روانہ ہونے سے قبل مدینہ کے مسلمانوں کی ایک جماعت حضور کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ عرض کیا کہ انہوں نے ایک مسجد تعمیر کی ہے۔ بیماروں، حاجت مندوں اور نپاہ گزینوں کو سردیوں کی راتوں میں ٹھہرانے کے لیے مسجد استعمال میں لائی جائے گی۔ حضور سے درخواست کی گئی کہ آپ مسجد کا افتتاح فرمائیں اور وہاں نماز ادا فرمائیں۔

حضور نے جواب دیا کہ اب تبرک جانے کی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ وہاں سے واپسی پر انشاء اللہ مسجد کا افتتاح کیا جائے گا۔ یہاں تک تو اس واقعہ میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

جب تبرک سے واپسی ہو رہی تھی تو حضور نے مدینہ سے ۵ میل دور اپنی فوجوں کو رک جانے کا حکم دیا۔ یہاں سے آپ نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو حکم دے کر روانہ کیا کہ وہ اس مسجد کو سرے سے مہدم کر دیں۔ اس کا نشان تک باقی نہ رکھیں۔ اس کی باقیات کو نذر آتش کر دیں۔ حضور کے مبتعین نے وہی کیا جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ مسجد جلادی گئی۔ جو لوگ مسجد میں مقیم تھے بھاگ گئے۔

مسجد کو سمار کر دیے جانے کی توجیہ یہ دی جاتی ہے کہ نئی مسجد مسلمانوں کی پہلی مسجد قبار کے نزدیک اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ قبار میں مسلمانوں کا جو اجتماع ہوا کرتا تھا وہ بٹ جائے۔ ان میں تفرقہ پڑ جائے۔

ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس مسجد کو تعمیر کرنے والے ابو عامر کے ماننے والے تھے۔ ابو عامر ایک راہب تھا۔ حدیث کو تسلیم کرنے کے باوجود حضور کی رسالت

لا قابل نہیں تھا۔ قسطنطنیہ ہجرت کر گیا تھا وہاں سے اس نے ایک پیغام روانہ کیا کہ وہ
بیزنطینیوں کی ایک بہت بڑی فوج لے کر مدینہ پر قبضہ کرنے آ رہا ہے۔ اس نے اپنے ماتے
والوں کو ہدایت کی تھی کہ اس کے لیے ایک نئی مسجد بنائی جائے۔

غالباً ابو عامر کی شہادت اسی کی وجہ سے مدینہ میں یہ افواہ گرم ہوئی تھی کہ مدینہ
کے شمال میں بیزنطینی فوجیں جمع ہو رہی ہیں۔ جس نوعیت سے یہ روایت ہم تک پہنچی ہے
بڑی ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ بیزنطینی سلطنت اہمالی کمزور ہو چکی تھی۔ ایران سے
مسل ۲۶ سال تک برس برس پیکار ہونے کے سبب بیزنطینیوں میں ایک انتشاری کیفیت تھی۔
اپنی ساری عظمت سے یہ لوگ ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ انحطاط، پستی اور قومی منزل کا یہ
حال تھا کہ مدینہ سے ۵۰ میل دور رہنے کے باوجود ایلبا، ہربا اور اذرح کے لوگ
مسلمانوں کی پناہ کے طالب تھے۔ اپنی جان و مال کی حفاظت تک وہ نہیں کر سکتے تھے۔
مسلمانوں کا اسرا ڈھونڈ رہے تھے۔ اس وقت بھی جبکہ رومی شہنشاہیت کا سورج اپنی پوری
آب و تاب سے چمک رہا تھا اور میوں کو حجاز پر قبضہ کرنے میں کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔
اگر ابو عامر اور بیزنطینی مدینہ پہنچنے کی کوشش کرتے بھی تو برسوں کی نہیں تو کم از کم مہینوں
کی تیاری اس کے لیے انہیں درکار ہوتی۔ اس تیاری کا کہیں نام و نشان بھی ہمیں دکھائی
نہیں دیتا۔

ہو سکتا ہے کہ قدیم زمانے کے مسلم مورخین اور تبصرہ نگاروں پر بھی مسجد ضرار کی
معماری کا وہی پر وہ حائل ہو جو آج ہمارے سامنے ہے۔ اس مسجد کو سمار کے جانے کا
منشا کیا تھا وہ ابھی تک سمہ بنا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مسجد کی تعمیر کے والوں کی
پشت پر وہ لوگ تھے جن کو غیر ملکی بڑی طاقتوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس لیے آج کی
بیسویں صدی کی ذہنیت کے پیش نظر اس مسجد کو سمار کیا جانا حق بجانب نظر آتا ہے۔
مسجد ضرار کا تعلق ابو عامر سے بتایا جاتا ہے۔ اس کے معماروں کے تعلق سے بھی

شہ ہے کہ وہ ابو عامر کے حالی موالیوں میں سے تھے۔ یہ لوگ غالباً موجد تھے مگر ایک ساتھ حضور کی رسالت کے منکر تھے۔ ایک طرف رسالت کا انکار اور دوسری طرف اس رسول کو عبادت کے لیے اپنی مسجد میں مدعو کرنا یقیناً اس مسجد کی تباہی کا باعث بنا ہوگا قرآن کے سورہ توبہ میں جہاں تبوک پر جانے کے لیے مسلمانوں کے روقدح کا ذکر ہے وہیں اس مسجد کا بھی ذکر آیا ہے۔

۱۶ ویں آیت میں ارشاد ہوا ہے۔

”مشرکوں کو زیب نہیں دیتا کہ خدا کی مسجدوں کو آباد کریں جبکہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہیں۔ ان لوگوں کے سبب اعمال بے کار ہیں۔ یہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔“

اسی سورہ کی ۱۰۷ ویں آیت میں پھر بیان ہوتا ہے۔

”تم اس مسجد میں کبھی جا کر کھڑے بھی نہ ہونا۔ البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔ اس قابل ہے کہ اس میں جایا اور نماز پڑھایا کرو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور خدا پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“ اس وقت مسلمان دوسری جگہوں پر کئی ایک مسجدوں کی تعمیر میں مصروف تھے۔ کوئی وجہ ایسی ضرور ہوگی جس کی بنا پر اس مسجد کی تعمیر پر اتنے شد و مد خدا اور اس کے رسول کی طرف سے ناپسندیدگی کا اظہار ہوا۔

حضور حبیب مدینہ کو واپس ہوئے تو تین مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے انہوں نے اقرار کیا کہ وہ حضور کے ساتھ تبوک کی مہم پر نہیں گئے تھے۔ انہوں نے بظاہر حضور کو اس دھوکے میں رکھا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ جنگ میں شریک ہو رہے ہیں۔ حضور روانہ ہو گئے وہ تینوں مدینہ میں چھپ گئے۔ حضور کے واپس آنے کے بعد ان تینوں نے خفت اور مذمت محسوس کر کے اپنے دل کی آواز پر لبیک کہا اور حضور کے آستانہ

پر حاضر ہو کر حقیقت حال کا اظہار کر دیا۔

حضورؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ سزا کے طور پر ان تینوں سے بات چیت بند کر دی جائے۔ حضورؐ کے اس فرمان کا اثر یہ ہوا کہ نہ صرف عام مسلمان بلکہ ان کے افراد خاندان نے بھی ان سے بات کرنی ترک کر دی۔

بات چیت بند کروانے کے چالیس دن بعد حضورؐ نے ان تینوں کو حکم دیا کہ وہ بغیر طلاق دیے ہوئے اپنی بیویوں کو ان کے سیکے روزانہ کر دیں اس سزا کے پچاسویں دن حضورؐ نے مسجد میں نماز فجر کے بعد مسلمانوں سے خطاب کیا۔ فرمایا کہ خدا نے ان تینوں کے گناہوں کو معاف کر دیا ہے۔ ان تینوں کے درست احباب دوڑتے ہوئے اپنے معتوب دوستوں کے ہاں گئے۔ دور سے انہیں کہا کہ کعب بن مالک خوش خبری ہے۔ بلال ابن امیہ خوش خبری ہے۔

کعب ابن مالک کی ایک جانی ہنسی پانی شخصیت تھی۔ یہ ایک معروف شاعر تھے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ اس خوش خبری کے ملنے پر میں حضورؐ کی تلاش میں نکلا۔ لوگ راستے میں مجھ سے ملے رتب۔ خدا کے معاف کر دینے پر مجھے مبارک باد پیش کرتے رہے۔ جب میں نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا تو حضورؐ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا: "آج کا دن تمہاری زندگی کا بہترین دن ہے۔ یہ خوش خبری تم کو مبارک ہو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ مبارک باد حضورؐ کی طرف سے یا خدا کی طرف سے۔ حضورؐ نے فرمایا: "یقیناً خدا کی طرف سے ہے۔" جب بھی حضورؐ دوسروں کو کوئی خوش خبری سنایا کرتے تھے تو آپ کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکتا رہتا تھا۔

حضورؐ کے رو بہ رو میں باادب بیٹھ گیا۔ نیاز مندانہ عرض کیا کہ میں اپنی جاہلاد خدا اور خدا کے رسول کی خدمت میں پیش کرنا ہوں۔ اس واقعہ کو اتنی تفصیل سے بیان کرنے کا منشا محض حضورؐ اور مسلمانوں کا آپس کا تعلق اور ان کے درمیان ہونے والے

ناز و نیاز کو ظاہر کرنا ہے۔ حضور کا جواثر مسلمانوں پر تھا وہ بھی اس واقعہ سے آشکار ہے۔ مسلمانوں کا ایمان اور عقیدہ جو اپنے رسول کے تعلق سے تھا وہ بھی نمایاں ہے سورہ توبہ میں جہاں تبوک کے موقع پر مختلف بدگمانیوں کا ٹسکار ہونے والوں کا ذکر ہے وہیں اس سزا کا بھی ذکر ہے جو ان تین مسلمانوں کو دی گئی تھی۔

۱۱۷ اور ۱۱۸ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ ”ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان پر دو بھر جو گئیں اور انہوں نے جان لیا کہ خدا کے ہاتھ سے خود اس کے سوا کوئی پناہ نہیں۔ پھر خدا نے ان پر مہربانی کی۔ تاکہ توبہ کریں۔ بے شک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔“

اسے اہل ایمان خدا سے ڈرنے رہو اور راستبازوں کے ساتھ رہو،
مدینہ واپس ہو جانے کے بعد ڈسمبر ۶۳۰ء میں حضورؐ کی خدمت میں طائف کا ایک نمائندہ کسی ایک معاہدے کی تشکیل کے سلسلے میں آیا۔ حضورؐ سے بات چیت کرنے کے بعد یہ نمائندہ خود مسلمان ہو گیا۔ یہ جب طائف واپس پہنچا تو اپنے گھر کی کھڑکی میں سے جھانک کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔

لوگوں نے حملہ کر کے اسے جان سے مار ڈالا۔ مدینہ روانہ ہونے سے قبل وہ طائف کا ایک مقبول ترین باشندہ تھا۔ اسی لیے وہ بطور نمائندہ روانہ کیا گیا تھا۔ طائف میں ثقیف قبیلے کے لوگوں کی اکثریت تھی۔ چند ماہ بعد ان لوگوں نے محسوس کیا کہ اب دن و دن رات جو گنی ترقی کرنے والے اسلام کی مخالفت کرنا بے سود ہے۔ اسلام کی مخالفت اب ان کے بس کی بات نہیں رہی۔ ان کے آس پاس اور جو قبیلے رہتے تھے انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ طائف کے لوگوں کی چیرٹی ہوئی بکریاں خدا کا نام لے لے کر اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ طائف کے رہنے والوں کے

کاروانوں کو مال غنیمت سمجھنے لگے تھے۔ بن سب باتوں کے ہمیش نظر ان لوگوں کے اپنا دوسرا وفد حضورؐ کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس وفد کے چھ ارکان تھے۔ ہر رکن ایک قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔

حضورؐ نے ان کے لیے ایک خیمہ مسجد کے قریب ڈلوایا۔ انہوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ وہ اپنا سر نیاز جھکانے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ علقہ بگوش اسلام ہونا چاہتے ہیں۔ شہرِ طمرت پر پیش کی کہ معاہدہ تحریری صورت میں ہو۔ ان کی جان و مال اور مویشیوں کی حفاظت اور سلامتی کی ضمانت دی جائے۔

ایک نیا الجھاوا درمیان میں آیا۔ وفد کے اراکین نے حضورؐ سے کہا کہ وہ اسلام تو قبول کر ہی رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے نسوانی خدالات کو تین سال تک ان کو اپنے قبیلے میں رکھنے کی اجازت دی جائے۔ حضورؐ نے ان کی درخواست کو فوراً مسترد کر دیا۔ اب انہوں نے حضورؐ سے میاد کے تعلق سے سودا بازی شروع کر دی۔

تین سال کو گھٹا کر انہوں نے دو سال کہا۔ دو سال سے ایک سال پر اتر آئے۔ ایک سال سے چھ مہینے پر اور اترتے اترتے ایک بہینہ پر حضورؐ قطعاً اس بات پر راضی نہیں ہوئے۔ آپ نے ابوسفیان کو ان کے ساتھ روانہ کیا تاکہ وہ جا کر اپنی موجودگی میں لات کو سمار کر وادیں۔ حضورؐ نے ابوسفیان کو ان کے ساتھ روانہ کر کے انتہائی دانشمندی کا ثبوت دیا۔ وہی ابوسفیان جو چند ماہ پہلے بتوں کا رکھوالا تھا۔ اب بت شکن کے لیے چنا گیا۔

اس وفد نے حضورؐ سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ ان کو نماز سے مستثنیٰ رکھا جائے ان کے نظروں میں رکوع اور سجدہ ناشائستہ اور گری ہوئی حرکات تھیں۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ نہ ہب میں کوئی شخص اچھا اس وقت تک بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ نماز کو نہ اپنائے۔ نمائندوں کو حضورؐ کی یہ بات قبول کرتے ہی بنی۔

حضور نے طائف کے نمائندوں میں سے ایک کو چنا۔ اس کے ذمہ یہ کام لگایا گیا۔ کہ وہ طائف کے لوگوں کو نماز پڑھنا سکھائے۔ آپ نے راز و راز طریقے سے اپنے چنے ہوئے آدمی کو فرمایا کہ نمازوں کو مختصر رکھا کرو۔ جب تم نمازیوں کا جائزہ لو تو اپنے ذہن میں کمزور اور ضعیف لوگوں کو رکھا کرو۔ نماز پڑھنے والوں میں بوڑھے، جوان، بیمار اور کمزور سب ہی شریک ہوتے ہیں نمازوں کو طویل کر کے ان کو زحمت اور تکلیف نہ دو!

انسان کے فطری تقاضے ہمیشہ آپ کے پیش نظر ہوتے تھے۔ انسانی کمزوریوں اور مجبوریوں پر آپ کی نظر رہتی تھی۔ ان ہی کو روشنی میں جب بھی آپ کچھ طلب کرتے تو اعتدال پسندی اس طلب کا محور بنی رہتی تھی۔ رہائیت اور خود کو سمجھانے کے۔ آپ ہمیشہ مخالفت رہے۔ اپنی اپنی پسند کی عاید کردہ زحمات کو آپ نے کبھی پسند نہیں فرمایا۔ حضور کے انتقال کے بعد آپ کی امت نے ان ہی باتوں کو جزو زندگی بنانے کی کوشش کی جس کو آپ نے کبھی بھی قبول نہیں کیا تھا۔ حضور نے فرمایا ہے کہ "خدا نے ہم کو تباہ و برباد کر لینے کا تو کہیں حکم نہیں دیا ہے" اس کے باوجود دن کی ۵ نمازیں اور رمضان کا پورا مہینہ روزہ رکھنا کچھ کم مجاہدہ نہیں ہے۔ یہ دونوں عبادات زندگی میں کچھ کم نظم و ترتیب پیدا نہیں کرتیں۔

طائف کا یہ وفد مدینہ سے واپس ہوتے ہوئے عجیب گھبراہٹ اور پریشانی کی حالت میں تھا۔ ان میں سے ہر ایک اس خیال سے ہراساں تھا کہ نہ معلوم طائف جانے پر ان کا شریک کیا ہو۔

ابوسفیان کولات کی تارا جی کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔ اس کام کو کرنے سے قطعی انھوں نے انکار کر دیا۔ طائف سے باہر ان کا مکان تھا۔ وہاں جا کر فروکش ہو گئے۔ طائف ہی کے رہنے والے ایک اور مسلمان صاحب المعیزہ ابن شیبہ نے اپنی درانتی سے لات کو توڑ دیا۔ لات کے گلے میں سونے اور جواہرات کی مالا تھی۔ اسے اتار لیا گیا۔ جس پوشیدہ خزانے پر اسے براجمان کیا گیا تھا وہ خزانہ بھی زمیں سے نکال لیا گیا۔

رات کو بیت میں وقت پاش پاش کیا جا رہا تھا۔ طائف کی ساری کی ساری عورتیں وہاں جمع ہو گئیں۔ پریشان حال، کھٹے بال، سو بچھے ہوئے گالوں کے ساتھ نوحہ خروالی میں منسروٹ تھیں۔ ان کی نظر میں جو دیوی پورے طائف والوں کی محافظ سمجھی جاتی تھی اب اسی مقام کے ناہنجارا اور نیردل مردوں کی موجودگی میں خاک کا تودہ بنی جا رہی تھی۔

مکہ فتح ہو جانے کے بعد پہلی جمعہ کے موقع پر حضورؐ نے حضرت ابو بکرؓ کو مکہ روانہ فرمایا تاکہ وہ اپنی نگرانی اور قافلہ سالاری میں لوگوں کو جمع کر دے۔ حضرت ابو بکرؓ پہلے ایڑتج تھے جنہوں نے اسلامی مکہ میں مسلمانوں کو جمع کروایا۔ جب حضرت ابو بکرؓ مکہ جانے کی طرف سے مدینہ سے روانہ ہو چکے تو حضورؐ پر وحی نازل ہوئی۔ حضورؐ نے وحی لکھ کر حضرت علیؓ کے ذریعہ حضرت ابو بکرؓ کے ہاں روانہ کی۔ حج کی ساری رسومات ادا کی گئیں، اس موقع پر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں نے بھی حج ادا کیا۔

حج کے دوران منیٰ میں جب حاجیوں کا اجتماع ہوا تو حضرت علیؓ نے ان آیات کی تلاوت کی جو حضورؐ پر نازل ہوئی تھیں اور جن کو حضورؐ نے حضرت علیؓ کے ہاتھ حضرت ابو بکرؓ کے ہاں روانہ کیا تھا۔ اس پیغام میں مختصراً یہ تھا کہ بت پرستوں کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے اس مدت کے اختتام پر مسلمان ان پر جنگ کا اعلان کر دیں گے۔

اس مدت کے اختتام پر مشرکوں کی جان و مال کی ذمہ داری نہیں رہے گی، بت پرست اب جہاں کہیں بھی ملیں گے ان کے ساتھ سختی سے پیش آیا جائے گا۔

صرف وہی بت پرست اس اعلان سے مشتعل رہیں گے جن کو معاہدہ کے ذریعہ جان و مال کی سلامتی بخشی گئی ہے۔ یہ جان و مال کی سلامتی صرف اتنے ہی عرصہ تک کے لیے رہے گی۔ جس کا معاہدہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ ایک اور نئی بات کا اعجاز اس طرح سے ہوا کہ آئندہ سے صرف مسلمان ہی حج کے فرائض ادا کریں گے۔ خانہ کعبہ میں جہاں ایک سال پہلے تک ان کے آبائی بت بڑے ہی احترام اور عزت و شان کے ساتھ

جلوہ افروز تھے۔

برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔

یہ سارے احکامات قرآن پاک کے سورہ توبہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس سورہ کا آخری حصہ توبہ کی مہم کے سلسلے میں ہے۔ اس سورہ کی آیات واقعاتی تسلسل کے اعتبار سے ترتیب میں نہیں ہیں۔

سورہ توبہ کی پہلی آیت میں ارشاد ہوا ہے۔

”خدا اور اس کے رسول کی طرف سے مشرکوں سے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا بیزاری اور جنگ کی تیاری ہے“

ان احکامات کے انطباق کا حکم صرف مشرکوں کے لیے تھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے نہیں تھا۔ ان سے تشدد برتنے کے لیے نہیں کہا گیا۔

فروری ۶۳۱ء میں عبداللہ ابن ابی کا انتقال ہوا۔ بستر مرگ سے اس نے حضور کی

خدمت میں پیغام روانہ کیا۔ حضور سے التجا کی کہ حضور اس کی نماز جنازہ میں شریک ہوں۔

قبر پر فاتحہ پڑھیں۔ عبداللہ ابن ابی کی ایک ایک بات حضرت عمرؓ کے ذہن میں نمود کہ

آئی۔ حضرت عمرؓ نے حضور سے شکایت آمیزانہ لہجے میں درخواست کی کہ عبداللہ ابن ابی

کے جنازے میں شرکت نہ کی جائے۔ رحمۃ اللعالمین نے مرنے والے کی آخری خواہش کا

پاس رکھا۔ عبداللہ ابن ابی کا کردار شش و پنج میں گھرا ہوا کردار تھا۔ وہ غالباً حضورؐ

سے حسد کرتا تھا۔ حضور کے مدینہ میں تشریف لانے کی وجہ سے اس کی سرداری ختم ہو کر

رہ گئی تھی۔ اس کے ایمانی جذبے نے کبھی بھی اسلام کی خاطر تلوار نہیں اٹھائی۔ وہ شروع

ہی سے لڑائیوں سے کتراتا تھا گھبراتا تھا۔ اسلام کی آمد سے قبل بھی جبکہ بنی ادس اور

بنی خزرج میں لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو غیر جانبدار رکھا تھا۔

مورخین میں گھناؤنے طریقے سے عبداللہ ابن ابی کے کردار کو پیش کرتے ہیں اس کے

میش نظر یہ بات کہی ہا سکتی ہے کہ اگر وہ واقعی ویسا ہی براتھا جیسا اسے بتایا جاتا ہے کہ حضورؐ کے لیے یہ بہت ہی آسان بات تھی کہ اسے قتل کر دیتے جیسا کہ اس سے کم درجے کے ظالمین کے ساتھ ہوا ہے۔

روایات تو یہاں تک ہیں کہ اس کے بیٹے نے اپنے باپ کو قتل کر دینے کی خود حضورؐ کو پیش کش کی تھی مگر حضورؐ نے اس کی درخواست کو رد کر دیا تھا۔ حضورؐ کا اس کے بیٹے کی درخواست کو رد کر دینا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اتنا برا نہیں تھا جتنا مسلم مورخین اسے برا ٹھہراتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی منافقت کے باوجود مقامی لوگوں میں اتنا مقبول اور بااثر تھا کہ حضورؐ اس کا قتل کیا جانا پسند نہ کرتے ہوں گے۔

یادگار تاریخیں

| | |
|-------------------|-------------------------------------|
| ۶ ۶۲۲ | مدینہ کو ہجرت |
| ۶ ۶۲۳ | غزوہ بدر |
| ۶ ۶۲۵ | غزوہ احد |
| ۶ ۶۲۶ | جنگ خندق |
| ۶ ۶۲۸ | صلح حدیبیہ |
| ۶ ۶۳۰ | فتح مکہ |
| مارچ ۶۳۰ء | حضور کے صاحبزادہ ابراہیمؑ کا انتقال |
| ستمبر اکتوبر ۶۳۰ء | غزوہ تبوک |
| فروری ۶۳۱ء | مسلمانوں کا پہلا حج اور عقبہ |
| | بت پرستوں کو اتبہ |

بُت پرستوں کو انتباہ

عزیزوں کے پاس قدیم زمانے سے قمری مہینوں کا استعمال چلا آرہا ہے۔ ان پر
لوگوں کیلئے قمری مہینے اُساں ہوتے تھے۔ سرزمین عرب کی راتوں میں چاند مختلف صورتوں
میں ہمیشہ دکھائی دیتا ہے۔ بارہ قمری مہینے ایک شمسی سال سے گیارہ دن چھوٹے ہوتے
ہیں۔ شمسی سال میں ۳۶۵ دن ہوتے ہیں۔ ایک قمری مہینہ جو کبھی گراما میں آتا ہے وہ آہستہ
آہستہ موسم بہار میں آئے گا اور پھر یہی مہینہ سردیوں کے زمانے میں آئے گا۔ حضور کے سگرو
وادا تعسی نے اپنے زمانے میں ایک نئے مہینے کی اختراع کر کے قمری سال کو شمسی سال کے
برابر کرنا چاہا تھا۔ ہر تیسرا سال ۱۲ قمری مہینوں پر مشتمل سال قرار دیا جاتا تھا۔ اس کا مقصد یہ
تھا کہ کعبہ کی زیارت کو آنے والے ہمیشہ ایک مقررہ تاریخ پر ہی مکہ آئیں بدقسمتی سے تعسی کا
یہ تجربہ ناکام رہا۔ ایسا کرنے کے باوجود بھی دونوں سالوں میں مطابقت نہ ہونے پائی۔ قضی نے مہینہ
کا اضافہ کر کے اپنی جگہ دانش مندی اور جرأت کا ثبوت دیا تھا۔

۶۲۱ء میں حضور پر وحی نازل ہوئی۔ ہر تیسرے سال کے تیرہ مہینے مقرر کرنے پر امتناع
عماد کیا گیا۔ ایسا سال کعبہ کہلاتا تھا۔ قرآن کے سورہ توبہ کی ۳۶ ویں آیت میں ارشاد ہے
”امن کے کسی مہینے کو ہٹا کر آگے پیچھے کر دینا کفر میں اضافہ کر دیتا ہے اس سے کافر
گمراہی میں پڑے رہتے ہیں۔ ایک سال تو اس کو حلال سمجھتے ہیں اور دوسرے سال حرام
تاکہ ادب کے مہینوں کو جو خدا نے مقرر کیے ہیں، گنتی پوری کر لیں اور جو خدا نے منع کیا ہے

اس کو جائز کر لیں۔ ان کے برے اعمال ان کو بھلے دکھائی دیتے ہیں۔ خدا کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اس وقت سے لے کر آج تک مسلمان صرف قمری مہینوں ہی کو پیش نظر رکھ کر رمضان کے روزے رکھتے ہیں اور حج کرتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے اس امتناع کی غرض و غایت کیا تھی وہ آج تک ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

جو لوگ حج کر کے واپس ہو رہے تھے ان کے ذریعے سے یہ خبر عام ہوئی کہ حضور نے تمام بت پرستوں اور مشرکوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ جو لوگ ابھی تک مسلمان نہیں تھے اب چوکنے ہو گئے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت سے ایسے قبیلے تھے جو اس بات کے لیے تیار تھے کہ جیسے ہی حضور کسی مشرک قبیلے پر حملہ کا حکم دیں وہ تعمیل کے لیے فوراً آگے بڑھیں اگرچہ حکم کی تعمیل پر کمر بستہ ہونے والے بذات خود بادل نا خواستہ اسلام کے حلقہ بگوش ہونے والوں میں تھے۔ یہ لوگ دوسروں پر حملہ کرنے میں اس لیے خوشی محسوس کرتے تھے کہ ان حملوں سے ان کو مال غنیمت ہاتھ آتا تھا۔ اس سے ہٹ کر بھی اب عربوں کے لیے بت پرستی میں کوئی خاص کشش باقی نہیں رہی تھی۔ ان میں بت پرستی کا شوق اور وہ پرانا دلولہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے مسلمانوں نے سارے بڑے بڑے بتوں، لات، العزای وغیرہ و نیزہ کو توڑ کر ان کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ بعض بتوں کو تو پاش پاش کر ڈالا تھا۔ اس مار پیٹ کے باوجود ان کے بتوں نے نہ تو اپنی آپ مدافعت کی۔ اور نہ ہی اپنے سامنے والوں کو محفوظ رکھا۔ اور نہ ہی مسلمانوں کا کچھ بگاڑا۔

اب بت پرست محسوس کر رہے تھے کہ اب تک جن کو وہ اپنا محافظ خیر خواہ اور والی سمجھ بیٹھے تھے وہ تو واقعی پتھر کے بت نکلے۔ ان مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں انہوں

نے بہترینی اسی میں سمجھی کہ حضورؐ سے امن کی درخواست کی جائے۔

۱۹۲۱ء کا سال عام و فود و کھلا تھا ہے۔ کرب کے کونے کونے سے مختلف جماعتوں اور قبیلوں کے نمائندے حاضر ہوئے۔ ہی اس لیے تھے کہ اسلام قبول کریں۔ سلامتی کی درخواست کریں۔ ہم اس پیچ پر سوچتے ہیں کہ خوف اور لاپٹ کی بنیادوں پر مذہب کا تبدیل کرنا یا تبدیل کروانا ایک بے معنی سی بات ہے تاریخ ہمارے اس خیال سے اختلاف کرتی ہے اس میں جو آدمی محض خوف اور ڈر کی بنا پر اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے۔ اس میں اخلاص اور صداقت کی کمی ہوتی ہے۔ وہ خود تو یہ غلطی کر لیتا ہے لیکن اس کا تیارہ اس کی اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اولاد اپنے ماں باپ ہی کے مذہب پر پتی اور بڑی ہوتی ہے اور اس مذہب پر قائم رہتی ہے۔ ماں باپ کا یہ مذہب اولاد کا دائمی مذہب ہو جاتا ہے۔ تیسری اور چوتھی نسل میں تو یہ بات اتنی پرانی ہو جاتی ہے کہ خاندان والوں کو اس کا علم ہی نہیں رہتا کہ ان کے جو اعلیٰ یا مورث اعلیٰ نے لاپٹ یا ڈر کی وجہ سے اپنا آبائی مذہب تبدیل کر دیا تھا ان کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیا تھا یا وہ مجبور ہو گئے تھے ان کی آنے والی نسلیں بڑے ہی ایماندارانہ طریقے سے خلوص دل کے ساتھ اپنے وراثتی مذہب کی لاج رکھتے ہوئے مذہب کے اصولوں کی پابندی کرتی ہیں۔ یہی مثال ان عزلوں پر بھی صادق آتی ہے جن کو حضورؐ نے منافقین سے مخاطب کیا تھا اور ان کے اس عیب کی مذمت کی تھی۔ منافقین یقیناً مرتع پرست تھے اور ساتھ ہی ساتھ مناسب موقع کے متلاشی بھی۔

جیسے ہی حضورؐ کا استعمال ہو ابہت سارے عرب قبیلوں نے بغاوت کر دی۔ ان ان کی بغاوت کو سختی سے کچنا پڑا۔ ان ہی منافقین اور شرپند، مرتع پرستوں کی دوسری تیسری اور چوتھی نسلیں اسلام کے مبلغین اور فاتحین میں شمار کی گئیں۔ انہی نسلوں کے لوگ تھے جنہوں نے اپنی، صداقت، جرات، جوش، جذبہ اور قوت ایمان سے مہذب دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا اور اسلامی علم کو ہر طرف لہراتے پھر رہے تھے۔

حضورؐ نے مسلمان بننے کے لیے صرف ایک ہی تو شرط رکھی تھی۔ جس کسی نے ایک دفعہ

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ دیا وہ مسلمانوں کے زمرے میں شامل کر لیا گیا۔
 ہر وہ شخص جس نے اس کلمہ کو اپنی زبان سے ادا کر دیا بلا کسی حیلہ و حجت کے مسلمانوں کی
 برادری میں شامل کر لیا گیا۔

کلمہ پڑھ لینے کے بعد کسی سے روادار نہیں کی جاتی تھی۔ سوالات کی بوچھاڑ کبھی کسی پر
 نہیں کی گئی۔ کلمہ گو کے ماضی کو ٹٹولا نہیں گیا۔ کلمہ پڑھ لینا اپنی کئی ہوئی ہر چھوٹی بڑی خطا پر توبہ
 کر لینے کے مترادف قرار دیا گیا۔

عسکر کے قریبی جانثار اور رفقاء ہمیشہ اس بات کے شاکی رہے کہ جن لوگوں میں وہ خلوص
 کا فقدان دیکھ رہے تھے ان کو بھی حضور نے کلمہ پڑھوا کر ایک دوسرے کے برابر کر دیا۔ جن لوگوں
 میں خلوص کا فقدان تھا اور اس کے باوجود انہوں نے کلمہ پڑھ لیا تھا اب ان لوگوں کی عسری
 کا دغوی کر رہے تھے جو سراپا اسلامی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔

اگر کسی مسلمان کے ہاتھ میں تلوار ہوتی اور وہ کسی فرار ہونے والے مشرک کا پیچھا کر
 رہا ہوتا اور قریب تھا کہ وہ مشرک کا سر اس کے تن سے جدا کر دے۔ فرار میں ناکام ہونے
 والا ہانپنا کانپنا مشرک فوراً کہدے کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

تو مسلمان پر یہ لازم ہو جاتا تھا کہ وہ اپنی تلوار پھینک دے اور فراری کلمہ گو کو اپنے
 سینے سے لگا کر مسلم برادری میں شامل کرے۔ کلمہ طیبہ کا پڑھ لینا ان کے لیے اپنی جان بچانے
 کا آسان ترین طریقہ تھا۔ گو کلمہ پڑھ کر مسلم برادری میں آملنے والے نو مسلم سے سوالات تو
 نہیں کیے جاتے تھے لیکن ایک بار اسلام قبول کر لینے کے بعد اسلام سے پھر جانے والے
 کو فوراً ہلاک کر دیا جاتا تھا۔

جو لوگ زبردستی مجبوری، حرص اور لالچ یا دکھانے کی خاطر مسلمان ہوئے تھے اب
 ایک نئی آفت میں پھنس گئے تھے۔ مرتد کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ اسلام سے پھر جانے کی صورت

میں ان کو اپنی موت کا خدشہ لگا رہتا تھا۔

بنی تمیم ایک بڑا قبیلہ تھا۔ جب اس قبیلے کے نمائندے مرکزی نجد سے مدینہ آئے تو ان کے تعلق سے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں بڑی ہی دل چسپ ہیں۔ اس قبیلے کے دو ایک سردار پہلے ہی سے مسلمان ہو چکے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر یہ حضور کے ساتھ تھے۔ حنین میں بھی یہ موجود تھے اس موقع پر بنی تمیم کے بہت سے سرداروں کو یہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ بدویوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ ہمیشہ مسادات کے قائل رہے ہیں۔ دل کی بات زبان پر لانے میں خوف محسوس نہیں کرتے۔ ہمارے اپنے زمانے میں خود میں نے اپنے کانوں سے بدویوں کی مخاطبت کو سنا ہے۔ جن اہم اور ذمہ دار شخصیتوں کو آپ اور ہم یوراگلسنی یا حضور والا سے مخاطب کرتے ہیں ان لوگوں کو یہ بدوی "o man" یا اوادی سے مخاطب کرتے ہیں۔

رینٹانی صحر کو سمندر سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ سمندر کی پر آشوب اور طوفانی ہواؤں میں جس طرح ہماز کے کپتان کو بیخ کر اور چلا کر بات کرنی پڑتی ہے۔ اسی طریقہ سے سرب کے بدویوں کو بھی اپنی گفتگو کے لیے بلند آواز کا ہمارا لینا پڑتا ہے۔

بنی تمیم کے بہت سارے لوگ حضور کی خدمت میں حاضری دینے کے لیے مسجد نبوی گئے۔ اس وقت مسجد نبوی اینٹ اور گارے کی بنی ہوئی ایک کشادہ عمارت تھی۔ اس پر کھجور کے پتوں کا ساہا تھا۔ کھجور کے درختوں کی لکڑی کے ستون تھے۔ حضور کو مسجد میں موجود نہ پایا۔ حضور کے در دولت پر گئے۔ حضور کا شانہ مبارک مسجد نبوی کے بالکل متصل تھا۔ گھر کے سامنے کھڑے ہو کر ہلڑ پھانی شروع کر دی۔ آوازیں دینے لگے کہ محمد باہر آؤ۔ محمد باہر آؤ۔ ہم سے بات کرو۔ ان لوگوں کا اس بد تمیزی سے چیخنا، چلانا اور شور مچانا اور حضور کو گھر سے باہر نکلنے کے لیے بے چینی کا مظاہرہ کرنا اور جلدی کرنا۔ یہ ساری باتیں حضور کی طبیعت پر گراں گزری۔ حضور کیلئے یہ ایک بالکل ایک نیا تجربہ تھا۔ حضور کی خدمت میں مسلمان جب بھی حاضر ہوتے تھے ادب

اور عز و تیا زکی تصویر بنے رہتے تھے۔

ان بدویوں کے گستاخانہ اور بدتمیزانہ شور و غوغا کے باوجود بھی آپ باہر تشریف لائے

گرم ہوشی سے بدیوں کا استقبال کیا۔

انہوں نے دعوت دی کہ شاعری اور خطابت میں ان لوگوں کا مقابلہ کریں۔ حضور نے

ان کی اس دعوت کو قبول فرمایا۔ اگرچہ کی حضور بذات خود شاعری کو ناپسند فرمایا کرتے تھے۔

آپ کا خیال تھا کہ اپنے باپ و دادا کے کارناموں پر ہمیشہ فخر کرتے رہنا کوئی اچھی بات نہیں

ہے۔ اس وقت کی شاعری کا بڑا حصہ فخر و مباہات پر ہی مشتمل ہوا کرتا تھا۔ فخر و مباہات اور

تعریفوں کے ڈانڈے اکثر و بیشتر شکر اور بت پرستی سے جاملتے ہیں۔

سب اپنے آباؤ اجداد کی جو تعظیم و تکریم کرتے تھے وہ مذہبی بنیادوں پر نہیں کرتے

تھے۔ جذباتی لگاؤ اور ان کی خود سے نسبت ان کو اپنے آباؤ اجداد کی تعریف و توصیف پر بھارتی

تھی۔ بالکل اسی طریقے سے جیسے موجودہ یورپ کے وطن پرست اپنے ملکوں کی تاریخ پر اثرایا

کرتے ہیں۔

حضور نے غالباً ہی سمجھتے ہوئے آباؤ اجداد کے کارناموں کی مدح سرائی سے منع فرمایا تھا

کہ ایسا کرنا مذہب کا ایک رقیب پیدا کرنا ہے۔ اس خطابت اور شاعری کے مقابلے کا افتتاح

بنی تمیم نے اپنی تقریر سے کیا۔ انہوں نے اپنے قبیلے کی دولت اور طاقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا،

کہ ان دونوں چیزوں کی ان کے ہاں اس قدر ہیبت ہے کہ ان ہی کے بل بوتے پر وہ دنیا کے

بادشاہوں، شاہزادوں اور حکمرانوں سے اقتدار کی تقسیم کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور حکومتوں میں حصہ

دار بن سکتے ہیں۔

حضور نے انصار میں سے کسی کو حکم دیا کہ اس تقریر کا جواب دیا جائے۔ انصاری نے پہلے

تو حمد و ثناء پڑھی۔ انہوں نے کہا کہ خدا نے اپنے فضل و کرم سے حضور کو رسالت سے نوازا۔

آپ کو صاحب قرآن بنایا۔

اس گل کائنات میں جس اکثریت نے سب سے پہلے حضور کی آواز پر لبیک کہا وہ مدینہ کے باسیوں پر مشتمل تھی اور انہوں نے اپنے آپ کو حضور کی خدمت میں پیش کیا اور اللہ کی راہ میں وہ لڑنے کے لیے تیار ہوئے۔ تقریریں ختم ہوئیں۔ اب شاعری کی باری آئی۔ حضور نے حسان ابن ثابت کو حکم دیا کہ بنی تمیم کے شعراء کو جواب دیں۔ دونوں فریق کے شعراء اپنی اپنی شاعری سناتے رہے۔ بنی تمیم کے شعراء اپنے اشعار پڑھتے پڑھتے اتنے تھک گئے کہ ان کا ترنم جواب دینے لگا۔ گلا بیٹھ جانے لگا۔ اپنے شعراء کی یہ حالت دیکھ کر بنی تمیم کے اقرع ابن مابس اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہا کہ میرے باپ کی قسم ہے۔ اس آدمی نے پہلے ہی سے چند آدمیوں کو تیار کر رکھا ہے۔ اس آدمی کے خطیب اور شاعر ہمارے خطیبوں اور شاعروں سے ہزاروں گنا بہتر ہیں۔ ان کی آواز میں نغمگی ہے۔ جتنے لوگ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ حضور نے ان سب کو تحفے دیے۔

آج بھی نجد کے قبیلہ واری لوگوں میں وہی سفر و پندار، وہی شیخی، وہی شاعری سے لگاؤ پایا جاتا ہے جیسے ساتویں صدی کے قبیلوں میں پایا جاتا تھا۔ نجد کے لوگوں کی ساری پیرا پھیری کا مقصد شاید یہی تھا کہ وہ ناموشی سے اپنے آپ کو اسلام کے حوالے نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بلا کسی حیلہ و حجت کے اسلام قبول کر لینا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھ رہے تھے خصوصاً ایسے آدمی کی اطاعت کا ہمد کرنا جو معمولی تجارت پیشہ لوگوں میں سے ایک تھا ان کے لیے کسرِ شان تھا۔ ایسے انہوں نے پہلے خطابت کا مقابلہ کر دیا اور مسلم خطابت کا توازن کیا۔ اپنے شاعروں کی شاعری اور حسان بن ثابت کی شاعری کے مضمون، قافیہ اور ردیف پر نظر ڈالی۔ پھر جا کر بڑی ہی تمکنت اور افتخار کے ساتھ اسلام قبول کرنا اپنے شایانِ شان سمجھا۔

قبیلوں کے سردار جب ملاقات کے لیے آتے ہیں تو جاتے وقت ان کو تحفے تحائف دینا عربوں کی ہزاروں سال پرانی رسم رہی ہے۔ آج بھی ابن سعود اس پرانی روایت کو اپنائے ہوئے ہیں۔

بنی تمیم کی آمد ان معنی میں کامیاب رہی کہ وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ ان بدویوں کے گنوارین کا تاثر بڑا دیرپا رہا۔ اگر ابن اسحق اور طبری کی روایات درست ہیں تو ان کے بیان کے مطابق سورہ الحجرات کی ایک سے پانچ تک کی آیتیں ان ہی بدویوں کے گنوارین کے پیش نظر نازل ہوئی تھیں۔

”مومنو۔ خدا اور اس کے رسول سے پہلے نہ بول اٹھا کرو۔ خدا سے ڈرنے رہو۔ بے شک خدا متا جاننا ہے۔ اسے ایمان والو اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کرو۔ جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے بولتے ہو اسی طرح ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو جو لوگ پیغمبر خدا کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں۔ خدا نے ان کے دل تقویٰ کے لیے آزمائے ہیں۔ ان کے لیے بخشش اور اجر عظیم ہے۔ جو لوگ تم کو تجروں کے باہر سے آواز دیتے ہیں ان میں اکثر بے عقل ہیں۔ اگر وہ مہر کیے رہتے یہاں تک کہ تم خود نکل کر ان کے پاس آتے تو یہ ان کے لیے بہتر تھا۔ خدا تو بخشنے والا مہربان ہے۔“

ایک کے بعد دوسرا وفد آنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مدینہ ایک بڑی سلطنت کا پایہ تخت بن چکا ہے دو آدمی حضور کو قتل کرنے کے ارادے سے آئے عین وقت پر وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ ایک اور آدمی آیا۔ اس نے حضور سے درخواست کی کہ آپ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں کہ آپ واقعی اللہ کے پیغمبر اور رسول ہیں تاکہ وہ اس بات کا گواہ رہے۔ حضور نے اس کو خوش کر دیا۔ اس کی بات سن لی۔ وہ واپس ہوا۔ اپنے سارے قبیلے کو مسلمان کر دیا۔

بنی حنیفہ کا ایک وفد آیا۔ اس وفد کے ساتھ مسلمہ بھی تھا۔ اس نے آگے چل کر بنوت کا دعویٰ کیا۔

ایک روایت کے مطابق وہ نجد گیا اور اپنے قبیلے کے ساتھ مل گیا وہاں سے حضور کی خدمت میں ایک خط لکھا۔ خط کا متن ہے۔

”اللہ کے رسول مسد کی طرف سے اللہ کے رسول محمدؐ کی خدمت میں۔

کیوں نہ ہم زمین کو دو حسوں میں بانٹ دیں۔ آدمی زمین میرے لیے اور آدمی زمین

آپ کے لیے“

مفسر نے مسلمہ کے خط کا جواب لکھوایا اور بھجوا دیا۔ متن یہ ہے۔

”اللہ کے رسول محمدؐ کی طرف سے مسلمہ کذاب کے واسطے۔

ساری زمین خدا کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے زمین عطا کرتا ہے

جیسے بن مفسر کا استعمال ہوا بنی حنیفہ مسلمہ کی قیادت میں مرتد ہو گئے ان کی سرکوبی کے لیے

مسلمانوں کو طاقت کا استعمال کرنا پڑا۔ مسلمہ کے تعلق سے بہت ہی کم معلومات ہم تک پہنچی ہیں۔

جتنا بھی مواد ملتا ہے اس کو محفرت اور نفرت کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

بنی طے کے سردار زید انیل کی آمد بھی ایک خوشگوار واقعہ تھی۔ زید کو گھوڑوں کا زید بھی کہا

جاتا تھا۔ یہ گھڑ سواری میں آپ اپنی نظیر تھا۔ زید اور اس کی جماعت نے مفسر سے طول طویل

بات چیت کی۔ آخر کار سب مسلمان ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے جانے کے بعد مفسر نے فرمایا

”جب کبھی میں کسی ایسے سرب سے ملتا ہوں جو اپنی شہرت کے بام برونج پر رہتا ہے اور

لوگ اس کی تعریف میں قصیدے لکھا کرتے ہیں تو اکثر و بیشتر میں اس شخص میں کچھ نہ کچھ کمی

محمسوں کرنا ہوں۔ قصیدوں اور تعریفوں میں مجھے مبالغہ آرائی صاف نظر آ جاتی ہے۔ مگر گھوڑوں

کا زید وہ واحد آدمی ہے جس میں خوبیاں بن خوبیاں مجھے نظر آتی ہیں۔ جو تعریفیں میں اس

کے تعلق سے سن چکا ہوں۔ وہ اس سے زیادہ کا مستحق ہے۔“

زید کی بجاوت کا ایک آدمی ابھی شش و پنج ہی میں پڑا ہوا تھا۔ حضورؐ سے ملنے

کے بعد اس نے کہا کہ ”میں یہاں ایک ایسے آدمی کو دیکھ رہا ہوں جو تمام لوگوں پر اپنی ذہنیت

جتا چاہتا ہے لیکن مجھ پر سوائے میری اپنی ذات کے کوئی حکومت نہیں کر سکتا“

صحر کے انشا پندوں اور منشر دماغوں کی یہی تو آرزو ہوا کرتی ہے۔ اس قسم

کے لوگ بڑ بڑنگ قسم کی آزادی میں لطف اندوز ہونے کے دل سے خواہاں رہتے ہیں۔
مدینہ میں اسلام قبول کرنے کے بعد زید الخلیل واپس ہوئے۔ واپس ہونے کے فوراً بعد ان
کا انتقال ہو گیا۔ اس بہادر سپوت کو اس بات کا موقع نہیں ملا کہ تین سال بعد ہونے والی اسلامی
فتوحات میں حصہ لے کر اپنی بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھاتا۔ قبیلہ رطے کے لوگوں نے آگے
چل کر بہت نمایاں خدمات انجام دیں۔

مضور ناموں کو بڑی اہمیت دیا کرتے تھے۔ شگون اور نام میں ایک ربط محسوس کرتے
تھے۔ اکثر آپ نام تبدیل کر دیتے تھے تاکہ ہر چیز اور ہر شخص اسم با اسمی رہے اس موقع پر آپ نے
زید الخلیل کو تبدیل کر کے زید الخیر سے زید کو منالیا کیا۔ گھوڑوں کے زید کو مضور نے نیکوں کا زید
بنادیا۔ ایک اور موقع پر جبکہ آپ بدر شریف لے جا رہے تھے ایک وادی سے آپ کا گزر ہوا
تنگ وادی سے یہ موسم تھی۔ یہ نام کوئی اچھا شگون تو نہیں دے رہا تھا آپ نے حکم دیا کہ تنگ
وادی کا نام بدل کر آسان وادی رکھا جائے۔

اسلامی عرب میں ناموں کی تبدیلی کا طریقہ اب بھی مروج ہے۔ بہت سے مقامات
نام بدل کر طیب یا طیب رکھے گئے اس لیے کہ بعض پرانے نام ناپسندیدہ تھے۔
ایک مرتبہ اردن کے بادشاہ عبداللہ شاہ حسین کے دادا کے ساتھ میں بھی تھا۔
وہ کسی دیہات یا قبضے کے معائنہ کی غرض سے گئے تھے۔ ایک مقام پر انہوں نے لوگوں سے
دریافت کیا کہ اس جگہ کا نام کیا ہے۔ لوگوں نے جواب دیا وادی یابس یعنی خشک وادی۔
بادشاہ سلامت نے فوری حکم دیا کہ اس کا نام بدل دیا جائے اور اسے وادی رایا یعنی سرسبز
شاہ وادی کہا جائے۔ طے کے سردار حاتم کا ذکر ہم کر چکے ہیں اس کی مہمان نوازی اور سخاوت
فیاضی تو ضرب المثل تھی۔ حاتم اور سخاوت دونوں الفاظ ہم معنی سمجھے جاتے تھے۔ ہم اب جس
زمانے کے حالات قلم بند کر رہے ہیں اس وقت حاتم کا انتقال ہو چکا تھا۔ حاتم کار کا عدی
عیائی تھا۔ مسلمانوں سے گریز کی خاطر شام چلا گیا تھا۔ اپنی بہن کے کہنے پر مدینہ حاضر ہوا مسجد نبوی

میں حضور سے ملاقات کی۔ حضور نے عدی کو اپنے گھر پر مدعو کیا۔ حضور اور عدی جب مسجد نبوی سے کاشانہ نبوی جا رہے تھے راستے میں ایک بڑھیا حضور کے پیچھے پڑ گئی۔ حضور بڑی ہی خاموشی اور مہربانی کے ساتھ بڑھی عورت کی باتیں سنتے رہے۔ وہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بیان میں مسلسل طوالت کرتی جا رہی تھی۔ حضور بغیر کسی روک یا ممانعت کے ٹھنڈے دل سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ جب اس نے اپنے دل کی تمام بات حضور سے کہہ ڈالی تو اس سے اجازت لے کر آگے بڑھے اور عدی کو لے کر اپنے گھر آئے۔ اپنے ہمان کو بیٹھنے کے لیے گدا پیش کیا۔ خود سادا زمین پر بیٹھ گئے۔

حضور کی اس کسرتی اور اخلاق کریمانہ کا عدی پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ حضور کے سامنے وہ فوراً مسلمان ہو گئے۔

ایک اور بڑے ٹھاٹھ باٹ کا وفد آیا۔ یہ قبیلہ کنذا کا روانہ کر رہے تھے۔ یہ لوگ عرب کے قدیم حکمران اور شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وقت تک اسلام کا فروغ صرف حجاز ہی میں ہوا تھا پھر پندرہویں صدی کے نجد میں یمن یا مضموت جیسے دور دراز علاقوں تک ابھی اسلام نہیں گیا تھا۔ پہاڑوں کی وجہ سے آمدورفت میں دشواریاں تھیں۔

غالباً اپریل ۶۳۱ء میں زبید سے ایک وفد آیا۔ یہ لوگ بحر احمر کے ساحلوں پر رہا کرتے تھے۔ ان کے فوری بعد بنی بھیلہ والے آئے یہ قبیلہ یمن کے اندرونی علاقوں میں رہا کرتا تھا۔ تبوک کی مہم کے بعد ابی کلال اور الحمیار کے دوسرے شہزادوں نے ایک پیام رساں کے ذریعہ حضور کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا۔ حضور نے اس خط کا تفصیلی جواب دیا۔ اس خط میں زکوٰۃ اور ان محاسل وغیرہ کا ذکر کیا جو مسلمان کو اپنی جائیداد یا مویثیوں وغیرہ پر دینے پڑتے ہیں۔ ان کو بت پرستوں کے خلاف لڑنے کے لیے بھی کہا گیا تھا۔ بت پرست قبیلوں سے لڑنا ان کے لیے زکوٰۃ ادا کرنے سے بھی زیادہ تردد کا باعث بنا۔

حضور کی دانش مندی کہیے یا یمنیوں کی جھگڑا ز طبیعت جو سربراہ مدینہ آکر اسلام

قبول کر کے اپنے گھروٹے انہوں نے اپنے ہمایہ بت پرست قبیلوں پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔
اس طریقے سے یمن کا ایک بڑا حصہ مسلمان ہو گیا۔

بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ حضورؐ نے کبھی بھی یمن میں اپنی فوجیں روانہ نہیں کی تھیں اس کے باوجود یمن بمینوں ہی کی کوششوں سے مسلمان ملک بن گیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یمن اور نجد میں عرصہ دراز سے یہودی اور نصرانی رہتے آئے ہیں۔ حضورؐ نے الحمزیوں کے شہزادوں کو جو خط روانہ کیا تھا اس میں یہ صراحت فرمائی تھی کہ اگر ایک یہودی یا نصرانی اسلام قبول کر لے تو اس کے حقوق اور ذمہ داریاں وہی ہونگے جو ایک مسلمان کے ہونا کرتے ہیں ان میں سے جو لوگ اپنے مذہب کی رو سے روزہ رکھتے ہیں اور ان کو ان کے اس فرض کی ادائیگی سے روکا نہیں جائیگا۔ ان کو محصول تو ادا کرنا ہی پڑے گا۔ ہر بالغ کے لیے ایک دینار مقرر کیا گیا تھا۔ رقم کے معاوضے میں متبادل چیزیں بھی ادا کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ جو لوگ بھی اس محصول کو اللہ اور اس کے رسول کی خدمت میں پیش کریں گے ان کے جان و مال کی ذمہ داری اللہ اور اس کے رسول ذمے رہے گی۔ جو لوگ اس محصول کو ادا نہیں کریں گے وہ خدا اور رسول کے دشمن سمجھے جائیں گے۔ حضورؐ نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو معاذ بن جبل کی قیادت میں الحمزیوں کے شہزادوں کے پاس روانہ کیا تھا تاکہ وہ وہاں سے محصول وصول کر کے مدینہ لے آئیں۔ آپ نے یمنیوں کو متنبہ بھی کیا کہ آنے والی جماعت کو خالی ہاتھ واپس نہ کیا جائے۔ معاذ بن جبل کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ یمن والوں کے ساتھ نرمی اور تلمطف سے پیش آئیں۔ جو لوگ ابھی ابھی اسلام میں داخل ہوئے ہیں ان کے ساتھ کسی بھی قسم کی کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔

یمن کے مسلمانوں سے صرف مالی استفادہ کرنا ہی حضورؐ کا منشاء نہیں تھا۔ عرب میں محصول کا ادا کیا جانا اور وصول کرنا ایک سیاسی فعل تھا۔ حکمراں یا بااقتدار لوگ اپنے ماتحتوں اور محکوموں سے ہمیشہ سے ٹیکس وصول کرتے آتے تھے۔ محصول یا زکوٰۃ کا وصول کرنا اب محض اس لیے تھا کہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا رسمی اظہار کریں۔ اللہ اور اس کے

رسول کی یالادستی تسلیم کریں۔

مدینہ میں اتنے زیادہ دُفود کا آجانا مغربی معنفین کو یہ کہنے پر اکتانا ہے کہ حضورؐ نے جو غیر معمولی مقام حاصل کر لیا تھا اور قوت و اقتدار کا جو مظہر بن چکے تھے اس کی وجہ سے یہ دُفود سر نیاز مہنگانے کے لیے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے یقیناً یہ ہوا کہ حضورؐ کی بہت اور نیک نامی عرب کی سرحدوں سے آگے بھی پہنچ چکی تھی۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ بہت سارے قبیلوں نے حضورؐ کے انتقال کے فوراً بعد ازداد کا قتلہ اٹھایا تھا۔

یہ دونوں باتیں اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں ذات گرامی کی عزت زیادہ تھی یہ نسبت آپ کے مذہب کے عملی طور پر دُفود روانہ کرنے کا طریقہ عرب کے بدوی قبیلوں میں بہت ہی قدیم زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ بنیادی طور پر بدویوں کی دُفاداری اپنے قبیلے کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔

حکمران عام لوگوں کی سطح سے ادنیٰ ہوا کرتا تھا۔ اوروں کی مدد سے دوسروں پر اپنا تسلط قائم کرتا تھا۔ ان میں کثرت و بیشتر ظالم، جاہل بے رحم اور سنگدل ہو گئے تھے۔ ان کا واحد مقصد اقتدار اور حکومت کی تلاش ہوتا تھا۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا مطیع، مغلوب یا فرما بردار ہو کر رہنا پسند نہیں کرتا تھا اس کا نتیجہ ہمیشہ آپس کی لڑائیوں کی صورت ظاہر ہوتا تھا۔

قبیلے کا حکمران ایک مستقل خطرہ سمجھا جاتا تھا۔ قبیلے کے سربراہ بڑے ہی تدبیر اور دُراندیشی سے اپنے قبیلے کے لوگوں کو حکمران کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھتے تھے۔ اس حفاظت کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ سربراہان قبیلہ جب کسی کو حکمران بننا دیکھتے تو دُفد کی صورت میں اس کے پاس جاتے تھے۔ حکمران کا زمین ہوتا تھا کہ آنے والے دُفد کا خندہ پیشانی سے استقبال کرے تاکہ اس قبیلے کے آدمیوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکے۔ سربراہان قبیلہ کو مطمئن کرنے کے معنی ایہ ہوتے تھے کہ پورے قبیلے کی دُفاداریاں اس کو حاصل ہو جاتی تھیں اور قبیلے والوں کو حکمران کی سرپرستی حاصل ہو جاتی تھی۔

اگر حکمران سربراہوں کا خندہ پیشانی سے استقبال نہ کرتا تو اس کو ڈر لگا رہتا تھا کہ وہ لوگ کہیں اس کے حریف یا رقیب سے مل کر اس کی قوت اور اس کے اقتدار میں اضافہ نہ کر دیں۔ اسی لیے یہ دستور تھا کہ آنے والے فود کا گر محوشی سے استقبال کیا جائے۔ ان کی ضیافت کی جائے۔ کئی دن تک ان کی مہمان نوازی کی جائے۔ واپس جانے لگیں تو نحیف و نحیف پیش کئے جائیں۔ ان کو بہترین پوشاک پہنائیں۔ جب مہمان واپس جانے لگیں تو ان کا لباس اتنا دیدہ زیب، مرصع اور جاذب نظر ہو کہ محوشی میں ان کو اپنے آپ پر سیماں کا دھوکہ ہو۔ یہ ظاہری ٹپ ٹاپ حکمران کی شہرت، فیاضی اور سخاوت کو عملی طریقے سے لوگوں کے سامنے پیش کرتی تھی۔

اقوام متحدہ سے انفرادی طور پر امریکنوں، انگریزوں اور فرانسیسی حکومتوں کا آج جو ربط قائم ہے اور اس کی تہہ میں جو جذبہ کار و فرما نظر آتا ہے وہی صورت اور وہی تعلق اس وقت مکران اور قبیلوں میں پایا جاتا تھا۔

وفاداری بشرط استواری کے وہ قائل تھے۔ نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ اقوام متحدہ ایک سیاسی تنظیم ہونے کے باعث لوگوں کی قومی وفاداری کی جس کو اپنی طرف جیسے متوجہ کرتی ہے اسی طریقے سے حکمران اور قبائل میں ایک سیاسی ربط اور جذباتی وفاداری کا میلان پایا جاتا تھا۔

قبیلے کے سربراہوں کو حکمرانوں کی خدمت میں حاضری کا موقع ملنا نہ صرف غنیمت بلکہ فائدہ مند سمجھا جاتا تھا اور ان کے لیے یہ سہری موقع ہوا کرتا تھا۔ ان مواقع پر ان کو جو تحفے ملتے تھے ان میں روپیہ، پلیم، گھوڑے، ادنیٰ ہتھیار اور دیدہ زیب ملبوسات شامل رہتے تھے۔ ان تحائف کو لیے ہوئے جب وہ اپنے گھر لوٹتے تھے تو عام لوگوں کی نظروں میں ان کی وقعت اور بڑھ جاتی تھی۔

ہر سربراہ کو اس کی شخصیت، اہمیت اور منصب کے پیش نظر تحفے دیے جاتے تھے۔ یہ دیکھا جاتا تھا کہ قبیلے پر اس کا کس حد تک اثر ہے۔ جس سربراہ کو گھٹیا قسم کا تحفہ دیا جاتا تھا وہ اس میں اپنی تذلیل سمجھتا تھا۔ ہم جنین میں دیکھ چکے ہیں کہ جب حضورؐ نے بنی سلیم کے سردار

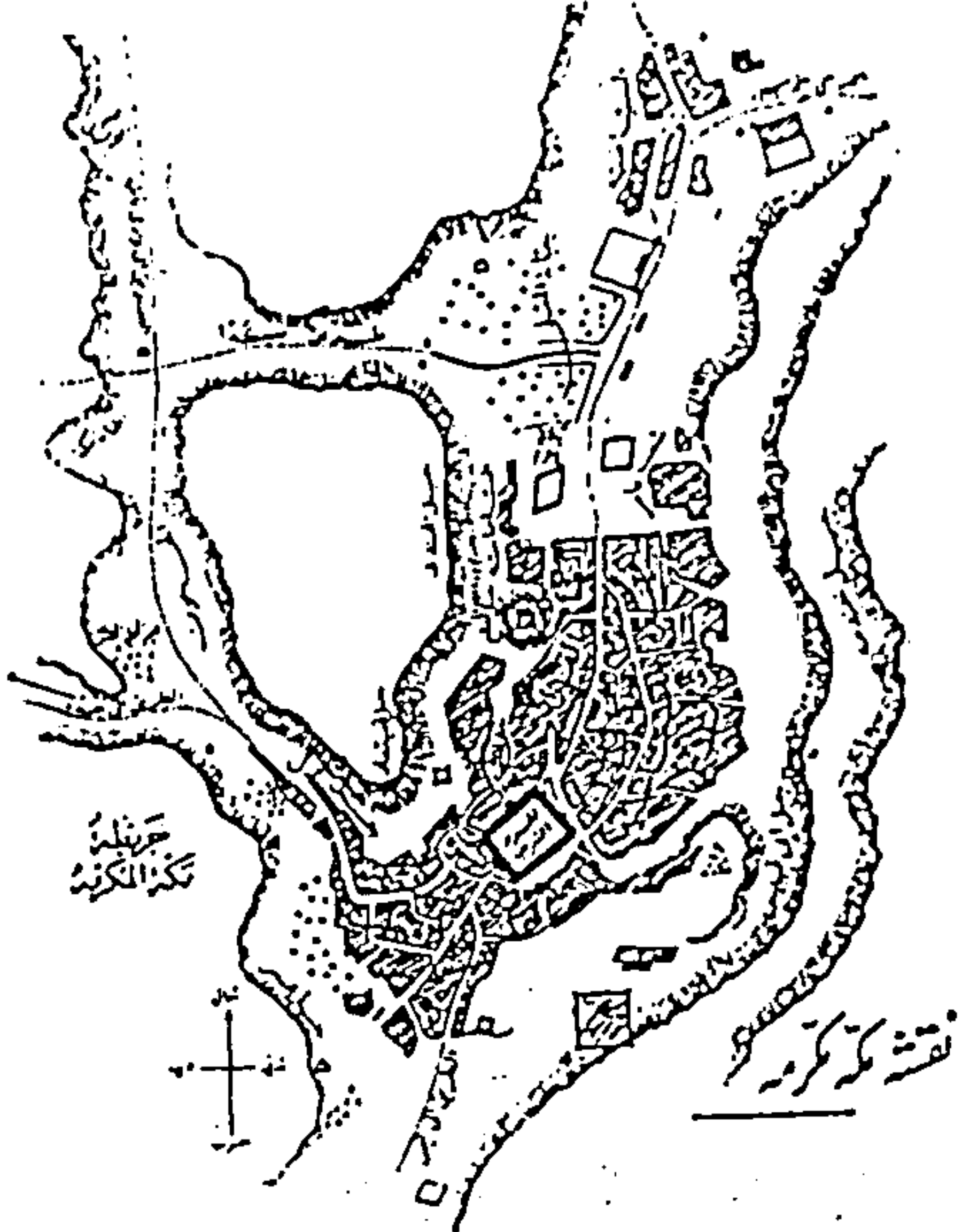
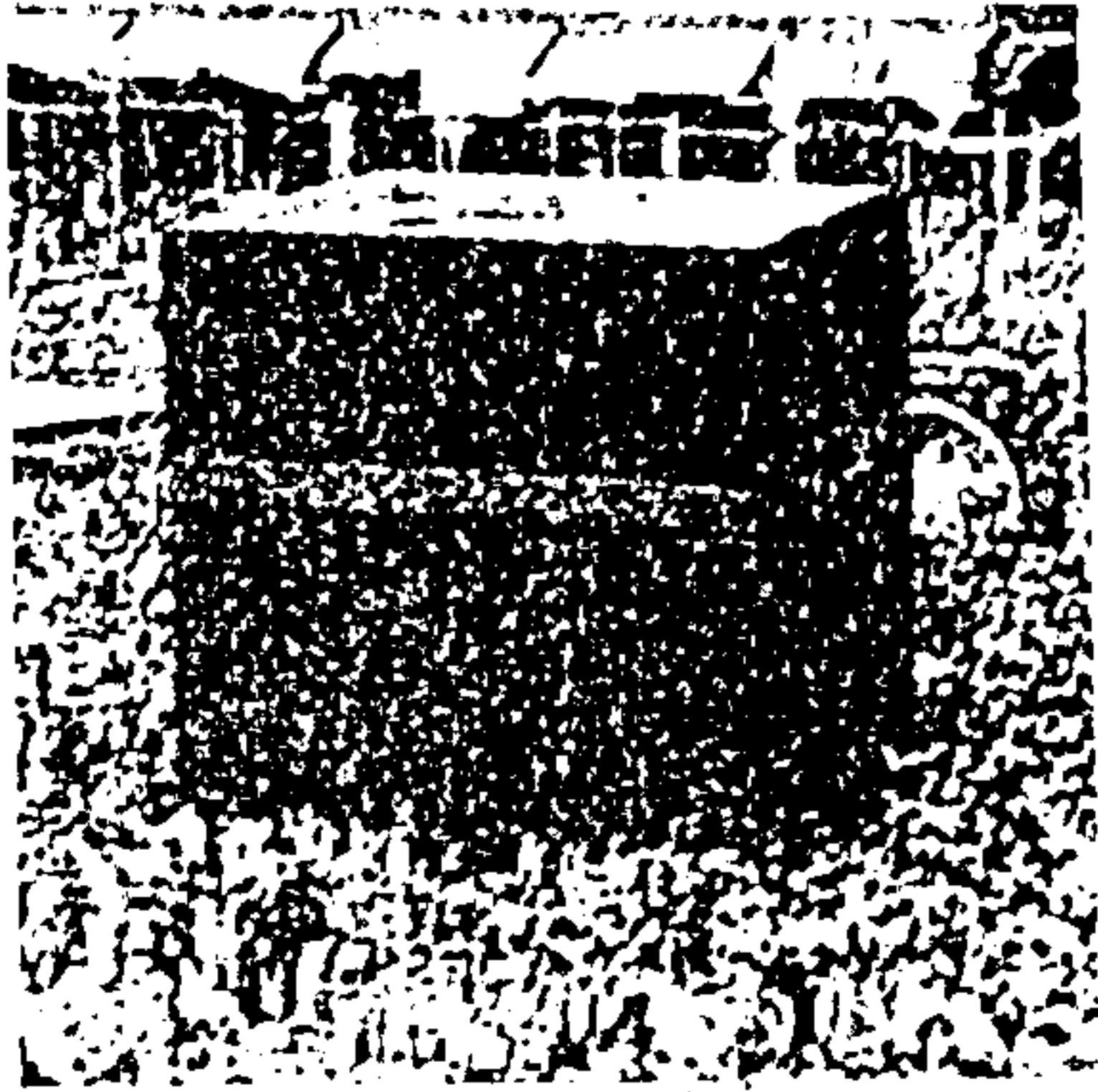
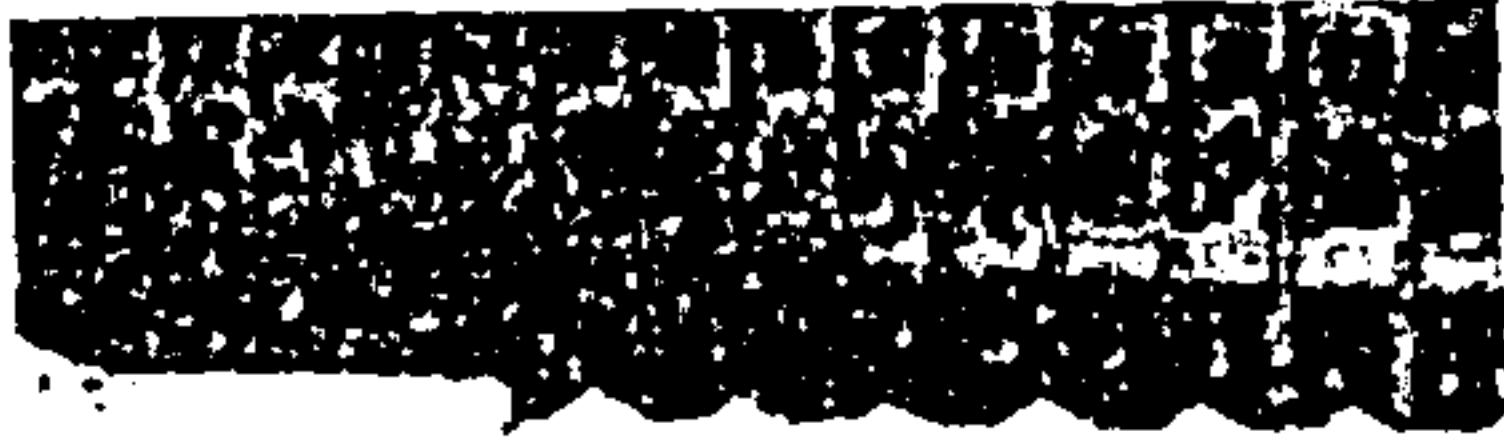
عباس ابن مرداس کو دس اونٹ انعام کے طور پر دیے اور دوسرے قبیلوں کے سرداروں کو سو سو تو اس میں اس نے اپنی ہتک محسوس کی اور حضورؐ سے شکایت کرنے لگا۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضورؐ نے مکہ میں نبوت کے ابتدائی دنوں میں جس میدے سے عقیقہ کی تلتین کی تھی وہ عقیقہ اب قانون کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ عقیقہ کی پہلی بیعت کے موقع پر جو لوگ مسلمان ہو رہے تھے ان سے کہا گیا تھا کہ وہ صرف ایک خدا کی عبادت کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں نہ کسی روح کو اس کا شریک بنائیں نہ کسی جسم کو اس کی جگہ دیں۔ ان سے کہا گیا تھا کہ چوری نہ کریں۔ شیر خوار بچوں کو نہ ماریں۔ پڑوسیوں کی عیب جوئی نہ کریں۔ لوگوں کی غیبت نہ کریں۔ حضورؐ کے ہر حکم کی تعمیل کریں۔ جن لوگوں نے اپنے ہمد کو پورا کیا ان کو جنت کی بشارت دی گئی اب یمن میں جو لوگ مسلمان ہوئے تھے ان کے لیے تفصیلی ہدایات کی ضرورت محسوس کی گئی ان کو نماز پڑھنا سکھانا تھا۔ عمرے اور حج کی تفصیلات بتلانی تھی۔ قبیلہ وارانہ جھگڑوں کی اب قدیم روایات کے تحت نہیں چکایا جاسکتا تھا ان کے جھگڑوں کے فیصلے اسلامی قانون کے تحت کئے جاتے تھے۔ جو لوگ اپنے قبیلوں کی رسومات کو باقی رکھنا چاہتے تھے ان کو تلوار دکھائی گئی۔ نماز سے پہلے وضو کرنا ضروری ٹھہرایا گیا۔ وضو میں پہلے دونوں ہاتھوں کو پہنچوں تک صاف کیا جاتا ہے پھر کلی کرنی پڑتی ہے۔ ناک کو صاف کرنا پڑتا ہے۔ پھر چہرہ دھویا جاتا ہے۔ دونوں ہاتھ کہنیوں تک صاف کئے جاتے ہیں۔ پھر سر کا مسح ہوتا ہے۔ آخر میں دونوں پیر ٹخنوں تک دھوئے جاتے ہیں۔ پانی کی عیز موجودگی میں تیمم کی اجازت ہے۔

زکوٰۃ اور جزیہ کی ادائیگی کے لیے بھی اصول وضع کیے گئے زرعی اور غیر زرعی زمینات کے لیے علیحدہ علیحدہ ٹیکس مقرر کئے گئے۔ اونٹوں، بھیڑوں اور بکریوں کے ٹیکس مختلف رکھے گئے۔

اب اسلام ایک حکومت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ روزمرہ زندگی میں جس بات سے بھی انسان کو سابقہ پڑتا ہے ان سب کو اسلام نے اسلامی قانون کے احاطے میں لے لیا۔

۶۳۲ء میں جب حج کا زمانہ آیا تو فیصلہ فرمایا کہ مسلمان حضورؐ کی سرکردگی میں حج کے مناسک



ادا کریں۔ ۲۰ فروری ۶۳۲ء کو حضور مدینہ سے روانہ ہوئے۔ عاشقوں کے بھر مٹ میں آپ آگے بڑھ رہے تھے شمع نبوت کے چاروں طرف جدھر دیکھو پروانے ہی پروانے نظر آتے تھے۔ لوگ پیدل بھی تھے۔ اونٹوں پر بھی سوار تھے جس طرف نظر اٹھائیں لوگوں کا مندر ٹھائیں مارتا نظر آ رہا تھا۔

حضور کا یہ آخری جمع تھا۔ ۹ مارچ ۶۳۲ء کو یہ جمع ادا ہوا۔ یہ جمع اپنی نوعیت میں ایک امتیازی شان لیے ہوا تھا۔ حضور نے جو کچھ بھی اس تاریخی موقع پر کہا اس کا اعادہ ہمیشہ ہوتا رہا۔ اس کی اتباع ہمیشہ ہوتی رہے گی۔ مورخین نے حضور کے اس خطبہ کو محفوظ کیا ہے۔ آپ نے اپنی عمر کے اسخری زمانے میں ہزاروں مسلمانوں کی موجودگی میں حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیا تھا۔ اس میں سود کی حرمت، خانگی جائیداد پر انفرادی ملکیت کا حق، قبیلے اور خون کی بنیادوں پر ایک دوسرے کا خون نہ بہانا، سال کبیہ کی منوخی، قمری مہینوں کا استعمال، عورتوں سے تملطف اور مہربانی کا سلوک مردوں کو یہ ہدایت کہ بیویاں اللہ کی امانت ہیں اور ان سے سلوک کا حساب و کتاب اللہ کو دینا ہوگا، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کو بھائی سمجھنا، نسلی غرور کی خدمت کے تعلق سے ارشاد فرمایا۔ اپنے خطبے کے اختتام پر حضور نے سامعین سے سوال کیا۔

”کیا میں نے تم کو وہ سب باتیں نہیں کہدی جن پر تم کو عمل پیرا ہونا چاہیے؟ کیا میں نے اپنے فرض کو پورا نہیں کر دیا؟ لوگوں نے بہ آواز بلند جواب دیا: ”ہاں۔ خدا کی قسم آپ نے اپنے فرض کو پورا کر دیا ہے“

حضور نے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف کیں اور فرمایا۔

”اے خدا تو گواہ رہنا“

جمع میں جتنے مناسک اور رسومات ادا ہوئے حضور نے ان کی ادائیگی کے وقت ہر چھوٹے

بڑے عمل کی وضاحت فرمائی۔

حضور نے مزدلفہ میں شیطان پر کنکریاں ماریں۔ منیٰ میں قربانی دی کعبہ کا طواف کیا۔ حج

کے لیے خاص لباس چنا اور اسے پہننا یہ لباس احرام کہلاتا ہے۔
 حج کے اختتام پر آپ نے لوگوں کو واپسی کی اجازت دی۔ مدینہ کو واپس ہونے کے لیے
 آپ نے سفر شروع کیا۔ اس کے بعد آپ نے مکہ کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔
 اس حج کو اسلامی تاریخ میں حجۃ الوداع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حجۃ الوداع کے بعد مئی ۶۳۲ء میں حضورؐ نے شام کی مہم کے لیے لوگوں کو جمع کیا۔ اس
 مہم کی خاص اور دلچسپ بات یہ رہی کہ اس مہم پر روانہ ہونے والی فوج کی قیادت کے لیے آپ نے
 اسامہ بن زید کو منتخب کیا۔ اسامہ کی عمر اس وقت ۲۰ سال تھی۔ ان کو جنگی قیادت کا تجربہ بھی نہیں تھا۔
 اسامہ کے والد بزرگوار زید ابن حارثہ موتہ کی جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔

جوان بیٹے کے لیے یہ بات بالکل زیب دیتی تھی کہ اپنے باپ کی شکست اور شہادت کا
 بدلہ پورے پورے طریقے سے اپنے دشمنوں سے لے۔ ذاتی انتقام کا جذبہ پھر عود کرتا نظر آ رہا ہے
 عرب کی روایات کے تحت ایک نوجوان لڑکے کی قیادت کے لیے انتخاب کوئی اچھے کی
 بات تو نہیں تھی۔ اس کے باوجود یہ انتخاب لوگوں میں چہ میگوئیوں کا باعث بنا۔

جو لوگ اپنے آپ کو تجربہ کار اور جنگی ماہر سمجھے۔ بیٹھے تھے وہ مشتعل ہو ہو کر اس انتخاب پر
 تنقید کر رہے تھے۔ ان کے خیال میں ان عمر رسیدہ اور تجربہ کار لوگوں کی موجودگی میں ایک ایسے
 لڑکے کو سرداری کے لیے چنا گیا تھا۔ جس کے ابھی وارثی مہم بھی نہیں نکلے تھے۔

عرب مورخین اس مہم کے بارے میں خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس مہم کا نتیجہ کیا
 نکلے گا اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ ابن اسحق نے مختصراً بیان کیا ہے کہ وہ فوجیں کسی بندرگاہ
 سے چند آدمیوں کو گرفتار کر کے انہیں قیدی بنا کر لائی تھیں۔

حضورؐ کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی حضرت علی رضی اللہ عنہ ابن ابی طالب سے ہوئی
 تھی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے دو صاحبزادے تولد ہوئے۔ ایک کا نام حسن رضی اللہ عنہ تھا اور
 دوسرے کا حسین رضی اللہ عنہ۔ چونکہ حضورؐ کی اولاد میں یہی دو لڑکے تھے اس لیے حضورؐ ان کو بہت

بہت عزیز رکھتے تھے۔ اپنے آپ کو ان دونوں کے لیے بالکل وقف کر چکے تھے۔ حضورؐ کو ان کے ساتھ کھیلنے سے زیادہ کسی اور بات میں خوشی نہیں ہوتی تھی۔ نماز کے دوران حضورؐ جب سجدہ میں جاتے تھے تو یہ دونوں صاحبزادے حضورؐ کی گردن پر بیٹھ جاتے تھے یا آپ کی پشت پر سوار ہو جاتے تھے اور نماز کے دوران آپ نے اپنی پشت پر بیٹھ جانے سے کبھی بھی بے مبری کا اظہار نہیں کیا۔ حسنؓ اور حسینؓ کو ان کے دل بھرنے تک اپنی پیٹھ پر بیٹھنے دیتے تھے۔ اپنے سجدوں کو طویل کرتے جاتے تھے۔ اس خیال سے کہ کہیں بچے گرنے جائیں آپ سجدہ ہی پُرسے رہتے تھے۔ اگرچہ کہ آپ کی اولاد میں لڑکے ہی تھے لیکن آپ کا گھرا گھرا بیشتر خاندان کے دوسرے رشتہ داروں اور رشتے کے بھائیوں سے بھرا پڑا رہتا تھا۔ آپ بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ بچوں سے کھیلنے میں آپ کو لطف آتا تھا۔

حضورؐ کی زندگی کے آخری دو سال خصوصاً مکہ کی فتح کے بعد اور حنین میں ہوازن کی شکست کے بعد بے انتہا مسروریت کے ہو گئے تھے۔ مختلف وفود کی مسلسل آمد، ہر وفد سے تفصیلی بات چیت، اسلام کی وضاحت، مذہب کی توضیح، قانونی اور مالی مسائل کے بارے میں مختلف فیصلے آپ کے روزانہ کے مشاغل تھے۔

بہت سے جزوی مسائل میں جن میں قانون اور نظم و نسق دونوں شامل ہیں۔ فیصلے دینے پڑتے تھے۔ یہ فیصلے احادیث اور مسلم روایات کا حصہ بن گئے۔ لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے واجب التعمیل قرار دیے گئے۔ یہ وہ فیصلے ہیں جن میں تبدیلی یا ترمیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان میں سے بہت سے ایسے فیصلے ہیں جن کے تعلق سے حضورؐ پر وحی نہیں نازل ہوئی تھی۔ اگر وحی نازل ہوتی تو وہ قرآن میں محفوظ رہتی۔ اس کے باوجود حضورؐ کے ذاتی فیصلوں کو احادیث میں شامل کر کے مسلمانوں کے لیے ایک قانون کی شکل میں پیش کیا گیا۔

عورتوں، بچوں اور غلاموں سے گزر کر حضورؐ کی مہربانیاں جانوروں پر تک نہیں۔

آپ نے گھوڑوں اور گدھوں کے سردوں پر مارنے کی ممانعت کی ہے۔ ان جانوروں کے بال جو ان کی خوبصورتی کی علامت ہیں کاٹنے سے منع فرمایا اور ساتھ ہی ان کی دموں کو کاٹنے سے روکا آپ ہمیشہ خندہ پیشانی سے اپنے مہمانوں کا استقبال کرتے تھے۔ شگفتگی اور مزاح کا پہلو بھی آپ کی زندگی میں ہمیں ملتا ہے۔ اپنے قریبی صحابہ سے آپ نے قولاً اور عملاً مذاق بھی کیا ہے۔ اکثر و بیشتر آپ مسکراتے تھے۔ تمہارے لگا کر آپ کبھی نہیں ہنسے۔ تمہارے لگا کر نہ ہنسنے کی عادت عربوں کی ایک قومی خصوصیت ہے۔ پورا مہینہ کھول کر زور دار تمہارے لگانا جیسا کہ یورپین لوگوں کی عادت ہے آج بھی عربوں کے نزدیک ایک گری ہوئی بات سمجھی جاتی ہے۔ جون کا مہینہ تھا اور عیسوی سنہ ۶۳۲ء۔ ایک رات حضورؐ نے اپنے آزاد کردہ غلام سے فرمایا کہ خدانے مجھے قبرستان جا کر مردوں کے لیے دعا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اپنے آزاد کردہ غلام کو لیے ہوئے جنت البقیع تشریف لے گئے۔ قبروں کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ اہل قبور کو مخاطب کر کے کہا۔

”اے قبر میں سونے والو! تم پر سلامتی ہو۔ تم بڑے مزے میں ہو۔“

تم موجودہ زندہ لوگوں سے بہتر ہو۔ رنجش اور نفاق رات کی تاریکیوں کے پردوں کی طرح یکے بعد دیگرے اپنی جگہ لیتے جا رہے ہیں۔ جو گزر چکے ہیں وہ آنے والوں سے بہتر ہیں۔“

آپ جب فاتحہ اور دعا سے فارغ ہو چکے تو اپنے خادم کو لیے ہوئے گھر واپس تشریف لائے۔ دو سکر دن صبح میں آپ نے اپنے سر میں شدت کا درد محسوس کیا آپ نے کوشش کی کہ اپنی ہر بیوی کے پاس جا کر ان سب سے ملاقات کریں۔ جب آپ بی بی میمونہؓ کے کمرے میں تھے آپ پر غشی طاری ہو گئی۔ آپ کی تمام بیویاں اطراف جمع ہو گئیں۔ آپ نے ان سب سے اجازت مانگی کہ علالت کے دوران آپ کو بی بی عائشہؓ کے کمرے میں ٹھہرنے دیا جائے۔ تمام بیویاں الگ الگ اپنے اپنے کمروں میں رہا کرتی تھیں۔ بیویوں نے آپ کو اجازت دے دی کہ علالت کے دوران آپ بی بی عائشہؓ کے کمرے میں رہ سکتے ہیں۔

جن لوگوں کو اسامہ کے ساتھ شام کی سرحدوں پر روانہ کیا جا رہا تھا وہ اب بہت لیت لال سے کہہ لے رہے تھے۔ اپنی تیاریوں میں سستی دکھا رہے تھے۔ حضورؐ میں اس وقت تک اتنی طاقت نئی کہ اسامہ کو جنگ کا علم غطا کر سکیں یہ رسم قنسی کے زلمنے سے چلی آرہی تھی۔ اس رسم تقریب کے بعد حضورؐ نے ایک رومال کو اپنے سر کے اطراف بختی سے کس لیا تاکہ سر کے درد میں کچھ آفاقہ ہو اب آپ نماز کے لیے مسجد جانے کی فکر میں تھے۔

حضورؐ کی علالت کے پیش نظر اسامہ کے لشکر کی روانگی میں اب تاخیر ہو رہی تھی حضورؐ کو سخت سنجار چڑھ چکا تھا۔ سارا بدن حرارت سے جل رہا تھا۔ اس نیز سنجا کی حرارت کو دور کرنے کے لیے آپؐ نے اپنی بیویوں سے کہا کہ پانی کا ٹب لایا جائے۔ پانی کے ٹب میں آپؐ بیٹھ گئے۔ آپؐ کی ازواج مطہرات نے آپؐ پر ٹھنڈا پانی ڈالنا شروع کیا۔ یہاں تک ڈالا کہ حضورؐ بس بس کہہ کر انہیں مزید پانی ڈالنے سے روک دیا۔

حضورؐ نے علالت کے باعث امامت کے قابل اپنے آپ کو نہ پا کر حضرت ابو بکرؓ کو حکم دیا کہ وہ آپؐ کی جگہ لیں اور لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ ایک موقع پر جبکہ ابو بکرؓ مسجد میں نہیں تھے تو عمرؓ بن خطاب خود سے کھڑے ہو گئے اور امامت کے فرائض انجام دینا ہی چاہتے تھے کہ حضورؐ نے ان کی آواز کو پہچان کر اپنے بستر پر ہی سے زور سے آواز دی: "یہ نہیں نہیں صرف ابو بکرؓ!"

لبانی عائشہ کے کمرے کا دروازہ بالکل مسجد نبویؐ میں کھٹا تھا اور حضورؐ چلمن کے ذریعہ نمازیوں کو دیکھ سکتے تھے۔

حضرت عمرؓ کی پیش قدمی سے غالباً حضورؐ کو ڈر ہوا کہ کہیں آپؐ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ میں رقابت نہ ہو جائے۔ اس لیے آپؐ یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ حضرت ابو بکرؓ فائز ہیں۔

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ اے ہاجرین۔ انصار کے ساتھ کے ساتھ لطف و کرم اور مہربانی سے پیش آؤ۔ دوسرے لوگوں میں تو اضافہ ہو گا مگر انصار اپنی اکثریت میں تو اضافہ

نہیں کر سکتے۔ انصار ہمیشہ سے میرے لیے بہارا ہیں۔ میرے سکون کا باعث ہیں۔ انصار میں جو لوگ اچھے ہیں ان سے بہتر ملوک کیا جائے۔ جن میں خامیاں ہیں ان کی نظر انداز کر کے۔ درگزر کیا جائے۔

حضورؐ کی چند بیویاں جمع ہو کر اور اپنے ساتھ اور عورتوں کو بھی شریک کر کے حضورؐ کو مجبور کرنے لگیں کہ آپ دوا پئیں۔ حضورؐ کے چچا عباسؓ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بھی عورتوں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ عورتیں اپنے مقصد میں کامیاب ہوئیں اور انہوں نے حضورؐ کو دوا پلا کر چھوڑیں۔

حضورؐ نے دوا پینے کے بعد ان عورتوں سے سوال کیا کہ دوا پلانے پر وہ اتنی زیادہ مصر کیوں تھیں۔ عورتوں نے جواب دیا کہ انہیں ڈرتھا کہ حضورؐ کو کہیں نہ ہو گئی ہو۔ حضورؐ نے فرمایا کہ خدا آپ کو کبھی ایسی بیماری نہیں دے گا۔

ابن اسحاق کی روایت کے مطابق حضورؐ نے ان ساری عورتوں کو حکم دیا کہ حفظ ماتقدم سے طور پر وہ خود بھی کچھ نہ کچھ دوا تیار کر کے کھالیں موجودہ علم کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ حضورؐ کو نمونہ ہو گیا تھا۔ اسی نمونہ کے اثر سے آپ کا انتقال ہوا۔ جب آپ آدھی رات کو قبرستان تشریف لے گئے تھے تو وہاں غالباً آپ پر سردی کا حملہ ہوا تھا۔ دوسرے دن صبح کو آپ کے سر میں شدت کا درد محسوس ہوا اس کے بعد آپ کو بخار چڑھ گیا۔ یہ بخار تیز تر ہوتا گیا۔ اپنی علالت کے دسویں دن جبکہ شدت کا بخار تھا آپ کو کپکپی شروع ہوئی۔ سارا جسم درد سے کھینچنے لگا۔ آپ پر نیم بے ہوشی طاری ہوئی۔

دوسرے دن صبح کو جبکہ فجر کی نماز ادا ہو رہی تھی اور حضرت ابو بکرؓ امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے نبیؐ عائشہ کے کمرے کا دروازہ کھلتا ہے۔ حضورؐ مسکراتے ہوئے صحن مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہیں کہ نماز جاری رکھی جائے۔ آپ زمین پر بیٹھ جاتے ہیں جب نماز ختم ہو چکی تو حضرت ابو بکرؓ حضورؐ کے پاس آئے۔ خوشی خوشی سے کہا کہ اے اللہ کے

رسول۔ آج آپ بہتر نظر آتے ہیں۔ اللہ کو فضل و کرم آپ کے شامل حال ہے۔ مزاج اقدس
خامو بہتر نظر آتا ہے ہماری بھی خواہش ہے۔ ہماری یہی تمنا ہے۔

یہ خیال کرتے ہوئے کہ حضور صحت یاب ہو رہے ہیں حضرت ابو بکرؓ نے حضور سے اجازت
چاہی کہ وہ اپنے افراد خاندان سے ملنے کے لیے اپنے گھر جانا چاہتے ہیں مدینہ کے دوسرے سرے
پر ایک بستی تھی حضرت ابو بکرؓ کے اہل و عیال وہاں رہا کرتے تھے۔

حضور گھر کے اندر تشریف لائے۔ بی بی عائشہ کے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔ اپنے دانشور
کو کسی بار اچھی طریقے سے صاف کیا۔ پھر لیٹ گئے۔

دن جیسے جیسے بڑھ رہا تھا۔ ویسے ویسے گرمی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا آپ لیے ہی رہے۔

اچانک بی بی عائشہؓ نے محسوس کیا کہ حضورؐ کا سر بھلری ہوتا جا رہا ہے۔ حضور نے فرمایا۔

”میرے اللہ مجھے معاف کر دے۔“

آپ کی آنکھیں ایک طرف لگ گئیں۔ بی بی عائشہ نے حضور کے یہ آخری الفاظ سنے

”اے اطمینان پانے والی روح۔ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ تو اس سے راضی۔ وہ تجھ

سے راضی۔ تو میرے ممتاز بندوں میں داخل ہو جا اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔“ (سورہ فجر)

مسلمان کا رسول۔ پیغمبر عرب۔ اب اپنے خدا سے ملنے کے لیے رخصت ہو گیا۔ آفتاب

رمالت مغروب ہو گیا۔

بی بی عائشہ نے حضورؐ کا سر مبارک اپنے سینے سے سرکایا اور آہستہ سے نیچے رکھ دیا۔

اپنے ہاگ کے لئے کا ماتم شروع کر دیا۔ سراپا اضطراب بن گئیں۔ حضرت ابو بکرؓ اپنے

بال بچوں سے ملنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ وہ دن تمام باہر ہی رہے۔ قریبی لوگوں میں حضرت

سمرض وہاں موجود تھے۔ جب ان کو حضورؐ کے انتقال کی خبر سنائی گئی تو انہیں یقین نہ آیا غضب

ناک ہو کر کہنے لگے کہ حضورؐ کو مردہ کہنے والے بے ایمان ہیں! حالت اضطراب میں انہوں

نے کہا کہ خدا کی قسم وہ مرے نہیں ہیں۔ وہ اسی طریقے سے خدا کے پاس گئے ہیں۔ جیسے

موسیٰ اپنے خدا سے ملنے گئے تھے۔ پالیں دن تک وہ اپنے لوگوں سے چھپے رہے۔ وہ اس وقت اپنے لوگوں میں پھر سے پہنچے جبکہ لوگ ان کو مردہ سمجھ بیٹھے تھے۔ خدا کی قسم۔ رسول اللہؐ اسی طریقے سے واپس آئیں گے جس طرح موسیٰ واپس آئے تھے۔ واپس آکر آپ ان لوگوں کے ہاتھ پیر کاٹ دیں گے جو آپ کو مردہ کہہ رہے ہیں۔“

اسی اثناء میں حضرت ابو بکرؓ کو بھی حضورؐ کی وفات کی اطلاع مل گئی۔ وہ جلدی جلدی مسجد نبویؐ پہنچے۔ حضرت ابو بکرؓ چپکے سے مجمع کی نظر بچاتے ہوئے۔ دروازہ کھول کر بی بی عائشہ کے کمرے میں داخل ہوئے اسی کمرے میں حضورؐ کی نعش مبارک رکھی ہوئی تھی۔ نعش پر یمنی زرکاری کی چادر اڑھائی گئی تھی۔ چادر کے قریب ایک کونے کو آہستہ سے سرکار حضرت ابو بکرؓ نے حضورؐ کے چہرہ مبارک کو بوسہ دیا اور کہا ”میرے آقا۔ آپ مجھے میرے ماں باپ سے زیادہ عزیز ہیں، موسیٰ کی مرضی کے مطابق آج آپ نے بھی موت کا مزہ چکھ لیا۔“ چادر کو پھر برابر سے اپنی جگہ پر رکھ کر حضرت ابو بکرؓ مسجد کے صحن میں گئے۔ یہاں لوگ کا اثر وہاں تھا۔ شدت غم سے بہک کر اب بھی حضرت عمرؓ لوگوں سے الجھ رہے تھے۔ اپنی مخاطبت جاری رکھتے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ نے کہا عمرؓ ہوش میں آؤ۔ عمرؓ نرم ہو جاؤ۔ عمرؓ خاموش رہو۔

حضرت عمرؓ پر جذبات کا جو عالم طاری تھا اس کی وجہ سے وہ حضرت ابو بکرؓ کے کہنے کو سن نہ سکے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ چند قدم آگے بڑھ گئے۔ لوگوں کو اپنے قریب بلا لیا۔ لوگ حضرت عمرؓ کو چھوڑ کر حضرت ابو بکرؓ کے اطراف جمع ہو گئے۔

حضرت ابو بکرؓ نے آہستہ سے کہا کہ لوگو تم میں سے جو محمدؐ کو پوجتا تھا یا محمدؐ کی عبادت کرتا تھا وہ جان لے کہ محمدؐ اب وفات پا چکے ہیں۔ جو خدا کو پوجتا ہے اور خدا کی عبادت کرتا ہے وہ کان کھول کر سن لے کہ خدا زندہ ہے۔ دائم و قائم ہے۔ اس کو فنا نہیں۔

اس کے بعد آپ نے قرآن کے سورہ آل عمران کی ۳۴ ویں آیت تلاوت فرمائی۔

”اور محمد تو صرف خدا کے ہمنمبر ہیں۔ ان سے پہلے کبھی بہت سے ہمنمبر ہو گزرے ہیں
 بھلا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں تو تم اٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو اللہ پھر جائیگا۔ یعنی مرتد
 ہو جائے گا تو خدا کا کچھ کبھی نہیں بگاڑ کے گا۔ خدا شکر گزاروں کو بڑا ثواب دے گا۔“

یادگار تاریخیں

| | |
|--------------|-----------------|
| ۶ ۵۷۰ | حضور کی پیدائش |
| ۶ ۶۱۰ | بعثت |
| ۶ ۶۱۳ | تبلیغ کی ابتداء |
| ۶ ۶۱۵ | ہجرت حبشہ |
| ۶ ۶۱۷ سے ۶۲۰ | مقاطعہ بنی ہاشم |
| ۶ ۶۱۹ | خدیجہ کی وفات |
| ۶ ۶۲۱ | بیعت عقبہ اول |
| ۶ ۶۲۲ | بیعت عقبہ دوم |
| ۶ ۶۲۲ | ہجرت مدینہ |
| ۶ ۶۲۴ | غزوہ بدر |
| ۶ ۶۲۵ | غزوہ احد |
| ۶ ۶۲۷ | غزوہ خندق |

| | |
|-----------|------------------|
| ۶۲۸ | شہر پرویز کا قتل |
| ۶۲۸ | صلح حدیبیہ |
| ۶۲۸ | غزوہ خیبر |
| ۶۲۹ | عمرہ کی ادائیگی |
| ۶۲۹ | جنگ موتہ |
| جنوری ۶۳۰ | فتح مکہ |
| جنوری ۶۳۰ | غزوہ حنین |
| مارچ ۶۳۰ | مدینہ کی واپسی |
| ۶۳۱ | سال وفود |
| ۶۳۲ | حجۃ الوداع |
| جون ۶۳۲ | حضور کا وصال |

فتوحات

جیسے ہی حضورؐ کے انتقال کی خبر عام ہوئی مدینہ کے لوگ جمع ہوئے تاکہ بنی نذرین کے سعد ابن عبادہ کو حضورؐ کا جانشین بنائیں۔

مہاجرین اور انصار کی آپس کی رقابتیں جو حضورؐ کی ذات گرامی کی وجہ سے دبی ہوئی تھیں فوراً اکٹھے کر سامنے آئیں۔ صنعت اور کمزور ابو بکرؓ نے عوام کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کہا کہ جانشینی کے لیے سرف قریش کا آدمی ہی قابل قبول ہوگا۔ چند بدعتی جو وقتی طور پر وہاں موجود تھے ان کی مدد سے اور مکے والوں کے تعاون سے حضرت ابو بکرؓ خلیفہ بن گئے۔ مسلمانوں پر سے بڑا نازک وقت گزر گیا۔ وہ وقت ایسا تھا جس میں اسلامی برادرتی میں اس مسئلہ پر بڑی طرح خلفشار پھیل جانے کا اندیشہ تھا۔

خلافت کے فتنہ کو دبایا ہی گیا تھا کہ خبریں آنے لگیں کہ عرب کے بہت سے قبیلے ارتداد کی طرف مائل ہیں۔ زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر رہے ہیں حضورؐ کے انتقال کے بعد بارہ مہینے مختلف قسم کی لڑائی جھگڑوں کی نذر ہوئے۔ ان بارہ مہینوں میں اتنا خون بہا ہے کہ حضورؐ کی زندگی میں جو نے والی تمام لڑائیوں میں بھی اتنا خون نہیں بہا ہوگا۔ مسلمانوں کے کمانڈر انچیف خالد بن ولیدؓ تھے۔

حضورؐ کے انتقال کے ایک سال بعد عرب کے تمام قبیلوں پر قابو پالیا گیا

یہ قابو و عنط و نصیحت یا تلقین و تدبیر کی بنیادوں پر نہیں تھا بلکہ فوجی بل بوتے پر تھا۔

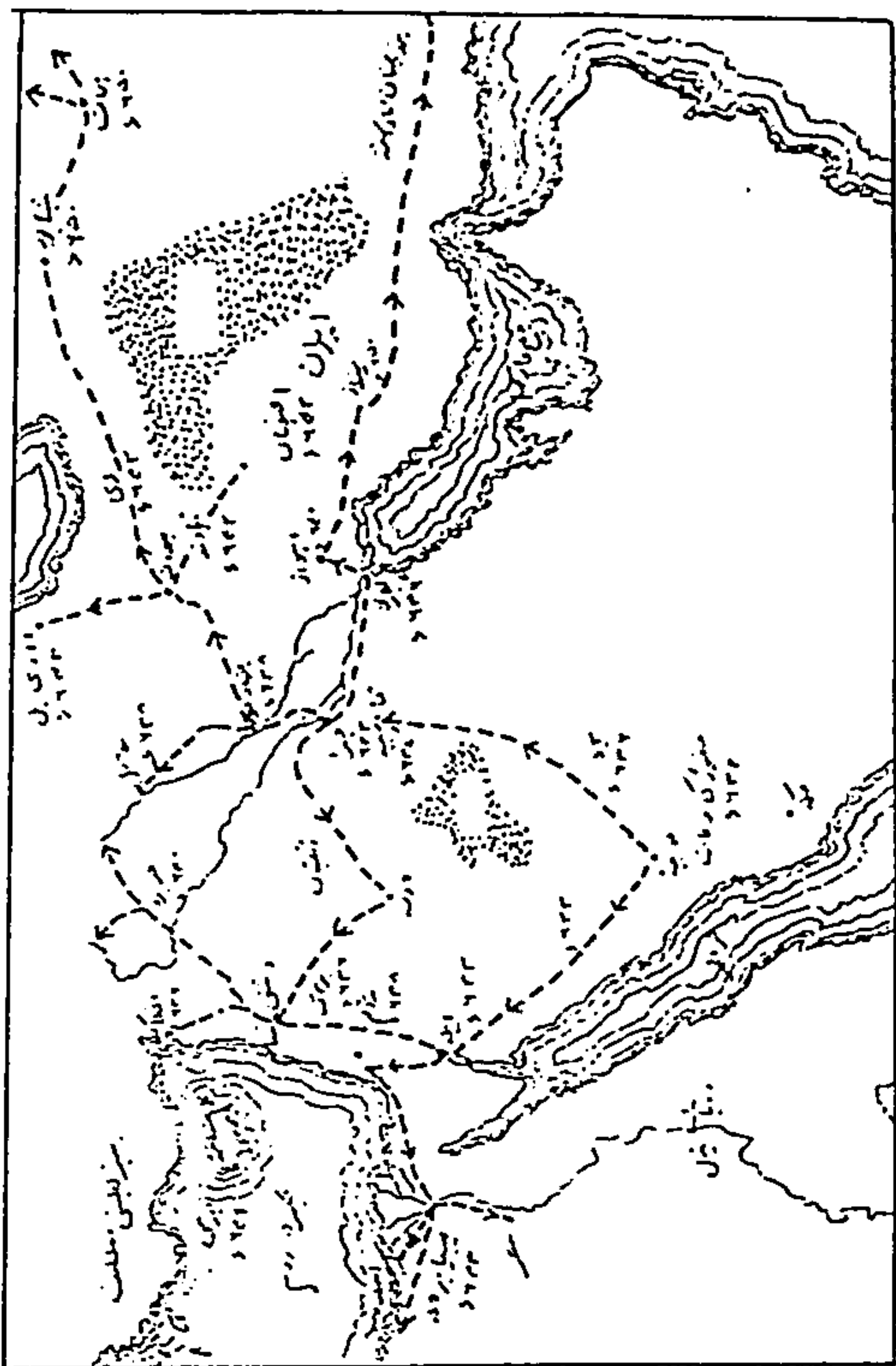
حضور کے انتقال کے بعد ہر طرف بغاوت کا جو دور دورہ رہا ہے اس زمانے کو اسلامی تاریخ فتنہ ارتداد سے موسوم کرتی ہے۔ ہزاروں سال سے عربوں نے ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے اپنا وقت کاٹا ہے۔ یہ بھی سمجھئے کہ ان کی لڑائیاں بے مقصد ہوا کرتی تھیں۔ اس کے باوجود لڑائیاں ان کی زندگی کا جزو تھیں۔ ان کا قومی شعار تھیں۔ ان کی رسم و راہ تھیں۔

مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے سے لڑنے سے منع کیا گیا جن کی فطرت اور قماش میں لڑائی جنگی ہے بے ہوئے ہوں ان کو کس طریقہ سے پرامن رہنے کے لیے مجبور کیا جاسکتا ہے؟ حضور نے لوگوں کو موتہ کی جنگ پر بھجوا کر اسی منطق کو ثابت کیا تھا۔ ۶۳۲ء اور ۶۳۴ء کے موسم سرما میں مسلمانوں کے تین دستے مدینہ سے روانہ ہوتے ہیں۔ فلسطین اور شام پر حملہ کرتے ہیں اسی اثناء میں مشرقی عرب کے قبیلے EUPHRATES کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں اور حیرا پر قبضہ کر لیتے ہیں۔

۲۶ اگست ۶۳۶ء کو مسلمانوں کے ہاتھوں باز نطینوں کو یرموک کے میدان میں شکست فاش ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے قبضے میں سارا شام آجاتا ہے۔ فروری ۶۳۷ء میں مسلم فوجوں نے قادسیہ کے مقام پر ایرانی فوجوں کو تباہ و تاراج کر دیا۔ قادسیہ حیرا کے جنوب میں تھا۔ تمام عراق مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔

ایران کے دارالسلطنت پر مسلمان قابض ہو گئے یہ دارالسلطنت اس مقام پر تھا جہاں اب بغداد واقع ہے۔

حضرت کے انتقال کے ۲۰ سال بعد ہرودس کی مذہبات



ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ نے کس محنت اور تدبیر کے ساتھ قبیلہ وارانہ ونداری کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ افراد کی اپنے قبیلے سے وفاداری اسلام کی وحدت کے منافی تھی اور نقصان دہ بھی۔ حضورؐ کے انتقال کے ایک سال بعد جب ارتداد کے فتنے کو کچل دیا گیا تو سارا عرب مسلمان ہو گیا۔ اب اسلامی وفاداری کو کسی اور وفاداری کی رقابت کا خطرہ نہیں رہا۔ ہر قبیلہ مسلمان ہو چکا تھا۔ قبیلے کا ہر تہیڈنا بڑا اسلام کے زمرہ میں داخل ہو چکا تھا۔ اس ہمہ گیر وفاداری کے پیش نظر اسلام نے قبیلوں کو اب خطرات کی نظر سے دیکھنا ترک کر دیا تھا۔ قبیلوں کو اسلام میں جذب کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اب ایک آدمی اچھا مسلمان ہوتے ہوئے بھی اپنے قبیلے کا وفادار رہ سکتا تھا۔ یہ اسی طریقے سے تھا جیسے آج کل ایک انگریز، فرانسیسی یا امریکن ایک اچھا شہری اور اپنے ملک کا وفادار رہتے ہوئے بھی اپنے عیسائی مذہب کا پابند رہ سکتا ہے۔

قریش کے اندرونی قبیلوں سے بہت ہی گہرے تھے۔ انتہائی خطرناک تھے ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ کی زندگی میں کس طرح عبدالشمس کی اولاد آپ کی اور اسلام کی محنت ترین دشمن رہ چکی تھی۔ اس لیے کہ حضورؐ عبدالشمس کے سرینہ اور رقیب ہاشم کی اولاد میں تھے۔

۶۵۶ء میں حضورؐ کے چچیرے بھائی علیؑ ابن ابی طالب۔ خلافت کے لیے چنے گئے۔ علیؑ ابن ابی طالب ہاشمی تھے۔ ابوسفیان کا بیٹا معاویہؓ عبدالشمس کی اولاد میں تھا۔ حضرت معاویہؓ اس وقت شام کے گورنر تھے۔ حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؑ کو خلیفہ ماننے سے انکار کر دیا۔

عبدالشمس کی آل یعنی ابوسفیان کے بیٹے معاویہؓ اور بنی ہاشم کی نسل علیؑ ابن ابی طالب کے درمیان پانچ سال تک غارتگری ہوئی رہی۔ حضرت معاویہؓ

نے دمشق کو اپنا اڈہ بنا رکھا تھا۔ حضرت علیؓ کا دار الخلافہ کو فرمایا۔
 ۶۶۱ء میں علیؓ ابن ابی طالب کو شہید کیا گیا۔ حضرت معاویہؓ نے خلافت
 پر قبضہ کر لیا۔ بنی امیہ کو حکمران خاندان میں تبدیل کر دیا۔ حضرت معاویہؓ کے
 خاندان والوں نے ۶۶۱ء سے ۷۵۰ء تک اسلامی دنیا پر حکومت کی۔
 رسول اللہ کے نواسے حسینؓ کو امویوں نے کربلا کے میدان میں بے دردی
 سے شہید کیا۔ کربلا عراق میں واقع ہے۔ سانحہ کربلا ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء کو
 وقوع پذیر ہوا۔

امویوں اور بنی ہاشم کی آپس کی رقابتوں نے مسلم دنیا کو دو حصوں میں
 بانٹ کر رکھ دیا۔ ان کا یہ اٹھایا ہوا فتنہ آج ہمارے اپنے زمانے تک موجود ہے۔
 جو لوگ علیؓ ابن ابی طالب اور ان کے خاندان والوں کے دعویٰ خلافت
 کی تصدیق کرتے ہیں اور ان کو خلافت کا حقدار ٹھہراتے ہیں شیعہ کہلاتے ہیں
 انہوں نے اپنے فرقے کی علیحدہ تشکیل کر کے عام مسلمانوں سے مختلف راہ
 اختیار کی۔

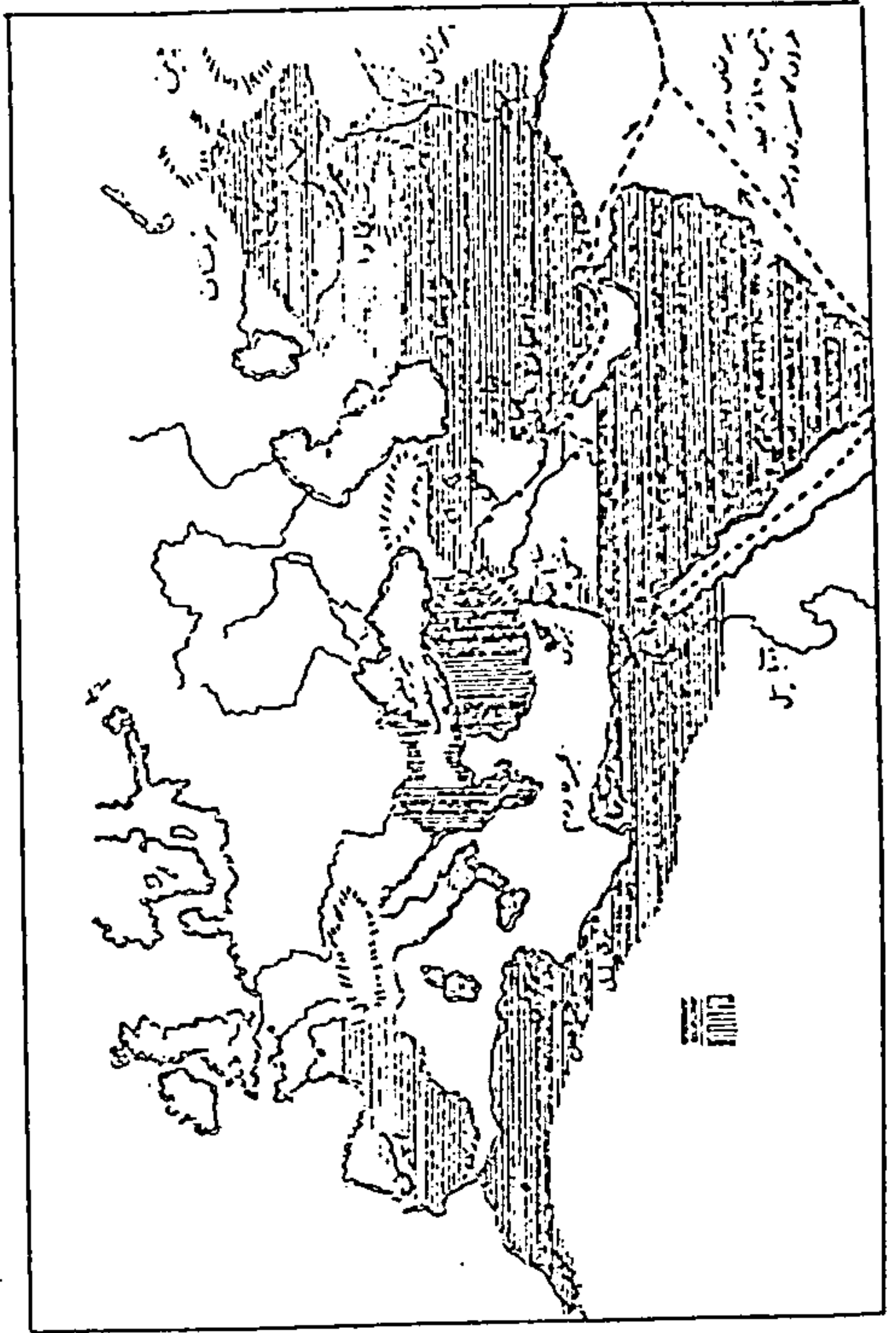
بنی امیہ کے دوران حکومت یعنی ۶۶۱ء سے ۷۵۰ء تک مسلمانوں
 نے چین کو چھوڑ کر دنیا کا ایک بڑا علاقہ فتح کر لیا۔ وہ علاقہ جو تہذیب و تمدن
 کا رکھوالا تھا ۱۲۰۰ء تک چین کی سرحدوں تک عرب پہنچ گئے۔ تبت کے
 شمال تک جا کر وہ سارا علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا جو آج مغربی پاکستان کہلاتا
 ہے۔ ۷۳۲ء میں مغربی دنیا میں جہاں تک وہ پہنچ سکتے تھے وہاں تک
 پہنچے۔ ان کو مرکزی فرانس کے علاقہ TOURS میں شکست ہوئی۔ یہ مقام انگلستان
 کی بندرگاہ DOVER سے صرف ڈھائی سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ عرب ایک ایسی
 قوم تھی جو بدو لوگوں کے چھوٹے چھوٹے قبائل پر مشتمل تھی۔ ہمیشہ آپس میں

برسر پیکار رہتی تھی۔ عرب کا ریگستان ان کی جائے پناہ تھا۔ اپنی اس حالت کو چھوڑ کر دنیا کے ایک وسیع اور غریب حصے پر قبضہ کر لینا دنیا کی تاریخ میں ایک حیران کن اور چونکا دینے والا واقعہ ہے۔ عرب شہنشاہیت کے جغرافیائی حدود ۷۲۲ء میں اپنی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ حضور کے انتقال کے پورے ایک سو سال بعد۔ ۷۵۰ء میں حضور کے چچا عباسؓ کی اولاد نے بنی امیہ سے بغاوت کی۔ اموی تختہ اقتدار کو الٹ کر خود حکومت پر قابض ہو گئے۔ اموی حکمران ابوسفیان کی اولاد میں تھے۔ اب عباس کی اولاد نے مسلم شہنشاہیت کی زمام اپنے ہاتھ میں لی۔ بنی امیہ کے بنائے ہوئے دارالسلطنت کو چھوڑ کر انہوں نے بغداد کو سلطنت کا مرکز قرار دیا۔ ایک خاندان سے حکومت نکل کر دوسرے خاندان میں آئی۔ اس سے دو قسم کے نتائج پیدا ہوئے۔

عراق ہمیشہ سے ایران کا حصہ رہا تھا۔ دمشق ہزاروں سال سے یونان اور رومیوں کے تحت رہا۔ مسلم دارالسلطنت کا شام سے بغداد منتقل کر دینے کا فوری اور پہلا اثر یہ ہوا کہ اسلام نے مشرقیت کو اپنا شروع کر دیا۔ دوسری چیز جو ہوئی وہ یہ کہ عباسیوں نے بڑی حد تک ایران کے مسلمانوں کی مدد کی۔ ان کے تعاون سے بنی امیہ کی بساط سیاست الٹ کر رکھ دی۔ جب عباسیوں نے اچھے طریقے سے حکومت کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو احسان شناسی کے طور پر بڑے بڑے اور اہم اہم عہدوں پر ایرانیوں کو فائز کرنا شروع کر دیا۔ اموی دور حکومت میں ساری عرب سلطنتوں میں ذمہ دار عہدوں پر صرف عرب ہی مقرر کیے جاتے تھے۔ عرب ہی حکمرانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ سارے بڑے بڑے عہدے عربوں ہی کو دیے جاتے تھے۔ عباسیوں کے دور میں عرب شہنشاہیت ایک بین الاقوامی مسلم حکومت اور سلطنت میں تبدیل ہو گئی۔

درب سبنا بنت

۸۵۰ جہن



اموی دور حکومت میں عربوں نے کئی ممالک فتح کیے تھے۔ عرب سلطنت میں توسیع کی تھی۔ عربوں کی فوجی قیادت بنی امیہ کے لوگ ہی کیا کرتے تھے۔ زہراء کے بعد عربوں کی کوئی ایسی غلطی اور قابل ذکر فتوحات نہیں رہیں۔ اب یہ وسیع اور عریض مسلم سلطنت صرف مدالغانہ صورت اختیار کیے ہوئے تھی دن بدن اس میں سکڑ آتی جا رہی تھی۔ وسعت میں کمی ہوتی جا رہی تھی۔ عباسی بحیثیت فاتح امویوں کے مقابلے میں کم کامیاب رہے۔ عباسیوں نے اپنے دور حکومت میں یعنی ۷۵۰ء سے ۸۶۱ء کے درمیان اپنی دولت، علم، ثقافت اور تہذیب میں غیر معمولی ترقی کی۔

عباسیوں کے ایک سو دس سالہ دور حکومت میں بغداد دنیا کا سب سے زیادہ امیر ملک تھا۔ عیش و عشرت کا گہوارہ تھا۔ ان کے دور میں دنیا میں بغداد سے بڑا عشرت کدہ کوئی اور نہیں تھا۔ یہ دور وہ تھا جبکہ یورپ کی قومیں وحشت اور بربریت کے دائرے سے نکل کر نیم وحشی بن رہی تھیں۔ یورپ کی تاریخ میں یورپ کے اس زمانے کو تاریک پہلو سے یاد کیا جاتا ہے۔ تاریکی اور اندھیرا صرف یورپ پر چھایا ہوا تھا۔ اسلامی دنیا روشن سے روشن تر تھی۔ دولت، علم اور ثقافت کے دیے جل رہے تھے۔

عرب کی تہذیب و ثقافت کی بنیادیں یونان، روم اور ایران کے خمیر سے کھڑی کی گئی تھیں۔ یونان، روم اور ایران تہذیب و ثقافت کے سرچشمے تھے۔ عرب کی تہذیب نے ان تینوں کی تہذیبوں سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ یونانی فلسفیوں اور ماہرین طبیعیات کی کتابوں کے عربی ترجمے کیے گئے۔ عربی تہذیب و ثقافت پر ان کا اطلاق کیا گیا۔ علم کے سارے شعبوں میں مسلمانوں نے قابل قدر اضافہ کیا۔ اس کی وجہ سے ان کی ثقافت بالامال ہو گئی۔ نویں صدی عیسوی میں

عباسی خلفاء کی سرپرستی میں میڈیکل کالجس کھلنے لگے۔ میڈیکل کے طلباء کو چار سال کی ٹریننگ لینی پڑتی تھی۔ چار سال کے عملی تجربے کے بعد ان کے باقاعدہ امتحانات ہوتے تھے۔ جب وہ اپنا آخری امتحان کامیاب کر لیتے تھے تو ان کو اپنا دو خانہ یا سرجری کھولنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ سولہویں صدی عیسوی تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں عربوں کی لکھی ہوئی کتابیں شامل نصاب تھیں۔ عربوں کی تحقیقات کو مستند اور مدلل سمجھا جاتا تھا۔

عرب کے ماہرین فلکیات نے زمین کا قطر ناپا۔ ایسی صحیح پیمائش کی تھی کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یورپ والوں سے آٹھ سو سال پہلے انہوں نے معلوم کر لیا تھا کہ زمین چپٹی اور سموار نہیں ہے۔

انسانی علوم میں جو عظیم الشان اور قابل قدر اضافہ ہوا وہ ریاضی کی وجہ سے ہوا۔ یہ وہی عرب تھے جنہوں نے دنیا کو صفر سے روشناس کرایا۔ صفر کا استعمال سکھایا۔ ہمارے موجودہ اعداد کا صفر کے ساتھ لکھنا جیسے ۱۰، ۱۰۰ یا ہزار، دس ہزار یہ عربوں ہی کا بتایا ہوا طریقہ ہے۔ موجودہ فن ریاضی کی ساری بنیاد عربوں کے اسی صفر کی دریافت کی رہیں منت ہے۔ ان کے بتائے ہوئے صفر ہی کی بنیادوں پر موجودہ علم ریاضی کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔

رومنوں کا اعداد لکھنے کا فرسودہ طریقہ فن ریاضی کی ترقی میں ایک سدا رہا بنا ہوا تھا۔ الجبرا، جو میٹری کی دریافت بھی عربوں ہی نے کی۔ علم مثلث، مثلث کے درمیان تناسب، لوگارتم، مستوی، خط مماس وغیرہ کو عربوں ہی نے دریافت کیا جو پورے دنیا کو فن ریاضی کی باریکیوں سے روشناس کرایا۔

یونانیوں نے مختلف علوم و فنون میں ترقی کر کے دنیا میں اپنا جو مقام پیدا کر لیا تھا اور ساتھ ہی دنیا کی ترقی میں جو حصہ لیا تھا اسی طرح عربوں نے ریاضی میں نئی نئی

اختراعات، بدین اور اصفیٰ نے کر کے ہم کو سائنس کے ایک نئے دور میں داخل ہونے کا موقع دیا۔

مسلم ممالک میں عرب فلاسفہ، حکماء، اطباء، ریاضی دان اور عالموں کی پوزیشن کو کتابی صورت میں عوام کے آگے پیش کیا گیا۔ نویں صدی کے بغداد میں کتب خانوں کی ہزاروں دکانیں تھیں۔ عربوں نے کاغذ بنانے کی ابتداء کر دی تھی۔ عربوں ہی نے یورپ کو کاغذ سے روشناس کیا۔ اسپین اور سسلی کے عربوں نے یورپ والوں کو سب سے پہلے کاغذ دکھایا۔ اس وقت جبکہ اسلامی اسپین کے کاشتکار اور دیہاتی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ عیسائی یورپ کے بادشاہ، شہزادے اور امراء کی اکثریت ان پڑھوں پر مشتمل ہوتی تھی۔

عربوں نے اپنی فرمانروائی کے زمانے میں سمندروں پر اس طرح حکومت کی کہ ان کے بحری بیڑے ہر طرف چلا کرتے تھے۔ دنیا کے جہاز ان کے حکم سے اور ان کی نگرانی میں بحیرہ روم اور بحیرہ ہند سے گزرا کرتے تھے۔ ان کے کارگو شپ اور دوسرے تجارتی جہاز انڈونیشیا اور مشرق بعید کو باقاعدہ جایا کرتے تھے۔ چین کے کینٹن میں عرب تاجروں کے تحفظات تھے۔ یہ تحفظات اسی نوعیت کے تھے جیسے انیسویں صدی عیسوی میں شنگھائی میں یورپی اقوام کے۔

اس وقت جبکہ یورپ کے حکمران اپنی رقیب بچت کو سکوں کی صورت میں تھیلوں میں بند کر کے اپنی کونٹریوں میں محفوظ رکھا کرتے تھے۔ عربوں نے باقاعدہ سکوں کی ابتداء کر دی تھی۔ اپنے بیٹوں کی اعلیٰ پیمانے پر تنظیم کر رہے تھے۔ عرب تجارت پیشہ اور سوداگر اپنے چیکوں کو کینٹن میں کیش کر داتے تھے۔ ان کے اکاؤنٹس بغداد میں رہا کرتے تھے۔

ساتویں صدی سے گیارھویں صدی عیسوی تک عربوں کو صنعت و حرفت میں

اجارہ داری حاصل رہی۔ شمال اور مغربی یورپ اس وقت محض زرعی علاقے تھے سمندر پار تجارت کا ان کے ہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یورپ میں لوگ خاندانی ضروریات کے مطابق اجناس خوردنی کی کاشت کر لیا کرتے تھے۔ سیدھا سادا کپڑا بنالیتے تھے۔ ضروریات کی معمولی چیزیں تیار کر لیتے تھے۔

مسلم دنیا میں کپڑے کی صنعت انتہائی سرورج پر تھی۔ کارکردگی، نفاست اور منفعت کے لحاظ سے ان کے کپڑے کی صنعت اپنی مثال آپ تھی۔ عربوں کی سلطنت اپنے وقت کی وہ سب سے بڑی سلطنت تھی جہاں دنیا بھر کے مقابلے میں سب سے زیادہ ریشمی اور سوتی کپڑا بنایا جاتا تھا۔ زرعی کام سب سے زیادہ اور بہتر ہوتا تھا۔ قالین اور محل بنانے میں بہت آگے تھے۔ موصل کا ملل اور دمشق کا شجر اور جامدانی بہت مشہور تھا۔ قالین کو روزمرہ استعمال میں لایا جاتا تھا جبکہ یہی قالین کئی صدیوں بعد یورپ میں تعیش کے طور پر استعمال ہونے لگے۔

ان کی دوسری صنعتوں میں اسلحہ سازی، سونے چاندی کا کام، زر کا کام، رنگین ٹائیل، مٹی کے برتن اور شیشہ گرمی وغیرہ شامل تھے۔

عمارت سازی کو انہوں نے ایک فن میں تبدیل کر دیا۔ مشرق اور مغرب کی عمارتوں کو پیش نظر رکھ کر ان دونوں میں انہوں نے امتزاج پیدا کیا۔ قدیم و جدید کو ملا کر ایسی عمارتوں کو وجود میں لائے جو دنیا کی خوبصورت ترین عمارتیں کہلاتی ہیں۔ ایسی عمارتیں انہوں نے بنائیں جن کو دنیا کی نظروں نے پہلی بار دیکھا۔ اس سے پہلے دنیا نے ایسی عمارتیں نہیں دیکھی تھیں۔

عربی ثقافت نے قدیم بدویوں کے شاعرانہ شعار کا بھی حفاظت کی۔ فن شاعری کو وہ سارے فنون کا امام مانتے ہیں۔ یہی وہ عرب ہیں جنہوں نے نظموں اور غزلوں کو ترنم سے پڑھنا یورپ والوں کو سکھایا۔

یونانیوں اور لاطینیوں کے قدیم شعراء ترنم میں پوشیدہ خوبصورتی اور اس کی فنی ماہیت کو سمجھنے نہ پائے تھے۔ ان کے پلے یہ بات نہیں پڑی تھی کہ نظموں کو ترنم سے زیادہ اثر انگیز کیا جاسکتا ہے۔

عربوں کے کارناموں کی اگر تفصیلات بیان کی جائیں تو فہرست اتنی لمبی ہوگی کہ پڑھنے والے اکتا جائیں گے۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی رہے گا کہ حضورؐ کے انتقال کے بعد سو سال تک مسلمانوں نے دنیا پر حکومت کی۔ دنیا کو اپنے زیر اثر رکھا۔ فوجی اور ثقافتی اعتبار سے پوری دنیا پر وہ اسی طرح چپائے رہے جیسے گذشتہ ڈھائی سو سال سے یورپ اور امریکہ۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ کس طرح ہوا۔ عرب کے ایک امی رسول اور آپ کے دیہاتی بدویوں نے کس طرح ایسی بیش بہا اور انمول ثقافت سے دنیا کو روشناس کروایا۔ طوالت سے بچنے اور کتاب کی ضخامت کو کم کرنے کے لیے مختصر طور پر ہم اس کا جائزہ لیں گے۔

حضورؐ نے اپنی زندگی میں کبھی ایسا سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ساتویں صدی عیسوی میں مرکزی عرب کے باشندے اپنے آپ کو جنگ کے لیے وقف کریں گے، بنیادی طور پر ذات اقدسؐ سر ابا مذہب کا پیکر تھی۔ آپ میں وہ مقناطیسی کشش تھی جو لوگوں کے دلوں کو فتح کر لیتی تھی۔ لوگوں کے دلوں کو فتح کر کے آپ فاتح زمانہ بنے۔ ہمیشہ آپ کی کوشش یہی رہتی تھی کہ لڑائی سے بگڑوں سے گریز کیا جائے، خون خرابے سے احتراز کیا جائے۔ حضورؐ اپنے دلائل سے لوگوں کو قائل کرتے تھے۔ لوگوں کے دلوں میں اپنی بات اتارنے کا حضورؐ کو ملکہ حاصل تھا۔ بہ نسبت ان لوگوں کے جو حضورؐ کی زندگی میں اور حضورؐ کی سرکردگی میں مختلف مہمات میں حصہ لیا کرتے تھے۔ فوجی اعتبار سے آپ کے ماننے والے آپ کے انتقال کے بعد

زیادہ کامیاب رہے۔ بہت سے مغربی اہل علم جن کی علمیت میں کوئی کلام نہیں لیکن ان کو اپنی زندگی بھر یہ موقع نہیں ملا کہ وہ بدویوں کے ساتھ رہیں یا ان کے ساتھ زندگی کا کچھ حصہ بسر کریں اس خیال کو اپنائے ہوئے ہیں کہ بدوی خون کے پیا سے ہوتے ہیں۔ ہا کو اور جلا د ہوتے ہیں۔ ان کی اس بہیمانہ خصلت کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی جنگجو یا نہ روش کے پیچھے حرص، لالچ اور لوٹ کھسوٹ کا جذبہ کام کرتا ہے۔ ان کے اس سوچنے کے انداز کو ان کے خیال کے مطابق حضورؐ کے طریقہ کار سے بھی تقویت ملتی ہے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے مالِ غنیمت کی امید دلا دلا کر ہی تو لوگوں کو اپنی طرف کیا تھا۔

ذاتی طور پر میں ان لوگوں کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ عربوں کو ہمیشہ میں نے جذباتی پایا۔ مذہبی دعوت پر لبیک کہتے سنا۔ وہ ان معنی میں بہت ہی فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ میرا یہ یقان ہے کہ بدویوں نے اسلام کو جو اپنایا وہ حضورؐ کی تبلیغ اور مذہب کے بلاوے پر اپنایا۔ مال و دولت کا لالچ مذہب کو تبدیل نہیں کرواتا۔

دنیا کی تمام بڑی بڑی مذہبی تحریکات کی طرح اسلامی تحریک بھی آہستہ آہستہ ٹھنڈی پڑنے لگی۔

حضورؐ تے مسلمانوں کے ایمانی جذبے کو جس طریقے سے اعبار اٹھا وہ جذبہ وقت کے ساتھ ساتھ ٹھنڈا پڑتا گیا۔

حضورؐ کے انتقال کے پچاس سال کے اندر ہی حضورؐ کے ماننے والے جنہوں نے ایک وسیع و عریض سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی اب سیاسی رستہ کشی کا شکار ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود سیدھے سادے مسلم عوام اپنے ایمانی جذبے کی حفاظت کرتے رہے۔

اگر ہم کو بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں حرص و ہوا کی مثالیں ملتی ہیں تو ان مثالوں کو سامنے رکھ کر یہ کھلبہ قائم کر لینا کہ بدر اور حدیبیہ میں حصہ لینے والے بھی اسی حرص و ہوا کے شکار تھے تو حق و انصاف کے ساتھ زیادتی کرنا ہے۔ ہر امر بے انصافی کرنا ہے۔

عربوں کی تاریخ کے دھارے کا ہم حسب ذیل طریقے سے تجزیہ کر سکتے ہیں۔ بنیادی طور پر حضورؐ نے عربوں کے آگے روحانی پیغام رکھا تھا۔ ان کی روحانیت سے اپیل کی تھی۔ لوگوں میں واقعی ایک نیا جوش اور ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا تھا۔

لڑائیوں کے لیے بجائے مدد کے حضورؐ کی ذات گرامی ایک رکاوٹ ثابت ہو رہی تھی۔ حضورؐ لڑائیوں کو صرف آخری حربے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ مسائل کو گفت و شنید سے حل کرنے کے خواہاں تھے۔ آپ نے لوگوں میں جو جوش و جذبہ پیدا کیا تھا اس کی گرمی حضورؐ کے انتقال کے بعد بھی لوگوں میں باقی رہی۔ آپ کی ذات گرامی کی غیر موجودگی کی وجہ سے لوگ اپنے حسب منشاء جنگیں لڑتے رہے۔ اپنی راہ آپ نکالی۔ ان لوگوں نے جتنی لڑائیاں لڑیں معجزانہ حد تک ان کو اس میں کامیابیاں ہی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ ان کے برخلاف حضورؐ کی زندگی میں جو لڑائیاں لڑی گئیں ان میں بعض میں کامیابی ہوئی اور بعض میں ناکامی۔

حضورؐ کے انتقال کے پچاس سال کے اندر ہی تنظیم سے عاری، تربیت سے ناواقف اور معاوضے سے بے نیاز عرب قبیلوں نے ایرانی شہنشاہیت کی اینٹ سے اینٹ بچا دی۔ بینر نطینی سلطنت کو اپنا بیج کر کے رکھ دیا۔ یہ جوش و خروش اتفاقی رہا۔ فتوحات حاصل کرنے کا زمانہ حضرت معاویہؓ کی

وفات یعنی ۶۸۰ء تک رہا۔

۶۸۰ء کے بعد دو بنیادی تغیرات رونما ہوئے۔

۱۔ مذہبی جوش و خروش جاتا رہا۔ گو حضرت معاویہ کی وفات کے ۵۰ سال بعد تک بھی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس کی بڑی وجہ گذشتہ ۵۰ سال کی عظمت و شان اور رعب و دبدبہ تھی۔

حضرت کے انتقال کے سو سال بعد یعنی ۳۲۷ء میں اسلامی فتوحات کا یہ سلسلہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اس وقت اسلامی سلطنت اتنی پھیلی ہوئی تھی کہ پوری دنیا میں ان کی بابرہی کرنے والا کوئی اور نہیں تھا۔ یہ اس وقت تک دنیا کی سب سے بڑی اور عظمت والی حکومت رہی جب تک کہ خود مسلمانوں نے آپس کے اختلافات، اندرونی خلفشار اور افراتفری سے اپنی ہی سلطنت کو اپنے ہی ہاتھوں مائل بہ تنزل نہ کر دیا۔

۲۔ دوسرا بنیادی تغیر جو وقوع پذیر ہوا وہ یہ تھا کہ ۶۸۰ء کے بعد عرب قبیلوں کے افراد کی فراہمی مشکل ہو گئی۔ یہ ایک ایسا اہم نکتہ ہے جس کو موجودہ مغربی مصنفین نے سرے سے نظر انداز کر دیا ہے۔ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ شام، عراق اور مصر فتح کر لینے کے بعد عربوں کی اکثریت ان مفتوحہ علاقوں میں جا کر آباد ہو گئی تھی۔

میں جہاں تک سمجھتا ہوں ایسا کہنا بالکل غلط ہے اور گمراہ کن ہے۔ یہ ایسا نکتہ ہے جو قابل تشریح ہے۔

سب سے پہلی بات یہ کہ آج بھی جزیرہ نمائے عرب کی پوری آبادی دریائے نیل کے دھانے پر رہنے والے لوگوں سے بہت ہی کم ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں مصر ایک خوش حال ملک تھا۔ آبادی بہت ہی گنجان تھی۔ عرب کی آبادی

زیادہ تر جنگجو جو قسم کے لوگوں پر مشتمل تھے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ساتویں صدی میں مرکزی عرب میں رہنے والوں کی تعداد مصر میں رہنے والے لوگوں کی تعداد کے مقابلے میں آج سے بھی بہت کم ہو۔

شام اور عراق بھی رومی اور ایرانی صوبے رہ چکے تھے۔ لوگ وہاں بھی کثرت سے رہتے تھے۔ یہ دونوں ملک شائستہ اور تہذیب یافتہ تھے اگر ان تینوں ملک کی جملہ آبادی کا حساب کیا جائے تو یہ عرب کے باشندوں سے تعداد میں کئی گنا زیادہ تھے۔

کس طریقے سے عربوں کا بہاؤ ان ملکوں کی طرف ہو سکتا تھا اور کس طریقے سے وہ شام، عراق اور مصر کو اسلامیت میں ڈھال سکتے تھے۔

اگر عربوں کو معاصر تاریخ کی طرح بھی ان پر ٹوٹ پڑے تھے اور ان پر قابض ہو چکے تھے تو ان ملکوں کے اصلی باشندوں کو کیا ہو گیا تھا کہ صورت حال سے انہوں نے خاموشی سے منٹ لیا۔

عربوں نے جب ان ملکوں کو فتح کیا تو وہاں پر نہ ہی کسی قسم کا کوئی قتل عام ہوا اور نہ ہی مقامی باشندوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور نہ ہی مقامی باشندوں نے اپنے ملک کو چھوڑا۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ مغرب کے موجودہ صاحبانِ علم کے نزدیک "بدویت" ایک انتہائی مکروہ لفظ ہے اور تکلیف دہ زندگی کا دوسرا نام ہے۔ بحث برائے بحث کی خاطر کہا جاسکتا ہے کہ فاتح عرب موقع کے متلاشی تھے۔ اپنے بوسیدہ خیموں سے نکل کر شام کے محلات میں عیش و عشرت سے لطف اندوز ہونے کے خواہاں تھے۔

عملی طور پر بدویوں نے کسی اور ہی رذیل عمل کا اظہار کیا۔ بہت سی حکومتوں



نے تعلیم، تربیت، قانون حتیٰ کہ تشدد کے ذریعے بددیت کو دبانے اور اسے ختم کرنے کی کوشش کی۔ سربراہان حکومتوں کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بددی اپنی زندگی کی رسم و رواج نہیں بدلنا چاہتے تھے تبدیلی کی وہ سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ مسنور کی زندگی میں جن بددی قبیلوں کا ذکر آتا ہے مثلاً جہینہ، آج بھی یہ قبیلہ اسی علاقے میں اسی طریقے سے زندگی گزار رہا ہے جیسے ان کے آباؤ اجداد ساتویں صدی عیسوی میں گزارا کرتے تھے۔

بنیادی طور پر انسانی فطرت ہمیشہ قدرتی ماحول کو ترجیح دیتی ہے شہر سے دور کھلے میدانوں کو پسند کرتی ہے۔ شہر کے ہنگاموں سے دور اور بہت دور قدرت کے شاہکار زندگی کے لیے جاذبِ نظر اور پُرکشش ہوتے ہیں ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہونا دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ ہر رات ایک نئے مقام پر سونا، سردیوں کی راتوں میں آگ جلانا، آگ کے اطراف بیٹھے رہنا، نئی نئی خیمہ گاہ، صبح صبح سورج طلوع ہونے کا نظارہ۔ سر شام سورج غروب ہونے کا منظر۔ یہ اور اسی قسم کے جلوے آج بھی ہم شہر میں رہنے والوں کے لیے ہماری آرزو اور ارمانوں کا حاصل ہوتے ہیں ان ہی کی تلاش میں ہم چھٹیاں گزارنے کے خواہشمند رہتے ہیں۔ اسی تمنا کو ساتھ لیے کوئی پیدل چلتا ہے۔ کوئی کیمپ میں ٹھہرنا پسند کرتا ہے۔ کوئی کاروان گراہیہ پر لیتا ہے۔ تو کوئی کسی اور طریقے سے رختِ سنہرا بندھتا ہے۔

شام، عراق اور مصر پر فوجی فتوحات کے نشہ نے کبھی بھی بددیوں کو اس بات کی طرف مائل نہیں کیا کہ وہ ان خوشحال اور امارت پسند ملکوں میں جا کر متوسط درجے کی خوش حالی اختیار کریں۔ نہ شام کی خوش حالی نے ان کو اپنی طرف مائل کیا اور نہ ہی مصر کی قدیم تہذیب نے۔ اس کے برخلاف ان

فتوحات نے ان کی بدویانہ زندگی کو پہلے سے زیادہ باوقفت بنا دیا۔ جیسے جیسے اسلامی حدود میں اضافہ ہونے لگا ان کی بدوی زندگی کے لیے نئے نئے میدان اور نئے نئے قدرتی ماحول میسر آنے لگے۔ ان کی تمناؤں کے قدم دشت امکاں کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگے۔

بدوی قبیلوں کے وہی گئے چنے افراد شہروں میں رہنے کو گوارا کر رہے تھے جو حکومت کے تمنخواہ دار تھے۔ بدویوں کی اکثریت رواں رواں رہی۔ مشرقی ایران، جنوبی افریقہ، اسپین اور دوسرے مقبوضہ علاقوں کے نئے نئے میدانوں میں وہ اپنے خیمے گاڑتے جا رہے تھے۔

اب عرب کے قبیلے دو مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ پہلی جماعت تو وہ رہی جس نے یکے بعد دیگرے فتوحات کی مہموں میں مجبوراً حصہ لیا۔ ان مہموں کی قیادت کی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے شمالی افریقہ، اسپین، ترکی اور ہندوستان پر اپنا اسلامی علم لہرایا۔ باقی وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنے اپنے پیدائشی مقامات پر زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ عرب کے رگیستان ان کی آماجگاہ بنے رہے۔ شام، فلسطین اور مصر میں زمینات پر کاشت کرنے کے لیے بہت ہی کم لوگ ان مقامات پر آباد ہوئے۔ عرب فتوحات نے مقامی لوگوں کے مقامی شعار اور اخلاقی اقدار کو بدلنے میں بہت ہی کم حصہ لیا اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

عرب بدویوں نے اپنے آپ کو نہ ہی شامی بنایا اور نہ ہی مصری۔ اس کے باوجود ان کی فتوحات کے پیش نظر ان کی قدر و منزلت میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ ہر مفتوحہ قوم کے نزدیک عرب ہونا بڑی ہی قدر و منزلت کی بات تھی۔ حضورؐ نے خود ہی ایک ایسا راستہ تجویز فرمادیا تھا جس پر چلتے ہوئے

مفتوحہ اقوام کو نہ ہانسنے کا علم ہوتا تھا اور نہ ہی اپنی شکست پر ذلت کا احساس۔ جو کوئی ایک بار کلمہ طیبہ اپنی زبان سے ادا کر دے وہ کلمہ گو ہو جاتا تھا۔ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر قانونی اور سماجی برادری میں برابر کا حصہ دار بن جاتا تھا۔ فاتح اور مفتوح میں کوئی فرق نہیں رہتا تھا۔ نہ فاتح میں مغرور باقی رہتا تھا اور نہ ہی مفتوح میں احساس شکست۔ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہو جاتے تھے۔

اپنے اپنے قبیلے والوں کے سامنے بھی ان کو اسلام کو قبول کر لینے کی وجہ سے نظریں چڑانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ وقت واحد میں مسلمان بھی رہتے تھے اور اپنے قبیلے کے فرد بھی۔

وہ دستاویزات اب بھی موجود ہیں جن پر حضورؐ کے انتقال کے تقریباً سو سال بعد کی تاریخیں پڑی ہوئی ہیں۔ ان دستاویزات میں مسلم اور عرب کو ہم معنی استعمال کیا گیا ہے۔

دلچسپ بات تو یہ ہے کہ جوش و خروش کے ابتدائی زمانے میں مسلمانوں کو جو فتوحات ہوئیں ان میں ان قبیلوں نے وہی طریقہ کار اختیار کیا جن کو وہ قبیلہ وارانہ جنگوں میں استعمال کرتے تھے۔

ساتویں صدی کے دوران شام میں اور بعد میں بغداد میں عباسی خلفاء کے عہد میں عربوں نے باقاعدہ فوج کی صورت اختیار کر لی۔ فوجی تنظیم، فوجی تربیت، ڈسپلن اور پیشہ وارانہ فوج کے اصول و قواعد کا ان پر اطلاق ہوا۔ جس طریقے سے بیزنطینی فوجوں کو جنگ کے لیے تیار کیا جاتا تھا انہی خطوط پر عرب فوجوں کی تنظیم نو کی گئی۔

ان فوجوں کے عہدہ دار اور سردار اب اصل عربوں کی اولاد نہیں رہے تھے مفتوحہ ممالک کے باشندوں ہی کو ان فرائض کے لیے چنا جاتا تھا۔ یہی وہ عنصر

تھا جس نے ہمارے اپنے خیال میں بغداد کے عباسی عہد کو ایک درخشاں اور زریں عہد بنا دیا تھا۔ اس دور میں علم کی شمعیں آب و تاب کے ساتھ روشن تھیں ان کی روشنی سے تمام دنیا فیض یاب ہو رہی تھی۔ عرب ثقافت اب مسلم ثقافت میں تبدیل ہو گئی۔ مسلمانوں کی زبان عربی زبان قرار پائی۔ اس زریں عہد کے مسلم مورخین، فلاسفہ، ریاضی دان اور دوسرے فن دان عرب بدویوں کی اولاد نہیں تھے۔ یہ ایک ایسی نسل سے تھے جو مختلف الخیال، مختلف مکاتب فکر کے حامل، مختلف اخلاقی اقدار سے تعلق رکھنے والوں کے باہمی میل ملاپ اور اتصال سے وجود میں آئی تھی۔ عباسی خلفاء نے جس معاشرت اور تہذیب کو اپنی سرپرستی اور نگرانی میں پروان چڑھایا تھا یہ اسی تہذیب کے پروردہ تھے۔ ترکی، ایرانی، یونانی، آرمینین، اطالوی، ہندی اور اسی طرح سے بہت سی قوموں کے افراد کو اپنے قریب کر کے مسلم دنیا کی نئی قوموں کو وجود میں لایا گیا تھا۔

عباسیوں کے زریں عہد کو عربوں کے عہد سے تعبیر کیا جائے یا کسی اور عہد سے، اس سے نفس واقعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ نفس مضمون کو سمجھیں تو ہم کو مشرق وسطیٰ کے اخلاقی اقدار کے معنوں اور ان کی پیچیدگیوں کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔

اخلاقی اقدار کی ان پیچیدگیوں کو ذہن میں لانے کے لیے ہمارے سامنے ایک زندہ مثال ہے۔ امریکہ کے لوگوں کی زبان انگریزی ہے۔ رہن سہن کا طریقہ انگریزوں سے ملتا جلتا ہے اس کے باوجود بھی اس ملک کے مختلف مقامات میں رہنے والوں کے اخلاقی اقدار کی ترکیب و ماہیت میں اتنا اختلاف واقع ہے کہ ان سب کے اشتراک سے ایک نئی امریکن قوم ظہور میں لانی پڑی۔ اگر دیکھا جائے تو امریکہ کی صورت حال میں پیچیدگی ذرا کم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ امریکہ میں

جرمن، اطالوی، یونانی اور بہت سی ایسی قومیں آباد ہیں جو ابھی تک اپنے آپ کو امریکی قومیت میں جذب نہیں کر سکیں اور اپنی قومی انفرادیت کو باقی رکھنے پہنچی ہیں۔ جب یہ لوگ واقعی اپنے آپ کو مقامی لوگوں میں جذب کر دیں گے اور پورے طریقے سے اختلاط عمل میں آجائے گا تو جغرافیائی حدود میں امریکہ ہی میں ان کو ایک مقام سے نکال کر دوسرے مقام پر آباد کرنے میں اتنی ذلیہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔

عرب ممالک میں ایسا کرنا ناممکن ہے۔ عربیت کو اپناٹے ہوئے لوگ جیسے شامی، معری اور الجیریہ۔ ان کی رگوں میں بہت ہی کم عربی خون ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ ان میں سے ہر ایک مختلف قوم ہے ہر قوم اپنے ہی ملک میں رہتی آئی ہے۔

حضرت کے انتقال کے سو سال بعد ہی عرب کے اصلی باشندے روزِ خسروی سے بے بہرہ کر دیے گئے تھے۔ سیاست سے بے دخل کر دیے گئے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے ورثے میں جو جنگی بہادری اور شجاعت چھوڑی وہ تاریخ کا باب بن گئی۔ عرب کے اصلی باشندوں ہی نے افغانستان اور اسپین جیسے دور دراز مقامات پر اسلامی جھنڈا لہرایا تھا۔ ان کی بہادری اور شجاعت نے ان ممالک کو ان کے زیرِ نگیں کیا تھا۔ ان ہی فاتحین کی بہادری اور دلیرانہ صفات اور خصوصیات کا گہرا اثر مغربی یورپ پر پڑا اور مغربی اقوام نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کے جنگی طریقوں کو اپنایا۔ اس کے برخلاف شام، مصر اور عراق والوں نے ان عربوں کے جنگی نظریات کو تسلیم کیا اور نہ ہی ان کو اپنانے کی کوشش کی۔

دسویں صدی عیسوی میں عرب سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس کی بڑی

وجہ قریش کی آپس کی رقابت اور وہی پرانی دشمنی رہی۔ ایک نیا خاندان جو اپنے آپ کو علیؑ ابن ابی طالب کی اولاد بتلاتا تھا ۹۶۳ء میں مصر میں اقتدار پر قابض ہو گیا۔ انہوں نے عباسی خلفاء کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ یوں بھی عباسیوں پر اس وقت زوال کے آثار تھے۔

۱۰۵۵ء میں ترک سلجوق بغداد پر قابض ہو گیا۔ یہ مرکزی ایشیا کا ایک سفاک اور وحشی خانہ بدوش سردار تھا۔

۱۰۸۷ء میں صلیبی شام میں پہنچے۔

۱۲۵۰ء میں مملوک مصر پر قابض ہوئے۔ یہ ترک تھے۔

آخر کار ۱۵۱۷ء میں عثمانی ترکوں نے شام اور مصر کو فتح کر لیا۔ پھر عراق اور الجبیر یا پر قابض ہو گئے۔

عربوں کے اقتدار نے جو آفاقیت اختیار کی اور ہمہ گیر سلطنت کی بنیاد ڈالی اس کی تہہ میں دو باتیں ملتی ہیں۔ یہی وہ دو ذریعے تھے جو ان کے عروج کا باعث بنے۔ ایک ذریعہ جو سب سے بند اور اعلیٰ تھا وہ رسول اللہ کی مذہبی تعلیمات تھیں دوسری بات جو کارگر ہوئی وہ عرب قبائل کی شجاعت، بہادری اور لڑنے مرنے کا جذبہ تھا۔ ان کے اسی جذبے نے اسلام کے نئے عقیدے کو اسپین سے چین تک پھیلا کر اسے آفاقی بنا دیا۔ اسلام کو ہمہ گیر کر دیا۔ اسپین، مراکش اور انڈیا تک جا کر عرب قبائل کی تلوار رک گئی۔ جو آگے بڑھتے رہے وہ ان مقامات تک پہنچ گئے اور جو پیچھے رہ گئے وہ خانہ بدوشی کی زندگی میں پھر سے لگ گئے۔

اسلام نے نہ صرف مفتوحین کو بلکہ فاتحین کو بھی اپنے آپ میں جذب کر لیا۔ جزیرہ نما بے عرب سے اپنا ناتا ختم کر کے عثمانیوں کو اس نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اسلام کے اثر سے ترک سیدھے سادے بن گئے۔ اسلام

کے شیدائی بن گئے۔ شجاع اور بہادر بن گئے۔ ان خوبیوں کے باوجود وہ عرب نہ بن سکے۔ ان میں ایک طرف جنگی بہادری اور شجاعت کی کمی تھی تو دوسری طرف شام، ایران، عراق اور مصر کی تہذیب اور شائستگی کا فقدان تھا۔

بادگار تاریخیں

- ۶۳۲ء حضور کا انتقال
مدینہ میں چار خلفاء کی خلافت
حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ
۶۳۲ء سے ۶۶۱ء تک
- شام کے بنی امیہ کی حکومت (ابوسفیانؓ کا خاندان) ۶۶۱ء سے ۷۵۰ء تک
بغداد کی عباسی حکومت
۷۵۰ء سے ۸۷۸ء تک
- گویہ ۱۲۵۸ء تک بغداد میں رہے لیکن ان کی حیثیت شطرنج کے ایک مہرے جیسی تھی۔
- بنی فاطمہ کی حکومت
۹۶۳ء سے ۱۱۶۱ء تک
- فاطمہؓ حضورؐ کی چہیتی صاحبزادی کا نام ہے
ترک اسلجوق کا بغداد پر قبضہ۔
۱۰۵۵ء
- صلیبی جنگیں
۱۰۹۸ء سے ۱۲۹۱ء تک
- شام اور مصر پر عثمانیوں کا قبضہ
عثمانی ترک تھے
۱۵۱۶ء
- عربی بولنے والے ممالک سے عثمانیوں کا اخراج
۱۹۱۸ء

اسلام کا پھیلاؤ

بحیثیت مذہب

ایسے مادی زمانے میں جبکہ ہر چیز کو سائنس کے علم اور حساب و کتاب کی تراز میں تولد جاتا ہے۔ ہمیں یہ بات بتائی گئی ہے کہ ہر عمل کا ایک رد عمل ہوتا ہے۔ ہر حرکت کا ایک سبب ہوتا ہے۔ جب عمل اور رد عمل اور حرکت اور اس کے سبب میں تناسب قائم کر لیا جاتا ہے، اس کی وجہ معلوم کر لی جاتی ہے، تو مسئلہ کے حل کرنے میں آسانی تیز ہو جاتی ہے۔ ایسے حل کو بغیر کسی الجھن کے مضابطہ کی صورت دی جاسکتی ہے۔ مضابطہ کو حسب ضرورت استعمال کرنے کے لیے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ سارے برآمد شدہ نتائج کو متعلقہ نائل میں رکھ کر اس نائل کو الماری میں اس کی مقررہ جگہ پر رکھ دیا جاتا ہے۔

تاریخ میں انسان کی شروع کی ہوئی جتنی تحریکات کا ذکر ہے بد قسمتی سے شاید ہی ان تحریکات کو کسی ایک مقصد یا منشاء سے متعلق کیا جاسکتا ہے۔ انسانی زندگی بڑی ہی پیچیدہ رہی ہے۔ مختلف نقاط نظر اور مختلف فکر و عمل کے حامل انسانوں کے کارناموں پر تبصرہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ان کے کارناموں پر کوئی جچی تلی رائے قائم کرنا اور کبھی مشکل ہے۔ ان کے عمل اور رد عمل کو سامنے رکھ کر کوئی واضح نتیجہ اخذ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

جب ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ حضورؐ کے انتقال کے بعد اسلام نے جو

عالمگیر صورت اختیار کر لی تھی اس کے کیا اسباب تھے تو اس سوال کا جواب ایک دو اسباب کی صورت میں بیان کر دینا سوال کی اہمیت کو گھٹا دینا ہے جو اب کی حد سے زیادہ آسان صورت دیکر سوال کرنے والوں کے ذہنوں میں ایک غلط تاثر پیدا کرنا ہے۔

یہ سوال اتنی زیادہ بار دہرایا گیا ہے کہ ہم کو بہر حال اس کا جواب دینا چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ ہم اس موضوع کو دو حصوں میں تقسیم کریں۔

پہلے حصے میں عربوں کا اسلام قبول کرنا بیان کریں گے۔ دوسرے حصے میں غیر مالک ہیں اس نئے مذہب کی اشاعت اور اس کے پھیلاؤ کا ذکر کریں گے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ کی زندگی ہی میں دس ہزار سے زیادہ لوگوں نے آپ کی تعلیمات کو دل و جان سے قبول کر لیا تھا۔ حضورؐ کی تبلیغ اور آپ کے ارشادات کے وہ قائل ہو گئے تھے۔ اپنے آپ کو اسلام کے لیے وقف کر دینے والوں میں اکثریت یا تو مکے کے لوگوں کی تھی یا پھر مدینہ کے۔ ساتھ ساتھ وہ قبیلے بھی تھے جو ان دونوں مقامات کے قرب و جوار میں تھے اور جو ایمانی جوش و جذبے سے معمور تھے۔

جو قبیلے دور دور رہا کرتے تھے ان پر اسلامی تعلیم کا اثر کم ہوا۔ وہ حضورؐ کو ویسا ہی حکمران سمجھتے تھے جیسے لہجہ یا بنی غسان کے حکمران ہوا کرتے تھے حضورؐ کے اثر و اقتدار میں جب اضافہ ہوا تو مختلف قبائل کے سردار آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ مسلمان ہو جاتے تھے۔ تحفے تحائف لے کر واپس ہوتے تھے۔ یہ بالکل سیاسی قسم کا شعار تھا جو عرب میں اس وقت سے چلا آ رہا تھا جبکہ تاریخ کے افسانے پر ابھی سویرا بھی نمودار نہ ہوا تھا۔ ان میں اکثروں نے حضورؐ کو ایک سیاسی رہبر اور سیاسی شخصیت کا روپ دے دیا تھا۔ اس ذہنیت کے

نیچے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے ہی حضورؐ کا انتقال ہوا۔ بہت سارے قبائل نے بغاوت کا اعلان کر دیا۔ یہ بغاوت کی آگ سارے جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی تھی۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ اسلام کی کامیابی اور ترقی کا پہلا سبب حضورؐ کی ذاتِ گرامی تھی۔ اسلام کی اشاعت اور اس کی روز افزوں کامیابی کا سہرا حضورؐ کی اُس صداقت کے سر ہے جس کو کام میں لاکر آپ نے لوگوں کے دل کو ویلے تھے آپ نے لوگوں کے دلوں کو اس طرح سے اپنی طرف کر لیا تھا کہ زندگی میں جو بھی ایک بار آپ کا ہو گیا وہ پھر آپ کے دائرہ اثر سے باہر نہیں نکلا۔

اسلام کے تیزی سے پھیلنے کا دوسرا سبب مقامی عربوں کی بھرم بھاری اور پٹارا خالی والی روش تھی۔ ان کے عقائد اتنے کمزور تھے اور ان میں اتنا زیادہ خلل تھا کہ ان کی یہ کمزوری اسلام کے پھیلنے میں بڑی مددگار ثابت ہوئی۔ ان بُت پرستوں اور بے دینوں کے ہاں نہ اپنے مذہب کی اہمیت تھی اور نہ ہی وہ اسے اہمیت دیتے تھے۔ عرب بُت پرستی کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ کوئی ایسا محافظ یا سرپرست نہیں تھا جو بُت پرستی کی بقا کے لیے سینہ سپر ہو کر میدان میں آتا۔ نہ ان میں کوئی تنظیم تھی نہ ہی آپس میں اتحاد و اتفاق۔ جو لوگ ان میں تجارت پیشہ تھے اور تجارتی سفر کے دوران عیسائیوں، یہودیوں اور آتش پرستوں سے ملتے تھے جب وہ اپنے مذہبی اصول و عقائد کا مقابلہ اہل کتاب کے مذاہب سے کرتے تو اپنے مذہب کو مسخر اپن قرار دیتے تھے۔ اس کا تمسخر اڑاتے تھے۔ پورے عرب میں کوئی ایک عرب بھی ایسا نہیں نکلا جس نے اپنے بتوں کی حفاظت اور مدافعت کی خاطر اپنی جان کی قربانی دی ہو۔ ان کی خاطر تلوار اٹھائی ہو یا بتوں کی خاطر جامِ شہادت پیا ہو۔ عربوں کے سامنے ان کے بتوں کی بے بسی اور مجبوری رکھی

گئی۔ ان کو قائل کیا گیا کہ دیوتاؤں کی پوجا کرنا عقل و انصاف کے منافی ہے۔ عربوں کے قدیم شعراء اور ان کی خاندانی اعلیٰ صفات کو ان کے آگے رکھا گیا۔ ان کے بڑوں کی داستانیں ان کے سامنے اس لیے دہرائی گئیں کہ وہ اپنے پس منظر سے واقف ہوں۔ روحانیت کی طرف مائل ہوں۔ زندگی کے اعلیٰ اقدار سے شناسا ہوں۔ بجائے بتوں کو اہمیت دینے کے ان کو اپنی آپ پہچان کے لیے کہا گیا۔ حضورؐ کی وحدانیت کی تعلیم اتنی ارفع و اعلیٰ تھی مگر اس کا مقابلہ کعبے کے بتوں کو پوجنے سے کیا ہی نہیں جاسکتا۔ ہر وہ شخص جس میں عقوڑی بہت بھی سمجھ بکھی وحدانیت کی تعلیم کو سمجھنے لگا تھا۔ عجیب بات ہے کہ عربوں میں سے کسی نے بھی اپنے بتوں کی مدافعت کے لیے توار اٹھائی اس کے باوجود وہ اپنے پرانے اور رومانی رسم و رواج کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ جب ان سے بت پرستی چھڑوانے کی کوشش کی گئی تو ان میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ جب ایک مرتبہ تمام قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا تو پھر اسلام اور قبیلہ داری و فاداری کے درمیان کوئی تنازعہ پیدا نہیں ہوا۔ عربوں اور اسلام میں مکمل سمجھوتہ ہو گیا۔ ہر عرب قبیلہ مسلمان تھا اور ہر عرب کسی نہ کسی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ جب بات یہاں تک پہنچی تو کوئی سبب نہ تھا کہ اسلام عربوں کی خوبیوں کی مخالفت کرتا۔

جب بدلہ لینے کا ذکر آتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ حضورؐ نے کبھی بھی مسلمانوں سے یہ نہیں فرمایا کہ اپنے دشمن سے محبت کرو۔ آپ نے فرمایا کہ دشمن اس قابل ہیں کہ ان سے انتقام لیا جائے لیکن اگر مسلمان اپنے دشمن کو معاف کر دیں تو ان کی یہ معافی اللہ کی خوشنودی کا باعث ہوگی۔ حضورؐ کے اس فرمان کی روشنی میں عربوں کو یہ موقع ملا کہ اپنے قدیم قومی شعار کے مطابق آئندہ بھی لوگوں سے انتقام لیتے رہیں۔

عربوں میں اسلام کے تیزی سے پھیلنے کا تیسرا سبب یہ تھا کہ حضور کے انتقال کے بعد سب ہی قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ پرانی رقابت جو اسلام سے وفاداری اور قبیلہ وارانہ وفاداری کے درمیان چلی آرہی تھی وہ اب مفقود ہو چکی تھی۔

چوتھا سبب یہ رہا کہ جیسے ہی بنی نطینوں کے خلاف عربوں نے جنگ شروع کی آپس کے اختلافات کو ختم کر دیا۔ اسلام پر جو اعتراضات کیے جاتے تھے وہ بھی دب گئے۔ غیر مسلموں سے جنگ اب ان کے جذبات کو ابھارنے لگی۔ ان میں ہوش اور ولولہ پیدا کرنے لگی۔ جنگوں میں ان کی روانیت کا عنصر نظر آنے لگا آپس کی قبیلہ وارانہ جنگوں سے زیادہ کشش اب انہیں غیر مسلموں کے خلاف جنگ کرنے میں نظر آنے لگی۔

جو لوگ کل تک بتوں کی پوجا کرتے تھے، زندگی کے مقصد سے نا آشنا تھے آج ان کو مذہب کے نئے تصور سے نوازا گیا۔ اس خدا کا تصور دیا گیا جو بیکتا ہے، عظیم ہے، قہار اور جبار ہے جس کی ساری دنیا پر حکومت ہے۔ ساری کائنات پر حکومت ہے۔ خدائی کے اس تصور نے ان کی جذباتی دنیا میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ سونے پر سہاگہ ان کے ذہنوں میں یہ خیال بھی جم گیا کہ پروردگار نے ان کو اس لیے ایمان سے نوازا کہ وہ ساری دنیا کو فتح کریں۔ کائنات پر حکمرانی کریں۔ اس نئے نظریے اور نئے تصور نے عرب کے سیدھے سادے لوگوں کی رگوں میں ایک برقی زو دوڑا دی تھی۔

رسول اللہ کے انتقال کے بعد عرب قبائل نے متفقہ طور پر اس نظریے کو اپنایا کہ وہ خدا کے نائب ہیں۔ دنیا پر حکومت کرنا ان کا حق ہے۔ نیابت الہی کے نظریے کی بدولت وہ ہر موقع پر فاتح رہے۔ فتح و نصرت ہمیشہ ان کا ساتھ دیتی رہی۔

بدو، اُعد اور مُخنین میں ایک عرب دوسرے عرب سے لڑ رہا تھا۔ وہ آپس ہی میں برس پکارتے تھے۔ مسلمان اپنے مذہب کی خاطر لڑ رہے تھے۔ ان کا منشا تھا کہ قدیم رومانی زندگی کا، جس کے وہ عادی ہو چکے تھے خاتمہ کر دیا جائے۔ جیسے ہی انہوں نے اسلام قبول کر لیا اب وہ یونانیوں اور ایرانیوں کے مقابلے پر اتر آئے۔ صورتحال نے پلٹا کھلایا۔ اب قدیم اور رومانی طرز زندگی کا خاتمہ کرنا نہیں تھا بلکہ لڑنا اللہ کی راہ میں تھا۔ عربوں کی روایاتی اور تاریخی بہادری اب اسلام کی خدمت بجا رہی تھی۔ عرب میں اسلام کے تیزی سے پھیلنے کا پانچواں سبب ان کی مسلسل کامیابیاں رہیں۔ دنیا میں کامیابی سے بڑھ کر کوئی اور نشتہ نہیں ہوتا۔ مہربانی اور سادہ زندگی بسر کرنے والوں نے اب اپنے اللہ سے یہ امید لگا رکھی تھی کہ وہ اپنے ایماندار اور اطاعت گزار بندوں کو اسی دنیا میں انعام و اکرام سے نوازے گا۔ توریت میں بھی بارہا اس عقیدہ اور ایقان کا ذکر آچکا ہے۔ موسیٰ کی قوم اپنے خدا سے توقع رکھتی تھی کہ وہ ان کو فتح سے نوازے گا۔ رسول اللہ کا بھی عقیدہ اور ایمان تھا کہ صاحب ایمان کو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی نوازے گا اور آخرت میں بھی۔

ایک زمانہ ایسا بھی آیا جس میں مذہبی لوگوں نے عسوس کیا کہ عملی طور پر ایسا ہونا ناممکن ہے۔

عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق جنت کے فرشتوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ رنج و الم سے جیسے نکل آئے ہیں۔

سینٹ پال کا بھی یہی کہنا ہے کہ رنج و الم اور تکلیف و مصیبت میں شادمانی اور راحت ہے۔

عرب کے بدوی بڑے ہی سادہ لوح تھے ان کو یقین تھا کہ ان کا خدا ان کو دولت، حکمرانی، کامیابی اور دنیا کی ہر نعمت سے سرفراز کرے گا۔ وہ سمجھتے تھے

کہ خدا کی نظر کرم نے ان کو اپنی نعمتوں کے لیے چُن لیا ہے۔ بیز نطمینوں اور اربابوں پر ان کی فتح نے ان کے اس یقین میں اور پختگی پیدا کر دی۔ ان کو یقین ہو گیا کہ خدا واقعی لڑائیوں اور جنگوں میں ان کے ساتھ ہے ان کی مدد کر رہا ہے۔

عرب میں تیزی سے اسلام پھیلنے کا چھٹا سبب یہ تھا کہ وہاں کے لوگ اس پیغام کے اہل تھے۔ زمانہ اس کے لیے سازگار تھا۔ اسلام اصل میں عربوں کا مذہب ہے۔ قرآن عربی میں اتارا گیا ہے۔ قرآن کے عربی میں نازل ہونے کی وجہ سے انہوں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ یہ خدا کی زبان ہے۔ جنت میں خدا عربی زبان ہی میں لوگوں سے مکالمہ ہوگا۔ عربوں کا انداز فکر بہت ہی سیدھا سادا ہوتا تھا۔ آج بھی ان کے سوچنے کے انداز میں وہی سادگی ملتی ہے۔ یونانیوں، شامیوں اور بحیرہ روم کے ساحل پر رہنے والے لوگوں کی طرح ان میں زیرکی اور چالاکی نہیں تھی۔ فلسفیانہ ٹوٹکائیوں سے کوسوں دُور تھے۔ ذہنی تیز فہمی نہیں تھی۔ اسلام یہودیت سے ان معنی میں مشابہ تھا کہ مذہب کے خدا و خال بہت ہی واضح، صاف اور بغیر کسی مہیر پھیر کے تھے۔ ایک خدائے واحد و برتر۔ ایمانداروں کے لیے جنت میں انعام و اکرام۔ بدکاروں کے لیے دوزخ میں سزا۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ اسلام مشرق و مغرب میں تیزی سے جو پھیلا وہ خط استوا کے شمال میں ۱۵ اور ۳۵ درجہ کے عرض البلد میں دونوں طرف یکساں طریقے سے پھیلا۔ اس حصے میں ریگستان کا ایک لمبا سلسلہ چلا گیا ہے برائش سے لے کر پاکستان تک۔ اس حصے کا درجہ حرارت خطِ سرطان اور خطِ جدی سے بالکل مختلف ہے۔ غالباً ریگستانی علاقوں میں جو لوگ پیدا ہوتے ہیں وہ بہت ہی سادہ لوح اور سیدھی سادی ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں۔ آفریقیہ کے باشندوں نے بڑے ہی جوش و خروش سے اسلام کو قبول کیا۔ عربوں سے

اخلاقی اور سماجی اعتبار سے رشتہ ناتا ہونے کے باوجود انہوں نے عربوں کے مذہب کو خوش آمدید کہا۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے زیر اقتدار یا ان کے زیر حکومت رہنا کبھی پسند نہیں کیا۔ عربوں کی حکومت کی انہوں نے سختی سے مخالفت کی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عرب کے لوگ شرک و بت پرستی سے اپنا ناتا جوڑے ہوئے تو تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ کسی اعلیٰ اور برتر روحانی عقیدے کی تلاش میں تھے ان کے آگے یونانی مسیحیت کی وحدانیت کا پیغام بھی تھا۔ پہاڑی و عظمیٰ سے بھی وہ واقف تھے۔ پہاڑی و عظمیٰ جو سادگی اور سچائی تھی یہ سچائی اور سادگی ان کو وحدانیت کے اس پیغام میں نہیں ملتی تھی جو یونانی مسیحیت کی طرف سے ان کے آگے پیش کیا جاتا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں یونانی مسیحیت علمی اور منطقی موٹو شگافیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ عقیدہ تنازع پر لا حاصل بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ مسئلہ تنازع کی تشریح و توضیح نت نئے طریقوں سے کی جاتی تھی۔ ان کی ان لا حاصل بحثوں کی وجہ سے عام لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ ان کی فلسفیانہ باتیں عام لوگوں کی سمجھ سے باہر تھیں ان کے آپس کے بحث و مباحثہ ایک دوسرے سے نفرت اور رائی کا پہاڑ بنانے نے عربوں کو اس کا موقع دیا ہی نہیں کہ وہ یونانی مسیحیت کی طرف توجہ بھی کریں۔

عرب سمجھ بوجھ کے لحاظ سے بھی یونانیوں کی پیچیدہ مسیحیت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ عیسائیوں کے نظریات جو محبت، خوشی اور امن کے تعلق سے تھے یونانیوں کی آپس کی کج بحثیوں کی وجہ سے عربوں کے علم میں نہ آسکے۔ عرب لوگ محبت، خوشی اور امن کے عیسائی تصور سے بے بہرہ رہے۔ اس وقت جبکہ عرب ایک پاکیزہ اور اعلیٰ مذہب کی تلاش اور جستجو میں تھے بیزنطینیوں

سیمت ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام رہی۔

یہودیت میں وحدانیت کی ایک صاف اور صریح تعلیم تھی۔ عربوں کا رویہ یہودیت کے تعلق سے نرم اور مصالحتانہ تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک موقع پر حضورؐ نے مسلمانوں اور یہودیوں کی ایک مشترکہ فوج بھی بنانے کی امید ظاہر کی تھی تاکہ دشمنوں سے مقابلہ کیا جاسکے۔ مدینہ کے یہودیوں کی تھوٹی شان نے حضورؐ کی اس امید کو بالوہی میں تبدیل کر دیا۔ یہودیوں نے وہ موقع تو ہاتھ سے جانے دیا جس سے فائدہ اٹھا کر وہ مقامی لوگوں کو اپنے مذہب کی طرف مائل کر سکتے تھے اس کے برخلاف یہ حماقت ضرور کی تھی کہ اپنے سارے علمی ذخیرے کو کام میں لاتے ہوئے حضورؐ کی تضحیک کرنی شروع کر دی۔ لوگوں کے سامنے آپ سے پہلے سوالات کر کے آپ کو شرمندہ کرنے کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

عرب اپنے دل کی تسکین کے لیے وحدانیت کی تلاش میں تھے۔ ان کے سامنے وحدانیت کا جو تصور پیش کیا گیا اس میں پیش رو و مذاہب کے وحدانی تصور کی آمیزش کی گئی اور ان کو بنیاد بنایا گیا۔ ایک ایسا تصور وحدانیت ان کے آگے رکھا گیا جو ان کی طرز فکر سے مطابقت رکھتا تھا۔ ان کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا۔ اس تصور میں اتنی پیاری عربی چاشنی تھی جو سارے جزیرہ نمائے عرب میں اس مذہب کو تیزی سے پھیلانے میں دو آتشہ کا کام کر رہی تھی۔

جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے تیزی سے پھیلنے کے اسباب جو اوپر بیان کیے گئے ہیں وہ بہت سوں کے لیے یقیناً قابل قبول ہوں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا تھا جو غیر عرب ممالک میں رہا کرتے تھے اور اس سرعت کے ساتھ اسلام کو قبول کرتے جا رہے تھے۔ یہ سوال اپنی جگہ اور بھی اہمیت اختیار کر لیتا ہے جب ہم ان ممالک کے لوگوں کا ذکر کرتے

ہیں جن کو اپنی ہزاروں سالہ تہذیب و تمدن اور ثقافت پر ناز تھا۔ جو ایک حد تک وحدانیت پر بھی یقین رکھتے تھے۔

منرب میں رہنے والی عیسائی اقوام کا عام طور سے یہ خیال ہے کہ اسلام کو تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے۔ بہت زیادہ سختیوں کے ساتھ ان کے اس خیال سے متفق ہونا پڑتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ حضورؐ کے انتقال کے بعد عرب کے مختلف قبیلوں میں بغاوت کی جو آگ پھیل گئی تھی اس کو بجھانے کے لیے طاقت کا استعمال کرنا پڑا۔ تلوار استعمال کی گئی۔ چند ہی مہینوں بعد جب مسلمانوں نے بیزنطینیوں اور ایرانیوں کے خلاف قدم اٹھائے تو اندرونی بغاوت کو کچلنے کے لیے جو خون بہایا گیا تھا اس کو سب ہی نے نرا موش کر دیا۔ چونکہ غیر ملکیوں سے لڑنے کا معاملہ سامنے تھا اس لیے گھر کے تھکڑوں کو ہر ایک نے بھلا دیا۔ آپس کی ساری ٹسکر رنجیاں اور غلط فہمیاں دور کرنی پڑیں۔ غیر ملکیوں سے لڑنے کے لیے سارے عرب انتہائی جوش اور جذبے کے ساتھ میدان عمل میں کود پڑے۔ جس سرعت کے ساتھ مسلمانوں نے شام، مصر اور فلسطین کو فتح کیا اس کا ذکر ہم کہ چکے ہیں۔

سب سے دلچسپ ترین بات ان فتوحات میں یہ رہی کہ مفتوحہ اقوام کو اپنا مذہب تبدیل کرنے کے لیے مسلمانوں نے کبھی بھی مجبور نہیں کیا۔ کہیں بھی مجبور نہیں کیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ رسول اللہؐ نے عیسائیوں اور یہودیوں کو جبراً مسلمان بنانے کی کبھی بھی وکالت نہیں کی تھی۔

مدینہ کے یہودیوں پر جو نزلہ گرا تھا اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہودی قبیلوں نے حضورؐ کے پیغام کی مخالفت کرنی شروع کر دی تھی اسی لیے یا تو ان کو قتل کر دیا گیا یا پھر مدینہ سے بھاگا دیا گیا۔

دوسرے مسزوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہودیوں سے مخالفت کی برسی وجہ سیاسی رہی نہ کہ مذہبی۔ یہودیوں کی ساری تباہی کے باوجود کبھی انفرادی طور پر یہودی مدینہ میں زبا کرتے تھے۔ اپنی تمہارت میں لگے ہوئے تھے۔ مدینہ میں رہنے والے بقیہ یہودیوں پر کبھی بھی کوئی ایسا اثر اور دباؤ نہیں ڈالا گیا جس سے عبور ہو کر وہ اپنا مذہب بدل لیں۔ جیسے ہی انہوں نے حضورؐ کی مخالفت کرنی ترک کر دی ان سے کسی بھی قسم کی کوئی باز پرس نہیں کی گئی۔

جہاں تک نصرانیوں کا تعلق ہے حضورؐ نے نصرانی قبیلوں سے معاہدے کیے تھے۔ نجران، جنوبی اردن، ایلہ اور رومہ کے عیسائی حکمرانوں نے حضورؐ کے ساتھ معاہدے کر رکھے تھے۔ قرآن میں ایسے کئی باب ہیں جن میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ پیغمبر کا کام لوگوں کو سرف بنیہہ کرنا ہے۔ ان کے پیچھے پڑ جانا نہیں اپنے عقیدے کی طرف بلانا ہے۔ سلامتی کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔ لاعمال خواہشات کے چکر میں نہیں پڑتا ہے۔ خدا پر اور اس کی نادل کی ہوئی کتابوں پر ایمان لانا ہے بعض جگہ کہا گیا ہے کہ خدا ہمارا بھی خدا ہے۔ خدا تمہارا بھی خدا ہے۔ ہمارے اعمال ہمارے ساتھ ہیں۔ تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں۔ تم میں اور ہم میں جھگڑا تو ہونا ہی نہیں چاہیے۔ خدا ہم سب کو ایک کرے گا۔ ہم سب مل کر اس کی بارگاہ میں ٹوہیں گے۔

قرآنی آیات کا جو مفہوم اُد پر پیش کیا گیا ہے اگر اس مفہوم کے پیش نظر یہودی اور عیسائی ہی ہیں تو یہ اسلامی رواداری کی معراج ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا رواداری ہو سکتی ہے۔

آگے چل کر قرآن کے سورہ نور کی ۵۴ آیت میں ارشاد ہوتا ہے "کہہ دو کہ خدا کی فرمانبرداری کرو اور رسول کے حکم پر چلو اگر منہ موڑو گے تو رسول پر جو ان کے ذمے ہے اور تم پر جو تمہارے ذمے ہے اور اگر تم ان کے فرمان پر چلو گے تو سیدھا راستہ پالو لے اور رسول کے ذمہ تو صاف صاف (احکام) پہنچا دینا ہے۔"

قرآن کی یہ آیتیں صاف طور پر کہہ رہی ہیں کہ پیغمبر کا کام صرف تبلیغ کرنا ہے ارشاد و ہدایت ہے۔ طاقت کا استعمال نہیں۔

اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ قرآنی آیات نہ صرف جنگ نہ کرنے کی حامی بھر رہی ہیں بلکہ جنگ کرنے سے منع کر رہی ہیں تو پھر اس روشنی میں ہم مسلم فاتحین کے کارناموں پر نظر ڈالیں گے۔

حضور کے انتقال کے دو سال بعد حضرت ابو بکرؓ جب شام پر حملہ کرنے کا حکم دے رہے تھے اپنی فوجوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "انصاف سے کام لو۔ عقیدے اور ایمان میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ بچوں کو نہ مارو۔ ضعیفوں اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ پھل دینے والے درختوں کو نہ کاٹو۔ اگر تمہارا گزر دوسرے مذاہب کے عبادت خانوں کی طرف سے ہو تو ان عبادت خانوں میں جو لوگ عبادت کر رہے ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔"

جن لوگوں کو منسوخ یا مغلوب کیا گیا ان کے سامنے دو صورتیں رکھی گئیں۔ اسلام یا تلوار۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے عرب کو چھوڑ کر اسلام اور تلوار کا فارمولہ جس طریقے سے استعمال میں لایا گیا وہ یہ تھا کہ دشمن کو جب اسلام کی اطاعت کے لیے کہا جاتا تھا ان کو تلوار دکھائی جاتی تھی۔ جب دشمن ہتھیار ڈال دیتے تھے تو تلوار نیام میں رکھ لی جاتی تھی۔ دشمنوں سے ہتھیار ڈالوانے کے لیے تلوار دکھائی گئی۔

میرا یہ بیان مزید تشریح طلب ہے۔ سب سے پہلی بات جو ہمیں یاد رکھنی چاہیے وہ یہ کہ دشمن جسے ہی مغلوب ہو جاتے تھے اور اسلام کے حلقہ میں داخل

ہو جاتے تھے ان کو فاتحین کی برابری حاصل ہو جاتی تھی۔ فاتح اور مفتوح میں پھر کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا تھا۔ یہ ایک ایسی خاص بات تھی جو کشادہ دلی اور وسعت قلب کی بہترین ترجمانی کرتی تھی۔ تاریخ عالم میں ایسی مثال نایاب ہے کہ جس میدان پر لڑائی ہوئی ہو وہیں اسی جگہ کسی فاتح نے مفتوح کو اپنے برابر کا مقام دے دیا ہو۔ بعض بعض جگہ اس زندگی اصول پر عمل نہیں کیا گیا۔ عربوں نے اپنی فتوحات کے نشہ میں سماجی طور پر اپنی برتری کا مظاہرہ کیا۔ مفتوح قوموں کو دوسرے درجے پر رکھا۔ ایسا عمل معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سرکاری پالیسی کے عین مطابق تھا۔

عرب فاتحین نے مفتوحین کے ساتھ جس وسعت قلبی اور نرمی کا مظاہرہ کیا اس کی بھی چند وجوہات تھیں۔ شکست خوردہ لوگوں کے سامنے جو متبادل صورت رکھی جاتی تھی وہ جزیرہ تھا۔ زکوٰۃ کے سلسلے میں یہ کہا جا چکا ہے کہ عرب قبائل کسی بھی قسم کے ٹیکس ادا کرنے کو اطاعت اور فرمانبرداری کا ایک طریقہ سمجھتے تھے۔ جو لوگ ٹیکس وصول کرتے تھے وہ ٹیکس کو اپنی سیاسی برتری کا ایک نشان سمجھتے تھے۔ یہودیوں اور عیسائیوں پر جزیرہ عاید کرنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ ان سے اس طریقے سے اپنی برتری منوائی جائے۔

مختلف دور میں مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے جزیرے وصول کیے گئے۔ جزیرے کی متعینہ رقم میں حالات کے لحاظ سے کمی بیشی ہوا کرتی تھی۔ اس لیے ہمارے واسطے یہ مشکل ہے کہ جزیرہ کی شرح کو یہاں پاؤنڈ اور پینس کے حساب سے پیش کریں۔ عام طور پر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر آدمی کو دو پاؤنڈ یا ۵ ڈالر جزیرہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اگر اس کا پانچ یا دس گنا بھی انہیں دینا پڑتا تو یہ اتنی بڑی رقم نہیں تھی کہ وہ ادا نہ کر سکتے ہوں۔ یہ جزیرہ صرف مردوں سے وصول کیا تھا۔ محتاجوں اور سبوں اور چرچ میں رہنے والوں سے جزیرہ نہیں لیا جاتا تھا۔ یہ لوگ جزیرے سے مستثنیٰ

قرار دیے گئے تھے اس معمولی اور حقیر رقم کو جزیے کے طور پر ادا کر دینے کے بعد عیسائی اور یہودی فوجی خدمات کی ادائیگی سے اپنے آپ کو مستثنیٰ کر لیتے تھے صرف مسلمانوں کے فرائض میں فوجی خدمات شامل تھیں۔

جزیے کے طور پر ایک معمولی رقم ادا کر دینے کے بعد فوجی خدمات سے چھٹی پا جانا یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے واقعی ایک سستا سودا تھا۔ جزیہ وصول کرنے کے بعد مسلمانوں کا یہ فرض بن جاتا تھا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے جان و مال کی حفاظت کریں۔ مسلمانوں کے ذمے فوجی فرائض کے علاوہ زکوٰۃ کی ادائیگی بھی تھی۔ یہودی اور عیسائی زکوٰۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہودیوں اور نصرانیوں کے ساتھ خاصی رعایت کی جاتی تھی۔ مالی اعتبار سے بھی ان کا جزیہ مسلمانوں کی زکوٰۃ کے مقابلے میں انفرادی طور پر بہت ہی کم ہوتا تھا۔

خالد ابن ولیدؓ نے حبشہ کے شہریوں کے ہتھیار ڈال دینے کو قبول کر لینے کے بعد ان کو اپنے خط میں لکھا کہ اگر ہم تمہاری حفاظت کریں تو تمہارے لیے جزیہ واجب الاراد ہوگا۔ اگر ہم تمہاری حفاظت نہ کر سکیں تو تم کو جزیہ دینے کی ضرورت نہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے حفاظت کرنے کے فرض کو انتہائی خوش اسلوبی اور دیانتداری کے ساتھ نبھایا۔ ۶۳۵ء میں انہوں نے دمشق پر قبضہ کیا۔ شام کے ایک بڑے حصے کو بغیر لڑائی کے اپنے قبضے میں لے لیا۔ وہاں کے عیسائیوں سے جزیہ وصول کیا۔ مسلمانوں کے اس قبضہ کرنے کے دوسرے ہی سال بیزنطینیوں کی ایک تازہ دم فوج نے عربوں کو شام چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ شام چھوڑنے سے پہلے مسلمانوں کے کمانڈر ابو عبیدہؓ نے حکم دیا کہ جن ذمیوں سے جزیہ وصول کیا گیا ہے وہ سب کا سب ان کو لوٹا دیا جائے۔ ابو عبیدہؓ نے کہا کہ عربوں نے یہ جزیہ ذمیوں کی جان و مال کی حفاظت کے بدلے میں وصول کیا تھا۔ اب چونکہ مسلمان شام

کے ذمیوں کے جان و مال کی حفاظت کرنے کے موقف میں نہیں ہیں اس لیے جمع کیا
مہاجرین کو واپس کر دیا جائے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ دنیا کی تاریخ میں کوئی واقعہ اس نوعیت کا ہو کہ کسی
حکومت نے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برائے ہو سکنے کی وجہ سے عوام
سے وصول کیے ہوئے ٹیکس کو عوام میں پھیر سے لوٹا دیا ہو۔

آغاز اسلام سے قبل صحرائے شام کے بہت سے مدوی قبائل عیسائیت
کو اپنا مذہب بنائے ہوئے تھے۔ جب مسلمانوں نے شام اور عراق پر حملہ کیا تو
شام کے یہ عیسائی عرب مسلمانوں کی طرف سے لڑنے لگے اس لیے کہ ان کا طرز
زندگی عربوں سے ملتا جلتا تھا۔ ان کی زبان عربی تھی۔ جب مسلمانوں کی طرف سے
اہل کتاب بھی جنگ میں حصہ لیتے تو ان سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ ان کو اپنا مذہب
بدلنے کے لیے بھی نہیں کہا جاتا تھا۔

عربوں اور مسلمانوں کے طرز فکر میں مقوڑا بہت جو اختلاف پایا جاتا ہے اس
کی ایک مثال ہمارے سامنے ہے۔ حبشہ میں رہنے والے ایک عیسائی قبیلے تغلب
نے اپنے آپ کو عیسائی ہی رکھا۔ پہلے تو ان کو جزیہ دینے پر مجبور کیا گیا لیکن بعد
میں ان سے جزیہ لینا اس لیے بند کر دیا گیا کہ وہ عرب تھے۔

یہ بات بڑے ہی تعجب کی ہے کہ اموی خلفاء کے زمانے میں یعنی ۶۶۱ء
سے ۷۵۰ء تک عربوں نے خود ہی یہ کوشش کی کہ مقبوضہ علاقوں کے لوگ
مسلمان نہ ہونے پائیں۔ بجائے دیگر اقوام کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے وہ ان
کے اسلام قبول کرنے کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ بیٹ کا توازن
قائم رکھنے کے لیے خزانہ عامرہ ہمیشہ جزیہ پر مہروسہ کرتا تھا۔ چونکہ مسلمان جزیہ
ادا نہیں کرتے تھے اس لیے ایک بڑی تعداد میں لوگوں کا اسلام قبول کر لینا

مسلمانوں کے بچٹ کو خسارے میں ڈالنے کا باعث بن سکتا تھا۔ جب غیر مسلموں نے مسلمان ہو جانے پر اصرار کیا تو جزیہ وصول کرنے والوں کو ہدایت کی گئی کہ لوگوں سے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی جزیہ وصول کیا جائے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ جزیہ کی ادائیگی لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کا ایک بڑا سبب بنی۔ اس لیے نہیں کہ جزیہ ان کے لیے ایک رقمی بار تھا بلکہ اس لیے کہ جزیہ کا ادا کرنا ان کے لیے ایک سبکی اور تحقیر کا باعث تھا۔ اس کے ادا کرنے کو وہ اپنی ذلت سمجھتے تھے۔

مفتوحہ نسلیں کے تعلق سے عربوں کا رویہ ہمیشہ رواداری اور لطف و کرم کا رہا۔ مفتوحہ اقوام کی جان و مال کی حفاظت مسلمان کیا کرتے تھے۔ مفتوحہ اقوام کے قابل افراد کو مختلف فرائض منصبی پر فائز کرتے تھے۔ ان کو اچھی ملازمتیں دی جاتی تھیں۔ اثر و اقتدار کا بلجی اور ماوی کون تھے اس کے پہچاننے میں کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کی شہادت اور گواہی کو ترجیح دی جاتی تھی۔ ایک مسلمان کے عہد اور اس کی قسم کا بہ مقابلہ غیر مسلم زیادہ پاس رکھا جاتا تھا۔ ملک کے تمام انتظامی اور فوجی اعلیٰ عہدے مسلمانوں کو دیے جاتے تھے۔ کلرکی اور معمولی قسم کے کام دوسروں سے لیے جاتے تھے۔ ایک مسلمان عیسائی عورت سے شادی کر سکتا تھا لیکن ایک مسلمان عورت کسی عیسائی کو اپنا شوہر نہیں بنا سکتی تھی۔ اس قسم کی عدم مساوات کی مثالیں مسلمانوں میں پائی جاتی تھیں۔ عیسائیوں اور یہودیوں کو کبھی بھی دق نہیں کیا گیا۔ غیر ضروری طور پر مسلمانوں نے ان کو تنگ نہیں کیا۔ یہودی اور عیسائی مسلمانوں سے زیادہ مالدار رہے۔ اس کے باوجود وہ سماجی اور پرنسپل کیج کا شکار بنے رہے۔ مسلم سوسائٹی میں ان کو کم وقعت سمجھا جاتا تھا۔

مسلمانوں کا سیدھا سادا فارمولا جو لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شکل میں ہے۔ مسائل کو خود بخود حل کر دیتا ہے۔ جیسے ہی غیر معلم اس کلمے کو ادا کر دیتے تھے۔ فاتحین کی صف میں شامل کر لیے جاتے تھے۔ مسلمان ہو جانے کے بعد عرب عورتوں سے شادی کر سکتے تھے۔ حکومت اور فوج کے بڑے سے بڑے عہدے حاصل کر سکتے تھے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ مفتوحہ علاقوں کے افراد زیادہ سے زیادہ تعداد میں خود سے اسلام قبول کرنے کے خواہاں تھے۔ ان کے لیے اب اسلام میں کشش تھی۔ جاذبیت تھی۔ دین تو تھا ہی دنیا بھی ان کو مل رہی تھی۔ مسلمان ہو جانے کے بعد بھی جزیہ کی ادائیگی کا حکم تک ان کو مسلمان بننے سے نہ روک سکا۔ ہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ عربوں کی ابتدائی فتوحات میں مسلمانوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی یہودیوں اور عیسائیوں نے تلوار کے ڈر سے اپنا مذہب تبدیل کیا۔

شام فتح ہو جانے کے بعد کئی نسلوں تک شام کے عیسائی اپنے ہی مذہب پر قائم رہے۔ لبنان میں آج تک عیسائی رہتے آ رہے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ نصاریٰ اور یہود کو اس بات تک کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ پر اپنے مذہبی قانون کا اطلاق کریں۔ اپنے تنازعات کے فیصلوں کے لیے حاکمان عدالت کا اپنی برادری میں سے انتخاب کر لیں۔

مسلم نظریات کی رُو سے تمام قانون مذہب سے جنم لیتے ہیں۔ قانون کی اساس مذہب ہی پر رکھتا ہے۔ مذہب ہی کے سرچشمے سے قانون کی ندیاں بہتی ہیں مسلمانوں کے اپنے قانون کا ماخذ قرآن اور احادیث ہیں۔ اسی لیے عیسائیوں اور

یہودیوں کے لیے یہ ضروری قرار نہیں دیا گیا کہ وہ اسلامی قانون پر عمل پیرا ہوں۔ چونکہ عیسائیوں اور یہودیوں کو جبراً مسلمان بنانے سے احتراز کیا گیا، اسی منطلق کے پیش نظر ان پر اسلامی قانون کے اطلاق کی بھی شرط نہیں رکھی گئی۔

ہر مذہب اپنے بنیادی عقیدے اور ایمان کی روشنی میں اپنے قانون آپ

مرتب کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عربوں نے تو اپنے مفتوحہ لوگوں کو اسلام

قبول کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا تھا اس کے باوجود شام اور مصر کے یہودیوں

اور عیسائیوں نے مخالفت کیوں نہیں کی۔ مسلمانوں کو ان کی مخالفتوں کا سامنا

آخر کیوں نہ کرنا پڑا؟

اس کا پہلا سبب تو بیزنطینی چرچ کی تنگ نظری رہی۔ بازنطینی ایک ہزار

سال تک شام کے لوگوں کا خون چوستے رہے۔ ان کو اپنے رنگ میں رنگنے کی

کوشش کرتے رہے۔ شام کے شہریوں میں رہنے والوں کی بڑی اکثریت یونانیوں

پر مشتمل تھی یا یونانی خون اپنی رگوں میں لیے ہوئے تھی۔ شام ہمیشہ سے شرانگیزیوں

کا گہوارہ بنا رہا۔ فرقہ بندی، خفیہ جاعتوں اور مذہبی اور سیاسی گٹھ بندوں کا وہ

عرصے سے گڑھ رہا ہے۔ ساتویں صدی کا یہ ملک آج سے یا اپنے زمانے سے

پہلے کے شام سے مختلف نہیں تھا۔ ان کا کام ہی یہ ہوتا تھا کہ ہر شرانگیزی

کی سرپرستی کریں۔ مختلف دھڑے بندوں میں جی کھول کر حصہ لیں۔ مختلف قسم کے

عقائد کی اپنے ملک کو آماجگاہ بنائیں۔

بیزنطینیوں نے رواجی چرچ کے ساتھ اپنا نانا جوڑنا چاہا۔ جو عیسائی اس کے

لیے تیار نہیں تھے۔ ان کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔

مسلم حملہ آور یونانی کج بختوں سے بہت مختلف تھے۔ انہوں نے عیسائیوں

سے رواداری برتنے کا وعدہ کیا۔ اپنے برابر سمجھنے کا وعدہ کیا۔ وہ عیسائی جہول نے اپنے آپ کو رواجی چرچ کے ساتھ وابستہ نہیں کیا تھا اب وہ مسلمانوں کے عدل و انصاف، رواداری اور مساوات کے گن گانے لگے۔ یہی وہ عیسائی تھے جو اپنے ہی ملک میں اپنے ہی مذہبوں کے ہاتھوں ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے تھے اس ظلم و ستم سے بچنے کی خاطر حکمراں مسلمانوں سے عدل و انصاف اور رحم و کرم کی امید باندھنے لگے تھے۔ مسلمانوں نے ان کی امیدوں کا پاس رکھا۔ ان کے ساتھ انتہائی رواداری اور مذہبی غیر جانبداری کا سلوک کیا۔

عرب خلفاء کے زمانے میں عیسائیوں کی قسمت کا ستارہ بڑے ہی عروج پر رہا۔ دربار میں اہم مناصب ان کو دیے جاتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کے اہم کام ان کے تفویض کیے جاتے تھے۔ دربار کے حکیم اور اطباء یہ ہوتے تھے۔ شام کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی بڑی مدد کی۔ مسلمانوں کے لیے یہ ایک بڑا سہارا ثابت ہوئے۔ پروفیسر آرنلڈ کے الفاظ میں عیسائیوں کا مسلمانوں کی طرفداری کرنا۔

”یونان کے مذہبی عالموں اور ماہرین الہیات کی خالی خولی دینی بکواس کے خلاف ایک بغاوت تھی۔“

یہ صحیح ہے کہ فتوحات کے ابتدائی زمانے میں جبکہ مسلمان سرچاپا جوش و جذبہ کے پیکر ہو کرتے تھے اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ تبلیغ اور تعلیم کے ذریعہ عیسائیوں کو اسلام کی طرف راغب کریں۔

اسلام کی سب سے بڑی خوبی اس کی سادگی ہے۔ ان پڑھ لوگوں کے لیے تو اسلام کی سادگی ایک نعمت ہے۔ رواجی چرچ اپنے مذہبی عقائد و مسائل میں بال کی کھال اتارنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اسلامی عقائد کی سادگی اسلام کی فوری قبولیت کا باعث بنی۔

مصریوں نے تو شامیوں کے مقابلے میں اور بھی جلدی اسلام قبول کیا تھا اسی آسانی سے چوتھی صدی عیسوی میں عیسائیت کو بھی قبول کر لیا تھا۔ مصر کے لوگ ہمیشہ سے خاموشی پسند رہے ہیں۔ اقتدار کے آگے ہمیشہ سے سر جھکائے رہتے ہیں۔ بہت ہی رکھ رکھاؤ کے لوگ ہیں۔ مصریوں کے برخلاف شامی ہمیشہ سے مفسد اور شرانگیز ہوتے آئے ہیں۔

جب شام کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ربط و ضبط بڑھا تو عیسائیوں نے اسلام پر اپنا اثر ڈالنا شروع کیا۔ قرون اولیٰ کے مسلمان بہت ہی سیدھے سادے تھے۔ شاید ہی ان کو علم الہیات یا دینیات کے دقیق مسائل سے کوئی دلچسپی رہی ہو۔ جب مسلمانوں نے عیسائیوں سے مناظرہ اور بحث و مباحثہ شروع کیا تو خود بخوبی اس بات پر مجبور ہوئے کہ فرقی مخالف کو اپنے دلائل سے قائل کرنے کے لیے مختلف کتابوں کا مطالعہ کریں۔ مطالعے کی روشنی میں بحث کو کامیاب بنائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے عمیق اور وسیع مطالعے نے علم الہیات کی بنیاد ڈالی۔ مسلمانوں نے خود اپنا نیا فلسفہ دنیا کے آگے پیش کیا۔

غیر عرب ممالک میں جہاں کہیں بھی اسلام گیا مقامی اثرات سے متاثر ہوا۔ مختلف اثرات کو قبول کیا۔ غیر عرب قوموں نے اسلام پر مختلف قسم کے اثرات ڈالے۔ شام میں اسلامی ذہنیت پر عیسائیوں کے طرز فکر کی گہری چھاپ پڑی۔ بہت سے یورپین کی نظروں میں اسلام ایک ایسا گھناؤنا مذہب ہے جس میں دنیا بھر کی برائیاں جمع ہیں۔ ان کی نظر میں یہ ایک تکلیف دہ مذہب ہے۔ ظالم ہے۔ وحشیانہ عقائد کا حامل ہے۔ انتہا پسندوں کی آماجگاہ ہے ایک ہاتھ میں تلوار ہے تو دوسرے ہاتھ میں اسلامی جھنڈا ہے جس پر ہلال کی شکل اترتی ہوئی ہے۔

اسلام یا مسلمانوں کے تعلق سے جو تصور باندھا گیا ہے۔ وہ صرف گذشتہ بیس برس کی پیداوار ہے۔ گذشتہ بیس برس سے مغربی اقوام کے ذہنوں میں مسلمانوں کے تعلق سے اس قسم کا خاکہ بننے لگا۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ بحیرہ روم کے سیاست دانوں نے خصوصاً مصریوں نے اسرائیل کو صغیر ہستی سے ختم کر دینے کی دھمکیاں دے رکھی ہیں۔

صرف وہی لوگ حقیقت سے روشناس ہو سکتے ہیں جن کو کئی سال تک اسلامی ملکوں میں رہنے کا موقع ملا ہو جو لوگ روانی کے ساتھ عربی میں بہت چیت کر سکتے ہیں۔ وہ میرے اس تاثر کی تصدیق کریں گے کہ عرب بڑے ہی شریف النفس ہوتے ہیں۔ ہمدرد ہوتے ہیں۔ ملنسار ہوتے ہیں۔ برابری اور مساوات ان کے معاشرے کی روح رواں ہے۔ ان کی خوش طبعی اور زندہ دلی، اپنے ہمسایوں کا خیال اور ان کی مدد، ان کی عورتوں کے اخلاق حسنہ، ان کی اپنے بچوں سے محبت، یہ ساری باتیں مسلمانوں کے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتی ہیں۔ جس سے انس ہونے لگتا ہے۔

یہاں اتنا اضا ذکر دینا ضروری ہے کہ مسلم ممالک میں رہنے والے عیسائیوں میں بھی وہی صفات پائی جاتی ہیں جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں ہوتا کہ یہ خصوصیات بحیرہ روم کے خطہ میں رہنے والوں کی خصوصیات ہیں۔ کیا ان خصوصیات کا مذہب سے کوئی تعلق ہے؟ کہنے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ شام اور مصر کے عیسائی جبکہ وہ عیسائیت کو چھوڑ کر اسلام کے دائرے میں داخل ہو رہے تھے کیا ان خصوصیات کو اپنے ساتھ اسلام میں نہیں لائے تھے؟

پھر سے میں یہ کہوں گا کہ تمام انسانی تحریکات اتنی پیچیدہ سے پیچیدہ تر

ہیں کہ ان کی علت کی تخصیص نہیں کی جاسکتی۔

بہت سے عیسائی خیالات چور دروازے سے اسلام میں داخل ہوئے ہیں اس سلسلے میں ایک مثال کا دے دینا بہت کافی ہے۔

بخاری میں ایک روایت ہے: ”کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ خدا نے فرمایا ہے کہ میں اپنے نیک بندوں کو اس طرح سے تیار کر چکا ہوں کہ ان جیسے لوگوں کو اب تک نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور جس کو انسان کا دل ماننے کے لیے کبھی تیار ہی نہ ہو۔“

انجیل میں لکھا ہے ”کہ آنکھ نے نہ دیکھا ہے۔ کان نے نہ سنا ہے۔ نہ کسی آدمی کے دل میں یہ بات گئی ہے ان چیزوں کے تعلق سے جن کو خدا نے تیار کیا ہے ان لوگوں کے لیے جو اس سے محبت کرتے ہیں۔“

بخاری معتبر راویوں میں ہیں۔ احتیاط کے ساتھ انہوں نے قلم اٹھایا ہے احادیث کی روایات میں وہ بہت محتاط تھے۔ ایک لمحے کے لیے بھی ان کو اس الزام سے طوٹ نہیں کر تا کہ انہوں نے جان بوجھ کر عبارت کی چوری کی ہے اور انجیل کی آیات کو حضورؐ سے منسوب کر دیا ہے۔

امام بخاری کے مہتمم بالشان کارنامے کو کتابی صورت میں دیے جانے سے آٹھ سو سال قبل سینٹ پال نے ان جملوں کو CO RINTHIANS II کی نویں سطر میں لکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ شام کے لوگ سینٹ پال کی اس تحریر اور مضمون سے واقف ہوں اور ان جملوں کو حضورؐ کے آگے بیان کر دیا ہو۔ بلاشبہ بے شمار طریقوں سے عیسائیت اور اسلام نے ایک دوسرے پر اپنا اثر ڈالا۔ ایک مذہب کی باتیں دوسرے مذہب میں داخل ہوئیں۔

اسلام کا زہر اور ساتھ ہی سختی اس بات کا باعث بنی کہ قسطنطنیہ کے

کھیسائوں میں جو پتلے اور مذہبی نشانیاں رکھی ہوئی تھیں ان کا ناس کیا گیا۔ سیاست کی بناوٹی سطح پر تو عیسائیت اور اسلام میں بعض اوقات سخت رقابت رہی مگر جب ان دونوں مذہبوں کی جڑوں کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے پوست اور بڑی ہوئی ہیں۔

میرے نزدیک عیسائیت مسیح کی تعلیمات کا نام ہے۔ موجودہ کلیساؤں کی فرسودہ رسومات اور چرچ کے اپنے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون عیسائیت تو نہیں۔ اسلام کی اشاعت جب غیر ہلک میں ہونے لگی تو غیر عرب لوگوں نے اپنے اپنے اثرات اسلام پر ڈالنے شروع کیے۔

حضور نے رہبانیت اور گوشہ نشینی کو سخت ناپسند فرمایا تھا۔ اس کے باوجود حضور کی زندگی میں لوگوں نے گوشہ نشینی اور رہبانیت اختیار کر لی جب اسلام دوسری قوموں میں پہنچا تو اسلامی رہبانیت اور گوشہ نشینی میں اور اضافہ ہو گیا۔

صوفی وہ شخص کہلاتا ہے جو دنیا سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ دنیا کے بھیمیدوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ دنیا کو ترک کر کے اس کو شش میں لگا رہتا ہے کہ روحانی طور پر براہ راست خدا سے رابطہ قائم کیا جائے۔ صوفی کا منشاء اور مقصد خودی کو عروج اور بلندی پر لے جانا رہتا ہے۔ اس کے لیے وہ مراقبہ کرتا ہے۔ مراقبے میں سب را پا محبت کا تصور رہتا ہے۔ وصل کی خواہش رہتی ہے۔ فنا فی اللہ ہو جانا چاہتا ہے۔

انسانی نسل کی ہر شاخ میں ان لوگوں کی کمی نہیں جن کو روحانی صلاحیتیں عطا کی جاتی ہیں۔ عربستان کے عرب بہ حیثیت مجموعی اس معاملے میں بھی علی طور پر خاص الخاص بنے رہے۔ حضورؐ کے انتقال کے سو سال کے اندر ہی اسلام

میں صوفیاء کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ خصوصاً کوفہ، بصرہ اور عراق میں کافی صوفی منظر عام پر آتے رہے۔ نامی گرامی اور مشہور و معروف صوفیاء کا تعلق زیادہ تر ایران سے رہا۔ ایران کے بعد دوسرا نمبر صوفیاء کو وجود میں لانے کا اسپین کا تھا۔

خدا کے تعلق سے رسول خدا نے جو تعلیم دی ہے وہ یہی ہے کہ خدا رب العالمین ہے۔ عظیم اور اکبر ہے۔ ساری شان اور عظمت کا وہ مستحق ہے اپنے بندوں کے تعلق سے رحیم و کریم ہے۔ ان تمام خدائی صفات کو بیان کر دینے کے بعد آپ نے خدا کو خدا رکھا۔ بندے کو بندہ۔ بندہ بندہ ہی رہے گا۔ خدا نہیں بنے گا۔

قرآن میں بکھری ہوئی چند آیات ایسی مل جاتی ہیں جس سے یہ مفہوم نکالا جاتا ہے کہ اللہ کی روح کبھی انسان میں بھی اتر آتی ہے۔ ذات باری کا براہ راست تعلق کسی کی بھی انفرادی روح سے ہو جاسکتا ہے۔

قرآن پاک کے سورہ ق کی چند آیتیں اور سولہویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

”اور ہم ہی نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ جو خیالات اس کے دل میں گزرتے ہیں ہم اُن کو جانتے ہیں۔ ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ دو لکھنے والے جو دُائیں اور بائیں بیٹھے ہیں وہ لکھ لیتے ہیں۔“

مسلم صوفیاء نے اس قسم کی آیات کو اپنی مطلب برداری کے لیے استعمال کیا۔ ان آیات سے وہ اپنے نظریات کی صداقت کا استدلال کرتے رہے یہ کہنے لگے کہ ذات باری کی جلوہ گری انسان میں بھی ہو سکتی ہے۔ ان کے نزدیک یہی وہ مقام ہے جو عین وصال کہلاتا ہے۔

حضور کے انتقال کے دو سو سال بعد صوفیوں نے اپنے آپ کو اسلامی تعریف کا نمائندہ ظاہر کرنا شروع کیا۔ ایران کے شیعہ فرقے نے یہ بات سڑھ لی کہ خدا کی روح حضرت علیؑ اور ان کے جانشینوں میں حلول کر گئی تھی۔ یہ ایک ایسا نظریہ اور عقیدہ ہے جو صاف طور سے دکھائی دیتا ہے کہ عیسائیوں سے اخذ کیا گیا تھا ان کے اس عقیدے پر یسیت کی تھیپا تھی۔

اسلامی صوفیاء اور مسیحی صوفیاء کی تحریروں میں بڑی مشابہت ہے۔ جب وہ روحانیت کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو لقبوں ان کے ظاہری عبادات پیچھے تھپوڑ دی جاتی ہیں۔ شریعت محض ایک رسم رہ جاتی ہے احکام دینی ایک ڈھکوسلہ معلوم ہوتے ہیں۔ سارے مذاہب ان کی نظروں میں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے بہت بڑے اور مشہور صوفی مولانا جلال الدین رومی لکھتے ہیں کہ اس سے محبت کرو جس سے فرشتوں نے محبت کی۔ انبیاء نے محبت کی۔ سمجھوں نے محبت کی۔ اسی کی وجہ سے ہم زندہ ہیں۔ اسی کی وجہ سے زندگی ہے۔ اسی کی وجہ سے ہر حرکت ممکن ہے۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔ ”محبوب میں فنا ہو جاؤ۔ اس طرح سے فنا ہو کہ میں اور تو کا جھگڑا ہی باقی نہ رہے۔ صرف ایک ہی ایک رہے۔“

اسلام اور مسیحیت کی اصل اور بنیاد میں کئی ایک باتوں کی مشابہت ہونے کے باوجود جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا یہ دونوں مذاہب ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔ کئی صدیوں تک آپس میں فکر و نظر کی لین دین ہوتی رہی۔ مغربی ممالک کی دولت ہندی اور اثر اقتدار کے عروج نے عیسائیوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا۔

اسلام اور مسیحیت میں جو فکری تبادلے ہوتے رہے اور اس ماحول میں جن لوگوں نے علمی خدمات انجام دیں ان میں ایک بہترین مثال الغزالی کی ہے۔
 محمد الغزالی پیدائشی ایرانی تھے۔ اپنے آپ کو عربیت کا جامہ پہنا لیا تھا۔ حضور
 کے انتقال کے ۴۲۶ سال بعد ۱۰۵۸ء میں یہ پیدا ہوئے۔

غزالی اپنے زمانے میں علم و فضل کے امام تھے۔ بغداد کے مدرسہ نظامیہ
 میں درس دیا کرتے تھے۔ سامعین اور شاگردوں کا اتنا بڑا ہجوم رہتا تھا کہ
 مدرسہ کھنچا کھنچ بھج جاتا تھا۔ اپنے وقت کا یہ امام، علم و فضل میں یکتا، ہزاروں کو
 درس و تدریس سے فیض یاب کرنے والا، آفتاب رشد و ہدایت، ایک دم ساری
 دنیا کو چھوڑ کر صوفی بن جاتا ہے۔ اپنے آپ کو زہد و تقویٰ کی اس منزل پر پہنچاتا
 ہے جہاں اس کے پاس ایک پھوٹی کوڑی نہیں رہتی۔ دنیا کے گورکھ و صندوق
 کولات مار کر افلاس و تنگدستی کو اپنے آپ پر طاری کر لیتا ہے۔ خواہش و صل اس
 کو سرگرداں کیے رہتی ہے، خدا سے ملنے کے لیے وہ بے تاب رہتا ہے۔ اسی
 کیفیت میں آپ نے اپنی مشہور عالم کتاب احیاء العلوم والدین لکھی۔ مذہبی تعلیمات
 کو از سر نو پھر سے پیش کیا۔

یہاں پر امام غزالی کا ذکر کرنے کی اس لیے سوجھی کہ ہم اسلام اور مسیحیت
 کے درمیان جو فکری تبادلے ہوتے رہے ان پر روشنی ڈالیں۔ امام غزالی
 عیسائیت سے خوب واقف تھے۔ پروفیسر Hitti نے اپنی کتاب "عرب
 کی تاریخ بنانے والے" میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے پہاڑ پر جو بدعظ و نصیحت
 کی تھی بڑی ہی سخاوت، فیاضی اور دریا دلی کے ساتھ امام غزالی نے اُسے اپنی
 کتاب میں پیش کر دیا۔ انجیل میں بیان کردہ بہت سی تشبیہات اور استعارے
 امام غزالی استعمال کرتے رہے۔ اس قسم کا فکری تبادلہ یا لین دین یک طرفہ نہیں

تھا۔ یہ فکری ٹرائفک دونوں طرف سے تھی۔ تقاسم A QUINES مسیحیت کے ایک بہت ہی بڑے عالم مل جاتے ہیں۔ NUPLES کی یونیورسٹی میں انہوں نے امام غزالی کی کتابوں کا بہت ہی گہرا مطالعہ کیا۔ نصاب میں انہوں نے امام غزالی کی کتاب کو شامل کروایا۔

PASCAL, DANTE اور MAIMONIDES جو یہودیوں کے بہت ہی بڑے فلسفی تھے امام غزالی کے خیالات اور ان کے طرز فکر سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ انہوں نے استفادہ یہاں تک کیا کہ امام غزالی کے جواہر پاروں کو اپنانے کی کوشش کی۔

امام غزالی کی تعلیمات کا خلاصہ ہے " جس تناسب سے ہماری چاہت اور ہماری محبت اپنے اللہ سے ہوگی عین اسی تناسب سے اُس کی عنایتیں اور مہربانیاں ہمارے شامل حال ہوں گی۔"

حضورؐ کے انتقال کے بعد اسلام کے تیزی سے پھیلنے کے اسباب و علل پر ہم نے روشنی ڈالنے کی کوشش کی۔ اپنی تحقیقات کی روشنی میں اسلام کے تیزی سے پھیلنے کے جو اسباب رہے ان کے پیش نظر قطعیت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ طاقت اور تلوار کے استعمال سے اسلام نہیں پھیلا۔ جنگی اور فوجی مہموں نے اسلام کی اشاعت نہیں کی۔ اسلامی جنگیں کبھی بھی اسلام کو تیزی سے پھیلانے کا واحد اور بڑا سبب نہیں بنیں۔

ہم اس موضوع پر اختصار کے ساتھ ہی قلم اٹھا سکتے ہیں۔ لکھا تو بہت کچھ جا سکتا ہے لیکن ہم نے کوشش کی ہے کہ مختصراً آپ کے سامنے اسلام کی اشاعت کے اسباب و علل پیش کر دیں۔

لوگوں کا یہ کہنا کہ اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے تلوار استعمال کی گئی

جزوی طور پر اپنے اندر صداقت رکھتا ہے۔ اگر عرب فتوحات عمل میں نہ آتیں تو ایک بڑی تعداد میں مسلمان اسپین، مراکش، ایران اور ہندوستان میں نہ پہنچے ہوتے۔ جب ایک مرتبہ عربوں نے دور دراز کے ملکوں میں اپنے قدم جمالیے تو اس کے بعد انہوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ یہودیوں، عیسائیوں اور آتش پرستوں کو اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کرنے کو کہیں۔ اس کے برخلاف ان عرب فاتحین نے اپنے مفتوحین کے ساتھ انتہائی رواداری کا سلوک کیا۔ مفتوحہ اقوام نے مسلمان فاتحین کے اس رویے کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ مراکش سے لے کر شمالی ہندوستان تک جو ریگستان کا سلسلہ چلا گیا ہے ان علاقوں میں رہنے والوں کے لیے سیدھی سادی اسلامی تعلیمات بڑی ہی پُرکشش اور موزوں ثابت ہوئیں۔ انہوں نے اس مذہب کو اپنے لیے انتہائی موزوں اور مناسب سمجھا۔

شام اور مصر میں ایک عیسائی فرقے نے دوسرے عیسائی فرقے پر جو ظلم و ستم کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا اس کی وجہ سے ان دونوں ممالک میں رہنے والوں نے اسلامی آغوش میں پناہ لینے کو ترجیح دی۔

سونے پر سہاگہ یہ کہ عربوں کو جب پے در پے فتح حاصل ہو رہی تھی تو عام لوگوں نے یہ سمجھا کہ عربوں کو غیب سے مدد مل رہی ہے۔ خدا یقیناً ان کے ساتھ ہے۔ ان کی طرف سے خود لڑ رہا ہے۔

اسلام جب وہاں پہنچا جہاں کے لوگ عقل و خرد میں عربوں سے آگے تھے اور روحانیت سے بھی آگاہ تھے تو انہوں نے اسلام کو اپنے مقامی سانچوں میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ اس میں کچھ اس قسم کی رد و بدل اور ترمیمات کیں جس کے بعد اسلام ان کی مرضی اور منشاء کے مطابق بن گیا۔ اسلام کو مقامی

رنگ میں رنگ دینے کی وجہ سے نئے اور مقامی لوگوں کو اسلام میں لور
بھی جاذبیت نظر آنے لگی۔

باوجود ان ناقابلِ تردید تاریخی حقائق کے مغربی مصنفین اب بھی یہی
زٹ لگائے جاتے ہیں کہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت تلوار کے ذریعے ہوئی۔ یہ
مصنفین اپنی ہٹ دھرمی کو برقرار رکھنے کے لیے اُن قتل و غارتگریوں کا حوالہ
دیتے ہیں جو وقتاً فوقتاً تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں نے کیں۔ ہو سکتا ہے
کہ اس قسم کی وارداتیں اتفاقی رہی ہوں اس قسم کی وارداتوں میں عباسیوں کا
بیزنٹینیوں کے ساتھ سلوک یا سلجوق ترکی یا تیمور رنگ کا طریقہ کار یا انیسویں صدی
میں عثمانیوں کا آرمینیہ کے لوگوں پر ظلم و ستم۔ اسی قسم کی چند ایک باتیں ان کے
پیش نظر رہتی ہیں۔

چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں سے چُن چُن کر چند حادثات اور واردات
کو بطور شہادت پیش کرنا ہی ٹھہرا تو پھر مسیحیت کی تاریخ بھی اس قسم کی مثالوں
سے بھری پڑی ہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں عیسائیوں نے بھی دوسرے اہل مذاہب کے
قتل عام کیے ہیں ان کو بھی بطور ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۰۹۹ء میں مسیحیوں نے پہلی مرتبہ جب یروشلم کو اپنے قبضے میں لیا تو
مدافعت کرنے والے بہت سارے مسلمانوں کا انہوں نے قتل عام کیا۔ ۱۱۹۱ء
میں رچرڈ نے دو ہزار سات سو مسلمانوں کو قیدی بنایا۔ انتہائی سرد مہری کے
ساتھ ایک قصاب کی طرح ان سب کے گلے کاٹ دیے۔

۱۲۰۰ء میں جب مسلمانوں نے اسپین پر قبضہ کیا تھا تو مفتوحین کو اپنے
اپنے مذہب پر عقیدہ و عمل کی پوری آزادی دی تھی۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو

صرف جزیے کی ادائیگی کے لیے کہا گیا تھا۔ مسلمانوں کے برخلاف سولہویں صدی عیسوی میں جب عیسائی حکمران پھر سے اسپین میں برسرِ اقتدار ہوئے تو انہوں نے قتل و غارت، ظلم و ستم قید و بند اور مسلمانوں پر دہشت انگیزی کے وہ بازار گرم کیے کہ خدا کی پناہ۔ نہ صرف یہ سب کچھ کیا بلکہ تیس لاکھ مسلمانوں کو اسپین سے نکال دیا۔ مسلمانوں کو نکال کر ہی عیسائیوں نے اسپین میں دم لیا۔

اس قسم کی بحثوں کے وقت بڑا ہی مغالطہ ہوتا ہے۔ وہی دقت پیش آتی ہے کہ کون سے عمل کا کون سا ردِ عمل ہے کس اثر کا کیا سبب تھا۔ انسانی معاملات ہمیشہ سے بڑے ہی نازک اور پیچیدہ واقعہ ہوئے ہیں۔ مسیحیوں نے مسلمانوں کا قتل عام اس لیے نہیں کیا تھا کہ ایسا کرنا ان کے مذہب کی رُو سے جائز ہے یا عیسائیت نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے اس قتل عام کی تہہ میں اگر مٹور سے دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ گیارہویں صدی عیسویں میں شمال مغربی یورپ کے رہنے والے نیم وحشی تھے اسی لیے نیم وحشی عیسائیوں نے یروشلم کے مسلمانوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا۔

تیمور لنگ نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ بغداد اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں رہنے والوں کو روئے زمین سے نیست و نابود کرنے کی کوشش کی۔ اسلام ایسا کرنے کی تو ابازت نہیں دیتا ہے چونکہ تیمور اور اس کے سارے ساتھی نیم وحشی تھے اس لیے انہوں نے اپنی فطرت سے مجبور ہو انسانیت کا بے دردی سے خون بہایا۔

ان تاریخی واقعات کو بحث میں لاتے ہوئے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے ان لوگوں کے درمیان ایک حد قائم کریں جو کسی بھی مذہب سے وابستہ سمجھے جاتے ہیں۔ ہم کو دو قسم کے لوگ ملتے ہیں۔ ایک تو وہ معدودے چند

ہوتے ہیں جو اپنے اپنے مذہب کی تعلیمات سے واقف ہوتے ہیں۔ شریعت اور طریقت کا ان کو علم ہوتا ہے۔ صدق دل سے وہ اپنے مذہبی احکام پر عمل پیرا ہونے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ دوسری طرف اسی مذہب کے ماننے والوں میں اکثریت ان کی ہوتی ہے جو مذہب کا لیل اپنے آپ پر لگا لیتے ہیں۔ چونکہ ان کی پیدائش ایک عیسائی یا مسلم گھرانے میں ہوئی ہے اس لیے وہ اپنے آپ کو عیسائی یا مسلمان سمجھتے ہیں ان کے نام چونکہ عیسائی یا مسلمان جیسے ہوتے ہیں اس لیے وہ اپنے آپ کو نام کے مطابق مذہب سے وابستہ کرتے ہیں۔

اگر کوئی یورپ میں عیسائی خاندان میں پیدا ہو جاتا ہے تو عیسائی کہلاتا ہے ایشیا کے کسی مسلم گھرانے میں پیدائش ہو تو مسلمان کہلاتا ہے۔

چند سال پہلے میری حیرت اور تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جبکہ مجھے اپنے ایک یہودی دوست کا خط ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ عیسائیت ہمیشہ سے ایک ظالمانہ اور بہیمانہ مذہب رہا ہے۔ میری آنکھوں کو مشکل ہی سے اس عبارت کا یقین آیا۔ میں یہ سمجھتا رہا کہ میری آنکھیں مجھے دھوکہ دے رہی ہیں۔

کیا عیسائیوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ امن قائم کرنے والے پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ اسی لیے تو ان کو خدا کے بچے کہا جاتا ہے۔ کیا عیسائی مسیح نے یہ نہیں کہا تھا کہ اپنے دشمنوں سے محبت کرو۔ اگر وہ تم کو بددعا دیں تو تم ان کے لیے دعا کرو۔ جو تم سے نفرت کرتے ہیں ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔

آگے چل کر میرے یہودی دوست نے اپنے خط میں اس ظلم و ستم کا ذکر کیا تھا جو یورپ میں عیسائیوں کے ہاتھوں یہودیوں پر ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں آہستہ آہستہ آنے لگا کہ دوسرے مذاہب پر اتہام لگانا کتنا آسان ہے

سارے جرائم اور اعمال خبیثہ کا کسی بھی مذہب سے ناتا جوڑ دینا کتنا سہل ہے۔ انجیل میں کسی جگہ بھی ایسا نہیں لکھا گیا ہے جس کی روشنی میں یہ کہا جاسکے کہ یورپ میں یہودیوں پر جو ظلم و ستم ڈھایا گیا ہے وہ انجیل کے احکام کے مطابق ہے۔ یورپ کی جن اقوام نے اس ظلم و ستم کو روک رکھا وہ وحشی تھے۔ ظالم اور جفا کار تھے۔ حریص اور لالچی تھے۔ خبیثی اور جنونی تھے انہوں نے جو کچھ کیا وہ سراسر مسیحیت کی تعلیم کے منافی تھا۔ مذہب کے اصولوں کے خلاف تھا۔

ان تمام باتوں کی روشنی میں یہ بعینہٴ مجموعی سہارے لیے سوائے ماننے اور تسلیم کرنے کے کوئی چارہ نہیں کہ اگرچہ اسلام نے جنگیں لڑی ہیں اور بعض حالات میں جنگ کرنے کا حکم بھی دیا ہے لیکن بنیادی طور پر اسلام کو تلوار سے نہیں پھیلا یا گیا اس کے برخلاف خصوصاً عرب فاتحین نے اعتدال پسندی سے کام لیا۔ دوسرے مذاہب کے تعلق سے رواداری کا مظاہرہ کیا۔ یقیناً ان کی فتوحات میں بڑی تیزی سے اصناف ہوتا گیا مگر مفتوحہ عوام نے اسلام کو آہستہ آہستہ قبول کیا۔ مفتوحہ اقوام کو ان کا مذہب بدلوانے کے لیے کبھی بھی طاقت اور زور کا استعمال نہیں کیا گیا۔

اس باب میں ہم نے اسلام کا مقابلہ مروجہ عیسائیت سے کیا ہے۔ اسلام وہی ہے جو گذشتہ ۱۴ سو سال سے چلا آ رہا ہے۔ اسلام کو لوگ اس کی اپنی اصلی ہیئت اور ماہیت ہی میں مانتے چلے آ رہے ہیں۔

عیسائیوں کا سہارا اپنا مسئلہ موجودہ زمانے کے لحاظ سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ آج خود خدا کی ذات پر اعتراضات کی بوجھاڑ ہے۔ یہ اعتراضات اور سوالات ان لوگوں کی طرف سے ہوتے ہیں جو کسی بھی چیز کو ماننے سے اس وقت تک انکار کرتے ہیں جب تک کہ وہ اس چیز کی موجودگی کو اپنے حواس خمسہ

سے ثابت نہ کر لیں۔ اپنی طاقت، قوت، سماعت، بصارت اور ذائقہ کی حس کو وہ ہمیشہ استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ مادی دور میں وہ صرف مادہ ہی کے قائل ہیں۔

اپنی دنیا اور اپنے ماحول سے پرے جو چیز ہے اس کے باوجود یا اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا تصور ان کے ذہن میں نہیں آتا۔ مادی دنیا سے باہر کی ہر چیز کا وہ انکار کرتے ہیں۔ یہی انکار ان کو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری سے منحرف رکھتا ہے۔

انسان کی تخلیق کے پیچھے ایک بڑا ہی پیارا عنصر موجود ہے۔ وہ یہ کہ لاشعوری طور پر انسان اپنے آپ کو اس کے لیے وقف کر دیتا ہے جس کو وہ اپنی ذات سے عظیم تر سمجھتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان جذبات سے مغلوب ہو کر ہمیشہ اپنے دل کی آواز پر لبیک کہتا ہے۔ آمنا اور صدقنا کہتے ہوئے اپنا تن من دھن سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ عظیم تر مقصد کے لیے خوشی خوشی وہ اپنے آپ کو وقف کر دیتا ہے۔ ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق اپنے مقصد کا تعین کرتا ہے۔ کوئی کمیونزم کی طرف مائل ہو جاتا ہے کوئی قومیت کے محبت کو سجدہ کرنے لگتا ہے۔ کوئی فاشیزم کو اپنا لیتا ہے۔

انسانی جذبات کے بہاؤ کا کوئی نہ کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی راستہ ہوتا ہے۔ مادی ذرائع سے وہ اپنی جبلت کی تسکین کرتا ہے۔ اپنے آپ کو وہ مقصد کے لیے وقف تو ضرور کر رہا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے تسکین کے محور کو مادی صورت میں اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہا ہے۔ اس کے باوجود بھی اس کو اطمینان قلب اور ذہنی سکون حاصل نہیں ہوتا۔ جب اس میں بھی اس کو ناکامی ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ سے مایوس ہو جاتا ہے اس کا وجدان

ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی انا نیت چلانے لگتی ہے۔ اس کا نفس اس کو مُردہ نظر آتا ہے۔ اپنے آپ کو وہ اتنا پاہنج اور معذور تصور کرنے لگتا ہے کہ اس کی زندگی اس کے نزدیک مشین کا ایک پُندہ بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو تاش کا ایک پتہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ شطرنج کا مہرہ دکھائی دیتا ہے۔

اس تہذیب جدید کا پیدا کردہ معمہ صرف اسی صورت میں حل ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے اپنے مذہب کی طرف لوٹیں۔ جس فرقے سے چاہیں ہم اپنے آپ کو وابستہ کر لیں مگر مذہب کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے آج کل کی عوامی تحریکات جس بڑے پیمانے پر ظہور پذیر ہوتی ہیں ان میں گھبر کر رہا ہے آپ کو گم شدہ تصور کرتا ہے۔ ایک نشان بے نشان سمجھتا ہے۔ مشینوں سے پیدا کردہ انبار میں اس کی حیثیت ایک اتنے حقیر اور بے مایہ ذرہ کی ہے جس کو دیکھنے کے لیے بھی ایک خوردبین کی ضرورت پڑتی ہے۔

خدا کی ہستی اس قابل ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کے لیے آمادہ بھی کہ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ اور حقیر سے حقیر انسان پر بھی اپنی نظر کرم ڈالے اس کو اپنی رحمتوں کے دامن میں سمیٹے۔

صرف یہی رابطہ انسان کو دنیا بھر کی غلامیوں سے نجات دلا سکتا ہے۔ حقیقی معنی میں اس کو آزادی حاصل ہو سکتی ہے اللہ سے صحیح رابطہ قائم کرنا ہی اپنے آپ کو بندگی کے سانچے میں ڈھالنا ہے اس کے بندوں کی خدمت اور دلجوئی کرنا ہی اپنی روح کو جلا دینا ہے۔ جسمانی یا ذہنی طریقوں سے انسانیت پر ظلم کرنا اپنے آپ پر اور اپنے خدا پر ظلم کرنا ہے۔

* * * * *

اختتام

یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والی لڑائیاں اور ان کی آپس کی رقابتیں انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ رہی ہیں۔ یہودیت نے پہلی بار دنیا کو توحید کا درس دیا۔ اس مذہب نے تھوڑی بہت ایسی ہدایت بھی دیں جن سے دوسرے مذاہب کی عزت و تکریم کا پہلو نکل آتا ہے۔ عیسائیت نے اپنے مذہب کی بنیاد ہی محبت پر رکھنے کا دعویٰ کیا۔ اسلام نے ان دونوں مذاہب کے تعلق سے بہتر رویے کو اختیار کرنے کی تاکید کی۔

ہم کو پھر ایک بار ہر مذہب کی ان دو جماعتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے جن میں سے ایک جماعت تعداد میں کم لیکن اپنے عقیدے اور ایمان میں پختہ ہوتی ہے۔ حتیٰ الامکان اپنے مذہبی احکامات کی پابندی کرتی ہے۔ دوسری جماعت ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو یہودی، عیسائی اور مسلمان اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ان گھرانوں میں پیدا ہوئے۔ یہ نام کے یہودی، عیسائی اور مسلمان صرف باتوں سے اپنا کام چلاتے ہیں۔ ان کے اغراض و مقاصد صرف لفاظی پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے جذبات کے محکوم ہوتے ہیں۔ ان کو ان کے جذبات مغلوب کیے رہتے ہیں۔

سفر اور اناہیت انسان کی ایک ایسی کمزوری ہے جو تاریخ میں مختلف

تباہیوں کا واحد سبب بنی۔ مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان جو رقابت رہی ہے وہ محض انسانوں کی اپنی خود نمائی کی وجہ سے رہی ہے نہ کہ آپس کے مذہبی اختلافات کی وجہ سے۔ خدا کی خدائی اور اس کی عظمت و بزرگی کے اگر ہم قائل ہیں تو کیا ہم کو یہ زیب دیتا ہے کہ ان لوگوں کو قتل کر دیں جو ہمارے اپنے عقیدوں سے ذرا بھی ہٹے ہوئے ہوں۔ ان کے ساتھ زیادتی کریں اور ان کو زندہ جلادیں۔

اپنی انا کو تسکین دینے کی خاطر ہمیشہ ہم یہی کہتے ہیں کہ جو راستہ ہمارا ہے وہی حق کا راستہ ہے۔ باقی کی ساری نسل آدم غلطی اور گمراہی کا شکار ہے۔ اس عام تاثر سے گریز مشکل ہے کہ مسلمانوں نے اگرچہ کہ ان کی نیت اس کی نہیں تھی مذہبی جنگوں کی ابتداء کی۔ قصداً اور عمداً انہوں نے لڑائیاں نہیں لڑیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ مدینہ کے مہاجرین نے قریش کے کاروانوں پر جو حملے کیے تھے وہ تمام اسلامی جنگوں کا پیش خمیہ تھے یا نہیں۔ قدیم یونانیوں رومنوں اور ایرانیوں کے نزدیک مذہب کبھی بھی جنگ کی بنیاد نہیں بنا۔ ان لوگوں نے مذہب کی خاطر کبھی بھی کوئی لڑائی نہیں لڑی۔ مذہبی اختلافات مذہبی لڑائیوں کا باعث نہیں بنے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات ایک مذہب کے کسی خاص فرقہ نے اپنے ہی مذہب کے کسی اور فرقے کے ساتھ ظلم و زیادتی کی ہے لیکن اس کی بڑی وجہ ان کا یہ ایقان رہا کہ ان سے مختلف عقیدہ رکھنے والے حکومت کے لیے خطرہ کا باعث ہیں۔

۶۳۳ء میں عربوں نے جان بوجھ کر بنی نطین اور ایرانی حکومتوں پر حملے کیے۔ حضورؐ کی تعلیمات نے ان کے رگ و ریشہ میں ایک آگ لگا دی تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ جب انہوں نے یکے بعد دیگرے مختلف ملکوں کو زیرِ نگیں کرنا

کیا تو عیسائیوں، یہودیوں اور آتش پرستوں کو مذہب بدلنے کے لیے مجبور نہیں کیا۔ بلاشبہ انہوں نے اسلام کے نام پر دنیا کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ منصوبہ کی تکمیل کے لیے چل نکلے۔ اس عمل کے ردِ عمل میں تین سو سال بعد ان پر جوابی حملے شروع ہوئے۔ حملہ کرنے والوں نے عیسائیت کے نام پر حملہ کیا عیسائی حضرت عیسیٰ کی یہ تعلیم بھول گئے کہ اپنے دشمنوں سے پیار کرو۔ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دو۔ عیسیٰ مسیح کی ان بنیادی تعلیمات کو مسیحیوں نے نظر انداز کر دیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ صلیبی جنگوں میں مسیحیوں نے درندگی کا مظاہرہ کیا۔ مسلمانوں سے چار ہاتھ آگے انہوں نے ظلم و ستم کو روا رکھا۔ ان سفاکانہ واقعات کو ان کے اپنے مذہب سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسلام نے کم ظلم کرنے کی اجازت دی ہے اور سچیت زیادہ ظلم کرنے کو کہتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مغربی یورپ کے مسیحی اس زمانے میں نیم جنگلی تھے اس لیے انہوں نے جنگلی پن کا مظاہرہ کیا۔ مسلمان عام طور سے قدیم تہذیب و تمدن سے وابستہ رہے تھے اس لیے انہوں نے دیکھ بھال کر کام کیا۔

تاریخی واقعات اتنے مختلف عناصر کا مجموعہ واقع ہوئے ہیں کہ ان کے تجزیہ کے لیے بڑے ہی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ یہ بات بڑی بحث طلب رہی ہے کہ عیسائیوں کی آپس کی مذہبی لڑائیاں مسلمانوں اور عیسائیوں کو آپس میں لڑنے کے لیے مثال کا کام دینے لگیں یا پہلے کی مذہبی جنگیں بعد کی مذہبی جنگوں کا سبب بنیں۔

قدیم مذہبی فرقے جنہیں حکومت وقت دبا کر رکھتی تھی ان کے تعلق سے کہا جاسکتا ہے کہ حکومت کو ان فرقوں کی وفاداری پر بھروسہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ حکومت کو یہ خطرہ لگا رہتا تھا کہ کسی وقت بھی مخالف فرقے بغاوت اور غداری کے

مترکب ہو سکتے ہیں۔

تیرھویں صدی میں جنوبی فرانس نے ALBIGENSES کو بڑی طریقے سے کچل کر رکھ دیا۔ پوپ نے حکومت وقت کے اس اقدام کی حمایت کی۔ اس لیے کہ وہ لوگ ملحد تھے انہوں نے بادشاہ وقت کی بالادستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اسی طریقے سے نیدرلینڈ میں اسپین والوں نے پروٹسٹنٹ پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے اس کی وجہ بھی مذہبی اور ساتھ ہی ساتھ سیاہی رہی۔

ہمارے اپنے زمانے میں روس اور امریکہ بھی اسی کھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ جزوی طور پر نظریاتی اختلاف۔ کمیونزم بہ مقابلہ سرمایہ داری۔ بڑی حد تک دو بڑی طاقتوں کو ایک دوسرے کے مد مقابل کر دیتا ہے۔ اس کی تہہ میں حسد کا زفر ما رہتا ہے۔

اسلام اور مسیحیت کے درمیان اسی قسم کی سیاسی رقابتوں نے غلط فہمیوں کی ایک وسیع اور گہری خلیج حائل کر دی ہے۔ مغربی دنیا میں تو ایسا کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں مقامی عیسائیوں نے مسلمانوں کے درمیان کسی نہ کسی طرح اپنے وجود کو برقرار رکھا۔ یہ لوگ مسلمانوں کے درمیان اپنی زندگی گزارتے آئے۔ مسلمانوں نے ان سے کبھی بھی تعصب نہیں برتا۔ اس کے برخلاف مغربی اقوام میں اسلام کے خلاف سخت تعصب پایا جاتا ہے۔

مسلمانوں کے تعلق سے مغربی یورپ اور جنوبی امریکہ میں رہنے والوں کی اکثریت کا یہ خیال ہے کہ یہ لوگ بے دین ہیں۔

یہودیوں کے تعلق سے البتہ یہ بات ماننے کے لیے تیار ہیں کہ یہودی مذہب مسیحیوں کے مذہب کا جوڑ وال بھائی ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ یہ نسبت یہودیت کے اسلام عیسائیت سے بہت زیادہ قریب ہے۔

جیسا کہ ابتدا میں بیان کیا جا چکا ہے کہ میری زندگی کا آدھے سے زیادہ حصہ مسلمانوں اور صرف مسلمانوں کے درمیان گزرا۔ مسلمانوں سے اکثر و بیشتر مجھے مذہبی اور نیم مذہبی بحث کا موقع ملا۔ کسی بھی شخص کے لیے جو مسلمانوں کے درمیان رہتا ہو یہ ناگزیر ہے کہ وہ ان سے مذہب پر بات چیت نہ کرے اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی زبان پر رات دن اللہ کا نام رہتا ہے۔ ہمارے درمیان اکثر ایسے موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی کہ کون سی بات اللہ کو پسند ہے کون سا اقدام خدا کی مرضی کے مطابق ہے۔ اس سلسلے میں ہم میں اتفاق بھی ہوا کرتا تھا۔ اختلاف بھی ہوتا تھا۔ ان سجاویر کی حمایت اور وکالت بھی کی جاتی تھی جن کی بنیادوں پر ہمارا عمل اللہ کی خوشنودی کا باعث ہو۔

اس طریقہ سے اخلاقی ضابطہ حیات کے مختلف ابواب پر ہم ہمیشہ متفق ہوا کرتے تھے۔ مذہبی لوگوں کا اس طریقے سے تعاون حاصل کرتے ہوئے مجھے عسوس ہوا کہ دس میں سے نو مذہبی فرائض و ذمہ داریوں کی ادائیگی میں عیسائیت اور اسلام ایک جیسے ہیں۔

اگر ہم اپنی دماغی اختراعات اور کج بخششی کو کام میں لاتے ہوئے مختلف مذہبی احکام کی من مانی تاویل و تشریح کرتے تو یقیناً ہم میں ہر قدم پر اختلاف رونما ہوتے۔ انسانی دماغ اس قابل نہیں ہوتے کہ پورے طریقے سے خدا کو سمجھ سکیں۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ان موضوعات پر خواہ مخواہ الجھنا اور دوسروں کو الجھانا بے مقصد اور بے فائدہ ہوا کرتا ہے۔ مسلمانوں سے ان کے مذہبی عقائد پر بحث کرنا اور مختلف مذہبی عقائد کے آپس کے اختلافات کا ان سے ذکر کرنا میری نظر میں ایک سخت غلطی ہے چونکہ وہ اپنے عقیدوں پر سختی سے جے رہتے ہیں اور ان کو اپنا عقیدہ اتنا عزیز

ہوتا ہے کہ اس بحث کا اختتام اکثر و بیشتر غصہ، تناؤ اور جذباتی جھڑکاؤ کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس سے خواہ مخواہ ان سے دشمنی اور مخالفت پیدا ہو جاتی ہے۔

چند مشنریوں کو میں نے چارلس ڈی نو کاٹو کی پیروی کرتے پایا۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہم کو اپنے مذہب کی فوقیت اور برتری کا اظہار کرنا چاہیے اس کی بہتر اور واحد صورت یہی ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو نمونے کے طور پر پیش کریں۔ اپنی زندگیوں سے ہم اپنے اعلیٰ مذہب کی عکاسی کریں۔

ہماری مخلوط فکر و نظر کے منبع کی نشان دہی ہمارے اپنے مشاہدے ہی سے ہو سکتی ہے اس کے لیے ہم کو ضروری نہیں کہ ہم مغرب کے عیسائیوں کے مغرور طرزِ عمل کو دیکھیں۔ ان کا یہ طرزِ عمل صنعتی انقلاب کا نتیجہ ہے ایک زمانہ وہ تھا جبکہ نفرت زیادہ کی جاتی تھی اور غرور و تکبر زیادہ ہوا کرتا تھا۔ ملکہ و کٹوریہ کے عہد میں مغرب کے لوگوں میں یہ بات پھیلانی گئی کہ اسلام غربت اور تنگدستی کی طرف رہبری کرتا ہے۔ جمود کی طرف مائل کرتا ہے۔ آگے کی طرف نہیں بلکہ پیچھے کی طرف لے جاتا ہے۔

جن لوگوں نے مسلمانوں کے تعلق سے ان خیالات کو عوام میں پھیلا یا اب وہ اس بات سے خوش ہو رہے تھے کہ ان کی غلط بیانی اپنا کام کر گئی اور اس طرح سے ذہنی طور پر ایک طرح کی برتری مسلمانوں پر حاصل کر لی۔ بد قسمتی سے وہ نرے جاہل نکلے۔ ان کو تاریخی حقائق کا پتہ ہی نہیں تھا۔ وہ تاریخ سے واقف ہی نہیں تھے وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ اسلام سات سو سال تک دولت، ثقافت، امارت اور قوتِ اقتدار میں ساری مغربی عیسائی مملکتوں سے بہت آگے تھا اس کے بعد کے سات سو سال میں حالات اس کے برعکس ہوتے

گئے۔ مدد و نصرت ہوا۔ جزیر کی باری آئی۔ مغربی یورپی اقوام مسلم ممالک میں گھس پڑیں جبکہ اپنے غروج میں مسلمان یورپ میں پہنچ چکے تھے۔ تہذیب و تمدن اور حکومتوں کے غروج و زوال کے یہ چکر چلتے ہی رہتے ہیں۔ تاریخ میں بار بار اس قسم کے واقعات لوٹ لوٹ کر آتے رہے۔ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہرائی رہی۔

مختلف مذاہب کے بچوں تک کا یہ عقیدہ کہ ان کا مذہب صرف انہیں کو بچائے گا اور باقی دنیا جرم قرار دی جائے گی انصاف پر مبنی تو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ پیرب زبانی نہیں تو اور کیا ہے؟ وہ لوگ جن کو کسی خاص مذہب کی تعلیم دی گئی ہو اگر وہ اسے رد کریں تو واقعی مجرموں میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔ ان لوگوں کو جرم کیسے قرار دیا جاسکتا ہے جنہوں نے مذہب کے تعلق سے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

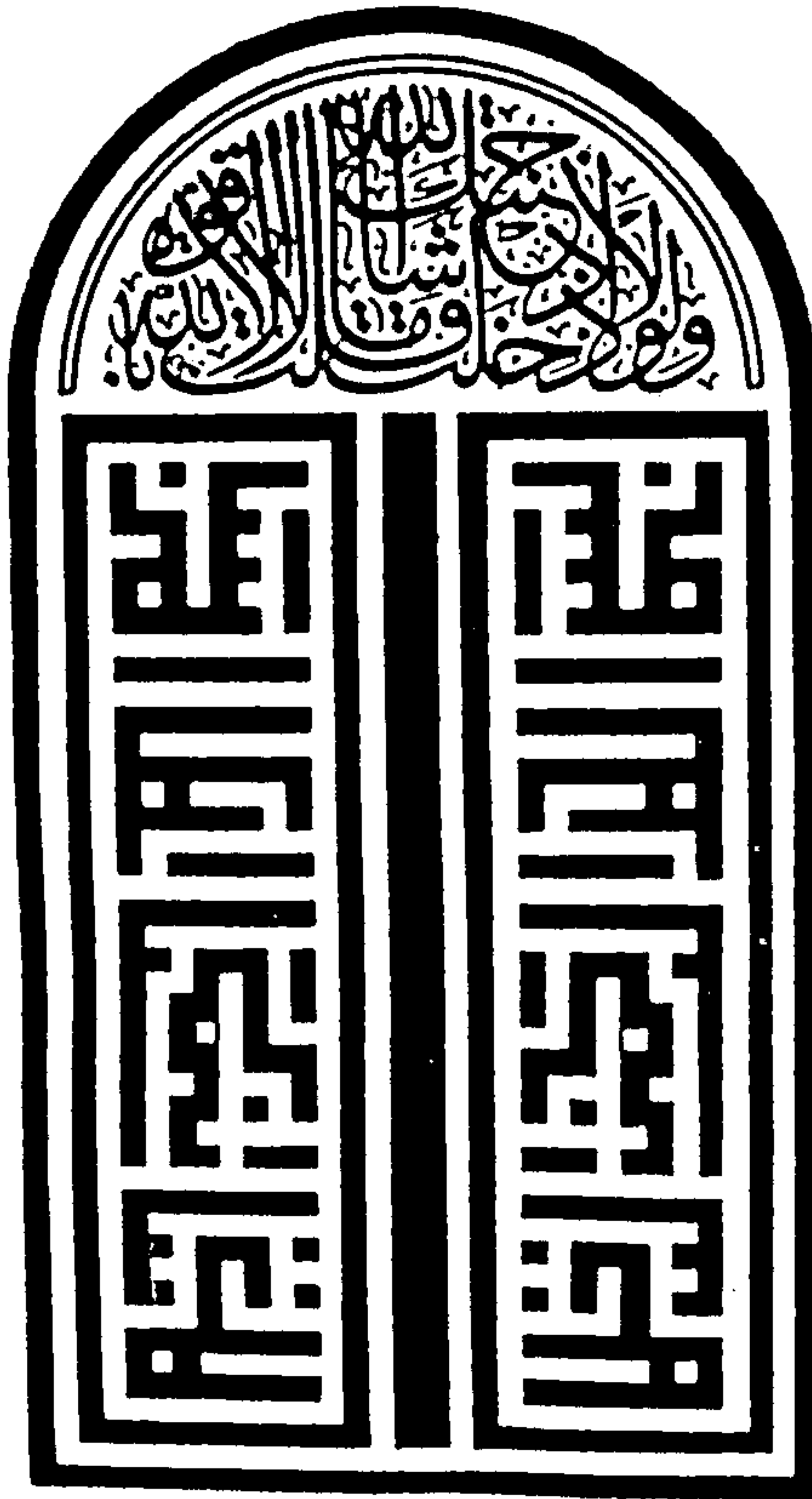
میں ایک جاہل آدمی ہوں۔ علمی اور دینی ماحول مجھے نصیب نہیں ہوا اس کے باوجود مسلمانوں کے درمیان میرے طویل قیام نے مجھے اس بات کا قائل کر دیا ہے کہ تمام لوگ جو خدا پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے احکام کی تعمیل کی کوشش کرتے ہیں ایک ہی راہ پر گامزن ہیں۔ شریعت اور طریقت میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کا بڑا سبب ان کے تہذیب و تمدن کا فرق ہے۔ اس تعلیم کا اثر ہے جو ان کو ان کے گھرانوں سے ملی۔ ان موروثی خیالات کا نتیجہ ہے جو ان کو اپنے آباؤ اجداد سے ملے۔ اگر خدا واقعی محبت ہے تو ہماری ناقص عقل میں یہ بات پوری نہیں اترتی کہ وہ ان لوگوں کو سزا کیوں کہ دے گا جن کو زندگی کے صحیح راستے سے واقف کروایا ہی نہیں گیا۔ اگر لوگوں کو بہتر راستے کا علم ہو جائے اور باوجود واقفیت کے اس راستے پر گامزن نہ ہوں تو یقیناً وہ سزا کے مستحق ہوں گے۔ جو کلام علم میں وہ بہر حال قابل معافی ہیں۔

اگر ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ دوسرے مذاہب والوں کی نسبت ہم خدا کی مرضی اور منشاء کو پورا کرنے کے زیادہ اہل ہیں تو یقیناً ہمارا یہ فرض بن جاتا ہے کہ ہم زندگی کی ان راہوں پر چلیں جس کو دیکھ کر دنیا کے اچھے لوگ ہماری اچھائی اور خوبیوں کی وجوہات دریافت کرنے لگیں۔

دوسرے مذاہب کے لوگوں سے غرور و تکبر کے ساتھ پیش آنا اس بات کا ثبوت دینا ہے کہ ہم میں رواداری نہیں ہے۔ ہم نیم دلی کے ساتھ اپنی زندگی کے دن یونہی گزار رہے ہیں۔ اگر ہم رواداری کے لفظ اور اس کے مفہوم سے نا آشنا ہیں تو پھر ہماری زندگی کی رسم و راہ ایسی ہے جس کو دیکھ کر نہ صرف دوسروں کو بلکہ اپنے آپ کو بھی ڈر ہونے لگے۔

تمام شد

خدا کے فضل و کرم سے اس کتاب کا ترجمہ آج بتاریخ ۲۷ جون ۱۹۷۳ء
یوم چہار شنبہ رات کے ایک بجے مکمل ہوا۔
اس کتاب کے ترجمے میں تقریباً ایک سال کا عرصہ لگا۔
اس کی طباعت کے لیے کتابت کا کام جناب سید قاسم محمود کی توجہ سے
یکم جنوری ۱۹۸۷ء کو شروع ہوا۔ اور فروری ۱۹۸۹ء میں ختم ہوا۔ جناب شاہ
مصباح الدین شکیل نے نظر ثانی اور پرودت ریڈنگ کا کام انجام دیا۔



An Urdu Translation of
General Galib Pasha's
The Life and Times of
Muhammad

Translated By:
Habib Haiderabadi



31-32. 0320-4821459

297.9921

م 28 پ



بیکن بُک

قذافی مارکیٹ، اہدو بازار، لاہور

ملکاشت، ملتان فون: 20791



BEACON
BOOKS

E-mail: beaconbookspakistan@hotmail.com

ISBN 969 - 534 - 020 - 2

Rs. 375/-

Design-Angk

باہر سیران میں لڑائی جانتے اور جھوٹا اس کے لیے پہل کر بی۔ ان کے اصرار پر آپ نے گھر تشریف لے گئے۔ اسلمو زین بن کیا۔

یہاں آپ کے کردار کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ لوگوں کا یہ خیال کہ آپ نڈر اور بے لگام شخصیت کے مالک تھے اور لفظوں اور گیسٹوں پر پندوں کے سربراہ تھے بالکل جہل ہے آپ اپنے فیصلوں میں جلد بازی نہیں کرتے تھے۔ فیصلہ صادر کرنے میں ہمیشہ توقف سے کام لیتے تھے۔ بعض مسلمان اس توقف کے تصور کو قبول کرنے سے بھی پیتے ہیں۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ آپ کا یہ عمل آپ کی تبلیغ کے طریقوں میں سے ایک طریقہ تھا۔ آپ جب وحی والا ہام کی بنا پر کوئی قدم اٹھاتے تو اس میں غلطیوں کی کوئی گنجائش ہی نہ رہتی تھی۔ جب خود اپنی طرف سے کوئی بات کرتے تو بعضی اوقات اس میں انسانی کمزوریوں اور خامیوں کے عناصر شامل ہو جاتے تھے۔ انسانی کمزوریاں اس بات کی طرف نہ صرف اشارہ کرتی ہیں بلکہ شہادت دیتی ہیں کہ حضور کی کامیابیوں کے پیچھے ہمیشہ غلطی ہاتھ رہا ہے۔

قرآن کے تیسرے پارے میں امد کی جنگ کا ذکر آیا ہے اس میں یہ بیان نہیں کیا گیا ہے کہ آپ پہلے خود اس خیال کے ظہور دہ تھے کہ شہر میں رہ کر دشمنوں کا مقابلہ کیا جائے مگر اگلے پارے سے متاثر ہو کر اپنا خیال بدل دیا۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو قرآن میں ضرور اس بات کا ذکر ہوتا کہ آپ نے فیصلہ کرنے میں غلطی کی اور مسلم نوجوانوں پر یہ الزام ضرور لگا ہوتا کہ ان کی خدمت کی وجہ سے مسلمانوں کی امد میں ٹکست ہوئی۔ گو جب کے مورخین نے اس کا ذکر ضرور کیا ہے کہ آپ پہلے پہل شہر ہی میں رہ کر لڑنا پسند کر رہے تھے مگر مورخین کا یہ بیان قرآن کے بیان سے میل نہیں کھاتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نیکو خیالوں نے بعد میں جہاں کہیں بات گڑھلی ہوتی کہ امد کی جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اس سے آپ کو متاثر قرار دیا۔

حیات

عظیمی

صلی اللہ علیہ وسلم



تصنیف

جنرل گلپ پاشا

ترجمہ

حبیب حیدر آبادی